گھنگرو ٹوٹ گئے
لازوال گیتوں کے خالق
بے مثل شاعر قتیل شفائی کی آپ بیتی
حمیدی

یوٹیوب چینل Roshni TV کے وزٹ کے لئے نیچے ٹچ کریں

روشن کتب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اس گروپ میں وقتاً فوقتاً آپ کو تفاسیر القرآن، احادیث، اسلامی، تاریخی، مذہبی، سیاسی نفسیاتی، شاعری، فلسفہ، سائنس، سفرنامے، صحت و تعلیم، تنز و مزاح، سوانح حیات، فقہ ناول، تہذیب و تحقیق پر مبنی کتب ملیں گی۔ یہ کتاب اور من پسند کتابیں ڈاک کے ذریعے منگوانے کے لئے رابطہ کریں۔

ہمارے Whatsapp گروپ میں شامل ہونے کے لئے رابطہ کریں

ہم سے رابطہ کے لئے : 923019452605+

روشن کتب اردو بازار لاہور پاکستان

03019452605

آپ whatsapp پر رابطہ کے لئے اوپر نمبر پر ٹچ کریں

قتیل شفائی کی آپ بیتی

تزئین، پی ڈی ایف : حمیدی

میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اس لحاظ سے قطعاً غیر ادبی اور غیر علمی تھا کہ اس ماحول سے وابستہ لوگ، جن میں میرا اپنا خاندان بھی شامل تھا، پیسے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور انہیں اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ علم بھی زندگی کے لیے ضروری ہے اور علم سے آگے بڑھنے والا ایک راستہ ادب کا بھی ہوتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریز کا پرچم اپنی پوری شان کے ساتھ فضاؤں میں لہرا رہا تھا اور لوگوں کو غیر ملکی غلامی کے ماحول میں اور فکر کم ہوتی تھی پیسہ کمانے کی فکر زیادہ ہوتی تھی یا پھر سرکاری دربار میں رسائی حاصل کرنے کے مواقع تلاش کرنا ان کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ میرے خاندان کا المیہ یہ تھا کہ ہر شخص تقریباً لکھ پتی تھا لیکن تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے کوئی سرکاری دربار میں اوپر تک تو نہیں پہنچ سکا مگر ان پڑھ ہونے کے باوجود مقامی میونسپلٹی کی پریذیڈنٹ شپ تک ان لوگوں میں سے گئے۔

میں جب پیدا ہوا تو اس وقت مجھ سے پہلے گھر میں کوئی اولاد نہیں تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ میرے باپ

نے جب پہلی شادی کی تو کافی عرصہ تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ خاندان کے اور گھریلو مشورے سے انہیں مجبوراً دوسری شادی کرنا پڑی جس سے 24 دسمبر 1919ء کو میں اپنے آبائی گاؤں ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوا۔ چونکہ یہ میرے والد کی پہلی اولاد تھی اس لئے میری پیدائش پر بہت جشن منایا گیا۔ میری تولید کے تین سال بعد میری بہن پیدا ہوئی اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی دوران پہلی ماں سے بھی ایک بچہ ہو گیا اور وہ ہمارے گھر میں آخری بچہ تھا۔ گویا ایک ماں سے دو اولادیں ہوئیں اور دوسری ماں سے ایک جن کی کل تعداد تین بنتی ہے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔

میرے والد کی دو شادیوں میں کوئی معاملہ معاشقہ' آوارہ گردی یا عیاشی کا نہیں تھا بلکہ ایک ضرورت کے تحت میرے والد نے دو شادیاں کی تھی' اس لئے گھریلو ماحول پُرسکون رہا اور دونوں مائیں ایک دوسرے کا احترام کرتی تھیں اور ایک دوسرے کے بچوں سے بھی پیار کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ظاہر ہے کہ دو شادیوں کی قباحتیں اپنی جگہ ہیں۔ کبھی کبھی وہ پہلو بھی سامنے آجاتا تھا لیکن عام طور پر حالات خوشگوار ہی رہے' سوائے اس کے میرے والد گھریلو اخراجات اور ضرورتوں کے بڑھنے کی وجہ سے کاروبار اور محنت کا سلسلہ بڑھانے پر مجبور تھے اور اس کے علاوہ انہیں ایک اور طرف جانا پڑ گیا جسے ہم شرفاء کی زبان میں ایک اچھا کام نہیں بھی کہہ سکتے اور وہ کام تھا کارنیوال۔ سیدھے لفظوں میں ہم اسے جوا کہہ سکتے ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ ہر اچھائی اور برائی کی کچھ سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک اچھائی کی سطح اتنی گہری ہوتی ہے کہ اچھائی ہونے کے باوجود ہم اسے پسند نہیں کرتے اور ایک برائی کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ برائی زیادہ کھلتی نہیں۔

میرے والد کا حلقہ احباب متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے روسا کا تھا جو اپنے وقت میں بہت بڑے

سرمائے کے ساتھ شغف کرتے تھے۔ان کے ساتھ جنہوں نے کارنیوال کا کاروبار شروع کیا‘ اس میں میرے والد سمیت پارٹنر تھے۔اس کاروبار میں انہیں اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی جو کہ پوری طرح جائز کمائی سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔

اس صورت میں میری پرورش ایک امیرانہ ماحول میں ہوئی اور میں نازونعم میں پلا لیکن یہ ساری چیزیں ہونے کے باوجود راستے میں ایک قسمت کی دیوار بھی ہوتی ہے۔ بچپن ہی میں والد رخصت ہو گئے جن کے بل بوتے پر یہ ساری عیش و عشرت کی فضا قائم تھی۔جب تک وہ زندہ رہے۔انہوں نے میری ہر خواہش پوری کی۔

پانچویں جماعت میں جب میں سکول میں بزم ادب کا سیکرٹری بن گیا تو انہوں نے میری پوری کلاس اور متعلقہ اساتذہ کو ایک اچھی خاصی دعوت دے ڈالی جیسے آجکل کوئی کونسلر منتخب ہو جائے۔اسی طرح اس زمانے میں مجھے موسیقی کا شوق ہوا تو انہوں نے ایک گراموفون اور اس سے متعلقہ چیزیں مجھے فراوانی سے مہیا کر دیں۔پھر سیاحت کا شوق ہوا تو جہاں میں نے جانا چاہا۔انہوں نے اس ہدایت کے ساتھ کہ اچھی کلاس میں سفر کرنا مجھے دوستوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

ابتدا ہی سے میرے لئے مشہور تھا کہ میں خوش لباس‘ خوش گفتار اور خوش خوراک ہوں۔ یہ سب چیزیں مجھے اپنے والد کی طرف سے ملی ہوئی تھیں۔انہوں نے میری تربیت کچھ اس رنگ میں غیر محسوس طور پر کی تھی کہ انہوں نے مجھے زندگی کا قرینہ اور مجلسی آداب سکھائے۔جب انہیں محسوس ہوا کہ میرے اندر تھوڑا سا ادب کا شائبہ بھی ہے تو انہوں نے بہت سی ادبی کتابیں بھی مجھے مہیا کر دیں حالانکہ اس دور میں ادبی کتابیں بہت کم ہوتی تھیں۔وہ الف لیلیٰ اور حاتم طائی وغیرہ کی کہانیاں

اس بہانے مجھ سے پڑھاتے تھے کہ خود بہت کم پڑھے ہوئے تھے۔ اکثر مجھے کہتے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے یہ کتاب مجھے پڑھ کر سناؤاور یوں سننے کے بہانے وہ مجھے پڑھاتے تھے۔ شاعری کی صرف وہی کتابیں میرے ہاتھ آتی تھیں جو گورنمنٹ ہائی سکول ہری پور کی لائبریری میں میسر تھیں۔اس زمانے کے گراموفون ریکارڈوں میں آج کی طرح گھٹیا شاعری نہیں ہوتی تھی بلکہ اساتذہ کا کلام ہی ہوتا تھا۔میرے پاس جو ریکارڈ تھے ان میں زیادہ تر غالب' امیر مینائی اور ذوق کا کلام تھا۔زیادہ تر گانے والے اساتذہ ہی کا کلام گاتے تھے۔میرے والد مجھے چن چن کر ایسے ریکارڈ مہیا کرتے تھے جن میں شاعری کا ایک معیار ہوتا تھا اور یوں میری ذہنی پرورش ہوتی رہی۔ جب میں چھٹی کلاس میں تھا اور بزم ادب کا سیکرٹری بھی تھا تو سکول میں مضمون نویسی اور شاعری کا مقابلہ ہوا۔اس مقابلے میں مجھے اپنی نظم پر انعام میں ایک کتاب ''سوز بیدل'' ملی۔بیدل پشاور کے شاعر تھے۔سکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد اشرف تھے۔وہ ہمارے کرایہ دار بھی تھے اور ان سے ہمارے گھریلو تعلقات بھی تھے۔ان کی مجھ پر بڑی توجہ تھی اس لئے مجھے انعام ملنے پر وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔میرے والد کی وفات کے وقت ہماری پوری فیملی میں پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے اور انہیں بالکل احساس نہیں ہوا کہ اس لڑکے کو آگے جینا بھی ہے۔ انہوں نے میری ماں کو مشورہ دیا کہ اب باپ کا سایہ سر پر نہیں ہے۔اس لئے لڑکے کو کاروبار کروا دو۔اس وقت میرے دو تایا موجود تھے۔ایک تایا فاترالعقل تھے اور بڑی مدت سے پاگل چلے آرہے تھے۔وہ گویا ایک سرپرست کے فرائض ادا نہ کر سکتے تھے۔دوسرے تایا بھی اکثر بیمار رہتے تھے۔یہ دونوں ایک طرح سے ہماری فیملی کی ذمہ داری بن چکے تھے اور ان کی نگہداشت بھی ہمیں

کرنا پڑتی تھی۔

میری ماں بہت سادہ عورت تھی اور بالکل ان پڑھ تھی۔ وہ بھی اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جس میں باقی ساری فیملی۔ اس وقت میری عمر تقریباً سولہ برس تھی۔ مجھے کہا گیا کہ کاروبار کرو۔ کاروبار کے بارے میں مجھے کوئی تجربہ یا ٹریننگ نہ تھی۔ سب سے پہلے مجھے فٹ بال یا سپورٹس کی دکان کھول کر دی گئی اس لئے کہ سپورٹس سے میرا تعلق تھا۔ اس کاروبار میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا کیونکہ مجھے دوکانداری کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ تمام کاروبار پرانے کاروباریوں کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ سکول کے لڑکے آتے تھے اور چائے وغیرہ پی کر چلے جاتے تھے۔ جب اس کاروبار میں نقصان ہوا تو بچا ہوا مال کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سائیکلوں کی دوکان کھول کر دی گئی۔ اس لئے کہ نئی سائیکلیں فروخت کی جا سکیں گی اور پرانی کرایہ پر دی جا سکیں گی۔ مگر اس دوکان کا بھی پہلی دوکان جیسا ہی حشر ہوا۔ اس کے بعد کچھ رشتہ داروں نے مشورہ دیا کہ ایبٹ آباد میں بزازی کی دوکان کھولنی چاہیے۔ اب اس طرح کے کام بڑی ٹریننگ چاہتے ہیں بلکہ اگر فیملی میں یہ کام پیچھے سے چلا آتا ہو تو یہ کاروبار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایبٹ آباد میں بزازی کی دکان صرف تیرہ دن چلی اور اس کے بعد بند کر دی گئی۔ کیونکہ اس تمام عرصے میں ایک گاہک بھی نہ آیا تھا۔

میونسپلٹی میں ہمارے ایک قریبی رشتہ دار سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا میونسپلٹی میں محرر ہو جاؤ اور میں تمہیں بہت جلد ترقی دلوا کر بڑے عہدے تک پہنچا دوں گا۔ مزید کہا کہ تمہارا بچا ہوا روپیہ میں اپنے کاروبار میں لگا دیتا ہوں۔ تمہیں ادھر سے بھی فائدہ ہو گا اور ادھر سے بھی۔

دراصل ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ میں تو میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا‘ وہ مجھے ترقی دلوا کر انسپکٹر کیسے بنوادیتے۔ لیکن وہ اپنی پلاننگ میں کامیاب ہوئے اور میں ناکام۔

خیر! میں میونسپلٹی میں محرر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا مگر میرے آفیسرز کو ایک چیز کھلتی تھی۔ بات یہ تھی کہ میرے والد کے زمانے کے بہت سارے سوٹ پڑے ہوئے تھے۔ آمدن بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔ دو‘ تین مکانات بھی تھے اور جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ اس زمانے میں ہری پور میں مسلمانوں کے مکانوں میں سب سے بڑا تھا۔ اب تو وہاں پر ماشاءاللہ بڑی ترقی ہو گئی ہے۔ کچھ ہندوؤں کے مکانات البتہ ہمارے مکان سے بڑے تھے۔ میں جب دفتر میونسپلٹی میں جاتا تو والد کے زمانے کے وہی قیمتی سوٹ پہن کر جاتا اور ننگے سر رہتا حالانکہ اس زمانے میں سب لوگ سر پر ٹوپی پہنتے تھے۔

شاعری کا جو شوق تھا اس کی وجہ سے ایک انا بھی تھی کہ میں بھی کچھ ہوں۔ کچھ لوگوں کو یہ برا لگتا تھا۔ چنانچہ اسی چھوٹی سی بات پر کہ یہ ننگے سر کیوں پھرتا ہے اور ہم سے اچھا لباس کیوں پہنتا ہے‘ کچھ جھگڑے بھی ہوئے اور ایک بار مجھ پر اور میرے تین ساتھیوں پر ایک ناجائز مقدمہ بھی بنا دیا گیا جس کی وجہ سے ہم ایک ماہ سے زائد عرصہ تک حوالات میں بند رہے۔ بالآخر بڑی آبرو کے ساتھ ہم حوالات سے نکلے اور وہ ایڈمنسٹریٹر جنہوں نے جھوٹا مقدمہ بنایا تھا ان کے خلاف کارروائی کی اور وہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ اب ہری پور کو خدا حافظ کہنا چاہیے کیونکہ نوکری بھی بہت معمولی

تھی اور پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ اس سے ایک تو اپنی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔ دوسرے آئندہ بھی اس طرح کا سلوک ہوتا رہے گا۔ اس لئے میں وہاں سے راولپنڈی چلا گیا۔

ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت

شاعری کے پودے کی آبیاری راولپنڈی میں ہوئی اور یہ درخت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ وہاں زمانے میں تلوک چند محروم' عبدالعزیز فطرت' انجم رومانی' جگن ناتھ آزاد' احمد ظفر' جمیل ملک اور حسن طاہر جیسے لوگ موجود تھے۔ ان کے علاوہ وہاں میری ملاقات اپنے استاد حکیم محمد یحییٰ شفا صاحب سے بھی ہوئی جو طب اور علمیت دونوں ہی میں بہت فاضل تھے۔ شفا صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے۔ ان سب لوگوں کی محفلیں کام آئیں۔

روزگار کا سلسلہ یوں چلا کہ میں نے پنڈی' مری ٹرانسپورٹ میں دوسری نوکری بطور بکنگ کلرک کر لی۔ میرے والد بہت سا زیور اور نقد روپیہ چھوڑ گئے تھے اور ہم تین بہن بھائیوں کیلئے وہ انتظام کر گئے تھے کہ ساری چیزیں افراط سے موجود تھیں بلکہ وہ برتین جو دعوتوں کیلئے کام آ سکتے تھے وہ بھی گھر میں موجود تھے اور یہ سب کچھ تین چار برس میں میرے ہاتھوں ضائع ہوا کیونکہ میرے اوپر کوئی کنٹرول نہیں تھا اور لواحقین کی نیتیں بھی ٹھیک نہیں تھیں۔ چنانچہ وہ سب کچھ ضائع کرنے کے بعد میں راولپنڈی آ گیا۔

یہاں بھی ہمارے دو مکانات تھے۔ لیکن والد صاحب کا اثاثہ میرے ہاتھوں ضائع ہوتا رہا مگر بغیر کسی عیب کے۔ کیونکہ مجھ میں کوئی عیب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اگر کوئی دوست آ جاتا تو میں شاہ خرچی کرتا تھا۔ جو تین کاروبار کیے ان میں بھی کافی روپیہ ضائع ہوا۔ غرض جب پنڈی آیا تو اس وقت

میرے تین بچے تھے۔میری پھوپھی یہیں رہتی تھیں۔دونوں مائیں ہری پور ہی رہ گئیں۔یوں میں اور میرا کنبہ راولپنڈی آکر پھوپھی کے گھر میں مقیم ہوئے کیونکہ یہ بھی ہمارا اپنا ہی گھر تھا۔

میرے والد دس جون 1935ء کو فوت ہوئے تھے اور 1936ء کے آخر میں میری شادی ہو گئی تھی۔شادی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ان پڑھ ماحول میں لوگوں کو ابتداء سے ہی صرف بچے کی شادی کی فکر ہوتی ہے۔بچوں کی تعلیم کی یا کسی ٹریننگ کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔شادی کے وقت میں میری عمر کوئی سترہ سال ہو گی۔یہ شادی ایسے ہوئی کہ نہ مجھے علم تھا کہ شادی کہاں ہو رہی ہے اور نہ میری بیوی کو علم تھا کہ اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔دراصل ہوا یوں کہ میرے گھر ایسے لوگ پڑ گئے جو نہیں چاہتے تھے کہ میری شادی وہاں ہو۔اس لئے میری شادی بغیر کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے ایک دوسری جگہ ہو گئی۔

اب جب میں روزگار کا مارا ہوا پنڈی گیا تو وہاں ایک حکیم صاحب کے بیٹے میرے اچھے دوست تھے۔انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کوئی سروس کر لیں اور اگر کہیں تو پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں ساٹھ روپے ماہانہ کی نوکری دلوا دوں۔میری پہلی نوکری میں تنخواہ بائیس روپے ماہانہ تھی۔اس لئے یہ نوکری ملنے سے کافی ریلیف ملا۔علاوہ ازیں پنڈی میں کچھ مشاعروں وغیرہ کا بھی معاملہ ہو جاتا تھا۔یہ زمانہ بڑی محنت کا زمانہ تھا۔محنت تو خیر میں نے ساری زندگی کی ہے اور اپنا وقت ہمیشہ کارآمد طریقے سے خرچ کیا ہے۔

پھوپھی کے ساتھ ہم جس مکان میں رہتے تھے۔اس میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔اس لئے میں نے

اپنے مکان کے ساتھ ایک بیٹھک لے رکھی تھی۔ میرے پنڈی کے ادیب دوست وہیں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم وہاں کم از کم رات کے بارہ بجے تک بیٹھتے تھے۔ شاعری کے دور چلتے تھے بلکہ کبھی کبھی گانے بجانے کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب میں یہاں سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو مشق سخن کرتا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے سونے کے بعد میں بس سٹینڈ پر جاتا تھا کیونکہ چھ بجے مجھے پہلی بس مری کیلئے روانہ کرنی ہوتی تھی۔ نیند کی کمی دن میں تھوڑا بہت سو کر پوری کر لیتا تھا۔

ان مصروفیات کا فائدہ یہ ہوا کہ ان ادبی محفلوں میں ارتقاء کا معاملہ پیدا ہو ااور میری شاعری متعارف ہوئی۔ اس دوران کچھ ایسے اشعار بھی وارد ہوئے جو میری پہچان بنے۔

ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے:

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں

کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

یہ غزل میری پہچان اور شہرت کا باعث بنی۔ اس کی پیروڈی بھی ہوئی۔ دراصل اس غزل کا یہ شعر نئے لہجے کا تھا۔ کسی کی سمجھ میں آیا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ بدلی پازیب سے کیسے ٹکرا سکتی ہے؟ بہرحال یہ شعر ذہنوں میں اتر گیا اور اس سے میں آگے بڑھا۔

ماں باپ نے میرا نام اورنگ زیب رکھا تھا۔ جب میں نے پنڈی آکر حکیم شفا صاحب کی شاگردی اختیار کی تو اپنا نام قتیل شفائی رکھ لیا۔ شفا صاحب میرے رشتہ دار تھے اور ہم قریب قریب رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سکھایا اور میری ابتدائی شاعری کی تعمیر انہوں نے ہی کی۔

پیشہ کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور عروض کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ شفاء4صاحب کی شخصیت دو، تین خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ایک تو وہ مذہبی علمی شغف رکھتے تھے۔دوسری دلچسپی شعر وشاعری میں تھی اور تیسرا طبّی علمی شغف تھا۔وہ شاعری کو اپنا فالتو شغف سمجھتے تھے اور خود مکمل طور پر اس طرف نہیں آئے لیکن انہوں نے کئی شاگردوں کی اصلاح کی۔ انہی کے نام کی مناسبت سے میں نے شفائی تخلص رکھا۔

ہری پور کے زمانے میں زیب تخلص کرتا تھا۔جب پنڈی آیا تو قتیل کا تخلص رکھ لیا۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں پنڈی میں جس محلے میں رہتا تھا وہاں ہماری پچھلی گلی میں ایک امام بارگاہ تھی۔وہ زمانہ شیعہ سنی فساد کا زمانہ تھا اور اس محلے کے ہم سنی لوگ بھی ایک طرف سے اعزازی شیعہ بن گئے تھے۔وہ زمانہ امام باڑوں میں بھی اچھی شاعری کا تھا قطع نظر اس کے کہ ملتانی ذاکر جو پڑھتے ہیں وہ ایک الگ چیز ہے۔ان مجالس میں انیس اور دبیر کی رباعیاں پڑھی جاتی تھیں بلکہ مجلس کے دوران کوئی آدمی اٹھ کر ایک دو رباعیاں پڑھتا تھا اور پھر ذاکر اپنا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔اس مجالس میں قتیل فرات کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔اب میں تجزیہ کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ قتیل کا لفظ مجھے امام باڑے سے ملا۔چونکہ والد صاحب فوت ہو گئے تھے اور کچھ تکلفیں بھی درپیش تھیں اس لئے مجھے یہ نام بڑا مناسب لگا۔ چنانچہ میں نے قتیل شفائی کا نام اختیار کیا۔

اس زمانے کا رواج تھا کہ لاہور کا رہنے والا لاہوری، جالندھر کا رہنے والا جالندھری اور اگر استاد کا نام فاضل ہے تو فاضلی کہلاتا تھا۔اس لئے میں نے بھی فیشن کے طور پر شفائی نام رکھا۔میرے

نام کے بارے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔وہ یہ کہ میرا ایک بیٹا انگلینڈ میں رہتا تھا جس کی بیوی سکاٹ لینڈ کی ہے۔ایک دن اس کی بیوی نے اس سے پوچھا کہ آخر اس نام قتیل شفائی کا مطلب کیا ہے تو میرے بیٹے نے وضاحت کی کہ قتیل کا مطلب ہے جسے قتل کر دیا گیا ہو اور شفائی کا مطلب ہے جو دوسروں کو شفا دے۔اس طرح ملا جلا کر اس نام کا مطلب حضرت عیسیٰؑ بنتا ہے۔

راولپنڈی سے مجھے ٹرانسفر کر کے مری بھیج دیا گیا۔میرے عزیز دوست اور نامور شاعر احمد ظفر بھی پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں کام کرتے تھے' انہیں بھی مری بھیج دیا گیا۔ان کے ساتھ گھریلو تعلقات تھے اور وہ میرے بھائیوں کی طرح تھے۔اس لئے اکٹھے مری جانے کی خوشی ہوئی۔ مری کی فضا میں بڑی شاعرانہ تھی۔ ہندوستان کے دور دراز سے آئے ہوئے باذوق رؤساہر روز اپنے بنگلوں میں کوئی ادبی محفل منعقد کرواتے تھے۔آزاد زمانہ تھا' آزاد فضائیں تھیں اور کھل کر شاعری ہوئی تھی۔اس زمانے کی شاعرانہ محفلوں کے مطابق ناؤنوش کا انتظام بھی ساری رات چلتا تھا۔ان محفلوں میں میں نے اچھے اور برے پینے والے بھی دیکھے اور یہ بھی جانا کہ شراب کے مفید پہلو کیا ہیں اور نقصان دہ پہلو کیا ہیں۔میں نے وہاں انسانوں کے ظرف بھی پرکھے اور بہت کچھ سیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں شاعری کو بھی بڑی جلا ملی کیونکہ تنقید بڑی صحیح بنیادوں پر ہوتی تھی۔

مری کا یہ قیام اس لئے بھی یادگار ہے کہ یہاں مری کے آس پاس رہنے والے دوست بھی ملے جن میں پروفیسر کرم حیدری بھی شامل ہیں۔وہ بزم کے بہت فعال سیکرٹری تھے اور وہاں کی ادبی سرگرمیاں انہی کے بل بوتے پر تھیں۔فیض احمد فیض سے بھی میری پہلی ملاقات مری ہی میں ہوئی

وہ وردی پہنچے ہوئے تھے اور ان دنوں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ جنگ کا یا جنگ سے ذرا بعد کا زمانہ تھا۔ وہاں پر کوئی تقریب تھی، وہ بھی اس سلسلے میں وہاں پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں جب پتا چلا کہ کچھ شاعر یہاں پر آئے ہوئے ہیں تو انہیں بلوایا۔ میں نجانے کیسے پہلے ہی سے ان کے ذہن میں تھا اس لئے جب میرا پتا چلا تو مجھے بھی بلوایا۔

مری میں ہر سال ایک بڑا آل انڈیا مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس کیلئے سارے شاعر کھنچے ہوئے چلے آتے تھے۔ انہی دنوں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ایک دوست الطاف مشہدی تھے جو اپنے زمانے کے بڑے نامور شاعر تھے اور جوش کے بعد ان کا مقام آتا تھا۔ خدا نے فن اور جسم کی تمام خوبیاں انہیں دے رکھی تھیں۔ لیکن انہوں نے شراب کو ساری برائیوں سمیت قبول کر رکھا تھا اور ان کی ایسی مجبوری بن چکی تھی کہ وہ کردار کے مقررہ معیاروں سے کچھ نیچے آ گئے تھے۔ انہوں نے پلان کیا کہ آل انڈیا مشاعرہ کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مشاعرے کا انتظام کیا اور دس دس روپے کے ٹکٹ رکھے۔ اس زمانے میں دس روپے بہت تھے۔ وہ شام کو باہر نکل جاتے اور جو رئیس نظر آتا اس سے اپنا تعارف کرواتے اور دو، چار، پانچ ٹکٹ فروخت کر دیتے۔ اس طرح انہوں نے بہت سار و پیہ جمع کیا۔ ہم ان کے شام کے ساتھی تھے۔ وہ یوں کہ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں کس وقت چھٹی ہوتی ہے۔ وہ پہلے ہی سے ہمارے منتظر ہوتے تھے اور ہمیں ساتھ لے لیتے تھے۔ ہم بہت خوش تھے کہ وہ اتنے ٹھاٹھ کا مشاعرہ کر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے ہندوستان کے تمام معروف شاعروں کو دعوت دے رکھی تھی اور جو کسی نے مطالبہ کیا کہا ٹھیک ہے۔

انہوں نے یہ مشاعرہ رمضان کے مہینے میں رکھا تھا۔ ناشتے یا کھانے کا انتظام تو در کنار جب مشاعرہ

ختم ہوا اور سب شعراء ہوٹل میں واپس پہنچے تو دیکھا کہ الطاف صاحب کا کمرہ خالی ہے۔ میں نے ہوٹل سے بسوں کے اڈے پر فون کیا اور پوچھا کہ میرے شاعر دوست الطاف صاحب کو دیکھا ہے تو پتا چلا کہ وہ ایک گھنٹہ ہوا پنڈی کی بس میں سوار ہو کر جا چکے ہیں۔ انہوں نے کسی کو کچھ نہ دیا اور سارے روپے خود سمیٹ کر چلے گئے۔

اس مشاعرے میں جو لوگ آئے ہوئے تھے ان سے بہت سے ایسے تھے جنہیں پہلے دیکھا ہوا بھی نہیں تھا، ہمارے دوست بنے۔ اس لئے کہ میں اور احمد ظفر یہاں بر سرِ روزگار تھے۔ کچھ کو کھانا کھلایا اور کچھ کو واپسی کا کرایہ بھی دیا۔ مشاعرے کا یہ تاریک پہلو میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے بعد بھی ایسے کئی واقعات دیکھے جن کا بیان آگے آئے گا۔

میونسپلٹی میں ملازمت کا جو واقعہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ میرے پاس میرے والد کے ولایتی سوٹ موجود تھے۔ لوگ زیادہ تر بھلہ کمپنی کے بنے ہوئے دیسی بوٹ پہنتے تھے لیکن میرے پاس تو باقاعدہ ولایتی بوٹ بھی ہوتے تھے۔ جب میں نے میونسپلٹی کی ملازمت کی ان دنوں تحصیل کا ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہی ایڈمنسٹریٹر بلدیہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ہمارا ایڈمنسٹریٹر راشی اور کرپٹ تھا۔ ہمارے وہاں ڈاکٹر جیمز بنی لال کی عیسائی فیملی تھی جن کے ساتھ ہمارے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کے دونوں بیٹے میرے بھائی تھے اور بیٹیاں بہنوں کی طرح تھیں۔ یہ ایڈمنسٹریٹر اس طرف سے گزرتا تھا اور اس نے فرض کر رکھا تھا کہ ہر عیسائی فیملی کرپٹ ہوتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہاں آتے جاتے دیکھ کر رکھا تھا۔ ایک دن میں دفتر میں گیا تو آگے وہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں دفتر میں جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ بھی کیا تھی' جنگلا سا بنا ہوا تھا جس کے اندر ہم پیچھے

تکیہ لگا کر نیچے بیٹھے ہوتے تھے۔ اس نے ہیڈ کلرک سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے بتایا کہ محرر ہے۔اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا" یہ کپڑے کہاں سے پہنتے ہو"۔

میں نے کہا"جی میں گھر سے پہنتا ہوں "

اس نے کہا" بائیس روپے تنخواہ میں کپڑے بنتے ہیں"۔

میں نے کہا"جی اس میں بائیس روپے کا کوئی تعلق نہیں۔یہ کپڑے میرے والد کے زمانے کے ہیں" اس نے میری وضاحت سنی ان سنی کر دی اور حکم دیا" یہاں ٹھیک طرح آیا کرو اور سر پر ٹوپی رکھا کرو"

میں نے کہا" جی میرے سر میں درد ہو جاتا ہے اور میں ٹوپی نہیں پہن سکتا" اس نے مجھے گستاخ قرار دیتے ہوئے بہت سی لایعنی سی باتیں کہیں اور اس واقعہ کو ذہن میں رکھ لیا۔

میرے ساتھ وہاں دو اور محرر بھی تھے۔انہی دنوں مجھے پنڈی ایک مشاعرے کے لئے جانا پڑا۔یہ میری زندگی کا پہلا پہلا مشاعرہ تھا۔اس سے واپس لوٹا تو پتا چلا کہ ہم تینوں محرروں پر اسی ایڈمنسٹریٹر نے غبن کا مقدمہ بنوا دیا ہے۔ ہم اس کیس میں کوئی مہینہ اور دو دن حوالات میں رہے۔جب بھی ہم عدالت میں پیش ہوتے تو وہ مجھے کہتا" دماغ ٹھیک ہوا ہے یا نہیں" اور اگلے ہفتے کی پیشی ڈال دیتا۔ میں نے ہر بار جواب میں یہی کہا ک"دماغ کا اس سے کیا تعلق ہے اور جو کیس بنایا گیا ہے وہ جھوٹا ہے"

میرے کچھ دوست اخبار نویس تھے میں نے انہیں بلایا اور کہا" یہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی منصف بھی" میرے ان دوستوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ویسے تو وکیل بھی اس کی عدالت میں

جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن ہمارے وکیل نے جرأت کر کے کہا" ہم اس کیس کو کسی اور عدالت میں تبدیل کروانا چاہتے ہیں۔چونکہ کیس کے مدعی آپ خود ہیں اس لئے ہمیں آپ سے انصاف کی توقع نہیں" ساتھ ہی اس نے ایک درخواست پیش کی کہ ہمیں آج کی کارروائی اخبارات میں چھپوانے کی اجازت دی جائے۔اس سے وہ ڈر گیا اور ہمیں ضمانت پر رہا کر دیا۔

ان دنوں چینی اور مٹی کا تیل پرمٹ پر ملتا تھا۔اب وہ مجھ سے خوفزدہ تھا کیونکہ میں نے پیغام بھجوادیا تھا کہ اب میں باہر آگیا ہوں اور اب میری باری ہے کہ یہ سب اخبارات میں چھپواؤں۔اس نے مجھے اپنے پاس بلوا کر حال دریافت کیا اور کہنے لگا" وزن بڑھا ہوا لگتا ہے" کہنے لگا" کھانا گھر سے کیسے جاتا تھا"

میں نے کہا" جیسے باقیوں کا جاتا ہے"

وہ مجھ سے کہنے لگا" بھئی یہ کیس تو الگ چلتا رہے گا۔اگر چینی اور مٹی کے تیل وغیرہ کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ"

میں نے کہا" ایک بوری چینی اور ایک کنستر تیل کا ہفتہ وار پرمٹ دے دیں" اس زمانے میں ایک کنستر سات روپے میں آتا تھا اور بلیک میں کوئی تیس روپے کا بکتا تھا۔اسی طرح چینی بھی بلیک میں بکتی تھی۔میں نے وہ پرمٹ لے کر بیچ دیا لیکن اس کی تصویریں بنوا کر ریکارڈ رکھ لیا۔اب میں نے اخبارات کو لکھنا شروع کیا کہ اس شخص نے جھوٹا مقدمہ قائم کر کے میرے ساتھ زیادتی کی ہے اور اب مجھے راضی کرنے کیلئے پرمٹ دیا ہے۔یوں میں نے اسے خوب بے عزت کیا۔چونکہ کیس جھوٹا

تھا‘ اس لئے میرے اس شور شرابے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا اور ہم باعزت بری ہو کر اپنی ملازمتوں پر بحال ہو گئے۔ چونکہ اس نے یہ کیس اس عیسائی فیملی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے بنایا تھا۔ اس لئے اس واقعے کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور میں نے طے کیا کہ یہ سب لوگ ذہنی اور معاشرتی سطح پر مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور یہاں مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر میں ہری پور چھوڑ کر پنڈی چلا گیا۔

اوپر میں نے کیس بننے سے پہلے پنڈی کے جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے اس کے آرگنائزر شوکت واسطی تھے جو وہاں سٹوڈنٹس یونین کے عہدیدار تھے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں مجھے بطور شاعر بلایا گیا تھا جیسے بڑا اعزاز دے کر بلایا جاتا ہے۔ لکھا ہوا تھا کہ اخراجات سفر ہم ادا کریں گے۔ میری سادگی کا یہ عالم تھا کہ مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم معاوضہ دیں گے۔ میں نے مشاعرہ پڑھا اور بہت ٹھیک رہا۔ سید ضمیر جعفری بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ انہوں نے میرے اشعار پر نہ صرف وہاں بیٹھے ہوئے داد دی بلکہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد بھی مجھے داد دی اور پوچھا کہ عزیز آپ کہاں رہتے ہیں؟ جب میں نے بتایا کہ میں ہری پور میں رہتا ہوں تو کہنے لگے کہ ماشاءاللہ آپ بڑی ترقی کریں گے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو شوکت واسطی مجھے ساتھ لے گئے اور پوچھا ”آپ کو کیا پیش کروں“

میں نے کہا ”سوا روپیہ آتے ہوئے لگا ہے اور سوا روپیہ واپسی پر کرایہ لگے گا اور آٹھ آنے تانگے کے ہوں گے اور یوں میرا کوئی تین روپے خرچہ آیا“ وہ مسکرائے اور مجھے پانچ روپے دے دیئے۔ اب

پتا نہیں انہوں نے میرے لئے کیا معاوضہ مقرر کرر کھا تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ جو واقعی خرچ آیا ہے وہ لے لینا چاہیے۔ یوں میں اپنا پہلا معاوضہ پانچ روپے لے کر خوش خوش چلا آیا۔

سید ضمیر جعفری نے میری بہت حوصلہ افزائی کی تھی اور وہ شاباش میرے بہت کام آئی۔ ابھی 3 اکتوبر 88ء کو انہوں نے ایک خط میں مجھے لکھا:

پیارے قتیل صاحب! السلام علیکم

میں '' جنگ'' راولپنڈی میں ایک کالم لکھتا ہوں۔ ایک تراشا بھیج رہا ہوں۔ محبت اپنی جگہ مگر یہ واقعہ جو میں نے لکھا ہے وہ درست ہے' مبارک ہو۔ اب واعظان کرام منبر پر آپ کے اشعار پڑھنے لگ گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں جادو کا سر پر چڑھ کر بولنا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے

آپ کا ضمیر

جو تراشا انہوں نے ساتھ بھیجا ہے اس کا عنوان ہے '' مجلس وعظ میں قتیل شفائی کی غزل کی اثر آفرینی'' اس میں لکھا ہے کہ منبر پر وعظ کے دوران ایک واعظ نے بار بار یہ شعر پڑھا:

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی

وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

اس کی تشریح انہوں نے بہت دیر تک کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے جو اور شعر پڑھے وہ مولانا روم' علامہ اقبال' حضرت میاں محمد بخش اور قتیل شفائی کے تھے۔

مجھے ابتدا ہی سے موسیقی کا بہت شوق تھا مگر مجھ سے ایک وقت میں دو کام نہیں ہوتے۔ میں شروع میں افسانے بھی لکھتا تھا۔ لیکن جب میں نے سوچا کہ مجھے دو کشتیوں میں سوار نہیں ہونا چاہیے تو میں نے افسانہ نویسی کو خیر باد کہہ دیا۔ حالانکہ میں دوسرے درجے کا افسانہ لکھتا تھا اور دوسرے درجے کا افسانہ بھی کم لوگ لکھتے ہیں۔ تب تک ''ساقی'' اور ''سنگ میل'' میں میرے افسانے شائع ہو چکے تھے۔

اسی طرح مجھے شروع میں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور کچھ دیر میں یہ شوق کرتا بھی رہا۔ پنڈی کا ماحول موسیقی کیلئے بھرپور تھا۔ محلے محلے میں ہارمونیم ہوتے تھے اور شریف یعنی غیر پیشہ ور لوگ بھی یہ شوق رکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں رفیق غزنوی جیسے لوگ پنڈی کے تھے اور رفیق غزنوی کا اپنے زمانے میں مہدی حسن سے بڑا نام تھا۔ اس لئے ان لوگوں کی وجہ سے اور کچھ ہندو گھرانوں کی وجہ سے موسیقی کا بڑا زور تھا۔ اس زمانے میں میں بھی راگ راگنیاں گاتا تھا جن کی سوجھ بوجھ اب بھی مجھے ہے اور پندرہ بیس ایسی راگ راگنیاں ہیں کہ میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ کونسی راگنی ہے۔

میری آواز بھی اچھی تھی اور گا بھی لیتا تھا لیکن جب شاعری کا غلبہ ہوا تو وہ شوق بھی چھوڑ دیا۔ صرف ایک ترنم باقی رہ گیا اور میرا ترنم بھی ٹیونز نہیں ہوتی تھیں بلکہ خالص شاعرانہ ترنم ہوتا تھا۔

آواز اتنی اچھی تھی کہ میں نے زمانے میں ''ہز ماسٹر وائس'' کو خط لکھا تھا کہ مجھے گانے کا شوق ہے اور میرا ریکارڈ بنایا جائے۔ مجھے جواب ملا'' آپ اپنے خرچ پر لاہور آجائیں۔ اگر اس قابل ہوں گے تو ضرور موقع دیا جائے گ'' مگر اسی دوران میں یہ شوق ترک کر کے شاعری کی طرف زیادہ توجہ

دینے لگا تھا۔

ہری پور کے کریم داد خان مرحوم پشاور ریڈیو سے گاتے تھے اور ان کی ایک گراموفون کمپنی بھی تھی۔ مجھے ریڈیو پر متعارف کروانے والے وہی تھے۔ وہ چڑیا خان کے نام سے مشہور تھے اور ان کا میرے پاس آنا جانا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگے " مجھے کوئی گیت لکھ کر دو، میں تمہارا گیت گانا چاہتا ہوں" انہوں نے میرا گیت گایا۔ اس طرح صوبہ سرحد کا میں پہلا آدمی تھا جس کا گیت سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو پشاور سے نشر ہوا۔ غزلیں وغیرہ تو اس سے پہلے بھی گائی جاتی رہی تھیں لیکن گیت سب سے پہلے میرا ہی گایا گیا۔

پھر کریم داد خان مجھے کہنے لگے کہ ریکارڈنگ کیلئے بھی مجھے گیت چاہئیں اس لئے اور بھی گیت دے دو۔ وہ لاہور میں آئے اور یہاں بھی میرے کچھ گیتوں کی ریکارڈنگ کروائی اور میرے گیت بہت پسند کیے گئے۔ یہاں سے انہیں لکھنؤ کا ایک آرڈر ملا تو وہاں چلے گئے اور وہاں بھی ریکارڈنگ کروائی۔ اتنی دیر میں میں گانے کا شوق چھوڑ کر پوری طرح شاعری کی طرف آ گیا تھا۔ البتہ شاعری میں ترنم باقی رہا جس میں بھی ٹیونز میری اپنی ہوتی تھیں اور ان میں سے کئی اب بھی چل رہی ہیں۔

ابتدائی زندگی کا ایک عجیب واقعہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ خواجہ محمد اشرف مرحوم سکول کے ہیڈ ماسٹر ہماری جائیداد میں کرایہ دار تھے۔ چونکہ ہمارے دونوں مکانات ملحقہ تھے اس لئے ان سے گھریلو تعلقات بھی تھے۔ میں چھوٹی عمر کا تھا اور چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک دوست تھا جو

مجھ سے کوئی تین چار سال بڑا تھا اور غالباً نویں یا دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ جب میں کوئی شعر کہتا تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عنایت مجھے شعر لکھ کر دے رہا ہے۔ جب لوگ عنایت سے پوچھتے تو وہ ہنس ہنس کر کہتا کہ نہیں میں تو نہیں لکھ کر دیتا۔ اس کا جواب کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ اس میں انکار بھی ہوتا تھا اور اقرار بھی۔ میں اس سے بہت تنگ آیا۔

ایک دن خواجہ صاحب مجھے کہنے لگے " میں تمہیں مصرع طرح دوں گا' تم مجھے اس پر شعر لکھ کر بتانا" ۔ میں نے کہا" ٹھیک ہے" ۔ انہوں نے مصرع طرح دیا تو میں نے رات کو اشعار کہے اور صبح سکول جانے سے پہلے ہی انہیں تھما دیئے یہ کوئی آٹھ دس اشعار تھے۔ وہ پڑھ کر کہنے لگے " تم تو لکھ لیتے ہو"

میں نے کہا" میں لکھ تو لیتا ہوں لیکن لوگوں کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر طرف یہ مشہور ہے کہ عنایت لکھ کر دیتا ہے"

عنایت میرا دوست بنا ہوا تھا اور اس کا والد میرے والد کا دوست بنا ہوا تھا۔ ہم کھلے ہاتھ کے لوگ تھے اور میرے والد میرے دوستوں کی خوب پذیرائی کرتے تھے۔ عنایت کا کھانا پینا اکثر ہمارے ہاں ہی ہوتا تھا اس کے باوجود الزام بھی مجھے پر ہی آ رہا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کی ہجو لکھی جائے۔ اس ہجو میں میں نے اسے خوب برا بھلا کہا اور لوگوں کو یہ ہجو سنائی۔ تب کہیں جا کر لوگوں کو یقین ہوا کہ میں خود اپنی نظمیں لکھتا ہوں کیونکہ کوئی اپنی ہجو لکھ کر تو نہیں دے سکتا۔ اس ہجو کا بنیادی خیال یہی تھا کہ شعر تو میں کہتا ہوں لیکن اپنے کھاتے میں تم ڈال لیتے ہو۔

اس کے علاوہ آج کا ہری پور تو نہیں' اس زمانے کا ہری پور ایک جنت تھی' یوں سمجھ لیجئے کہ اس

شہر میں ایک Fantasy تھی۔ ہر گلی میں چھوٹی چھوٹی نالیاں تھیں جن میں صاف پانی بہتا تھا۔ سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے نالے تھے جنہیں کٹھا کہتے تھے۔ اِدھر بھی سڑک ہوتی تھی اور اُدھر بھی اور درمیان میں ایک شفاف کٹھا بہتا تھا اور اوپر دریا سے پانی نکل کر شہر میں آتا تھا۔ ان کٹھوں پر عام طور پر ہندوؤں نے غسل خانے بنا رکھے تھے اور کچھ مسلمانوں نے ایک دوس مسجدیں بھی بنا رکھی تھیں۔ شہر سے باہر نکل کر اوپر ذرا مغرب کی طرف چلے جائیں تو پانی اور صاف ہوتا چلا جاتا تھا۔ لوگ صبح سیر کے لئے وہاں جاتے تے اور نہایت تھے۔

نرگس کا پھول اس شہر میں گھاس کی طرح اُگتا تھا۔ جتنے قبرستان تھے وہاں تو نرگس کے پھول ہوتے تھے لیکن جہاں بھی سبزہ ہو وہاں یہ پھول ضرور ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے شہر میں سرِ شام ایک مہک ہوتی تھی۔ جگنوؤں کی افراط تھی اور نو بجے کے بعد جدھر نظر اٹھا کر دیکھیں چھوٹے چھوٹے سے قمقمے جلتے نظر آتے تھے۔ درخت پھلدار تھے۔ ہری پور کی خوبانی تو شاید ایک مثالی خوبانی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کا پھل مو سوائے آم اور کیلے کے وہاں ہوتا تھا۔

ایک حساس آدمی کیلئے تو وہ اتنی متحرک فضا تھی کہ خواہ مخواہ کچھ کہنے کو جی چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سارے لوگ شاعر یا مصور نہیں ہوتے لیکن جن کے اندر یہ جوہر موجود تھا ان پر اس فضا نے بہت اثر کیا۔ چنانچہ اس ماحول میں ایک چیز اندر سے ابلتی تھی اور تحریک پیدا ہوتی تھی۔ اور پھر خواجہ صاحب کی مہربانیوں اور کچھ لوگوں کی ضد میں آکر جو میری شاعری کا انعام خود لینا چاہتے تھے' میں نے شاعری کی۔

میں نے جب سکول چھوڑ کر دوکانداری کا سلسلہ شروع کیا اور ساتھ ہی بزم ادب شروع کی جس کا

سیکرٹری میں خود تھا تو میں نے 1939ء میں علامہ اقبال کی پہلی برسی پر ہری پور کا پہلا مشاعرہ منعقد کیا۔اس میں جن مشہور لوگوں نے شرکت کی ان میں قمر جلال آبادی' اختر رضوانی مرحوم اور سٹیج کے بادشاہ نفیس خلیلی شامل تھے۔اس زمانے میں ہری پور کے لوگوں کو پتاہی نہیں ہوتا تھا کہ مشاعرہ کیا ہے۔ہم مشاعرہ کہتے تو لوگ نوشہرہ سمجھتے کیونکہ انہوں نے نوشہرہ ہی سنا ہوا تھا۔

اس ضمن میں لطیفہ یہ ہوا کہ ہم بازار میں گھومے اور ہر دوکان پر جا کر کہتے کہ ہم ڈاکٹر اقبال کی برسی منا رہے ہیں' چندہ دیجئے۔اس زمانے میں علامہ اقبال کو ڈاکٹر اقبال ہی کہتے تھے۔ہم نے چندہ ایک روپیہ فی دوکان رکھا ہوا تھا۔ ایک دوکان پر گئے تو دوکاندار نے حیرت سے پوچھا کہ ڈاکٹر اقبال مر گئے ۔ہم نے کہا جی ہاں ایک سال گزر چکا ہے۔اس نے چندہ دیا اور کہنے لگا کہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ میں نے کہا آپ نے انہیں پڑھا ہے۔کہنے لگا جی پڑھنا کیا ہے۔ ہماری بھینس بیمار پڑ گئی تھی اور انہوں نے علاج کیا تھا۔دراصل وہاں ایک وٹرنری ڈاکٹر تھے جنہیں لوگ ڈاکٹر اقبال ہی کہتے تھے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کی فضا ایسی تھی کہ لوگوں کو شعر سے یا شاعر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔یہ 1939 کی بات ہے لیکن آج جب میں وہاں جاتا ہوں تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہری پور میں کئی شاعر ہیں اور اچھا کہنے والے ہیں اور یہ شکایت اب کسی کو نہیں کہ مشاعرے کا مطلب کوئی نہیں سمجھے گا۔

میونسپلٹی ہری پور کے کیس سے بری ہونے اور راولپنڈی جانے کے درمیان میں نے ایبٹ آباد میں ایک ملازمت کی۔وہاں سے ایک پرچہ ""انکشاف"" نکلتا تھا جس کے مالک خان فقیر خان جدون

تھے۔وہ بڑے پر اسرار شخص تھے۔بہت وجیہہ ' خوش لباس ' شاہ خرچ اور اپنے پرچے کے ذریعے لوگوں کو اپنے شیشے میں اتارنے والے۔بڑے افسروں سے ان کے قریبی تعلقات تھے جبکہ ان سے ذرا نیچے والے افسروں کو اپنے پرچے کے ذریعے بلیک میل کرتے تھے۔وہ ایک عجیب انداز سے معمہ شائع کرتے۔ اس میں ان لوگوں کے نام لاتے ' الزامات کا ذکر کرتے اور لوگوں کو یہ معمہ حل کرنے کی دعوت دیتے۔مزے کی بات یہ ہے کہ پرچے پر یہ قیمت لکھی ہوتی تھی عوام سے کچھ نہیں ' خواص سے حسب خواہش مدیر۔

ان کے بارے میں مشہور تھا اور حقیقت سے قریب تھا کہ ان کی کوئی جائیداد یا زمین نہیں تھی ' ایک مکان ایبٹ آباد سے آگے نواں شہر میں تھا۔ سرحد کی ایک بڑی شخصیت رائے بہادر لالہ عشرت داس بھی وہاں کے تھے تاہم ان کا نواں شہر کے قریب ایک اور گاؤں تھا جس کا نام دھمتوڑ ہے۔ان کی مردان میں شوگر مل تھی جو تقسیم کے بعد کسی اور کو الاٹ ہوئی۔

خان فقیر خان جدون سال میں ایک دو کام دکھایا کرتے تھے۔ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ جب حیدر آباد دکن میں آریہ سماج تحریک چلی تو اسے ہندو مسلم اختلاف کا رنگ مل گیا۔انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔وہ یوں کہ ان کے کچھ اخبار نویس دوست تھے جن میں سول اینڈ ملٹری گزٹ والے م ش بھی شامل تھے جو انہیں خبروں میں نمایاں کرنے کی حد تک ان کے معاون ہوتے تھے۔انہوں نے ایجنسیوں کے ذریعے یہ خبر چھپوائی کہ خان فقیرا خان چیف آف دھمتوڑ آریہ سماجیوں کی مذموم حرکات کے سد باب کیلئے اپنے لاتعداد رفقاء سمیت حیدر آباد پہنچ

رہے ہیں۔ پھر یہ خبر چھپوائی کہ وہ لاہور پہنچ گئے ہیں جہاں انہوں نے ایک میٹنگ کی ہے کہ آریہ سماجیوں کے ساتھ کیسے بنٹا جائے اور اب وہ دہلی روانہ ہوں گے۔ انہوں نے پہلے ہی یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ ان کا کوئی آدمی حیدر آباد میں یہ کٹنگ نظام یا اس کے وزراء تک پہنچا دیتا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک ہوا بنا کر پیش کیا اور وہاں ان کا انتظار ہونے لگا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو دس پندرہ مسلح اور خوش پوش آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ان کا وہاں استقبال ہوا اور سرکاری مہمان بنائے گئے۔ اب یہ خدا ہی جانتا ہے کہ جب یہ وہاں سے واپس آئے تو کیا کچھ ساتھ لے کر آئے۔ البتہ ایک سونے کا ٹی سیٹ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو نظام کی طرف سے انہیں Present کیا گیا تھا۔

یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ان کا ایک دوسرا اور اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ ان کے گاؤں کا ایک بنیا جنگ کے دوران خوب کما کر واپس آیا ' کیونکہ وہ ٹھیکیدار تھا ' تو خان صاحب نے اسے ایک استقبالیہ دیا، جس میں سوڈیڑھ سو آدمی بلا کر اس کی بڑی ہوا باندھی ' وہ بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا۔ پھر حضرت نے اپنی سکیم کے مطابق ایک دن اس سے کہا کہ مجھے بمبئی سے یہ ٹیلیگرام آیا ہے ' میرے پاس کچھ جواہرات ہیں جو میں بیچنا چاہتا تھا جس سلسلے میں یہ شخص یہاں آرہا ہے لیکن مجھے وائسرائے نے بلا لیا ہے اور میں دہلی جا رہا ہوں۔ آپ یہ جواہرات اپنے پاس رکھ لیں اور اسے دکھا دیں اور جو قیمت بتائے ٹیلیگرام کے ذریعے مجھے بتا دیں۔ خان صاحب نے اسے کسی ہوٹل کا ایڈریس دیا جہاں جا کر انہوں نے ٹھہرنا تھا اور خود چلے گئے۔ بعد میں وہ آدمی آیا اور بات چیت کے بعد اس نے کہا کہ میں پچاس ہزار روپے دوں گا۔ سوان صاحب نے ٹیلیگرام کے ذریعے خان صاحب کو اطلاع کر دی۔ خان صاحب نے جوابی ٹیلیگرام دیا کہ یہ کم ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور بالآخر اس آدمی

نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی پیشکش کی مگر خان صاحب نے جواب بھیجا کہ یہ کم ہیں اور اس سے زیادہ قیمت کا گاہک میرے پاس موجود ہے اس لئے رہنے دیجئے۔ خان صاحب دہلی سے واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ وہ بیوپاری چلا گیا۔ اس نے کہا جی ہاں' کہنے لگا اچھا کیا آپ نے نہیں دیا میں تو یہ اڑھائی لاکھ روپے سے کم پر نہیں بیچوں گا اور پھر کہا لایئے وہ مجھے واپس دے دیجئے۔ انہوں نے ڈبہ کھولا تو کہنے لگے مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ آپ میرے اچھے دوست ہیں۔ میں تو آپ کو جواہرات دے کر گیا تھا آپ نے یہ imitation رکھ دی ہے۔ اس بیچارے کے تو ہوش اڑ گئے کیونکہ ان کے پاس سبھی ثبوت موجود تھے' قیمت کا تعین بھی ہو چکا تھا اور پھر ان کے سب افسران بالا سے تعلقات بھی تھے۔ انہوں نے اسے دھمکایا بھی اور اس سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لیا اور وہ بیچارہ آخر کار اسی صدمے سے مر گیا۔

ان کے بارے میں اس طرح کی اور بھی بہت داستانیں مشہور تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ بڑے خداترس اور خرچیلے مشہور تھے۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے' جہاں نمائش کا معاملہ ہوتا تھا وہ بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے اور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا وہ انتہائی خسیس تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا سگریٹ کیس رکھا ہوتا تھا جس کے ایک پلڑے میں گھٹیا سگریٹ ہوتے تھے اور دوسرے میں اعلیٰ درجے کی۔ خود اعلیٰ درجے کے سگریٹ پیتے تھے اور اگر کوئی بڑا آدمی ملتا تو اسے بھی اس سائیڈ سے سگریٹ پلاتے تھے اور کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کے سامنے دوسری سائیڈ کر دیتے تھے۔

میں نے دیکھا ہے کہ اپنے متعلقین کو جتنا Exploit کرنے والے یہ صاحب تھے اور کوئی نہیں

تھا۔ جیسا کہ م ش بھی ان سے Expliot ہوتے رہے۔ میں ان صاحب کے پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ لیکن پرچے پر میرا نام نہیں آتا تھا حالانکہ سارا کام میں ہی کام کرتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں پورا پرچہ مرتب کرتا تھا بلکہ اسے چھپوانے کیلئے پنڈی بھی لے جاتا تھا کیونکہ ایبٹ آباد میں پریس نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ ہر دفعہ مجھ سے کبھی کسی کی شان میں اور کبھی کسی کی شان میں کوئی نظم لکھواتے تھے اور نام ان کا ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب کوئی دعوت یا استقبالیہ ہوتا تو چونکہ میری آواز اچھی تھی اس لئے اعلان ہوتا کہ اب خان فقیر خان جدون کی لکھی ہوئی نظم قتیل شفائی ترنم سے سنائیں گے۔اور یہ سب کام مجھ سے اسی تھوڑی سی تنخواہ میں لیتے تھے جو پرچہ مرتب کرنے کے سلسلے میں مجھ سے طے ہوئی تھی۔

پرچے کے دفتر میں میری اور کاتب کی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں کیونکہ کاتب بھی باہر کا رہنے والا تھا۔ خان صاحب نے الماری میں کچھ انڈے رکھے ہوئے تھے جو وہاں پڑے پڑے اندر سے سوکھ گئے تھے۔ کاتب بیچارے نے وہ سات آٹھ انڈے خراب ہو جانے کی وجہ سے باہر پھینک دیے۔ وہ آئے اور کہنے لگے " میں نے یہاں انڈے رکھے ہوئے تھے"

اس نے کہا" میں نے وہ باہر پھینک دیئے ہیں کیونکہ وہ خراب ہو چکے تھے۔"

کہنے لگے "کس طرح پھینک دیئے۔ خود کھا گئے ہو بے ایمان آدمی، میں تو تم سے ان کے پیسے وصول کروں گا" اور اس کی تنخواہ میں سے ان کے پیسے کاٹ لئے۔ ظاہر ان کا کچھ تھا لیکن اندر سے

ان کی یہ حالت تھی، میں نے جب یہ دیکھا تو کانوں کو ہاتھ لگایا اور وہاں سے ملازمت چھوڑ کر چلا آگیا۔

جلال بابا

ایک شخصیت تو اس رخ کی میں نے آپ کو بتائی لیکن دوسرے رخ کے جو لوگ تھے ان میں سے ایک مشہور و معروف جلال بابا بھی تھے جو ایک سیلف میڈ آدمی تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ انگریز کے زمانے میں موٹر ڈرائیور تھے اور فٹ بال کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ وہ کسی ایسی ٹیم میں شامل تھے جو کاکول میں انگریزوں کے ساتھ مل کر یا ان کے بالمقابل کھیلا کرتی تھی۔ چنانچہ ان انگریزوں کی مدد سے انہیں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ ابتدا میں انہیں ایک چھوٹا سا ٹھیکہ ملا لیکن جلد ہی وہ صاحب حیثیت ہو گئے اور انہوں نے ایبٹ آباد میں پولیس سٹیشن کے سامنے ایک چھوٹا سا دفتر بھی قائم کر لیا۔

وہ بڑے بارعب آدمی تھے اور کھانے کے وقت ان کے دستر خوان پر دس پندرہ آدمی موجود تھے۔ انہیں انگریز کی طرف سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ جب سرحد میں ریفرنڈم کا دور آیا تو قائد اعظم نے سب مسلم لیگیوں سے کہا کہ انگریز کی طرف سے ملنے والے سب خطاب واپس کر دو۔ یہ اس وقت مسلم لیگ کی کسی ورکنگ کمیٹی میں بھی شامل ہو چکے تھے اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں یہ سب سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے خان بہادر کا اعزاز واپس کیا اور کہا کہ خان بہادر جلال الدین کی

بجائے میں اب جلال بابا ہی رہوں گا۔مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی جارج کٹ داڑھی تھی اور یہ جوانی ہی میں جلال بابا کہلواتے تھے۔

ریفرنڈم کے دوران ہم لوگوں نے جو کام کیا وہ انہی کی نگرانی میں کیا اور مسلم لیگ کی ہائی کمان اگر انہیں ایک ہزار روپے دیتی تھی تو یہ اپنے پلے سے چار ہزار روپے خرچ کرتے تھے۔لہٰذا ہزارہ میں مسلم لیگ کے فروغ کیلئے جتنا کام انہوں نے کیا اور کسی نے نہیں کیا۔جلال بابا ایوب خان کے زمانے میں مرکزی وزیر بنے لیکن یہ ان چند لوگوں میں سے ثابت ہوئے جنہوں نے وزارت سے ایک پائی کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ پاس سے خرچ کیا۔

اصل مسلم لیگ تو قیام پاکستان کے ساتھ ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔الاٹمنٹوں کا چکر چلا تھا جس سے مسلم لیگ ان پاپولر ہو گئی تھی۔چنانچہ جو اصل مسلم لیگی تھے وزارت سے بھی ہٹ گئے تھے۔ پھر جب ان کے زوال کا زمانہ آیا تو اس وقت ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے اپنے مکان اور دفتر کے۔میں جب کبھی ایبٹ آباد جاتا تو انہیں اپنا رہنما سمجھ کر اور مخلص لیگ کا قائد سمجھ کر سلام کرنے جاتا تھا۔یہ ان کا غربت کا زمانہ تھا۔ایک بار مجھے کہنے لگے " قتیل ! خدا خوش رکھے سردار بہادر خان کو جو مجھے ہر ماہ پانچ سو روپے بھیج دیتے ہیں۔اس کے علاوہ کسی اور کا نام بھی بتایا کہ پانچ سو روپے ماہانہ وہ بھیجتے ہیں۔اس طرح ایک ہزار روپیہ ہو جاتا ہے جس سے گزر بسر کرتا ہوں "ایک بیٹا کسی دواساز کمپنی میں کام کر رہا ہے اور دوسرے نے کوئی چھوٹی سی دوکان بنا رکھی ہے۔اس کے باوجود شان وہی تھی کہ جب گھر سے کھانا آتا جو صرف ایک ہی ڈش ہوتی تھی اس میں چار پانچ آدمیوں کو شامل کر لیتے تھے۔کچھ پیسے سامنے رکھے ہوتے تھے اور جب کوئی فقیر آتا تو اسے خیرات دیتے۔

جسٹس سجاد احمد جان سے میری ملاقات انہی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ ایبٹ آباد میں مقیم تھے۔ ان سے میرا تعلق دو طرح سے تھا۔ ایک تو یہ نواب صاحب کے لیگل ایڈوائزر تھے اور دوسرے یہ ایبٹ آباد کی بزم ادب کے صدر تھے۔ یہ ان دنوں عام وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ لیکن باقی وکیلوں کو دیکھا وہ تو صرف مؤکلوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے مگر یہ زیادہ تر وقت ان نوجوانوں کو دیتے تھے جو ادبی ذوق رکھتے تھے اور قیام پاکستان کیلئے سیاسی کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ایوب خان کے زمانے میں یہ جسٹس بنے اور لاہور آ گئے۔ یہاں بھی ان سے ملنا رہا اور ان کے بیٹے جو آجکل وزیر ہیں ہمارے دیکھتے ہوئے جوان ہوئے اور ان میں وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں ہیں جن کا اظہار باپ بھی نہیں کر سکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ :

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

صدر ضیاء کی ان پر نظر پڑی اور بے شک صدر ضیاء کی وجہ سے ہی سہی لیکن اس دائرے میں صدر ضیاء کے جو مقاصد تھے ' انہوں نے ان کی نمائندگی بہت خوبصورتی سے کی۔

جنس کا تجربہ

میرا جنس کا تجربہ خلاف فطرت نہیں رہا اور مجھے اس کا احساس شادی کے بعد ہی ہوا۔ لیکن میری بدقسمتی کہ شادی کے ایک دو سال بعد ہی کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ میری بیوی کو بجا طور پر مجھ پر اعتراضات کرنے کا موقع ملتا ہم ان میں میرا کوئی ایماء شامل نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ

ہری پور میں ہماری گلی سے پچھلی گلی میں ایک سینٹری انسپکٹر رہا کرتے تھے جن کا رنگ کالا اور عمر بھی پنتالیس سے اوپر تھی۔ ان کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور انہوں نے جس لڑکی سے دوسری شادی کی' وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ سرخ و سفید رنگ اور خوش پوش آدمی تھا' پھر خاندانی طور پر بھی کچھ نام تھا اور امارات کا بھی کچھ رعب تھا۔ میں کبھی کبھار اس گلی سے گزرتا تھا۔ پہلے تو اس نے کسی بہانے مجھے بلایا اور بات چیت کی' بعد میں یہ ہوا کہ میں جب ادھر سے گزرتا تو وہ بازو باہر نکال کر پکڑ لیتی تھی اور فریاد کے انداز میں کہتی کہ ایک جوتشی نے مجھے بتایا ہے کہ تم جسے چاہتی ہو وہ تمہیں نہیں چاہتا۔ مجھے احساس تفاخر ہوتا تھا لیکن محلے داری کی وجہ سے جوابی کارروائی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں شروع سے کچھ قاعدے اور اصولوں پر پابند رہا ہوں کہ جس محلے میں رہتے ہو' بڑی شرافت سے رہو' لوگوں کی عزت کرو اور کسی پر نظر نہ رکھو۔ دوسرا کسی دوست کے گھر جاؤ تو اس کی بہنوں کو اپنی بہنیں سمجھو۔

ہمارا مکان محلے میں سب سے اونچا مکان تھا' اوپر کھڑا ہو کر سب کچھ نظر آتا تھا' پھر میری بیوی کو کسی نے بتا بھی دیا تھا کہ یہ اس سے ملتا ہے تو اس سے چھت پر کھڑے ہو کر خود دیکھ بھی لیا تھا' اس لئے اس نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ اس نے کسی کام کیلئے بلایا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے کوئی انگوٹھی Present کی' میں وہ پہن کر گھر گیا تو بیوی نے پوچھا یہ کس نے دی ہے۔

میں نے کہا میرا کلاس فیلو جو سنار ہے اس نے دی ہے۔ کہنے لگی یہ تو اس نے دی ہے میں دیکھ رہی تھی۔اس طرح شکوک کی فضا بڑھ گئی۔

میں شاعر تھا لیکن میری بیوی کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ شروع سے ہی انتہائی وفادار، گھر کی نگہبان، پوری فیملی سے دلی محبت کرنے والی اور دل میں پیار کا سمندر رکھنے والی خاتون ۔اس میں خامی یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے کبھی ان جذبات کا اظہار نہیں کر سکی۔اگر اسے کبھی کوئی شکایت بھی ہوئی تو اس کے اظہار کا طریقہ بہت غیر شاعرانہ تھا۔مزاجوں کے اختلاف کی جو خلیج تھی، اس کی وجہ سے جب باہر سے کوئی میری طرف تھوڑا سا جال پھینکتا تو میں اس میں آجاتا تھا۔

مجھے اندر سے احساس ہوتا کہ جو کر رہا ہوں وہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس وقت میرے تین بچے تھے۔میں نے اس معاملے میں کبھی تماش بینوں والا رویہ اختیار نہیں کیا۔انہوں نے مجھے اپنے حالات اور بے سہارگی کے بارے میں بتایا تھا اور میں نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ میری بیوی اور تین بچے ہیں اور میں ان پر یہ حالات اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہتا۔انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے تو ایک Shelter چاہیے، اس کے بعد بات شیلٹر سے آگے بڑھ گئی، پھر مطالبے شروع ہوئے کہ بیوی سے الگ ہو جاؤ اور اسے طلاق دے دو۔دراصل وہ اپنے علاوہ اور کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیتی تھیں اور خود مسلمان بھی ہو گئی تھیں۔لیکن تقسیم کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ان سے علیحدگی ہو گئی۔

چونکہ یہ زندگی کا اور رومانس کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شکست وریخت بھی ہوئی اس لئے اس کا

میری زندگی پر بہت اثر پڑا۔ میں ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب ہوا کہ بہت دیر تک سنبھل نہیں پایا لیکن مجھے بہت سے موضوعات مل گئے۔ اس زمانے کی شاعری ایک نئے رخ پر آگئی اور یہ شعور پیدا ہوا کہ یہ محبتیں کیسے پیدا ہوتی ہیں۔

انہوں نے تقسیم سے پہلے جب مجھے دیکھا تو اس وقت انہیں میرا مستقبل بڑا شاندار نظر آرہا تھا۔ اس زمانے میں میری اس پروڈکشن کیلئے جو دو گیت ریکارڈ ہوئے تھے ان کا بہت شہرہ ہوا تھا کہ ایک شخص نیا انداز لایا ہے۔ اگر تقسیم نہ ہوتی یا تبادلہ آبادی نہ ہوتا اور وہی پروڈکشنز موجود رہتیں تو میں بہت آگے بڑھتا لیکن تقسیم کے بعد روزگار کا معاملہ آگیا اور انہوں نے کوٹھی' گاڑی اور عیش و عشرت کے بارے میں جو سوچا تھا وہ پورا نہ ہوا' سو وہ بددل ہو گئیں۔ پھر ان کی طرف سے جو مطالبات تھے وہ میں پورے نہ کر سکا' اس طرح جو علیحدگی ہوئی اس نے میری شاعری کو ایک پس منظر دیا اور میں روایتی شاعری سے ہٹ کر جذباتی شاعری کرنے لگا۔
اس کے کافی عرصہ بعد اقبال بانو سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ساڑھے تین یا چار سال چلا اور اس نے مجھے ایک موضوعی نظموں پر مشتمل ایک پوری تصنیف "مطربہ" دی۔ اگر کوئی شخص مجھے تھوڑا سا بھی جانتا ہو تو اس تصنیف سے میری ساری پہچان ہو جاتی ہے ہر چند کہ یہ چیزیں بیانیہ نہیں ہوتیں بلکہ ادب پارے ہوتے ہیں جن میں ذاتی سچ بھی ہوتا ہے۔
یہ تمام چیزیں میری بیوی نے اپنے اوپر جھیلیں اور اس پر میں کوئی فخر بھی نہیں کرتا۔ اور سمجھتا ہوں کہ یہ سب میرے دامن پر داغ ہیں جو آگئے۔ میری بیوی کو اذیتیں تو ہوئیں لیکن اس نے لڑائی

جھگڑے کے باوجود ایسا نباہ کیا کہ جب میں عمر کے اس حصے میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کی عظمتیں سامنے آتی ہیں اور اپنی لغزشوں سے شرمسار ہوتا ہوں۔

ایک بات میں نے ذمہ داری سے نبھائی کہ جس حال میں بھی رہا سب سے پہلے اپنے گھر پر توجہ دی اور گھر کی سب ضرورتیں پوری کر کے ہی کوئی اور کام کیا۔ اس کے علاوہ زندگی میں کئی ایسے مواقع بھی آئے کہ میرے گھر سے دور ہونے کے امکانات تھے۔ مگر میں ثابت قدم رہا۔ بعد میں ان کرداروں سے جب اگلے لوگوں کی وابستگیاں ہوئیں اور میں نے ان کا حشر دیکھا تو مجھے ہنسی آئی کہ میری بلا ان کے گلے پڑ گئی ہے اور میں اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بالکل ٹھیک بیٹھا ہوں اور اس عمر میں جبکہ سکون کی ضرورت ہے ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

دل توڑنے والے دیکھ کر چل

پاکستانی فلم انڈسٹری میں 1956ء انور کمار پاشا کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی فلموں میں لکھنے والوں کا ایک اجتماع ہوا کرتا تھا اور شاعری پر خصوصیت سے توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی کوئی فلم ایسی نہیں تھی جس میں کوئی سپر ہٹ گانا نہ آئے۔ اس زمانے میں جو واقعی شاعر تھے اور جنہیں شاعر کہنا چاہیے نغمہ نگار نہیں، وہ تنویر نقوی، سیف الدین سیف اور میں تھے۔ ہم تینوں پاشا صاحب کے قریبی لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے ور کبھی ان کیلئے پوری فلم اور کبھی مل کر لکھتے تھے۔ اس طرح ایک مسابقت کا سلسلہ تھا۔ اگر میرا گیت ہٹ ہو جاتا تو تنویر صاحب کوشش کرتے تھے کہ اس سے آگے بڑھیں اور اگر سیف صاحب کا کوئی گانا ہٹ ہو جاتا تو میں اس پر رشک کرتا اور کوشش کرتا کہ میں

ان سے آگے نکلوں، فلم ''گمنام'' کا ایک گیت تھا:

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

یہ گیت سیف صاحب نے لکھا اور اقبال بانو اس کی گائیکہ تھیں، اس گیت کی شہرت بہت دور دور تک پہنچی۔ مجھے یہ Haunt کرتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ کاش ایسا ہی ایک گیت میں بھی لکھوں اور سیف صاحب کے ہمدوش قرار دیا جاؤں اس کے بعد فلم قاتل بنی تو اس کے گانے میں لکھ رہا تھا۔ اس کے لئے ایک مشہور سی سچوایشن آئی جس کیلئے میں نے عام روش سے خاصا ہٹ کر یہ گیت لکھا :

الفت کی نئی منزل کو چلا

تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں

دل توڑنے والے دیکھ کر چل

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اس گیت کی ہسٹری یہ ہے کہ جب یہ لکھا گیا اور چونکہ عام روش سے ہٹ کر تھا، اس لئے پاشا صاحب اسے سن کر قدرے خاموش رہے۔ وہاں موجود پاشا صاحب کے مصاحبین ان کے تیور دیکھ کر ہی داد دیا کرتے تھے اور اگر پاشا صاحب کوئی گیت سن کر خاموش رہتے تو وہ سمجھتے کہ انہیں یہ پسند نہیں آیا اور وہ بھی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے تھے۔

پاشا صاحب نے یہ گیت اپنے والد نامی گرامی حکیم احمد شجاع کو سنایا تو انہوں نے گیت پر اس طرح تنقید کی کہ میں دل برداشتہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ آپ یہ گیت مجھے واپس کر دیں اور کسی اور

سے لکھوالیں۔ چنانچہ اس سجوئیشن پر پاشا صاحب نے مختلف شاعروں سے طبع آزمائی کروائی اور بالآخر سیف الدین سیف کا ایک مکھڑا لے لیا گیا لیکن سیف صاحب نے دوسرے دن یہ کہہ کر ان سے وہ مکھڑا واپس لے لیا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ قتیل صاحب کا لکھا ہوا گیت مجھ سے بہتر ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

نہ جاؤ اب چھوڑ کے بسمل ٹھہر جا
میں زندہ ہوں مرے قاتل ٹھہر جا

سیف صاحب اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے علاوہ منصف مزاج بھی تھے اور عام شاعروں کے برخلاف انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ چیک آئے گا بلکہ انہوں نے انصاف سے کام لیا۔ اور ان لوگوں کو آئینہ دکھا دیا۔ چنانچہ جب اس کے بعد سیف صاحب سمیت کوئی دس بارہ شاعر کوشش کر چکے اور کام نہ بن سکا تو وہ میرے گیت کی طرف متوجہ ہوئے جس کی ٹیون بھی ماسٹر عنایت حسین نے بنائی ہوئی تھی۔ یہ گیت سن کر ایک غیر محسوس چیز انہیں پکڑتی تھی اور وہ سوچتے تھے کہ اس میں کوئی بات ہے۔ چنانچہ ایک روز پاشا صاحب مجھے مل گئے اور کہنے لگے کہ میرا وہ گیت کہاں ہے میں بات سمجھ گیا لہٰذا میں نے کہا وہ گیت تو میں نے آگے بیچ دیا ہے۔ کہنے لگے وہ تو میرا گیت تھا وہ کیوں بیچ دیا۔ میں نے کہا آپ نے اور آپ کے والد نے تو اسے رد کر دیا تھا۔ میں نے یونہی انہیں ستانے کیلئے کہا کہ میں نے ایک ہزار روپیہ لے کر وہ گیت کسی کو بیچ دیا ہے' کہنے لگے آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں یہ لیجئے ایک ہزار روپیہ اور چیک کاٹ کر مجھے دے دیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔

اچھے شاعروں کی فیس ان دنوں پانچ سو روپے فی نغمہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ میرے بہت قدر دان تھے اور مجھے چھ سو روپے دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پانچ سو روپے تو گانے کے ہیں اور ایک سو روپیہ شاعر قتیل شفائی کو میرا نذرانہ ہے۔ جب یہ گیت فائنل ہو چکا تو پاشا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ نغمہ کس گلوکارہ کو گانا چاہیے۔ میرے ذہن میں تو وہی گیت تھا: پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے۔ میوزک ڈائریکٹر بھی وہی تھے۔ شاعری بھی اسی پایہ کی تھی، اس لئے میں نے کہا کہ یہ اقبال بانو کو گانا چاہیے۔ پاشا صاحب کہنے لگے کہ بس مسئلہ حل ہو گیا، میرے ذہن میں جو نام آتے تھے ان میں سے یہ بھی تھا لیکن آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے پھر کہا کہ اب ان سے رابطہ بھی آپ ہی کریں۔ وہ ملتان میں ہیں اور شاید مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکیں، اس لئے آپ کوشش کریں۔ اقبال بانو باقاعدہ پہلے بیک سنگر نہیں تھیں اور تقسیم سے پہلے ان کا ایک گیت آیا تھا۔ سٹائل اختری فیض آبادی جیسا تھا لیکن آواز منفرد اور انوکھی تھی اور وہ اپنی ایک پہچان رکھتی تھیں۔ اقبال بانو کا تعلق دراصل روہتک دہلی سے تھا اور وہیں انہوں نے گانے بجانے کا کام شروع کیا۔ تقسیم کے بعد وہاں سے منتقل ہوئیں تو ملتان میں حرم گیٹ کے پاس اپنے اڈے پر گایا کرتی تھیں۔ ان کا انداز سلجھا ہوا تھا اور اس میں چھوٹا پن نہیں تھا لیکن چونکہ یہ بیٹھ کر گانے والی تھیں جبکہ دوسری گانے والیاں ٹھمکے کے ساتھ کولہا ہلا کر گاتی تھیں اس لئے وہاں ان کا کاروبار ٹھیک طرح سے جم نہیں رہا تھا۔ اب انہوں نے جو فلم ''قاتل'' کا یہ گانا ریکارڈ کروایا تو ایک بار پھر وہ توجہ کا مرکز بنیں۔ فلم ریلیز ہوئی تو نہ صرف یہ گانا پاکستان کے کونے کونے میں مقبول ہوا بلکہ وہ جب انڈیا گیا تو ممبئی کی فلم انڈسٹری میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے پاس یہ ریکارڈ نہ ہو۔ اس زمانے میں یہ ریکارڈ سمگل ہو

کر جاتا تھا۔اس ریکارڈ کی قیمت یہاں پانچ سو روپے ہوتی تھی وہاں یہ ریکارڈ ستر ستر روپے میں بلیک میں بکتا تھا۔

یہ گانا گا کر اقبال بانو ملتان واپس چلی گئیں۔اس کے بعد ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے ان کی آواز کی ضرورت فلم عشق لیلیٰ کیلئے پڑی جس میں میری یہ غزل گائی جانے والی تھی:

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

منشی دل مرحوم اس فلم کے ڈائریکٹر تھے جبکہ میوزک ڈائریکٹر صفدر حسین تھے اور ہم سب مل کر باہمی مشورے سے ٹیم کے طور پر کام کرتے تھے۔میں نے کہا کہ یہ غزل اقبال بانو کی آواز میں مناسب رہے گی اور ان سے رابطے کا ذمہ بھی لیا۔ میں شہزاد احمد کو ہمراہ لے کر وہاں گیا اور انہیں اس گانے کیلئے راضی کیا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ وہ آئیں اور گیت گایا۔یہ فلم مقابلے میں بن رہی تھی اس لئے صرف سوا مہینے میں مکمل ہو گئی جبکہ ہم نے اٹھائیس دن میں اس کے چودہ گانے ریکارڈ کیے۔فلم ریلیز ہوتے ہی یہ گانا دھوم دھام سے باہر آیا اور اقبال بانو کا نام آگے بڑھا۔

تھوڑی سی ملاقاتوں میں اقبال بانو کے ساتھ قربتیں بڑھیں اور وہ اس لئے کہ ان کی باتوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شاعری میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اپنے کوٹھے پر گانے والے پیشے سے ناخوش ہیں۔ان کی باتوں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا تعاون چاہتی تھیں۔اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ ملتان سے لاہور منتقل ہو جائیں۔ملتان میں ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی جبکہ لاہور میں گنپت روڈ پر انہوں نے پہلے ہی سے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جب لاہور آتیں تو یہاں قیام کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کی ماں اور نانی تو ملتان ہی میں رہ گئیں وہ خود لاہور آ کر اس مکان میں قیام پذیر ہوئیں۔

یہاں ہمارا تعاون اس قدر بڑھا کہ میں جس فلم کے بھی گانے لکھتا' اس میں ایک دو گانے ان کی ٹائپ کے ضرور ہوتے۔اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان کی ٹائپ کا جو گانا بھی بنایا گیا وہ مقبولیت کی حد تک آگے بڑھا۔ اس طرح ان سے میری بات بڑھتے بڑھتے جذباتیت کی حد تک پہنچ گئی اور جب ہم جذبات سے آگے بڑھتے ہیں تو جنس کی شکل اختیار کرتے تھے۔

باوجود یکہ مجھے ہمیشہ سے گہری دلچسپی رہی ہے اور میں شعوری طور پر ایک ذمہ دار شوہر اور باپ رہا ہوں لیکن کچھ دوستوں کے طعنوں اور کچھ آئے دن کی قربتوں سے مجبور ہو کر میرے دوست اور مرحوم فلم ڈائریکٹر سبطین فضلی کو یہ کہنا پڑا کہ آپ لوگ اس طرح کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا ان سے پوچھئے اور انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے پوچھئے۔ معاملہ یہیں نہیں رکا بلکہ شرما شرمی میں شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ مقررہ دن وہ شادی کا جوڑا پہن کر پرویز صاحب کے ہاں آگئیں جہاں مولوی صاحب بھی بلوائے ہوئے تھے۔ فضلی صاحب نے دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا اور Confidential دوست بھی بلوائے تھے۔دل میں بھی کانپا اور وہ بھی۔شاید دونوں نے کوئی منصوبے بنا رکھے تھے مگر دل سے دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔

قسمت نے میری یاوری کی کہ اقبال بانو کو کوئی بات سوجھی' انہوں نے فضلی صاحب سے کہا کہ قتیل صاحب سے کہئے کہ شادی کے بعد کم از کم دو سال تک مجھے گانے کی اجازت دیں۔یہ بات میرے ہاتھ آگئی اور میں نے کہا کہ لوگ یہی کہیں گے کہ قتیل شفائی کی بیوی ناچ رہی ہے اور گا رہی

ہے کیونکہ شادی کے بعد صرف یہی فرق پڑتا ہے ورنہ میاں بیوی تو اب بھی ہم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جی میرے بچوں کا سوال ہے۔ فضلی صاحب نے کہا کہ اقبال بانو آپ ان سے مخلص نہیں ہیں اور قتیل صاحب آپ بڑے غیرت مند آدمی ہیں۔ اگر آپ ان کی شرط مان جاتے تو میں آپ کو بڑا بے غیرت آدمی سمجھتا۔ شادی رک گئی اور دو مہینے کی مہلت دی گئی کہ ہم دونوں سوچ لیں۔

ان دو مہینوں کے دوران شاید اقبال بانو ہی کو کوئی ترکیب سوجھی ہو گی کہ ہم دونوں میں کشیدگی بڑھ گئی اور علیحدگی ہو گئی۔

اس واقعہ سے فلم انڈسٹری کو یہ نقصان ہوا کہ تیس سال گزر چکے ہیں لیکن اقبال بانو کی آواز سے فلم انڈسٹری محروم ہو گئی ہے۔ میں تو اب تک چل رہا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آواز کی ضرورت تھی جس سے فلم انڈسٹری خدا جانے کیوں استفادہ نہیں کر سکی لیکن ایک بات ہوئی کہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں ان کے حصے میں جو جائیداد یہاں آئی تھی اس کی فروخت کی وجہ سے اقبال بانو فلم انڈسٹری سے دور رہنے کے باوجود اس وقت ایک امیر کبیر عورت ہیں۔

"ادب لطیف" میں ملازمت

پہلی مرتبہ 1946ء میں خالصتاً ادبی سلسلے میں میرا لاہور آنا ہوا۔ ان دنوں میں مری میں پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں کام کر رہا تھا اور "ادب لطیف" کے ادارے سے مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے کی دعوت ملی تھی۔ "ادب لطیف" میں یہ دستور تھا کہ مالکان کا نام ادارت میں آتا تھا باقی جو لوگ کام کرتے تھے ان کا نام نہیں آتا تھا۔ مجھ سے پہلے فکر تونسوی بھی اس ادارے میں کام کر رہے

تھے۔اس تقرری پر میری خوشی کی انتہا نہیں تھی کیونکہ ایک پسماندہ علاقے سے اور ایک خشک نوکری سے میں سیدھا اپنے خوابوں کی دنیا میں آگیا تھا اور خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا۔

میں نے کام کرنا شروع کر دیا اور تنخواہ کوئی طے نہ کی۔وہاں میں ڈیڑھ سو روپے لیتا تھا' سوچا کہ یہ لاہور ہے اس لئے دو سو روپے تو ملیں گے ہی۔اپنی خوشی کی وجہ سے ساری باتیں نظر انداز کر کے میں دس بیس روپے ایڈوانس لے کر اپنا کام چلاتا رہا۔ جب تین چار ماہ گزر گئے تو فکر تونسوی نے مجھے کہا کہ ان سے تنخواہ طے کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔ فکر مرحوم کھل کر کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان سے اسی زمانے میں دوستی شروع ہوئی تھی۔

مالکوں میں چودھری نذیر تھے۔میں نے ان سے کہا کہ یہ معاملہ طے کر لیں۔موری دروازے میں ''ادب لطیف'' کا دفتر تھا۔انہوں نے کہا شام کو انار کلی میں نظام ہوٹل میں بات کر لیں گے۔بات ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ آپ کی تنخواہ چوہتر روپے ماہوار ہو گی۔میں چکرا گیا۔انہوں نے کہا ادبی پرچہ ہے اس میں تو یہی ہو سکتا ہے۔میں نے کہا'' آپ کو پتا ہونا چاہیے تھا کہ میں وہاں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ لے رہا تھا۔آپ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی تو دیتے''

کہنے لگے'' یہ تو ممکن نہیں ''

میں نے کہا'' میں یہاں کام نہیں کروں گا اور آپ میرا حساب کر دیجئے۔لیکن مجھے یہ بتایئے کہ یہ تنخواہ چوہتر ہی کیوں ہے۔ستر پچھتر یا اسّی کیوں نہیں''

وہ اس بات کو گول کر گئے۔بعد میں فکر تونسوی نے قہقہہ لگا کر کہا'' میں یہاں تین سال سے کام کر رہا ہوں۔میری تنخواہ پچھتر روپے ہے' تم مجھ سے جونیئر ہو اگر تمہاری تنخواہ پچھتر روپے ہو جاتی تو

میری چھہتر کرنا پڑتی اس لئے تمہاری تنخواہ چوہتر روپے رکھی گئی“

مجھے اس واقعہ سے دھچکا لگا اور میں راولپنڈی واپس چلا گیا جہاں کچھ عرصے کے بعد گارڈن کالج پنڈی کے ایک مشاعرے میں میری ملاقات دو اشخاص سے ہوئی جنہیں میں پہلے سے جانتا تھا۔ ان میں سے ایک مرحوم محبوب اختر تھے جن کا وہاں ایشیاٹک آپٹیکل کمپنی کے نام سے ایک ادارہ تھا اور جو ”مغل اعظم“ کے ابتدائی ورشن کے رائٹر تھے اور کے آصف کی ٹیم میں کام کر چکے تھے۔ اب وہ اپنی فلم بنانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے کالج فیلو امان اللہ خان نیازی تھے جو ان دنوں نئے نئے کالج سے نکل کر آزاد زندگی گزار رہے تھے اور بعد میں جب ہارٹ فیل ہونے سے فوت ہوئے تو اس وقت وفاقی سیکرٹری ڈیفنس تھے۔ ان دونوں نے مل کر ” خیالستان پروڈکشنز“ قائم کی تھی اور بمبئی میں فلم بنانا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں دلیپ کمار اور نرگس نئے نئے ابھر رہے تھے اور میں ان کی سلیکشن کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے ان کو کاسٹ کیا۔ میوزک ڈائریکٹر شام سندر کو لیا اور گیت نگار کے طور پر مجھے چنا۔ میرے ذہن میں بھی ہی ایک خواب تھا اس لیے بہت خوش ہوا۔

انہوں نے میری تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار مقرر کی اور پانچ سو روپیہ مجھے ایڈوانس دیا کہ آپ بمبئی کی تیاری کریں۔ یہ نومبر 1946ء کی بات ہے۔ میں نے شیروانی اور سوٹ سلوائے اور اپنی سیٹ بھی ریزرو کروالی مگر انہی دنوں بمبئی میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو انہوں نے تار دے کر مجھے روک دیا کہ اب تم اگلے ماہ دسمبر میں آنا۔ دسمبر میں پھر سیٹ ریزرو ہوئی جو بایں وجہ منسوخ کروانا پڑی۔ بالآخر انہوں نے کہا کہ یہ پروڈکشن اب لاہور میں شروع کریں گے۔

لاہور میں میکلورڈ روڈ پر موتی مینشن ہے جس میں کبھی راشننگ کا دفتر ہوتا تھا‘ یہاں اس پروڈکشن کا دفتر قائم ہوا اور ہم تینوں یکم جنوری 1947ء کی صبح راولپنڈی سے لاہور پہنچے اور نیا سال خیبر میل‘ جو ان دنوں فرنٹیئر میل کے نام سے چلتی تھی ‘میں منایا جورات کو تقریباً نو بجے وہاں سے چلی تھی۔ یہاں انہوں نے مجھے گانوں کے علاوہ پبلسٹی کا انچارج بھی بنایا تھا اور اسی پروڈکشن کے سلسلے میں میری ملاقات اس خاتون چندر کانتا سے ہوئی تھی جس کا میری شاعری کا ٹرینڈ بدلنے میں بڑا ہاتھ تھا۔

جب خیالستان پروڈکشنز کی فلم یہاں شروع ہوئی تو اس کی کاسٹ بدل گئی اور اس میں خوبصورت ہیروئن وینا اور ان کے خوبصورت شوہر الناصر کو کاسٹ کیا گیا۔ دونوں کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ ککو ڈانسر تھیں اور پلے بیک سنگر درانی تھے جو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔ فلم کا نام ”ادھورے خواب“ رکھا گیا۔ اس زمانے میں فلم کے افتتاح کے موقع پر پوری انڈسٹری کو بلوایا جاتا تھا۔ جسٹس ایس اے رحمان کو افتتاح کیلئے بلایا گیا جو شاعر بھی تھے اور ادب نواز بھی اور محبوب اختر کے رشتہ دار بھی تھے۔

اس موقع پر میرے گیت کی ریکارڈنگ ہوئی۔ سُندر میوزک ڈائریکٹر تو مشہور تھے ہی لیکن اس تقریب میں شامل کچھ پروڈیوسروں نے پوچھ گچھ کی کہ یہ نغمہ کس نے لکھا ہے‘ جب انہیں میرے بارے میں بتایا گیا تو کچھ نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا” سبحان اللہ! آپ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے ایڈریس بتا دیا ‘میں ان دنوں میکلوڈ روڈ پر یونیورسل ہوٹل میں رہتا تھا جہاں فلم کے کچھ سفید پوش قسم کے لوگ رہتے تھے اور مجھ سے پہلے وہاں پر ان اور کلدیپ کورو غیرہ رہ چکے تھے۔ ایک ایک کمرہ

اور غسلخانہ ہوتا تھااور کرایہ نوے روپے ماہوار ہوتا تھاجو اس زمانے کے حساب سے خاصا تھا۔
اب پروڈیوسروں نے میری پوچھ گچھ شروع کی۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بہت آگے جاؤں گا۔
ایک دو جگہ سے پیسے ایڈوانس بھی مل گئے۔اس دوران فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔کچھ
ادیبوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے فلم کی شوٹنگ دیکھنی ہے۔میں نے جن ادیبوں کو
Audience میں شامل کیا۔ان میں جگن ناتھ آزاد اور فکر تونسوی بھی شامل تھے۔انہیں میک
اپ کرواکے پہلی قطار میں فرنٹ پر بٹھادیا گیا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائیں
گے لیکن وہاں تو ایک ایک سین ایک ایک گھنٹے میں ہوتا ہے اور یہ تو پھر ککو کا ڈانس تھا اس لئے ان
دونوں بیچاروں کو کافی مشکل ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنے کسی مضمون میں اس واقعے کا ذکر بھی کیا ہے۔اس طرح اس فلم کا
چرچا ادبی حلقوں میں بھی رہا لیکن فلم کے نام کی مناسبت سے سب خواب ادھورے ہی رہے۔
یہ فلم جنوری میں افتتاح ہوئی تھی اور مارچ تک صرف اس کی شوٹنگ ہی شروع ہو سکی تھی۔اسی اثناء
میں ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے سامنے پاکستان کی مخالفت میں اپنی کرپان ہوا میں لہرائی اور
اسی دن سے مذہبی فضا خراب ہو گئی اور فسادات شروع ہو گئے۔
اس عرصہ میں چندر کانتا مجھ سے مل چکی تھیں اور وہ ٹمپل روڈ پر اکیلی رہتی تھیں۔میں چونکہ ہوٹل
کے کمرے میں رہتا تھا اس لئے ایک موقع پر انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ مجھے اپنے گھر لے جائیں
کیونکہ بڑی جذباتی وابستگی ہو چکی تھی۔وہ علاقہ ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کا مشترکہ علاقہ تھا۔

ہندو مسلم کشیدگی کی وجہ سے لوگ جائیداد کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔اس وقت تک لاہور کے بارے میں کچھ واضح علم نہیں تھا۔ہندوؤں کا خیال تھا کہ لاہور ہندوستان میں شامل ہو گا جبکہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ لاہور پاکستان میں شامل ہو گا۔اس وجہ سے امن و امان کا سلسلہ درہم برہم ہر کر رہ گیا تھا۔

میں چندر کانتا کے مکان میں جون یا جولائی 1947ء میں منتقل ہوا تھا۔اس زمانے میں یہ ایسا واقعہ ہوا جس نے فلم سے ہٹ کر ادبی میدان میں مجھے شہرت دی۔یہ ریڈیو کا ایک مشاعرہ تھا جو ریڈیو پر میرا پہلا مشاعرہ تھا اور جو مجھے حفیظ ہوشیار پوری صاحب کی مہربانی سے ملا۔حفیظ صاحب ہمارے ساتھ نظام ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے اور میرے نئے لہجے کو پسند کرتے تھے۔ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ کبھی ریڈیو کے مشاعرے پر بھی گئے ہو' میں نے کہا کہ مجھے کون بلاتا ہے۔سو انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔

مشاعرے کا دن آیا تو شہر میں کرفیو تھا۔دن کے وقت تو کرفیو نہیں ہوتا تھا لیکن شام کو سات بجے کرفیو لگ جاتا تھا۔رات کو مشاعرہ تھا اور دن کے وقت جگن ناتھ آزاد چندر کانتا کے اس مکان میں مجھ سے ملنے کیلئے آئے اور پوچھا کہ رات کے مشاعرے کیلئے کیا لکھا ہے۔میں نے جو غزل کہی تھی انہیں دکھادی جس کا مطلع تھا:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

یہ نجانے کس موڈ میں تھے کہنے لگے " غزل کمزور ہے ' یہ نہ پڑھو ' کوئی اور پڑھو ' تمہارا ریڈیو پر پہلا چانس ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم نمایاں ہو جاؤ " وہ تو کھانا کھا کر چلے گئے لیکن میں اکھڑ گیا۔ میں نے ایک اور غزل کہی جو اچھی نظر آ رہی تھی مگر جب پہلی غزل پڑھتا تو وہ زیادہ وزنی نظر آتی تھی۔ میں نے دونوں غزلیں ہی ساتھ رکھ لیں۔ کرفیو پاس آ چکے تھے اور گاڑی شاعروں کو اکٹھا کر رہی تھی۔ جب یہ گاڑی میرے گھر آئی تو چار پانچ شاعر پہلے سے اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دونوں میں سے کونسی غزل اچھی ہے لیکن وہ کوئی حتمی رائے نہ دے سکے۔ ریڈیو سٹیشن پہنچنے تک میں نے سوچا کہ جو پہلے کہی تھی وہی ٹھیک ہے اب جو نصیبوں میں ہو گا۔

اس رات شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ لوگ سینماؤں میں جا نہیں سکتے تھے اور گھروں میں رہ کر ریڈیو سننے پر مجبور تھے اور یہ میرے لئے خوش قسمتی کی بات تھی۔ اس روز میری یہ غزلیں اتنی جمیں کہ حاصل مشاعرہ بن گئی۔ میں اس زمانے میں ترنم سے پڑھتا تھا لیکن ظاہر ہے صرف ترنم کی وجہ ہی نہیں تھی بلکہ غزلیں ہی ایسی تھی۔

یہ غزل لوگوں پر ایسی سوار ہوئی کہ اس زمین میں بہت سی غزلیں لکھی گئیں اور فلموں میں بھی اس کے بہت چربے آئے۔ اس مشاعرے سے اگلے روز میں جدھر سے بھی گزرا تو جو واقف بھی ملا اس نے کہا یار کمال کی غزلیں تھی ' واہ واہ ' اس غزل نے مجھے لاہور میں Establish کر دیا اور لوگوں میں میری پہچان شروع ہو گئی۔ رسالوں تک میں پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور اب ریڈیو تک بھی پہنچ گیا۔

چندر کانتا

جب یہ معلوم ہو گیا کہ لاہور پاکستان کے حصے میں آیا ہے تو قدرتی طور پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور غیر مسلموں کو خوف وہراس نے گھیر لیا۔ فرقہ واریت اور تعصب کا زہر تو تھا ہی' جہاں جس کا بس چلتا تھا اپنے مخالف کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا جس سے افراتفری مچ گئی۔ آبادی کا انخلاء شروع ہو چکا تھا اور اس خوشی کے زمانے میں بھی لاشیں ادھر سے آ رہی تھی اور جس بیدردی سے غیر مسلموں کو یہاں مارا جارہا تھا اسے دیکھ کر انسان کانپ جاتا تھا۔ اب ترازو رکھ کر تو یہ نہیں کیا جاسکتا کہ کدھر زیادہ ظلم ہوا اور کس نے زیادہ ظلم کیا لیکن انسان اس وقت درندہ بنا ہوا تھا اور آزادی کی جو نعمت اس وقت ملی تھی اس کا احساس اس چیخ وپکار میں دب کر رہ گیا تھا۔ ایک حساس آدمی کیلئے اس وقت جینا بہت دشوار تھا۔ اس سارے عرصے کے دوران ہم صرف لکھنے پڑھنے کی حد تک تھے۔ ہم لوگ جو اس سارے قصے میں شامل نہیں تھے زیادہ اذیت میں مبتلا تھے کیونکہ ہمارے کوئی سیاسی یا غیر سیاسی مقاصد بھی نہیں تھے۔ میں جس مکان میں چندر کانتا کے ساتھ رہتا تھا اس میں کچھ اور لوگ بھی رہتے تھے کیونکہ یہ ہندو پراپرٹی تھی اور چندر کانتا نے اس کا ایک حصہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ اب کچھ مسلمان یہ مکان خالی کروا کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ یہاں ایک مسلمان بھی رہتا ہے' مکان خالی کرنے کیلئے چیلنج کر دیا تھا۔

ایک دن اچانک دوپہر کو بلوا ہوا اور آگ لگ گئی۔ باہر کرفیو لگا ہوا تھا اور ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر سامنے ایک عیسائی فیملی کے گھر میں پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ بعد میں ہم ٹمپل روڈ پر کامیڈین نذر کے گھر منتقل ہو گئے جن سے کچھ راہ ورسم تھے۔

کچھ دنوں بعد جو لوگ بھارت سے آئے ان میں ساحر لدھیانوی' ابراہیم جلیس اور ابن انشا بھی شامل تھے۔ان سب کے آنے کی خوشی ہوئی اور اس سے پہلے ملاقات نہ ہونے کے باوجود ایسے تھا جیسے برسوں سے ملے ہوئے ہیں۔ساحر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کوشش میں تھے کہ فلم انڈسٹری میں Establish ہو جائیں لیکن ہو نہیں پا رہے تھے۔یہ فلم میں مدھوک کے چھا جانے کا زمانہ تھا اور اس کے بعد ''انمول گھڑی'' کے گانوں سے تنویر نقوی اوپر آ چکے تھے۔جب ساحر کے کچھ امکانات بنے تو تقسیم ہو گئی۔ان کی ماں اور نانی لدھیانہ میں اپنے آبائی گھر میں تھیں انہیں اپنے لئے نہیں بلکہ ان کی جان بچانے کیلئے وہاں سے بھاگنا پڑا۔جب یہ لدھیانہ پہنچے تو پتا چلا کہ وہ اس مہاجر کیمپ میں ہیں جو پاکستان جائے گا۔انہوں نے کسی طرح ماں اور نانی کو ساتھ لیا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں آکر یہ پہلے کمیونسٹ پارٹی کے آفس میں ایک اوپر کے کمرے میں ٹھہرے اور ماں کے پاس جو زیورات اور نقدی تھے انہیں بیچ بیچ کر گزر بسر شروع کیا۔

سبھی جانتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی لدھیانہ سے ایک ملحقہ گاؤں کے بڑے زمیندار کے بیٹے تھے جن کی ایک رہائش لدھیانہ میں بھی تھی اور جو شادیاں کرنے کے شائق تھے۔ساحر کی والدہ ان کی غالباً بارہویں یا تیرھویں بیوی تھیں۔وہ شادیاں کرتے تھے اور طلاق دے دیتے تھے۔ان پڑھ مگر عیاش آدمی تھے۔ان کی ماں سے شادی کی اور جب ساحر اڑھائی سال کے تھے تو اسے بھی طلاق دے دی اور بے آسرا کر دیا لیکن ان کی ماں بڑے حوصلے والی عورت تھیں۔وہ اپنے خاوند کے ساتھ مقدمے بازی کرتی رہیں۔چونکہ دوسری بیویوں سے بھی ساحر کے والد کا ان کے علاوہ اور کوئی بیٹا

نہیں تھا اس لئے وہ وقتاً فوقتاً کیس جیتتی تھیں' پیسہ حاصل کرتی تھیں اور ساحر کی پرورش کرتی تھیں۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں عورت کی وجہ سے بالخصوص اس عورت کی وجہ سے جسے طوائف کا نام دیا جاتا ہے جتنی تلخی بھی ہے وہ اپنے ماں کے باعث ہے کیونکہ ان کی ماں شروع میں اسی طبقے سے تھیں۔ یہ تلخی ہمیشہ ان کی شاعری میں رہی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ان کے والد بھی بھارت سے آ کر یہاں لائل پور میں آباد ہو گئے ہیں اور چونکہ بااثر صاحب ثروت آدمی تھے اس لئے یہاں بھی انہیں خوب زمینیں الاٹ ہو گئی تھیں۔

ایک دن ساحر نے مجھے اپنے باپ کا خط دکھایا' اس وقت وہ خود ہنس رہا تھا۔ خط میں لکھا تھا: پیارے بیٹے عبدالحئ! شاعری ایک اچھا شغل ہے لیکن اگر تم میرے پاس آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کم از کم نائب تحصیلدار بھرتی کروا دیتا۔ عبدالحئ ساحر کا اصل نام تھا اور نون ان کی ذات تھی۔ ساحر یہ پڑھ کر خود بھی ہنسے اور کہا کہ میرے والد کی نظر میں جو میں ہوں یا جو ایک شاعر ہے یہ مذاق ہے اور ان کی نظر میں اگر میں نائب تحصیلدار بن گیا ہوتا تو بڑی بات ہوتی۔ میں نے پوچھا' تم نے کیا جواب دیا ہے تو کہنے لگے کہ میں جواب دیتا ہی نہیں' میں تو اس سے بات کرنے کا روادار بھی نہیں' جس نے مجھ سے اور میری ماں سے یہ سلوک کیا میں اس کی نائب تحصیلدار کو کیا کروں۔

ساحر کا نام عبدالحئ رکھنے کی ایک وجہ لوگوں کو معلوم نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یونینسٹ دور حکومت میں سر سکندر حیات کی وزارت میں عبدالحئ نام کے ایک وزیر ہوا کرتے تھے جن کے ساتھ ساحر

کے والد کی نہیں بنتی تھی۔اس وزیر کی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحئی رکھا۔وہ ساحر کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جب وہ عبدالحئی پاس سے گزرتا تو کہتے اوہ حرامزادے عبدالحئی ادھر آ۔

ساحر پاکستان آنے کے بعد کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ یہاں پر رہے۔' انہوں نے میکلوڈ روڈ پر کبابوں والوں کی دو کانوں کے پاس ایک مکان بھی الاٹ کروالیا تھا لیکن ان کا روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہو پایا''سویرا'' ایک پروگریسو پرچہ تھا لیکن وہ دو تین مہینے کے بعد نکلتا تھا۔اس لئے وہاں سے جو پیسے ملتے تھے وہ برائے نام تھے۔انہی دنوں ''امروز'' تازہ تازہ نکلا لیکن چراغ حسن حسرت کسی وجہ سے ان کے ساتھ ناراض تھے اس لئے وہاں بھی نوکری نہیں مل پائی۔ایک مرحلہ ایسا آیا کہ انہیں مالی تکلیف ہونا شروع ہوئی کیونکہ والدہ کے پاس جو نقدی اور زیورات تھے وہ خرچ ہو چکے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے چلو بمبئی چلتے ہیں' میں نے کہا ٹھیک ہے آپ پہلے جا کر رہائش کا انتظام کریں میں بعد میں آجاؤں گا اور مل کر وہاں کام کریں گے۔

جب یہ یہاں سے بمبئی کیلئے روانہ ہوئے تو راستے میں دہلی میں رکے جہاں ان کی ملاقات اپنے ایک ماموں سے ہو گئی جو شروع میں آلہ آباد میں رہتے تھے۔دہلی سے ایک پرچہ ''شاہراہ'' نکلنا شروع ہوا تھا۔انہیں اس کے ایڈیٹر شپ کی آفر ہوئی۔ماموں نے مشورہ دیا کہ بمبئی بعد میں چلے جانا پہلے یہ کام کرلو۔ ممکن ہے یہ بہتر رہے' یہاں ریڈیو بھی ہے اور مشاعرے بھی ہوں گے۔ چنانچہ یہ دہلی میں رک گئے اور تقریباً ایک سال وہیں رہے۔

اس دوران یہاں بھی فلم انڈسٹری کچھ ابھری اور مجھے چار پیسے آنے لگے۔اس لئے میں نے سوچا کہ گھر کی آدھی باہر کی پوری سے بہتر ہے۔اگر وہ سیدھے بمبئی چلے گئے ہوتے تو ایک دو ماہ کے بعد میں

بھی وہاں چلا جاتا مگر اب حالات بدل چکے تھے اس لئے میں یہیں رہ گیا۔

یہاں دوسرے آنے والوں میں ابراہیم جیلس تھے جو پرو گریسو تھے۔ وہ ریاست حیدر آباد سے اس وقت آئے جب نظام کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ دراصل انڈیا ریاست حیدر آباد کو اس حال میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے بھی کیا کر لیتے کیونکہ بیچ میں کافی فاصلہ تھا اور بڑی غیر قدرتی سی بات تھی، پھر انڈیا کی پالیسی بھی یہی تھی کہ جتنی بھی ریاستیں ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلم وہ انہیں ہضم کر جائے۔

حیدر آباد میں ایک رضا کار تحریک چلی ہوئی تھی جس نے ہندوؤں کے خلاف اودھم مچا رکھا تھا اس تحریک کے سربراہ نے ایک فرقہ وارانہ جماعت قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد ہندوؤں سے مسلمانوں کو لڑانا تھا یہ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کے ذہن میں تو خدمت اسلام ہوتی ہے لیکن دراصل وہ خدمت اسلام نہیں ہوتی۔ اس وقت کے بہت سے نوجوان بھی متعصب ہو کر اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

ابراہیم جلیس حیدر آباد ریڈیو سے منسلک تھے اور جب انڈیا نے پولیس ایکشن کے نام پر ریاست پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام اور رضا کار تحریک کی زیادتیوں کا بدلہ لینا شروع کیا تو وہاں سے جو لوگ بچ کر نکل آئے ان سے ایک یہ بھی تھے، انہوں نے جب اپنی آنکھوں سے وہاں پر تصویر کے دونوں رخ دیکھے تو یہاں آ کر انہوں نے ”دو ملک ایک کہانی“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ

یہاں آکر مختلف اداروں سے منسلک ہوئے۔اس زمانے میں کچھ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کیلئے اور کچھ غیر شادی شدہ دوستوں کیلئے ہر اتوار کو میرے ہاں محفل ہوا کرتی تھی۔ میری بیوی ہمیشہ سے کھانا بہت اچھا پکاتی ہے اور اس میں ماہر ہے چنانچہ ہر اتوار کو ان سب کی میرے گھر پر دعوت ہوتی تھی جن کی تعداد تقریباً آٹھ دس ہوتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہوٹلوں سے کھانا کھانے والے تھے اور اہتمام یہ تھا کہ سب ہفتے میں کم از کم ایک دن گھر کا پکا ہوا لذیذ کھانا کھا سکیں۔

ان سب میں ابن انشا ایک ایسے آدمی تھے جو بڑی دھیمی رفتار سے چلے۔ایک کلرک سے اٹھے اور بالآخر ایک بڑی اچھی جاب پر گئے۔ان کا شاعری کا انداز بھی منفرد تھا۔دوستوں کے دوست تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی یہ کسی نہ کسی طرح آکر انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو جاتے تھے۔

میں بنیادی طور پر مسلم لیگی ہوں اور مسلم لیگ کیلئے قیام پاکستان تک کام کرتا رہا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کیمونسٹ پارٹی نے بھی بڑے انصاف سے کام لیتے ہوئے اس مطالبہ کو تسلیم کیا تھا اور مسلم لیگ کو تعاون دیا تھا۔میں کیمونسٹ پارٹی کا ممبر تو نہیں تھا بلکہ سیدھا سادا لیگی تھا لیکن جب تقسیم ہوئی اور میں نے اس کے بعد مسلم لیگیوں کی اکثریت کو لوٹ مار میں مگن دیکھا تو میرا جی مسلم لیگ سے اچاٹ ہو گیا۔اس دور میں ناجائز الاٹمنٹیں ہو رہی تھیں اور اصل مہاجرین کے علاوہ ”مقامی مہاجرین“ کی اصطلاح بھی سننے میں آئی۔ مؤخر الذکر وہ لوگ تھے جو مسلم لیگ میں شامل تھے یا ان کے ساتھ تھے۔ان بااثر افراد نے خوب لوٹ مار کی۔ہندوؤں کا جو مکان خالی ہوتا تھا، تالہ توڑ کر

اس کا سارا سامان لے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ذہنی طور پر مسلم لیگ سے دور ہو گیا اور میں نے کہا کہ اب یہ وہ مسلم لیگ نہیں ہے جس کے لئے ہم نے کام کیا تھا۔

میں جس وقت مسلم لیگ میں کام کر رہا تھا تو ذہن پر پرانی قسم کے اثرات نہیں تھے مثلاً میں اس زمانے میں بھی پیر پرستی' مزار پرستی اور جاگیرداری کے خلاف تھا۔ مسلم لیگ اس وقت تک متعصب جماعت نہیں تھی اور اپنے جائز مطالبات کے باوجود کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی بلکہ ایک مسلم معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ یہاں میں مسلم معاشرے کا مفہوم واضح کر دوں ' قائداعظم کے تمام بیانات دیکھ لیں وہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جس میں ان کے اقتصادی حالات کسی کے تسلط میں نہ ہوں۔ اگر صرف اسلامی یا مذہبی آزادی کی بات ہوتی تو وہ تو انگریز کے زمانے میں بھی تھی۔

جو خیالات میرے اس وقت تک تھے جسے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہابیت کے قریب تھے وہ آگے تک چلتے آئے۔ پھر مسلم لیگیوں نے جو زیادتیاں کیں انہوں نے مجھے برگشتہ کر دیا۔ اچانک پتا چلا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی ہے جس میں بقول لوگوں کے اکثریت کمیونسٹوں کی ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا اس میں کمیونسٹ بھی تھے مگر مجھ جیسے لوگ بھی شامل تھے جو کمیونزم کا صحیح مفہوم بھی نہیں جانتے تھے اور جنہیں ابتداء سے ہی رجعت پسندی کی چیزیں قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ ایسے لوگ جن کے نزدیک اس ادبی جماعت کے مقاصد اچھے تھے اور جو مسلم لیگ کے رویے سے بھی دل برداشتہ تھے وہ اس میں شامل ہو گئے۔ دوسرے جو لوگ اس انجمن سے وابستہ ہوئے ان میں

ابراہیم جیلس، ابن انشا اوراحمد ندیم قاسمی بھی شامل تھے۔

احمد ندیم قاسمی بھی مسلم لیگی تھی اور ہمارے حالات بالکل ایک جیسے ہیں۔یہ بھی تقسیم کے بعد لیگ سے دلبرداشتہ ہوکر پروگریسورائٹرز میں آئےاورآخر کاراس کے سیکرٹری جنرل بھی بنے۔اس زمانے میں شاعری کاجوایک دھارا چلااس نے ادب کو بہت سے نئے خیالات دیئے اورادب برائے ادب کاجونعرہ لگتاتھااس سے بھی گلوخلاصی ہوئی حالانکہ اگرغور سے دیکھیں تو ادب برائے ادب میں بھی زندگی کاایک پہلو موجود ہے۔ اب لوگ ادب برائے زندگی کی طرف آئے لیکن ایک زیادتی ہوئی کہ کچھ لوگ فوراً ادب برائے سیاست پر پہنچ گئے۔میں ادب برائے سیاست اسے کہتاہوں جس میں سیدھے نعرے تھے۔یوں نظر آتاتھاکہ ایک پارٹی نے ایک لائن دی ہے۔انہوں نے پارٹی لائن نثر میں دی تھی۔انہوں نے مصرعے سیدھے کرکے اسے منظور کردیا

میں ان چندایک شاعروں میں سے تھاجنہوں نے پروگریسورائٹرز میں رہ کر کبھی پروگریسو باتوں سے انحراف نہیں کیالیکن شاعری وہ کی جس میں فن آگے آگے رہتاتھااور مقصد غیر محسوس طور پر کسی پچھلی جگہ پر ہوتاتھا۔پروگریسو رائٹرز کی طرف سے یہ غزل کی مخالفت کازمانہ تھااوروہ کہتے تھے کہ غزلیں ترقی پسند چیز نہیں ہے۔اس زمانے میں بھی انڈیامیں مجروح سلطان پوری نے اور پاکستان میں پہلے فیض صاحب نےاور پھرمیں نے بڑے پروگریسو ہونے کے باوجود نظم بھی کہی لیکن غزل کا پرچم بھی بلند کیے رکھایہی وجہ ہے کہ فیض صاحب نے انتقال سے پہلے میری ایک کتاب کے فلیپ کیلئے لکھاکہ قتیل شفائی ہم میں سے ہے لیکن اس نے کبھی کوئی ہدایت لے کر شاعری نہیں کی۔جو ہماری منزل ہے یہ بھی اسی منزل کاراہی ہے لیکن راستہ اس کااپناہےاوراس نے اپناراستہ اختیار کر

کے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ قبولیت عامہ ایک سستی چیز ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اچھے برے کی تمیز مستقبل کرے گا لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آج جو آدمی زندہ ہے اسے قبول کرنے والے کتنے ہیں اور قتیل شفائی اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہے۔فیض صاحب کی طرف سے یہ سند مل جانا میرے لئے ایک قابل فخر بات ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ میری نظموں میں مزدوراور کسان کا نام کبھی شاذ ہی آیا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کبھی مزدور نہیں رہا۔ زمیندار بھی نہیں تھا کہ اپنی زمینوں پر ہی کسانوں پر ظلم ہوتا دیکھ لوں۔ میں تو ایک رئیس باپ کا بیٹا تھااور میرا تعلق جس طبقے سے تھااور جو کردار میری زندگی میں آئے وہ کچھ اور تھے۔میرا تو سٹوڈیو کا ماحول تھا جس میں بظاہر بڑی چمک دمک تھی پھر جن دو عورتوں سے جذباتی طور پر میرا واسطہ رہا ان کا پس منظر ہی کچھ اور تھا۔اب ایک گائیکہ خواہ کتنی بڑی ہو جائے اور اسے اس کے گانے کی کتنی داد مل جائے لیکن جب یہ ذکر آتا ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھنے والی ہے اور یہ اس کے کانوں تک پہنچتی ہے تو اس کے تحت الشعور میں جو زلزلہ آتا ہے میں اس کا تصور کر سکتا ہوں۔اسی طرح عورت جو بہت بڑی لاجپت رائے فیملی سے تعلق رکھتی ہے جو غلط جگہ شادی ہو جانے کی وجہ سے گھر سے نکلی اور فلم کا سہارا لینے کیلئے آئی اور جب اسے تھوڑا سا سہارا ملا تو فلم کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا تو میں اس کے تصورات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

میرا ایک موضوع بانجھ عورت بھی تھا جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اسی طرح میرا ایک موضوع ایکسٹرا عورت بھی ہے جو تمام عمر سٹوڈیو میں گھومتی ہے اور جس کی نسبت ایک مزدور بھی زیادہ پیسے لیتا ہے

جبکہ اس ایکسٹرا کے پیچھے گھر میں دو تین بچے بھی پڑے ہوتے ہیں جنہیں چھوڑ کر وہ کام پر آتی ہے۔ اس کے علاوہ میرا موضوع وہ عورتیں بھی ہیں جنہیں جھانسا دے کر اس لائن میں لایا جاتا ہے اور جو کماتی تو لاکھوں ہیں لیکن ان کے پاس ٹکا بھی نہیں ہوتا اور کھانے والے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ میری زندگی میں یہ سب کردار آئے ہیں اور میں نے یہاں وہی فرض ادا کیا ہے جو کوئی اور مزدور اور کسان کیلئے کر سکتا ہے۔ لیکن جب مجھے مزدور اور کسان کا ذاتی تجربہ ہے ہی نہیں تو اگر میں اس بارے میں کچھ لکھتا تو اس میں بناوٹ اور تصنع ہوتا' حقیقت نہ ہوتی۔ ان کرداروں کو تو میں نے دیکھا ' محسوس کیا' اپنے خون میں شامل کیا' اپنے احساس و جذبات میں گوندھا اور گوندھے کے بعد جو مٹی بنی اس سے میں نے کچھ پیکر تراشے' پھر کہیں جا کر وہ پیکر مؤثر نظر آئے۔

فیض صاحب تو کمیونسٹ تھے مگر احمد ندیم قاسمی صاحب لبرل اور پروگریسو ہیں۔ پھر بھی کچھ انتہا پسند لوگ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری تو ایسی ہے کہ کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے ہم پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے' اس کے خیالات کیا ہیں اور اس نے الفاظ کو نئے معنی کیا دیئے ہیں۔ یہ تعین کرنے کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ محض روایتی چیزیں نہیں ہیں اور ادب برائے ادب کی ذیل میں نہیں آتیں۔ یہ ادب برائے زندگی میں آتی ہیں اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

لاہور آنے کے بعد جدوجہد کا خاصا زمانہ گزرا۔ پھر میں نے اپنی برادری کی خدمت کرنے کے جذبے کے تحت مختلف سوسائٹیوں اور انجمنوں میں چھوٹے چھوٹے عہدے قبول کیے۔ اس کے

بعد ایک ایسا وقت آیا جب صدر ایوب کے زمانے میں قدرت اللہ شہاب نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی اور ان کے ساتھ جمیل الدین عالی ان کے معاون ہوئے۔ گلڈ کا بڑا غلغلہ مچا' کراچی میں اس کا کنونشن ہوا تو پاکستان بھر کے لوگ اس میں جمع ہوئے اور صدر ایوب نے اس کا افتتاح کیا۔ اس میں مولوی عبدالحق اور اُردو اور دیگر زبانوں کے عمائدین بھی شامل ہوئے۔

گلڈ کے بارے میں افواہ یہ تھی کہ یہ ادارہ صدر ایوب نے اپنی حکومت کو استحکام دینے کیلئے قائم کیا ہے اور اس کے مقاصد وہی ہیں جو جابر حکومتوں کے اپنے جواز کیلئے ہوتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ٹھیک ہے ایسا ہو گا۔ لیکن ہم تو اس لیے اس میں شامل ہوں گے کہ اگر ایسے کوئی مقاصد ہیں بھی تو انہیں پورے نہ ہونے دیا جائے۔ ون یونٹ کا زمانہ تھا اس لئے اس ادارے کے دو ریجن بنے یعنی مشرقی پاکستان ریجن اور مغربی پاکستان ریجن۔

ایک دن ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ کہ ہمارے منیر نیازی صاحب کہنے لگے کہ تمہیں پتا ہے کہ میں رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن کے سیکرٹری کے انتخاب کیلئے کھڑا ہو رہا ہوں۔ میں نے ازراہ مذاق کہا کہ اچھا یار وہ تو میں کھڑا ہو رہا تھا۔ کہنے لگے اچھا تو چلو مقابلہ کر لیتے ہیں۔ میں بھی سیر یس ہو گیا۔ اس کے بعد پتا چلا کہ وہ حسب معمول تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک بات کر کے الگ ہو گئے اور میں امیدوار کے طور پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن میں نے ارادہ کیا کہ اس ادارے میں جا کر ہم اچھے کام کریں گے اور اسے نہ تو حکومت کا اور نہ کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بننے دیں گے۔ ہر چند کہ میں ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والا آدمی تھا لیکن میں نے تہیہ کیا کہ میں اپنا نقطہ نظر بھی اس پر

لاگو نہیں ہونے دوں گا اور اسے ٹریڈ یونین کے طور پر چلاؤں گا۔

اس سے پہلے سید وقار عظیم سیکرٹری تھے اور یہ شاید ان کی دوسری ٹرن تھی۔ جب کمپین چلی تو میرے مقابلے میں صوفی صاحب کو کھڑا کر دیا گیا۔ وہ میرے بھی بزرگ تھے۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیوں سیکرٹری بننا چاہتے ہیں۔ اسی دوران ادھر اُدھر سے مجھ پر پریشر ڈالنا شروع کر دیا گیا کہ وہ بزرگ ہیں آپ بیٹھ جایئے۔ میں نے کہا" یار کس دستور میں لکھا ہوا ہے کہ ہم کسی بزرگ ہی کو لائیں گے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ بزرگوں کو چاہیے کہ نوجوانوں کیلئے جگہ خالی کریں جبکہ آپ کہہ رہے ہیں کہ نوجوانوں بیٹھو اور بزرگوں کیلئے جگہ خالی کر دو۔ یہ تو بالکل ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی جن لوگوں نے مجھے کھڑا کیا ہے وہ مجھے بیٹھنے نہیں دیں گے۔"

بعد میں ایک دن سیکرٹری صاحب کا بھی مجھے فون آیا" جب صوفی صاحب کھڑے ہوئے ہیں تو آپ نے کیوں سوچا ہے"

میں نے کہا" سوچا ہے کہ مقابلہ کریں گے"

کہنے لگے "کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی"

میں نے کہا"آپ کے دستور نے صرف ایک ہی صورت رکھی ہوئی ہے کہ الیکشن ہوں گے اس لیے الیکشن لڑیں گے"

کہنے لگے "میں سمجھ گیا لیکن میں آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ صوفی صاحب سے کسی موقع پر Misbehave نہ ہو"

میں نے کہا" وہ ہمارے بھی بزرگ ہیں' اختلاف تو الیکشن کی حد تک ہے اس لئے احترام کے ساتھ

الیکشن لڑیں گے۔ اگر وہ ہار گئے تو حالات ذمہ دار ہوں گے اور اگر جیت گئے تو میں انہیں مبارکباد دوں گا‘‘

عالی صاحب کو یہ غلط فہمی تھی کہ ہم اس سٹیج پر قبضہ کرنے آئے ہیں اور اگر الیکشن ہو جائے گا تو پروگریسوز اس پر قبضہ کر لیں گے اور ان کی جو بالادستی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ان کی کوشش تھی کہ میں ہار جاؤں یا بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ الیکشن والے دن سب لوگ جمع تھے اور کراچی سے عالی صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں آج مصروف ہوں‘ آ نہیں سکتا اس لئے الیکشن ملتوی کر دیئے جائیں۔ ہم نے کہا کہ آپ آئیں یا نہ آئیں الیکشن ضرور ہو گا۔ ویسے بھی آپ بذریعہ جہاز آ سکتے ہیں ہم الیکشن شام کو کر دیتے ہیں۔ معاملہ دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا کچھ کہہ رہے تھے کہ الیکشن ملتوی ہونا چاہیے اور کچھ کہہ رہے تھے کہ ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ آپ اس مسئلے پر ابھی ووٹنگ کروالیں۔ جب ہاتھ کھڑے کروائے گئے تو جن لوگوں نے الیکشن ملتوی کروانے کے حق میں ہاتھ کھڑا کیا، وہ صرف دو تھے ایک صوفی صاحب خود اور ایک کوئی اور صاحب۔ صوفی صاحب نے نتیجہ دیکھ لیا تھا اس لئے انہوں نے فوراً لکھ کر دے دیا کہ میں الیکشن سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اس طرح میں بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔

اس الیکشن کے بعد کراچی میں گلڈ کا اجلاس ہوا جس میں شرکت کیلئے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ہی سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ عالی صاحب مجھے اپنا حریف سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح محفل میں میری سبکی ہو جائے۔ چنانچہ اچانک اعلان ہوا کہ اب مغربی پاکستان ریجن کے سیکرٹری قتیل شفائی اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میں کبھی سٹیج پر گیا ہی نہیں تھا اور مجھے تقریر کا

طریقہ نہیں آتا تھا۔ جب یہ اعلان ہوا تو مجھے چکر آ گیا کیونکہ وہاں بڑے بڑے علماء اور مقرر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے سٹیج تک پہنچنے میں میں نے ذہن میں دو پوائنٹ بنا لیے جن میں سے ایک یہ تھا کہ گلڈ کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان ایک سٹیج پر ہیں اور جن لوگوں کا پہلے درشن نہیں ہوا تھا آج ہو گیا اور یہ کہ آگے چل کر دونوں تہذیبوں اور کلچر کا ایک سنگم بنے گا۔

پھر بھی جب میں جا کر سٹیج پر کھڑا ہوا تو صاحب صدر اور خواتین و حضرات کہتے ہوئے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں اور آنکھوں کے آگے تارے چمکنے لگے اور لگتا تھا کہ میں کہیں گر نہ جاؤں لیکن میں نے الفاظ سمیٹے اور کہا کہ باقی باتیں تو میں بعد میں کروں گا' ایک بات پہلے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کی نظر میں گلڈ کے قیام کا مقصد شاید کوئی اور تھا لیکن میری نظر میں اس کی افادیت یہ ہے کہ آج نذر الاسلام کی سرزمین کے لوگ اقبال کی سرزمین کے ادیبوں کے سامنے بیٹھے ہیں اور وہ اقبال کو سمجھ رہے ہیں اور ہم نذر الاسلام کو سمجھ رہے ہیں۔ میری اس بات پر تالیاں بجنے لگیں۔ اجلاس میں ایک طرف جسیم الدین بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف حفیظ جالندھری بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آگے چل کر کہا کہ یہ گلڈ ہی ہے جس کی وجہ سے آج یہاں جسیم الدین بھی بیٹھے ہیں اور حفیظ جالندھری بھی۔ پھر تالیاں بجنے لگیں اور میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ چنانچہ میں نے تقریباً دس بارہ منٹ تک روانی سے نپے تلے الفاظ میں تقریر کی۔ مجھے پسینہ آ گیا تھا لیکن میں نے عالی صاحب سے کہا کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے یا آپ کے کسی ساتھی نے مجھے وہاں سولی پر چڑھایا تھا کہ منصور لٹک کر مر جائے گا مگر منصور اس سے امر ہو گیا۔ میں نے آج سے تقریر کا فن سیکھ لیا ہے اور اگر یہی تقریر ہے تو مجھ سے روز تقریر کرواتے رہیے۔

گلڈ میں اس کامیابی کے بعد ہم نے اسے ایسے راستوں پر ڈالا کہ اوپر والے لوگ حیران ہوتے تھے کہ ہم نے تو اس کیلئے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں مغربی پاکستان ریجن کا رائٹرز گلڈ جتنا فعال رہا پھر کبھی نہیں رہا۔

گلڈ کے دستور کے مطابق کوئی شخص ایک عہدے پر دو سے زیادہ بار منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ دوسری ٹرم کیلئے بھی میں منتخب ہوا اگرچہ اس دوران میرے خلاف بڑی سازشیں بھی ہوئیں ۔پہلی ٹرم میں جب میں سیکرٹری تھا تو ایوان صدر میں آدم جی پرائز کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں گلڈ کے سیکرٹری جنرل شہاب الدین' دونوں صوبوں کے سیکرٹری جمیل الدین عالی اور دیگر انعام یافتگان مدعو تھے۔ صدر ایوب وہاں مدعو ہر شخص سے دو منٹ کیلئے ذاتی حیثیت میں بھی بات کرتے تھے۔ جس وقت میری باری آئی اور صدر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھایا تو شہاب صاحب نے کہا کہ سر قتیل صاحب تو آپ کے ''گرائیں'' ہیں۔ تو صدر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کہاں کے ہو بھئی۔ میں نے کہا ہری پور کا۔ انہوں نے مجھ سے ہندکو میں پوچھا تھا جس پر مجھے چکر سا آگیا تھا کیونکہ مجھے تو لاہور میں آئے ہوئے مدت ہو چکی تھی اور میں ہندکو کو تقریباً بھول چکا تھا لیکن میں نے الفاظ سمیٹ کر پہلا جواب ہندکو میں دے دیا۔ پھر انہوں نے ایک دو اور سوالات ہندکو میں پوچھے جن کے جوابات بھی میں نے بہر حال دے دیئے۔ پھر انہوں نے اُردو میں بات چیت شروع کی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بڑے خوش تھے اور کہنے لگے کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم ہری پور کے ہو لیکن تم نے پہلے کیوں نہ بتایا میں نے کہا جی ہری پور کا ہونا میرے لئے کوئی فخر کی بات

نہیں، ہری پور میں تو اور پچیس ہزار آدمی بھی رہتے ہیں، مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ آپ صدر ہیں اور مجھے بطور شاعر جانتے ہیں اس سے وہ بہت خوش ہوئے۔

اگرچہ صدر ایوب مارشل لاء کے بانی تھے اور آج ہم جو کچھ بھگت رہے ہیں انہی کی مہربانیاں ہیں لیکن ذاتی حیثیت میں وہ بہت اچھے تھے اور ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور وہ یہ کہ وہ سچے آدمی تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، اور اس کے علاوہ سچے دل سے محب وطن تھے انہیں طریق حکومت کا جو ڈھانچہ ملا ہوا تھا، اب ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کے اندر رہ کر ہی کام کرنا تھا۔ ان کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ منتقم نہیں تھے۔

اسی ملاقات کے دوران انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بھئی کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ کسی شخص سے صدر صاحب کے اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص مالا مال ہو جائے۔ لیکن میں نے کہا کہ ہمیں ایک رائٹرز کالونی چاہیے۔ انہوں نے مجھ سے درخواست لے کر شہاب صاحب کو دے دی۔ میں نے درخواست میں جگہ کی نشاندہی کی ہوئی تھی جو کہ وہ جگہ تھی جہاں آجکل ریواز گارڈن ہے کیونکہ ان دنوں یہ زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ادیبوں کیلئے یہ بڑی آئیڈیل جگہ تھی۔ لیکن اس کے بعد پتا نہیں چلا کہ یہ درخواست کہاں گئی۔ حالانکہ طریقہ یہ تھا کہ شہاب صاحب یہ درخواست اسی وقت ملٹری سیکرٹری کے حوالے کرتے اور اس پر آرڈر لکھا جاتا مگر انہوں نے نجانے درخواست کدھر کر دی تھی۔ بعد میں جب میں نے شہاب صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے کہ پتا نہیں وہ درخواست کہاں گئی میں نے تو وہ گورنر کو بھیج دی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح کام نہیں ہو گا۔

یہاں سے رائٹرز کالونی کیلئے میری جد وجہد کا آغاز ہوا۔ چنانچہ میں اور میرے ساتھیوں نے جن میں رؤف شیخ اور مرحوم عبدالرشید تبسم تھے مل کر کوآپریٹو سوسائٹی بنائی۔ یہ سوسائٹی ہم نے اپنے خرچ پر بنائی اور رائٹرز گلڈ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ سوسائٹی کی انکوائری کے لیے جب کوئی اہلکاران آتے تھے تو میں انہیں اپنے خرچ سے Entertain کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم نے بہت تھوڑے عرصے میں یہ سوسائٹی منظور کروالی۔ ہم نے اس کی ممبر شپ میں صاف لکھ دیا کہ یہ لاہور کے صرف بے گھر ادیبوں کیلئے ہے جن کے پاس پہلے سے کوئی پلاٹ ' مکان یا جائیداد نہیں ہے۔ اس سوسائٹی کے بہت سے ممبر بن گئے۔ ہم نے رائٹرز کیلئے اصولی طور پر ایک سو پلاٹ منظور کروالیے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ نقوش والے مرحوم طفیل صاحب مجھ سے دو ووٹ زیادہ لے کر گلڈ کے سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ مرحوم شروع سے ہمارے دوست اور ساتھی تھے لیکن انہوں نے یہ الیکشن بالکل سیاسی انداز میں لڑا اور اس پر ان کے کم از کم پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وہ ووٹوں کیلئے جہاز میں بیٹھ کر پشاور ' کراچی اور کوئٹہ بھی جاتے تھے اور گورنر سے سفارش بھی کرواتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے زمانے کے بالکل نواز شریف تھے۔ میں تو دو ووٹوں سے ہار گیا لیکن وہ اپنے ٹھیک ٹھاک کام دکھا گئے۔

رائٹرز کالونی کی کوآپریٹو سوسائٹی کی باڈی گلڈ سے الگ تھی لیکن میں اصولی آدمی تھا اس لئے میں نے کہا کہ میں ایک محاذ پر ہار گیا ہوں تو اب مجھے یہ باڈی بھی ان کے سپرد کر دنی چاہیے۔ مرحوم طفیل صاحب کی تمنا تھی کہ یہ سوسائٹی میرے پاس ہی رہے یا پھر ہم آدھے آدھے عہدیدار رکھ کر کام چلائیں۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں الیکشن میں ہار گیا ہوں اس لئے اب یہ سوسائٹی بھی آپ ہی

چلائیں۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ بعد میں اس کا کیا حشر ہو گا۔

اس سوسائٹی کا بعد میں حشر یہ ہوا کہ وہ کالونی جو لاہور کے صرف بے گھر ادیبوں کے لئے تھی اس میں الاٹمنٹ ایسے ایسے لوگوں کو دی گئی جن کے دو دو مکانات پہلے سے موجود تھے۔ان میں طفیل صاحب کے دوست، رشتہ در، پریس مین، مشین مین، پبلشر اور جلد ساز بھی شامل تھے جن کا ادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

محمد طفیل

''نقوش'' کے مالک و مدیر طفیل صاحب سے میرے تعلقات تقسیم ملک سے کوئی دو سال پہلے کے تھے وہ اور ان کے دوست لطیف فاروقی ایک بار ہری پور آئے تھے تو ایک ایسے موقع پر مجھ سے ملنے کیلئے آئے تب میرے چھوٹے بھائی کی شادی تھی اور دعوت ولیمہ کا دن تھا۔یہاں سے ان سے علیک سلیک شروع ہوئی۔پھر جب میں لاہور آکر سیٹل ہوا تو ان سے پرانی دوستی پھر سے چلی۔انہوں نے ادارہ فروغ اُردو کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور لطیف فاروقی کے ساتھ مل کر کتابیں شائع کرنا شروع کیں۔بعد میں لطیف فاروقی پر اسرار حالات میں اس ادارہ سے علیحدہ ہو گئے اور طفیل صاحب تنہا اسے چلانے لگے اور ادارے کی طرف سے پہلی کتاب احمد ندیم قاسمی صاحب کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' کے نام سے شائع کیا۔بعد میں انہوں نے قاسمی صاحب اور ہاجرہ مسرور کے تعاون سے ''نقوش'' شروع کیا اور خود محض ایک پبلشر کے طور پر اس میں نظر آئے۔

پرچہ ''نقوش'' ترقی پسند بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس زمانے کا ایک اچھا خاصا ترقی پسند گروپ

اس کے ساتھ تھا۔اس لئے پرچہ کچھ اچانک آگے بڑھا مگر اسی دوران ہم نے سنا کہ پرچہ بند کر دیا گیا ہے۔کچھ عرصہ پرچہ بند رہنے کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو یہ ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے نہیں تھا بلکہ کچھ اور لائنوں پر چلنے لگا تھا۔چنانچہ اس کے مدیر بھی کچھ اور لوگ ہی وقتاً فوقتاً مقرر ہوتے رہے۔

پھر ایک دھماکہ خیز خبر سنی کہ طفیل صاحب خود اس کے مدیر بن گئے ہیں اور اب وہی یہ پرچہ ایڈٹ کیا کریں گے۔لوگوں کا خیال تھا کہ نام تو طفیل صاحب کا چلے گا لیکن کام کوئی اور شخص کرے گا کیونکہ بعض دوسرے پرچوں میں یہی رسم چل رہی تھی۔یہ تاثر ایک عرصے تک چلتا رہا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس عرصے میں طفیل صاحب کے اندر ایک تخلیقی قوت بیدار ہو چکی تھی اور وہ خاص طور پر خاکہ نگاری کی صف میں بہت آگے نکل چکے تھے۔چنانچہ جب ان کے خاکے منظر عام پر آئے تو انہوں نے لوگوں کو چونکا دیا۔

انہوں نے پرچے کے عام روش سے ہٹ کر کام شروع کیا۔عام روش تو یہ تھی کہ پرچہ ہر ماہ باقاعدگی سے نکالا جائے مگر انہوں نے خاص نمبر نکالنے شروع کیے اور ایسے ایسے نمبر نکالے کہ دنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔اس بارے میں بھی ان پر الزامات آئے اور کچھ لوگوں نے کہا کہ پس منظر میں تو کوئی اور کام کرتا ہے لیکن سامنے نام طفیل صاحب کا آتا ہے۔مگر میری ذاتی رائے ہے کہ ایسا نہیں تھا۔اگر کچھ بھی تو وہ لوگ طفیل صاحب کی ہدایات پر کام کرتے رہے ہوں گے اور یہ کوئی عام بات نہیں کہ کوئی آدمی ایک ہزار صفحات کا نمبر نکال رہا ہے اور اس کا پورا خاکہ اس کے ذہن میں ہے پھر وہ

پرانے لکھنے والے لوگوں سے اپنی سوچ کے مطابق کام لے رہا ہے۔انہی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ”نقوش“ کے درجنوں نمبر سامنے آگئے اور یہ پرچہ ایک عام پرچے سے ہٹ کر ضخیم نمبروں کا سلسلہ بن کر رہ گیا اور کوئی لائبریری ایسی نہ تھی جہاں یہ موجود نہ ہو بلکہ کسی پڑھے لکھے گھر میں نقوش کا نہ ہونا اس لائبریری اور گھر والے کی کم ذوقی کی دلیل سمجھا جانے لگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ طفیل صاحب کاروباری ذہن رکھنے والے تھے مگر اس دور میں جو شخص بھی کام کرتا ہے اسے سب سے پہلے اپنے باورچی خانے اور اولاد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔اس معاشرے میں گزر بسر کرنے کیلئے اور اچھا مقام پیدا کرنے کیلئے اس کے پاس دولت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب نے بھی انہی لائنوں پر سوچا اور یوں وہ ادب کو بھی بہت کچھ دے گئے اور اولاد کو بھی۔ علاوہ ازیں جائیداد اور پریس بھی بنالیا۔پھر رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری منتخب ہونے کے بعد ایک اچھے ادارے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے تھے وہ بھی حاصل کیے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے ادارے نے ادب کے لیے جو کام کیا ہے وہ کام بہت سے ادارے مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ طفیل صاحب سے میرے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے بلکہ ”نقوش“ کے بنیادی معاونین میں سے ایک میں بھی تھا۔ہم زندگی کے بہت شعبوں میں ایک ساتھ آگے بڑھتے رہے۔انہوں نے میری کتاب ”روزن“ بھی چھاپی۔ مگر اس کتاب کے سلسلے میں بھی ایک عجیب واقعہ ہوا وہ یہ کہ قیام پاکستان سے پہلے مکتبہ اُردو نے میرے ساتھ ایک کتاب کا معاہدہ کیا چنانچہ میں نے اپنی کتاب ”جلترنگ“ کا مسودہ مکتبہ اُردو والے چودھری رشید صاحب کے بڑے بھائی چودھری نذیر

صاحب کو دے دیا۔ بعد میں یہ مسودہ چودھری نذیر صاحب کے ہاں سے گم ہو گیا۔ پھر تقسیم کے بعد میں نے ایک اور مجموعہ طفیل صاحب کو دینے کیلئے مرتب کیا اور اس کا نام ''روزن'' رکھا جس کا دیباچہ سعادت حسن منٹو کو لکھنا تھا جو نیا ادارہ میں بیٹھتے تھے۔ یہ ادارہ مکتبہ جدید والوں کے بھائی چودھری نذیر صاحب کا تھا۔ سعادت حسن منٹو وہیں بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ مسودہ لے کر وہیں اپنے دراز میں رکھ لیا۔ میں نے مکتبہ جدید والوں کو ''جلترنگ'' کا جو مسودہ دیا تھا وہ تو کھو چکا تھا اور میرے پاس اس کا کاپی بھی نہیں تھا۔ اس لئے جب انہیں پتا چلا کہ میرا ایک اور مسودہ منٹو صاحب کے پاس پڑا ہے تو انہوں نے پراسرار طور پر اسے وہاں سے غائب کروا دیا۔ منٹو صاحب بھی حیران تھے اور میں بھی کہ یہ مسودہ کہاں چلا گیا ہے کہ اچانک پتا چلا کہ وہ مسودہ ''جلترنگ'' کے نام سے مکتبہ جدید والوں کی طرف سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ مسودے کو یوں بدلنا ایک بھونڈا طریقہ تھا' پھر بھی میں چپ ہو گیا لیکن مجھے طفیل صاحب سے بہت شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ میں ان سے قیمت وصول کر چکا تھا۔ اب میں انہیں وہ مسودہ کہاں سے دیتا اور وہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میں نے جھوٹ بول کر ان سے پیسے وصول کیے ہیں لیکن بدگمانی کی فضا اس لئے پیدا نہ ہوئی کہ میرے پاس کافی مواد پڑا تھا اور پھر میں اچھی رفتار سے لکھنے والا آدمی ہوں اس لئے میں نے ادھر اُدھر سے کوشش کر کے انہیں ایک مجموعہ مکمل کر کے دیا۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں میرا سب سے کمزور مجموعہ یہی تھا۔ اس میں بہت کمزور کلام تھا کیونکہ میں نے محض ایک فرض نبھانے کیلئے اور اچھی ساکھ رکھنے کیلئے انہیں یہ بندوبست کر کے دیا تھا۔ اس کے بعد بھی طفیل صاحب سے میرے تعلقات چلتے رہے۔

میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے مغربی ریجن کا دوبار سیکرٹری چنا گیا۔ ہم ایک ہی ٹیم بنا کر چل رہے تھے کہ دوسرے الیکشن کے دوران مجھے پتا چلا کہ وہ درپردہ میرے مقابل آنا چاہتے ہیں۔ نجانے ان کے ذہن میں یہ بات کیسے آگئی تھی کہ وہ گلڈ پر قبضہ کرلیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو کہنے لگے کہ بالکل نہیں اور یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ بات کہنے والے مرتضیٰ برلاس تھے اور وہ بڑے معتبر آدمی تھے۔ مرتضیٰ برلاس ان دنوں گجرات میں اسسٹنٹ کمشنر لگے ہوئے تھے۔ طفیل صاحب کی عادت تھی کہ وہ جو کام بھی کرنا چاہتے تھے اس میں آخری حد تک جو حربہ بھی استعمال ہو سکتا تھا استعمال کر لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ احسان دانش کا مرتضیٰ برلاس پر بہت اثر ہے اس لئے انہیں گجرات مرتضیٰ برلاس صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں ووٹ دیں۔ برلاس صاحب بڑے اصول کے آدمی ہیں اور اگرچہ وہ احسان دانش کا بہت احترام کرتے تھے مگر وہ مجھ سے وعدہ کرچکے تھے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں قتیل صاحب سے ووٹ دینے کا وعدہ کرچکا ہوں۔

جب مجھے اس واقعہ کا برلاس صاحب کے ذریعے علم ہوا تو میں چوکنا ہو گیا کہ درون پردہ کچھ سازش ہو رہی ہے۔ تاہم ان سب باتوں کے باوجود میں ریجنل سیکرٹری کا الیکشن جیت گیا۔ الیکشن جیتنے کے بعد میں نے رضاکارانہ طور پر کہا کہ طفیل صاحب میرے پرانے ساتھی ہیں میں انہیں خازن تجویز کرتا ہوں چنانچہ یہ خازن بن گئے۔

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ میرے مقابلے میں کیوں کھڑا ہونا چاہتے تھے۔ حالانکہ ہمارے دوستانہ تعلقات تھے اگر وہ مجھے کہتے کہ میں سیکرٹری بننا چاہتا ہوں تو میں پیچھے ہٹ جاتا کیونکہ اس کام

کی کون سی مجھے تنخواہ ملتی تھی جبکہ وقت بھی دینا پڑتا تھا۔ میرا تو یہ حال تھا کہ میرا کاروبار متاثر ہو رہا تھا۔ پھر گلڈ میں آتے ہی میں نے کچھ ایسی اصلاحات کر دی تھیں کہ اگر کوئی سیکرٹری بد دیانتی کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکتے۔ میں نے سگریٹ قطعاً بند کر دیئے تھے کیونکہ اگر گلڈ کے کھاتے سے دو پیکٹ بھی نکالے جاتے تو اچھے خاصے پیسے بنتے تھے۔ اسی طرح میں نے کھانے کا بھی منع کر دیا ہوا تھا۔ صرف چائے کی اجازت تھی۔ اب باہر سے جو لوگ آتے تھے ان سے میرے دوستانہ تعلقات ہوتے تھے جس وجہ سے کھانے وغیرہ کے اخراجات مجھے اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتے تھے۔ اس لئے مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ الیکشن کے چکر میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔

خیر جب اگلے الیکشن آئے تو دستور کے مطابق صورتحال یہ تھی کہ کوئی شخص دو ٹرم کے بعد اسی عہدے کیلئے الیکشن نہیں لڑ سکتا البتہ وہ سیکرٹری جنرل کیلئے الیکشن لڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں سیکرٹری جنرل کے الیکشن کیلئے امیدوار کھڑا ہو گیا۔ اس بار طفیل صاحب بھی کھل کر سامنے آ گئے اور کہنے لگے کہ یار دوستانہ مشغلہ ہے اس لئے چلو الیکشن لڑتے ہیں ویسے بھی مجھے کون ووٹ دے گا۔ ان کا اندازِ کلام ایسا ہی تھا لیکن میں نے اور دوسرے دوستوں نے دیکھا کہ انہوں نے یہ الیکشن پارلیمنٹ کا الیکشن سمجھ کر لڑا وہ اور ان کے آدمی ہر جگہ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے اور وہاں کے ہر بڑے آدمی سے سفارشیں کروائیں۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس وقت کے گورنر' ایم این اے صاحبان اور لوگوں کے لواحقین کے ذریعے انہیں کہلوایا۔ کراچی کا ایک گروپ میرے حلیفوں میں سے تھا' آخری دن دیکھا کہ وہ تین چار آدمی بھی ٹوٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اور سلطان رشک کو پتا چل گیا تھا کہ ہم ہار جائیں گے اور میں نے سلطان رشک کو کہا بھی کہ آپ ووٹ دینے کیلئے نہ آئیں کیونکہ ان کی

لابی بہت مضبوط ہو چکی ہے اور ہم ہار جائیں گے مگر انہوں نے کہا کہ میں آ کر ووٹ تو ضرور دوں گا باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ چنانچہ وہ پنڈی سے آئے اور ووٹ دے کر کراچی رخصت ہو گئے۔ اس طرح میرے دیگر ساتھیوں نے بھی میرا ساتھ دیا اور ان میں سے کسی نے بھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ باقی سودے بازی میں آ کر نہیں کر سکتا تھا جبکہ طفیل صاحب کے ہاتھ میں سودے بازی آ گئی تھی جو کہ پلاٹوں کی الاٹمنٹ تھی۔ یہاں ایک صاحبہ ہیں مس صدیقی جو "تحریریں" رسالہ نکالتی ہیں۔ ان کا محض ایک ووٹ لینے کے لئے یہ سودے بازی ہوئی کہ ان کو اور ان کے بھائیوں کو چھ پلاٹ دیئے گئے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ صرف دو ووٹوں سے جیت گئے لیکن میں نے سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہر کرتے ہوئے کہا کہ طفیل صاحب اگرچہ میں ہار گیا ہوں لیکن میرا پورا تعاون آپ کے ساتھ ہو گا۔ اگر آپ کوئی اچھا کام کریں گے تو داد لیں گے اور اگر برا کام کریں گے تو لوگ آپ کے گریبان ہاتھ ڈالیں گے۔

بعد میں آ کر جب ہماری رنجش دور ہوئی تو میری ایک کتاب کے دیباچے میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ الیکشن ہارنے کے باوجود قتیل صاحب نے میرے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو ہارے ہوئے لوگ کرتے ہیں بلکہ مجھے کام کرنے دیا۔ اس طرح وہ پوری طرح کام کرتے رہے اور انہوں نے جو کام کیے ان میں کچھ اچھے کاموں کے علاوہ کچھ کمزور کام بھی تھے۔ جن میں سب سے برا کام یہ تھا کہ وہ گلڈ اور گلڈ ٹرسٹ کی جائیداد اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے' اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بعد ایک ایسا نیا آدمی سیکرٹری جنرل کے عہدے پر آئے جو ان کے بس کا ہو۔

دستور کے مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہر بار ایک دوسرے صوبے سے سیکرٹری جنرل لینا ہوتا تھا اور اس کے بار صوبہ سرحد کی باری تھی۔ وہاں فارغ بخاری جیسا نامور آدمی کھڑا ہوا تو طفیل صاحب نے پشتو کے ایک ادیب میاں سید رسول رسا کو کھڑا کر دیا اور پوری سرکاری مدد دلوا کر انہیں کامیاب کروا دیا۔ دراصل انہوں نے دائیں اور بائیں بازو کا چکر بنا لیا تھا اور موجودہ حالات میں جسے بھی گرانا ہوا سے کمیونسٹ اور سرخا کہہ دیا جائے اور مد مقابل کو عاشق رسول ﷺ کہہ دیا جائے تو کام بن جاتا ہے۔ یہی یہاں ہوا چنانچہ وہ عاشق رسول ﷺ جیت گئے اور جیتنے کے بعد تلاش کرنے کے باوجود چار سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہے مگر وہ نظر نہیں آئے۔ اس طرح ایک تو گلڈ کے الیکشن نہیں ہو رہے اور یہ ایک مردہ گھوڑا بن کر رہ گئی ہے دوسرے لوگوں نے ڈھنڈورے پیٹے کہ سیکرٹری جنرل کہاں ہیں؟ پشاور والوں کو بھی آج تک ان کی شکل نظر نہیں آئی۔

وہ رائٹرز گلڈ جسے قدرت اللہ شہاب' جمیل الدین عالی' سید وقار عظیم اور میں نے اپنا خون دے کر ان لائنوں پر چلایا تھا کہ یہ ہر قسم کے ازم اور دائیں بائیں بازو کے جھگڑوں سے ہٹ کر ایک ٹریڈ یونین کی حیثیت اختیار کر رہی تھی۔ وہ آخر کار ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھ گئی اور آج یہ پتا نہیں چلتا کہ گلڈ یہاں کہاں ہے۔ جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت ہے بھی یا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان سے جا کر پوچھئے جنہوں نے اس کا حشر کیا۔

سید عبدالحمید عدم

سید عبدالحمید عدم فطرتاً اور حقیقتاً بڑے معصوم آدمی تھے۔ میں نے کبھی کوئی ان سے بڑا معصوم

آدمی نہیں دیکھا۔ اگرچہ ان کے بارے میں میں کچھ داستانیں بنی ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جب دفتر سے تنخواہ لے کر نکلتے تو دو چار دن کے بعد گھر اس وقت پہنچتے جب ساری تنخواہ ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ ملٹری اکاؤنٹس کے محکمہ میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر تھے اور اس سے آگے ترقی اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کہنا تھا کہ جتنا کام ہو سکا ہے صرف اتنا ہی کروں گا۔ جب ان کا تنخواہ کے بارے میں یہ رویہ جاری رہا تو ان کے بچوں نے کوشش کر کے آدھی تنخواہ خود وصول کرنا شروع کر دی تھی جو انہیں گھر پہنچ جاتی تھی۔

لوگ عدم صاحب سے ان کی تنخواہ کھا پی جاتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے پاس کوئی پیسہ نہ بچتا تو چونکہ وہ نامور آدمی تھے اور لوگ لحاظ کرتے تھے اس لئے ان کے بیوی بچے یا دوست ان کے نام پر قرض لے کر خرچ کر لیتے تھے جس سے بدنامی عدم صاحب کی ہوتی تھی۔

جہاں اب لاہور ہوٹل گرایا جا رہا' اس کے ساتھ ایک کوٹھی تھی جس میں کئی پورشن تھے اور اس کے ایک پورشن میں ہمارے دوست شاد امرتسری رہتے تھے اور ان دنوں غالباً کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ بعد میں وہ ریڈیو میں پروڈیوسر ہو گئے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میرے پاس علی الصبح ایک آدمی میرے ہوٹل میں آیا۔ وہاں سے میرے ہوٹل کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ تھا۔ اس نے مجھے آ کر کہا " جلدی اٹھئے عدم صاحب شدید زخمی ہیں اور شاد امرتسر کے کمرے میں پڑے ہیں اور شاد صاحب چھوڑ کر کالج پڑھانے کیلئے چلے گئے ہیں"

میں بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ عدم صاحب بستر پر لیٹے ہیں۔ ان کے ایک جبڑے کے اوپر کا گوشت اڑا ہوا ہے اور ایک آنکھ سوجھی ہوئی ہے۔ عدم صاحب کراہ رہے تھے میں نے پوچھا" عدم

صاحب کیا ہو گیا ہے“

کہنے لگے ”وہ الطاف مشہدی ہے نا، حرامزادہ۔ وہ اور میں رات انار کلی میں رائل ہوٹل کی اوپر والی منزل پر بیٹھے تھے۔ اس نے کہا کہ:

پتا بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے

میں نے کہا کہ ہلتا ہے اور بغیر اس کی رضا کے ہلتا ہے۔ وہ پھر بھی بضدر رہا کہ ہلتا ہے اور میں نے کہا کہ نہیں ہلتا پھر اس نے کہا کہ حرامزادے کیوں بکواس کرتے ہو۔ نہیں ہلتا' میں نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو اور تم جو ثبوت چاہو میں دے سکتا ہوں۔ کہنے لگا مثلاً زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اس کی مرضی نہیں مر سکتے۔ میں نے کہا میری مرضی ہو تو میں ابھی مر سکتا ہوں۔ کہنے لگا مر کے دکھاؤ چنانچہ میں نے اوپر سے چھلانگ لگادی۔ ان کی تکیہ کلام حضور تھا“ کراہ کو بولتے رہے ”حضور! میں نے چھلانگ لگائی تو نیچے ایک چھجا تھا پہلے میں اس پر لگا اور پھر زمین پر گرا۔ وہ تو مجھے وہیں چھوڑ کر چلا گیا اور کسی نے مجھے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا ہے“

میں نے کہا ”آپ فکر نہ کیجئے میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔“

کہنے لگے ” نہیں حضور ڈاکٹر کو چھوڑیئے۔ میں نے تو آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ کے پاس وسکی کا کوئی کوارٹر پڑا ہو گا“

میں نے کہا ”عدم صاحب وسکی تو آتی رہے گی سب سے پہلے تو آپ کا علاج ہونا چاہیے“ ساتھ ہی ایک ہندو ڈاکٹر رہتا تھا۔ میں نے اسی لڑکے کو بھیج کر جو مجھے بلانے کے لئے آیا تھا ڈاکٹر کو

بلایااورانہیں فرسٹ ایڈدی۔اور پھر ان کے مطالبے کے مطابق کوارٹر کا بھی انتظام کیااور آخر کار انہیں ایک آدمی کے ساتھ تانگے میں بٹھا کر فتح گڑھ روانہ کیا جہاں یہ ان دنوں رہتے تھے۔بعد میں میں عدم صاحب کو پوچھا کرتا تھا کہ کیوں جی اس کی رضا کے بغیر پتاہلتا ہے یا نہیں تو وہ میری بات سن کر ہنسا کرتے تھے۔

عدم صاحب ہی سے متعلق ایک اور واقعہ یہ بھی ہے کہ یہ تقسیم کے تھوڑی دیر بعد راولپنڈی ٹرانسفر ہو گئے تھے اور وہاں جی ایچ کیو میں کام کرتے تھے۔انہی دنوں میں نے راولپنڈی میں ایک سکھ دوست سے سٹیشنری کی دوکان خریدی تھی اور کچھ دیر وہاں بیٹھتا بھی رہا۔

ایک دن صبح صبح میں نے دوکان کھولی ہی تھی کہ یہ وہاں آگئے اور کہنے لگے۔ "قتیل صاحب مبارک ہو" میں نے کہا" کس بات کی "

کہنے لگے "مجھے ترقی مل گئی ہے" اس وقت انہیں ڈپٹی اسسٹنٹ کنڑولر ملٹری اکاؤنٹس کی ترقی ملی تھی۔کہنے لگے "میں اس لباس میں بڑاافسر نظر آتاہوں یا نہیں؟"

میں نے کہا" عدم صاحب آپ کی اپنی حیثیت ہے۔آپ کو لوگ لباس سے تھوڑاہی پہچانیں گے"

کہنے لگے "نہیں نہیں یہ پتلون بہت خراب ہے۔آپ یوں کریں کہ میری پتلون آپ لے لیں اور اپنی پتلون مجھے دے دیں۔"

میری پتلون بالکل نئی تھی جو میں نے بڑے شوق سے سلوائی تھی۔اس لئے میں نے سمجھاناچاہاکہ عدم صاحب سائز کا بھی تو فرق ہے۔کہنے لگے "کوئی فرق نہیں آپ پتلون اتار دیئے اور دے دیجئے

"

میں نے ان کی پتلون پہنی تو بہت کھلی تھی۔ میں نے اسے تہمند کی گانٹھ دے کر گزارا کیا اور جب انہوں نے میری پتلون پہنی تو وہ انہیں اتنی تنگ تھی کہ انہیں اوپر کے تین بٹن کھلے چھوڑ نے پڑے ۔ہم دونوں ہی عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔

میرے پبلشرز

کسی لکھنے والے کو اپنے آغاز ہی میں صاحب تصنیف بن جانے کا بڑا شوق ہوتا ہے جبکہ دیکھا جائے تو خاص پختگی کے زمانے میں ہی کوئی تصنیف لے کر میدان میں آنا چاہیے۔ لیکن بہر حال یہ ایک اضطراری کیفیت ہوتی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ہر مبتدی سوچتا ہے کہ میں صاحب تصنیف بن جاؤں۔ چنانچہ میں نے بھی سوچا کہ اب میری بھی ایک کتاب آ جانی چاہیے۔اس زمانے میں بہاولپور میں ایک ادارہ تھا جس کا نام عباسیہ اکیڈمی تھی۔اس کے مالک حیات ترین تھے جو میرے دوست بن گئے۔ وہ بہت اچھے انسان تھے اور ایک رسالہ "ستلج" بھی نکالتے تھے۔ میں ستلج میں باقاعدگی سے چھپتا تھا چنانچہ انہوں نے جب عباسیہ اکیڈمی سے پبلشنگ کا پروگرام بنایا تو خود مجھ سے کہا کہ آپ اپنی کوئی تصنیف مجھے دے دیں۔ ذہن میں تو پہلے سے ہی تھا اس لئے میں نے ان سے کہا کہ گیتوں کا مجموعہ چھاپ دیجئے۔

دو سو روپے معاوضہ طے پایا۔ لیکن میں بہر حال وہ خوش نصیب تھا جسے اپنی پہلی تصنیف پر ہی کچھ معاوضہ ملا۔ معاوضہ مجھے دے دیا گیا اور 1947ء ہی میں مجموعہ چھپ گیا۔ اگر اسے میرے بچپن

کے گیتوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ مجموعہ ابھی تک چھپ رہا ہے اور اب اس کا آٹھواں ایڈیشن چھپنے والا ہے۔ اب اسے دیکھتا ہوں تو تھوڑی سی ہنسی بھی آتی ہے کہ میں نے کیا چیز چھپوادی لیکن اس عمر کے اعتبار سے وہ بہر حال اچھے گیت تھے۔

اس مجموعے کے اور لاہور آنے کے بعد مکتبہ جدید نے مجھ سے ایک مجموعے ''جلترنگ'' کا معاہدہ کیا اور اس کے پانچ سو روپے طے پائے۔ پھر نیا ادارہ نے میرا مجموعہ ''گجر'' لیا اور اس کے بھی پانچ سو روپے طے پائے۔ اس کے بعد محمد طفیل صاحب نے مجموعہ ''روزن'' لیا تو اس کے بھی پانچ سو روپے طے پائے یہ سب معاوضے یکمشت کے حساب سے چل رہے تھے۔

اس زمانے میں کسی مصنف کو معاوضہ مل جانا بڑی بات تھی۔ ایک مصنف اور ایک پبلشر کا واقعہ مشہور ہے کہ مصنف پبلشر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ یہ پیسے لیجئے اور معاہد منسوخ کر دیجئے۔ پبلشر نے کہا اچھا تو اور پیسے دوں اور پیسے دینے کی بجائے اسے تھپڑ دے مارا۔ یہ کتنا افسوسناک واقعہ ہے۔

اس زمانے میں اندرون لوہاری گیٹ وغیرہ میں بھی پبلشر ہوا کرتے تھے جو مسودے کی قدرو قیمت کا اندازہ اس کے نفس مضمون یا اس کی ادبی قدر سے نہیں بلکہ ہاتھ پر تول کر کرتے تھے۔ بہر حال اس پیشے میں شروع سے وہ لوگ زیادہ رہے ہیں جن کا مسئلہ ادب کی ترویج واشاعت نہیں تھا بلکہ پیسے کمانا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ادب چھاپتے تھے جس سے ان کو آمدن ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ پبلشر بڑے نفاست پسند بھی تھے۔

ایک نام لیتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ نام چودھری نذیر احمد کا ہے جو پہلے اپنے چچا چودھری برکت علی کے ساتھ مکتبہ جدید سے وابستہ تھے لیکن بعد میں انہوں نے نیا ادارہ کے نام

سے اپنا علیحدہ ادارہ قائم کیا اور پرچہ ''سویرا'' نکلا۔ یہ صاحب انتہائی طور پر کاروباری ذہن رکھتے ہوئے بھی کتاب کی چھپائی اور نفاست کے معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ جب کاغذ لاتے تو کاغذ کی ہر ایک شیٹ کو پرکھتے اور پھر لیتے اور کوئی کاغذ تھوڑا سا ناقص ہوتا تو اسے الگ کر دیتے۔ اس کے بعد جب کتابت کا مرحلہ آتا تو وہ چار چار بار پروف ریڈنگ کرواتے تھے۔ جب چھپائی کا وقت آتا تو پریس میں جا کر سنگساز کے ساتھ چائے وغیرہ لے کر بیٹھ جاتے۔ اس زمانے میں پتھر کا کام ہوتا تھا۔ آخر میں وہ جلد ساز کے پاس جا کر بھی خود بیٹھتے اور انہوں نے کتابوں کے جو پشتے بنوائے وہ آج بھی کسی کو نصیب نہیں ہیں۔ یہ ان کا ذاتی ذوق تھا حالانکہ کتاب ویسے بھی بک سکتی تھی۔ اس لئے انہیں خراج تحسین عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ان ک بعد کئی سال تک ایسا پبلشر نہیں آیا۔ ایک چیز جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے' کم ہے یا یہ کہ اس پیشے میں جتنے بھی لوگ آئے مصنف کے ساتھ ان میں سے بیشتر کا سلوک دیانتدارانہ نہیں تھا۔ اگر کوئی پبلشر ایک ہزار کا ایڈیشن چھاپ لیتا تھا تو وہ عام طور پر اس کی زندگی تک ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ اب تو کچھ ایسا ہے کہ پبلشرز نے مصنف کا مال ہضم کرنے کی عجیب عجیب ترکیبیں نکال لی ہیں۔

یوں تو میں کئی پبلشرز کا ستایا ہوا ہوں لیکن میں ایک پبلشر کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ یہ صاحب پہلے سرکاری ملازم تھے اور ملازمت ہی کے زمانے میں انہوں نے پبلشنگ کا کام شروع کر دیا تھا۔ پھر انہیں جب وہاں سے سروس چھوڑنا پڑی تو یہ کل وقتی پبلشر بن گئے۔ مجھ سے ان کے تعلقات بہت قریبی تھے اور یوں نظر آتا تھا جیسے ان سے زیادہ میرا کوئی اور ہمدرد یا دوست نہیں

ہے۔انہوں نے تجویز پیش کی کہ اپنی چھ سات کتابیں اشاعت کیلئے مجھے دے دیں۔میں چھاپوں گا۔ گھر کا معاملہ ہے آپ کی کتابوں کی حفاظت بھی ہو جائے گی۔اس زمانے میں میرے ایک بیٹے کی شادی ہو رہی تھی اور مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی میں نے شادی کے باقی اخراجات کا انتظام تو کیا تھا لیکن ولیمے کی دعوت کیلئے میں نے سوچا تھا کہ جو رائلٹی ملے گی اس سے یہ خرچ کرلوں گا۔ اس لئے میں تمام انتظامات سے مطمئن ہو گیا تھا۔

جب شادی کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ٹالنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ شادی میں صرف چار دن باقی رہ گئے تو انہوں نے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک معاہدہ میرے سامنے رکھ دیا اور ساتھ ہی نوٹوں کا ایک بنڈل بھی نکال کر رکھ دیا۔یہ ایک نفسیاتی مار ہوتی ہے کہ پیسہ بھی سامنے رکھ دو اور ایک مشکل سا معاہدہ بھی سامنے رکھ دو تاکہ انسان اپنی مجبوری کی خاطر وہ معاوضہ قبول کر لے۔اس میں لکھا تھا کہ یہ معاوضہ دو ایڈیشن کیلئے ہے اور تصور کر لیا گیا تھا کہ ایک کتاب کی قیمت بیس روپے ہو گی۔ چنانچہ بیس روپے کے حساب سے سات کتابوں کا معاوضہ فرض کر کے پیسے بنائے گئے تھے۔میں نے کہا کہ یہ دو ایڈیشنوں کا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔کہنے لگے آپ کو پتا ہے کہ ادبی کتاب بکتی نہیں ہے۔میں نے کہا کہ یہ بات تو میں گزشتہ پچاس برسوں سے سنتا آرہا ہوں۔ لیکن میری کتاب تو بکتی ہے اور میری ہر کتاب کے اب تک چھ چھ سات سات ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔میں نے کہا ”آپ کو پتا ہے کہ چار دن کے بعد میرے بیٹے کا ولیمہ ہے اس لئے میں یہ پیسے لے رہا ہوں لیکن احتجاج کرتے ہوئے لے رہا ہوں۔اگر آپ میری حق تلفی کر کے کروڑ پتی بن جاتے ہیں تو بن جایئے

اور میں نے وہ رقم اٹھالی"

جب میرے ساتھ اتنی بڑی بے ایمانی ہوئی تو مجھے جگہ جگہ اس کی باتیں کرنی چاہیے تھیں۔ چنانچہ میں نے دو چار جگہ یہ بات کی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے ملے تو بڑا شکوہ کیا کہ آپ میرے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا" بھئی تم جس کے ساتھ یہ سلوک کروگے تو وہ شور تو مچائے گا " چنانچہ انہوں نے کہا" لیجیے میں دو ایڈیشن کا لفظ کاٹ کر ایک ایڈیشن کر دیتا ہوں" ایک ایڈیشن کر دیا۔ لیکن چوتھا سال ہونے کو ہے ان کتابوں کا پہلا ایڈیشن ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس عرصے میں دو کی بجائے چار ایڈیشن بک سکتے تھے۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ رائلٹی مقرر کرتے وقت ہر کتاب کی مجموعے "ہریالی" اور "ابابیل" آئے ہیں۔ تو ان کی قیمت پچاس پچاس روپے رکھی ہوئی ہے۔ جب کبھی ہم اس مسئلے کا بیٹھ کر فیصلہ کرنا چاہیں گے تو وہ کوئی ایسا رویہ اختیار کریں گے کہ سچے وہی ہوں گے یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی رکشا پر بیٹھ جایئے اور میٹر تیز چلنے پر احتجاج کیجیے تو رکشے والا الٹا آپ ہی کو ڈانٹے گا کہ آپ جھوٹے ہیں اور میں سچا ہوں۔ یہی صورت حال ہمارے پبلشرز کی ہے۔

پبلشرز کے سلسلے میں ادیبوں میں عجیب عجیب لطیفے بھی مشہور ہیں مگر ان سب لطیفوں کی بنیاد حقیقتوں پر ہی ہے۔ ویسے بھی مصنف بیچارا یہی کر سکتا ہے کہ آپ واقعہ کو لطیفہ بنا کر بیان کریں۔ خود بھی ہنسے اور دوسروں کو بھی ہنسائے اور وہ رنج بھول جائے جو پبلشر کی طرف سے اسے ملا ہے۔

تقسیم ملک سے پہلے ساحر لدھیانوی جب لاہور میں تھے تو ایک بہت بڑے ترقی پسند پبلشر سے ان کے مراسم تھے۔ "تلخیاں" کا دوسرا ایڈیشن انہوں نے ہی چھاپا تھا۔ ساحر صاحب نے معاوضے

کے کچھ پیسے تو قسطوں میں وصول کر لیے تھے جبکہ ایک سو روپے ابھی باقی تھے۔ ساحر کے ایک دوست رام پرکاش اشک راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور نظم کے شاعر تھے۔ انہوں نے نظمیں تو بہت کم تھیں لیکن جو بھی کہی تھیں بہت عمدہ کہی تھیں اس زمانے میں وہ لاہور میں ایل ایل بی کر رہے تھے اور ایک ہوسٹل میں مقیم تھے۔ جب دونوں کی جیب میں کوئی پیسہ نہ رہا تو ساحر نے کہا کہ چلو یار میں نے فلاں پبلشر صاحب سے ایک سو روپیہ لینا ہے' دوکان کھل گئی ہو گی چل کر کوشش کرتے ہیں۔

صبح کا وقت تھا یہ وہاں پہنچے تو وہ پبلشر ان کا ایک چھوٹا سا بیٹا جواب کافی بڑا ہو گیا ہے' دکان پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑے پرتپاک ان کا استقبال کیا اور پوچھا کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔ ساحر نے بتایا کہ آپ کی طرف ایک سو روپیہ باقی ہے' ضرورت بہت شدید ہے اس لئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے حسب معمول جواب دیا کہ ہمارے ہاں تو رات ہنڈیا نہیں پکی اور آپ تو جانتے ہیں کہ کتابوں کی خریداری تو ہے نہیں اس لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہیں بلکہ میں تو اب پیشہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر پبلشرز ہمیشہ پیشہ تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن پیشہ چھوڑتے بھی نہیں۔ ساحر نے کہا" ٹھیک ہے آپ پیشہ تبدیل کر لیجئے لیکن جب تک یہ پروفیشن ہے اس وقت تک تو ہمارا جو حق بنتا ہے وہ دیجئے" ساحر لدھیانوی کے بقول انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی اندر دو انگلیوں سے کچھ گنا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ساحر سے کہا" یہ تو رکھ لیجئے باقی نوے روپے بھی میں آپ کو آہستہ آہستہ دے دوں گا" ساحر دس روپے کا

نوٹ لے کر چلنے لگا تو رام پرکاش صاحب نے کہا" بھوک لگی ہے اس لئے چلو انارکلی چل کے ملا حلوائی سے ناشتہ تو کریں،، پبلشر کا بیٹا یہ سن کر رونے لگا اور کہنے لگا" میں بھی چچا کے ساتھ ناشتہ کروں گا،، ساحر نے اس بچے کو ساتھ لیا' راستے میں سگریٹ وغیرہ لئے اور چونکہ رات سے فاقہ زدگی کا عالم تھا اس لئے ناشتہ کرنے لگے۔ اتنے میں وہ پبلشر صاحب بھی وہاں آ گئے اور کہنے لگے " چچا بھتیجا اکیلے اکیلے کھا رہے ہو' ہمیں نہیں پوچھو گے،، ساحر نے کہا " آپ بھی بیٹھئے،، چنانچہ وہ بھی بیٹھ گئے اور ناشتہ کیا اور دس روپے میں سے جو باقی بچا تھا وہ وہاں ادا کیا اور دو دوست سگریٹ پیتے ہوئے وہاں سے واپس چل پڑے۔

میرے ڈسٹری بیوٹرز

ادب میں ادیبوں کے ساتھ جو سلوک پبلشر کرتا ہے یا جو حیثیت پبلشر کی ہوتی ہے فلم لائن میں وہی حیثیت ڈسٹری بیوٹر کی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ڈسٹری بیوٹر کا پیسہ بھی فلم میں خرچ ہوتا ہے لیکن سب کوششیں پروڈیوسر کی اپنی ہوتی ہیں۔ ابتدائی پیسہ پروڈیوسر کا اپنا ہی ہوتا ہے لیکن جب ڈسٹری بیوٹر اس میں داخل ہوتا ہے تو فلمساز رفتہ رفتہ پیچھے چلا جاتا ہے اور ڈسٹری بیوٹر آگے آ جاتا ہے ۔جب فلم مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا مالک ڈسٹری بیوٹر بن جاتا ہے۔ حسابات اور بکنگ اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور جس طرح پبلشر کا پہلا ایڈیشن کبھی ختم نہیں ہوتا اس ڈسٹری بیوٹر کا دیا ہوا روپیہ بھی فلمساز کے سر سے نہیں اترتا اور وہ جو کچھ شروع میں لے چکا ہوتا ہے اس پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی پیسے آ جائیں تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔

میں شاعر کے علاوہ فلمساز بھی بنا ہوں اور اس سلسلے میں میرے تجربے اتنے تلخ ہوئے کہ میں نے توبہ کر لی کہ آئندہ فلم پروڈیوس نہیں کروں گا۔ شاعری کا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ تو مجبوری ہے اور وہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہو چکی ہوتی ہے اس لئے اندر جو شاعر بیٹھا ہوتا ہے وہ باہر کے آدمی کو لکھنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ شاعری پبلشرز کے روپے کو دیکھ کر چھوڑی نہیں جا سکتی۔ بہر حال میں نے فلمساز چھوڑ دی کیونکہ اس کا تعلق ذوق سے نہیں بلکہ صنعت اور کاروبار سے تھا۔

ہوا یوں کہ میں نے ''اک لڑکی میرے گاؤں کی'' کے نام سے ایک اُردو فلم شروع کی۔ یہ پکچر اپنے وقت میں تیسری رنگین فلم تھی کیونکہ ان دنوں ابھی رنگین فلموں کا زمانہ شروع ہوا ہی تھا ۔اس پکچر میں اس وقت کی بہت بڑی کاسٹ تھی ۔ فلم اناؤنس کی تو اچھا رسپانس ملا اور اس کے گاہک بھی آ گئے۔ فلم کا افتتاح بے نظیر تھا کیونکہ میرا حلقہ احباب فلم کے علاوہ ادب اور صحافت سے بھی تھا اور اس زمانے میں وزراء' بڑے بڑے افسران' ادیب اور اخبار نویس سب اس میں شامل ہوئے تھے۔

ہم نے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی۔ میرے ڈائریکٹر ایک ایسے بدنام زمانہ ڈائریکٹر تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ شخص اپنے باپ کا بھی لحاظ نہیں کرتا اور اس سے بھی دھوکا کرتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں ہو سکتا ہے کہ کسی اور کے تلخ تجربات ہوں اس لئے میں تو نہیں ہی ڈائریکٹر لوں گا۔ چنانچہ میں نے پے منٹ کا جو پہلا چیک کاٹا وہ ان ڈائریکٹر کا تھا۔ جب کام شروع ہوا تو پہلے دن کی شوٹنگ ہی میں انہوں نے میرے ساتھ جو کیا اسے

میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔

بات ڈسٹری بیوٹر کی ہو رہی تھی۔ اسے تو پیسے روک لینے اور کم پیسے دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ڈائریکٹر صاحب کی ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں تو ڈسٹری بیوٹر نے پیسے روکنے شروع کر دیئے۔ ڈائریکٹر صاحب کے بھی کچھ مقاصد تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ دوستی کے پردے میں جن روابط کی ترویج کی اور میرے ساتھ اپناوہ سلسلہ شروع کیا جوان کی فطرت میں تھا تو ان کے مقاصد ظاہر ہونے لگے۔ انہوں نے اپنی ایک الگ پلاننگ شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی ڈسٹری بیوٹر سے مل کر ساتھ ساتھ ایک اور فلم بنانا شروع کر دی۔

میں نے ڈائریکٹر صاحب کو پہلے وارننگ دی اور پھر انہیں علیحدہ کر دیا۔ پھر انہوں نے معافی مانگی تو میں نے انہیں معاف کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے معافی اس لئے مانگی ہے کہ وہ دوبارہ فلم میں آ کر فلم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں دوبارہ الگ کر دیا۔ اب یہاں سے فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحب کا سلسلہ چلا۔

یہ صاحب فلم کی ہیروئن کے عاشق تھے اور جب ہیروئن کا تھوڑا سا التفات ہوتا تھا اور وہ انہیں تھوڑا سا پچکار دیتی تھی تو وہ فلم کی سپیڈ تیز کر دیتے تھے اور جب اس طرف سے تھوڑا سا Discourage ہوتے تھے تو فلم بند کر دیتے تھے اور ہیروئن کو طوائف کہہ کر بُرا بھلا کہتے تھے۔ پھر ڈسٹری بیوٹر صاحب اس فلم کے ہیرو کے بھی دوست تھے جن کی ایکٹریس بیوی میری فلم کی ہیروئن سے اختلاف رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ یہ ہیروئن ان کے شوہر کے ساتھ کام نہ کر سکے کیونکہ اس ہیروئن کی وجہ سے وہ ہیروئن متاثر ہو چکی تھی اور فلموں میں اس کی مانگ کم ہو گئی تھی۔

ایک طرف تو میری فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحب تازہ تازہ میری فلم کی ہیروئن سے ستائے گئے تھے اور دوسری طرف انہوں نے ہیرو کی بیوی کو اپنی بہن بنا رکھا تھا اس لئے سازش یہ ہوئی کہ اگر میری فلم کی ہیروئن بدلی جائے تو فلم بنے گی ورنہ فلم نہیں بنے گی۔ جب ہمارا آپس میں پہلی مرتبہ جھگڑا ہوا تھا تو مرحوم آغا گل نے جو میرے ساتھ بہت تعاون کرتے تھے۔ یہ معاہدہ کروایا تھا کہ باقی کی فلم ڈسٹری بیوٹر بنائے گا اور اس فلم پر میرا جو پیسہ لگا ہے وہ سٹوڈیو سے فلم کے پرنٹ اٹھاتے وقت مجھے واپس کر دے گا چنانچہ ان صاحب نے تھوڑی سی فلم بنائی تھی لیکن ہیرو کی بیوی کے کہنے میں آکر انہوں نے فلم بند کر دی۔ اب ہمارے معاہدے میں میعاد نہیں لکھی ہوئی تھی اور ایسی کوئی شق نہیں تھی کہ اگر وہ فلم نہیں بنائیں گے تو کیا ہو گا' اس لئے میں نے مجبوراً خاموشی اختیار کر لی کیونکہ اگر میں مقدمہ دائر کرتا تو یہ مقدمہ دیوانی عدالت میں دس سال چلتا اور جتنا روپیہ فلم پر لگا ہوا تھا اتنا روپیہ میں اس پر بھی لگاتا۔ چنانچہ وہ روپیہ ڈسٹری بیوٹر صاحب کی مہربانی سے ان کے مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

میں نے دوسری فلم پشتو میں "عجب خان آفریدی" کے نام سے بنائی۔ اس فلم میں کچھ پارٹنر بھی بنے اور ایک پارٹنر ڈسٹری بیوٹر تھے۔ پکچر بننے کے بعد مجھے یہ پتا نہیں چلا کہ انہوں نے کیا کمایا ہے اور فلم سے کیا آیا اور کیا گیا ہے۔ چونکہ اس فلم کا مین پارٹنر میں تھا اور فلمساز کے طور پر بھی میں ہی محکمہ انکم ٹیکس میں ذمہ دار تھا۔ اس لئے مجھے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تو شکر ہے کہ حسابات کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور انکم ٹیکس آفیسر کی رحمدلی کی وجہ سے میں زیادہ نقصان سے بچ گیا۔

میں نے تیسری فلم ہند کو میں ''قصہ خوانی'' کے نام سے شروع کی۔ یہاں بھی ڈسٹری بیوٹر صاحب نے یکے بعد دیگرے بہت کچھ کیا۔ مختصراً یہ کہ جو رول ادب میں پبلشر ادا کرتا ہے وہی رول یہاں فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحبان نے ادا کیا۔ یہ فلم آخر میں صرف بیس ہزار روپے کی رقم پوری کرنے کیلئے کوئی پانچ سال پہلے ایک ڈسٹری بیوٹر کے پاس گئی تھی اور اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ فلم کہاں ہے اور اس کی آمدنی کہاں ہے۔

مسجد اور امام باڑے کا رول

ہری پور میں میری زندگی کے ابتدائی زمانے میں موسیقی اور شاعری کے علاوہ مذہب بھی پوری طرح حاوی تھا چنانچہ اکثر میں نمازیں پڑھتا تھا اور رمضان کے مہینے میں تراویح کے بعد بھی یاد خدا میں مشغول رہتا اور جب لوگ نماز تہجد پڑھتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوتا۔ اسی طرح جب ہم پنڈی میں رہتے تھے تو محرم کے دنوں میں میرے پہلے دس بارہ دن مجالس میں گزرتے تھے۔ چنانچہ میری شاعری کو جتنی جلا ملی ہے اس میں امام باڑے کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ اس زمانے میں ملتانی ذاکر بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ درمیانی وقفوں میں ایک آدمی اٹھ کر رباعی پڑھا کرتا تھا جو عام طور پر میر انیس جیسے شاعروں کے پائے کی ہوتی تھی اور انہیں عقیدے سے ہٹ کر اچھی شاعری میں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ رباعی طبیعت پر بہت اثر کرتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ویسی چیزیں کہوں۔ میں نے ان دنوں ماتم بھی کیا اور زنجیر زنی بھی کی۔ اگرچہ ہم سنی فیملی سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ایسا زمانہ تھا کہ وہاں کے بچے بالے بھی دیکھا دیکھی اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے امام

باڑے بناتے تھے اور امام حسینؓ کے فقیر بنتے تھے۔

ادھر امام باڑے میں جو تربیت ہوئی وہ شعری تربیت تھی اور ادھر مسجد ہری پور میں جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسجد اہلحدیث تھی چنانچہ ان کے جو عقائد تھے میں نے وہ بچپن میں قبول کئے۔ ان میں شرک، مزار پرستی اور پیر پرستی نہیں تھی اور یہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے آگے کے سلسلے کو اس حد تک نہیں مانتے تھے کہ اس کے بعد لوگ بھی خدا ہی نظر آئیں۔ اس طرح میری بنیادوں میں اہلحدیث والے عقائد پڑے ہوئے تھے۔

اس مسجد اور امام باڑے کے دور سے گزرنے تک مختلف فرقوں کی نعرہ بازیاں ابھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھیں۔ آگے چل کر دیکھا تو معاملہ کچھ دوسرا نظر آیا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے عقائد پر اعتراض کرتا ہے اور دوسرا پہلے پر۔ جب غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ کوئی فرقہ دوسرے فرقے کی نظر میں مسلمان ہی نہیں۔ اس مرحلے پر مجھے سوچنا پڑ گیا کہ اگر ایک فرقہ دوسرے فرقے کو غیر مسلم سمجھتا ہے تو کون آکر فیصلہ کرے گا کہ ان میں سے مسلمان کون ہے۔ کوئی انسان تو اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر کوئی انسان فیصلہ کرے گا تو ایک اور فرقے کا اضافہ ہو جائے گا اور جس طرح فرقے بنے ہوئے ہیں اسی طرح اس کا بھی ایک نظریہ ہو گا۔ وہ بھی صرف اپنے آپ کو ہی مسلمان سمجھے گا اور باقی سب کو غیر مسلم۔ اس مسئلے نے مجھے چکرا کر رکھ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا اور رسول ﷺ پر تو میرا ایمان پہلے سے بھی پختہ ہو گیا لیکن آگے آکر نہ مجھے اپنا سنی فرقہ بھلا نظر آتا ہے نہ شیعہ نہ اہلحدیث۔ یہ سب فرقے مجھے پسند نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہے تاکہ جس کا جو جی چاہے کرتا رہے اور مجھ پر جو فرض ہے میں اسے نبھاتا

جاؤں اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کو مانوں۔ بلکہ رسول ﷺ کو تو میں کچھ عجیب طریقے سے مانتا ہوں، شاید کوئی بھی اس طرح نہ مانتا ہو۔

میں جب دیگر ادیان کے بزرگوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں بڑے معجزے اور شعبدے اور بڑی Myth نظر آتی ہے لیکن اپنے رسول ﷺ کی طرف دیکھتا ہوں تو ان میں یہ ساری چیزیں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے رسول ﷺ سے جو دو یا چار معجزے منسوب کئے جاتے ہیں اگر وہ نہ بھی ہوں تو میری نظر میں ہمارے رسول ﷺ اس پائے کے اونچے انسان ہیں کہ اگر وہ رسول ﷺ نہ بھی ہوتے تو کم از کم میں انہیں رسول ﷺ مان لیتا۔ مجھے روئے زمین پر اتنا مکمل انسان نظر نہیں آتا۔ میرے یہ عقائد آج تک چل رہے ہیں اور اس سلسلے میں میرا ایک شعر ہے:

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفےٰ کے بعد

لیکن باقیوں سے میرا ایمان اٹھ گیا۔ ارکان اسلام کی حد تک ٹھیک ہے۔ میں بہت آزاد خیال ہوں۔ متقی اور نمازی آدمی بھی نہیں ہوں۔ عید کی نماز یا واجب نمازیں یعنی نماز جنازہ وغیرہ پڑھ لیتا ہوں۔ اگر دیکھا کہ کوئی خطیب بہت اچھا خطبہ دے رہا ہے تو اگلے جمعہ کو وہاں جا کر نماز پڑھ لیتا ہوں۔

میں عمرہ بھی کر کے آیا ہوں۔ خانہ کعبہ تو خیر خدا کا گھر ہے لیکن روضۂ رسول ﷺ پر جو لطف آیا اور جو وجد طاری ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ یہ نعت، رسول ﷺ پر کہی گئی۔ ہر چند کہ نعت کہتا ہوں لیکن میں اب تک حیران ہوں کہ وہاں جا کر کوئی نعت کیسے کہہ لیتا ہے۔ وہاں تو تصورات ہی اور بن جاتے ہیں اور الفاظ ساتھ ہی نہیں دیتے۔

اس لیئے وہاں کوئی آدمی کس طرح نعت کہہ سکتا ہے۔اور وہاں سوائے عشقِ رسول ﷺ کے سوچ کیسے سکتا ہے۔ اس منزل سے بھی میں گزرا ہوں اور عمرہ بھی کیا ہے۔ خیرات اور زکوۃ اسلام میں بہت اہم چیزیں ہیں یہ بھی کی ہیں لیکن میں ملائیت کا آج تک قائل نہیں ہوا۔ میرا اسلام وہی ہے جو اقبال کا اسلام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مذہب کو جتنا نقصان ملائیت نے پہنچایا ہے شاید کوئی دوسرا نہ پہنچا سکے۔

میں کوئی اسلام کا عالم نہیں ہوں لیکن ایک عام قاری اور ایک غیر متعصب قاری کے طور پر ضرور سوچتا ہوں کہ ہمارے ملاؤں نے اپنے آپ پر اجتہاد کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ میری جب ان سے گفتگو ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ زمانے کے ساتھ کیوں نہیں چل رہے تو وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے اور پندرہ سو سال پہلے کی بات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کچھ چیزیں مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ مثلاً سواری کا مطلب سواری ہے۔اس زمانے میں اونٹ تھا اور آج اگر ملا یہ کہتا ہے کہ یہ سنت رسول ﷺ ہے تو پھر اونٹ سنت رسول ﷺ ہونے کے باوجود آج کیلئے کار آمد نہیں ہے۔ آج کے لیے کار آمد چیزیں ہوائی جہاز ہے۔اس سے پہلے ریل گاڑیاں' بسیں اور ٹرک وغیرہ تھے مگر اب جہاز ہے۔اس لئے مقصود بالذات چیز سواری ہے اور اونٹ نہیں۔

اگر ہم اونٹ سے ہوائی جہاز پر آسکتے ہیں تو اس طرح ہمیں شوریٰ سے پارلیمنٹ تک آنا پڑے گا۔ اسلام نے الیکشن کی بنیاد رکھی ہے لیکن اس زمانے میں جمہوریت کی رسائی شوریٰ تک ہی تھی۔اب زمانہ آگے آگیا ہے اور اس کی ترقی یافتہ شکل پارلیمنٹ ہے لیکن انہی ملاؤں نے پچھلے گیارہ برسوں میں جمہوریت کی نفی کی۔ یہ لوگوں کو گمراہ کرتے رہے کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے اور اسلام سے

ٹکراتی ہے۔ اگراونٹ سے جہاز تک پہنچنا جائز ہے تو شوریٰ سے پارلیمنٹ تک پہنچنا بھی بالکل جائز ہے ۔

جو نئی چیز آتی ہے اسے ملا پہلے تو گالی دیتے ہیں لیکن بعد میں قبول کر لیتے ہیں۔ انہوں نے پہلے لاؤڈ سپیکر کو شیطان کی آواز قرار دیا۔ اب بعض جگہ تو واقعی نظر آتا ہے کہ یہ ٹھیک کہتے تھے جب لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال ہوتا ہے تو اس میں شیطان ہی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح بجلی آئی تو ان لوگوں نے کہا کہ نہیں مسجدوں میں سرسوں کے تیل کا چراغ جلے گا۔ چنانچہ ان میں لاعلمی اور کم عملی کی وجہ سے جو قدامت پسندی چلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے ہر چیز کا ذکر پندرہ سو سال پہلے سے کرتے ہیں۔

فلم اور سکینڈل

ادب اور فلم میں سازشوں کا جو چکر چلتا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ادب میں تو یہ چکر نسبتاً کم ہے کیونکہ اس میں پیسے کا عمل دخل نہیں ہوتا لیکن فلم میں نام کے ساتھ پیسے کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کو عجیب طرح سے گرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب میں فروری 47ء میں شروع شروع میں لاہور میں آیا تو میں نے پہلی فلم ''ادھورے خواب'' کے گانے لکھے تھے۔ میرے گانے جب ریکارڈ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو چونکا دیا اور پوچھ گچھ شروع ہو گئی یہ گانے کس نے لکھے ہیں۔ ایک نئے پروڈیوسر کا دفتر رائل پارک میں تھا اس کا آدمی مجھے بلانے کیلئے آیا۔ میں وہاں گیا تو خوب آؤ بھگت ہوئی اور وہ مجھے بڑے احترام سے ملے۔ اس زمانے میں شاعروں کیلئے زیادہ

سے زیادہ دوسو روپے فی نغمہ معاوضہ ہوتا تھا چنانچہ ان سے بات بھی طے ہو گئی۔اس دوران وہاں پر مجھ سے پہلے کا اک فلمی شاعر بھی بیٹھا ہوا تھا۔وہ مجھے بڑے احترام سے ملا اور کہنے لگا" قتیل صاحب آپ کو ملنے کی بہت تمنا تھی۔ پشاور کے ایک مشاعرے میں آپ کو سنا تھا تو آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ فلم میں نئے نئے آئے ہیں اور میں پہلے سے ہوں۔ ادب میں تو آپ کا ماشاءاللہ بہت مقام ہے لیکن فلم میں آپ نو آموز ہیں۔اس میں آپ کو تھوڑی سی ٹریننگ کی ضرورت ہو گی۔میں اس کیلئے حاضر ہوں۔جہاں بھی آپ کو ضرورت پڑے آپ مجھے سے مشورہ کر لیں، میں آپ کی رہنمائی کروں گا"

سیدھا طریقہ تو یہ تھا کہ میں کہتا" بھئی آپ کون ہوتے ہیں۔رہنمائی کرنے والے۔ میں فلم کو آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں" لیکن میں بالکل شرمیلا اور شریف سا آدمی تھی۔میں نے کہا" جی بالکل ٹھیک ہے۔میں تو فلم میں نیا آدمی ہوں۔ آپ سے ضرور مشورے کروں گا اور امید ہے کہ آپ مجھے ضروری وقت دیں گے"

جب یہ گفتگو ڈسٹری بیوٹر نے سنی تو اس کا رویہ تھوڑا سا اسی وقت بدل گیا اور کہنے لگا" اچھا صاحب پھر یہ بات آگے چلائیں گے" اس کے بعد اس نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔اس فلم کے گانے میری بجائے اس شاعر نے لکھے کیونکہ اس نے اپنی گفتگو کے ذریعے مجھ سے اقرار کروالیا تھا کہ وہ واقعی گانے لکھتا ہے اور میں کمزور ہوں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے جب میں Establish ہو چکا تھا اور میری سفارش بھی سنی جاتی تھی۔ میرے پنڈی کے دوست احمد ظفر اس زمانے میں ریڈیو کی ایک سنگر انیقہ بانوں کی طرف جذباتی جھکاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس یقین پر کہ وہاں قتیل شفائی ہے اس کے ساتھ وعدہ کر لیا اور اسے میرے گھر پر لے کر آ گئے۔ وہ اچھی گانے والی تھی اور اس وقت غالباً فلم ''قاتل'' بھی بن رہی تھی۔ چنانچہ میرے کہنے پر اس فلم کا ایک گانا انیقہ بانو کے لئے چنا گیا۔ اس فلم کے پروڈیوسر پاشا صاحب تھے اور میوزک ڈائریکٹر ماسٹر عنایت حسین تھے۔ دونوں نے اتفاق کر لیا۔ لیکن منور سلطانہ کی ایک لابی تھی اور اس فلم کے ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور کچھ دوسرے لوگ اس لابی سے تھے۔ ریہرسل ہوئی، ریکارڈنگ ہوئی اور واہ واہ ہو گئی۔ انیقہ بانو کو ادائیگی بھی ہو گئی اور ہم نے اسے پنڈی رخصت کر دیا۔

اس زمانے میں لیبارٹری کا کام ذرا دشوار ہوتا تھا اور اس میں ایک دو دن لگ جاتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ اس گانے کو اس طرح ریکارڈ کیا گیا کہ اس کی آواز دبی دبی تھی۔ میں نے پوچھا کہ صاحب کیا ہوا اس وقت تو آواز بالکل ٹھیک تھی تو ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے کہا کہ اس کی آواز اس سے بہتر نہیں آسکتی چنانچہ وہ بیچاری کٹ گئی اور وہی گانا منور سلطانہ نے گایا جو یہ تھا۔

لے کے پیار کا پیام
سانولی سلونی شام
آ گئی تو بھی آ

اس کے بعد منور سلطانہ کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ بھی ایک الگ واقعہ ہے۔ ایک فلم ''نوکر'' بن رہی تھی

جس میں ایک لوری تھی:

راج دلارے' میرے اکھیوں کے تارے

فلم میں یہ گانا منور سلطانہ نے گایا تھا۔ لیکن اس فلم کے مقتدر لوگوں میں سے ایک سنگر کوثر پروین پر نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسے ممنون کر کے اپنے مقاصد پورے کریں۔ان دنوں گانے کی ڈسک الگ بنا کرتی تھی اور گانا ٹریک سے منتقل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ کوثر پروین کو خوش کرنے کیلئے ڈسک کیلئے وہی گانا کوثر پروین سے ریکارڈ کروایا گیا۔اب منور سلطانہ بہت روئی ۔ہم نے کہا کہ آپ انیقہ بانو والا زمانہ یاد کریں۔ کہنے لگی "میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا" میں نے کہا" بہر حال جو اس کے ساتھ ہو گیا تھا وہ ادھر بھی ہو گیا ہے"

منور سلطانہ ویسے بہت اچھی گانے والی تھیں لیکن کتنے افسوس کی بات تھی کہ فلم میں تو منور سلطانہ کی آواز تھی لیکن ریکارڈ پر کوثر پروین کی۔ تو اس طرح کی چیزیں ڈائریکٹروں کے ساتھ بھی ہو جاتی تھیں اور کسی کو بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ آج میں جس مقام پر بیٹھا ہوں کل وہاں ہوں گا یا نہیں۔ دراصل فلم کا میدان اغراض کا میدان ہے۔ مجھے کسی سے غرض ہے تو میں اس کی خوشامد کر رہا ہوں۔اسے غرض ہے تو وہ مجھ سے محبت کر رہا ہے۔بس اغراض کا ایک چکر ہے جس میں ایک دوسرے کو وابستہ کئے ہوئے ہیں جب تک آپ سے کام ہے' آپ سے تعلقات بھی ٹھیک ہیں' محبت بھی ٹھیک ہے اور رومانس بھی ٹھیک ہے اور جب آپ سے کام نہیں رہا تو یہ سارا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

فلم "گلنار" بن رہی تھی' امتیاز علی تاج اس کے ڈائریکٹر تھے' نورجہاں کے شوہر شوکت حسین

رضوی اس فلم کے پروڈیوسر تھے 'شوکت تھانوی اس کے رائٹر تھے جو فلم میں ایک کیریکٹر بھی کر رہے تھے۔ماسٹر غلام حیدر میوزک ڈائریکٹر تھے' میں اس فلم کا شاعر تھا اور نور جہاں ہیروئن تھیں۔شوکت رضوی صاحب بڑے نستعلیق آدمی تھے اور روایتی طور پر شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ان کے ہاں شامیں بڑی رنگین ہوتی تھیں جن میں ہم لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ایک دوستانہ فضا تھی اور بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔

اب فلم میں ایک شعبہ سکینڈل کا بھی ہوتا ہے چنانچہ نور جہاں کے سلسلے میں افواہیں اڑنا شروع ہو گئیں کہ ان کے نذر صاحب (کرکٹر) سے تعلقات ہیں۔شوکت صاحب اور ان کے آپس میں جھگڑے بھی ہونے لگے۔نور جہاں ماسٹر جی کے پاس شکایت لے کر آتیں۔ان دنوں سٹوڈیوز میں ریہرسلیں ہوتی تھیں اور ایک گانے کی پانچ دس بار ریہرسل ہوتی تھی۔روز ہم سٹوڈیو میں بیٹھتے تھے۔نور جہاں ریہرسل کیا کرتی تھیں جبکہ میں اور غلام حیدر ساتھ ہوتے تھے۔نور جہاں ماسٹر صاحب سے شکایت کرتی تھیں" دیکھئے شوکت صاحب مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ نذر سے میرے تعلقات ہیں جبکہ وہ تو میرے بیٹوں جیسا ہے۔ہم بہت متاثر ہوتے تھے کہ بڑی مظلوم عورت ہے "

ماسٹر صاحب نے شوکت صاحب کو سمجھایا " دیکھئے لوگوں کے کہنے میں نہ آیئے یہ معاملہ غلط ہے۔ممکن ہے کسی نے انہیں ایک ساتھ دیکھا ہو لیکن یہ سارا سلسلہ غلط بھی ہو سکتا ہے"

شوکت صاحب کہنے لگے " آپ ان باتوں کو چھوڑیئے' میں نے اس خاتون کے ساتھ عمر گزاری ہے' اس لئے میں جو کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے" ہم سب بھی چپ ہو گئے لیکن ہمیں ان کے

جھگڑے دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

ایک دن پتا چلا کہ شوکت صاحب ہاتھ میں پستول پکڑے بڑے غصے میں گاڑی میں بیٹھ کر جارہے ہیں۔اس کے بعد پتا چلا کہ شوکت صاحب نے ایک مکان کی تنہائی میں نور جہاں اور نذر کو جا کر گھیر لیا تھااور پستول تان لیا تھا۔نذر صاحب نے جان بچانے کے لئے ایک کھڑکی سے چھلانگ لگادی ۔ان کا پاؤں اٹک گیا جس سے وہ بازو کے بل گرے اور ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ نتیجتاً وہ کرکٹ کے کھیل سے ساری زندگی کیلئے فارغ ہو گئے۔اب ماسٹر جی اور میں خاموشی میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے" یہ تو کہتی تھی کہ نذر میرے بیٹوں جیسا ہے"

اس واقعہ کے بعد نور جہاں کے شوکت صاحب کے ساتھ تعلقات خراب رہنے لگے اور پھر دونوں الگ ہوگئے۔اب دوسرے لوگوں کو چھوڑتے ہوئے چشم دید واقعات کی طرف آتا ہوں۔

فلم" انتظار" بن رہی تھی جس کے میوزک ڈائریکٹر مرحوم خواجہ خورشید انور تھے ۔اس پروڈکشن کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔رفتہ رفتہ ہمیں پتا چلا کہ نور جہاں اور خورشید انور صاحب کے LOVE AFFAIR آغاز ہو چکا ہے۔خورشید صاحب بھی عجیب تضادات کا مجموعہ تھے۔ بڑے سنجیدہ آدمی تھے لیکن رنگین مزاج بھی رہ چکے تھے۔پانچ وقت نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور ایک وقت شراب بھی باقاعدگی سے پیتے تھے اور پھر صبح تلاوت بھی کرتے تھے۔دراصل وہ زمانہ گزار چکے تھے جب ان کی زندگی میں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔اب یہ نئی بات سن کر کچھ انوکھی سی بات نظر آئی۔میریان سے بے تکلفی تھی اس لئے پوچھ لیا کہ کیا سلسلہ چل نکلا ہے۔کہنے لگے

"جی میں کیا بتاؤں ایک طرفہ معاملہ چل رہا ہے۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ نور جہاں کا خیال ہے کہ ان پر عاشق ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے"

دفتر میں کمرے کے اندر کمرہ آتا تھا اور آخری کمرے میں خورشید صاحب بیٹھتے تھے ایک دن اس کمرے سے پہلے کچھ اونچی اونچی آوازیں آئیں اور پھر کمرے میں سے خورشید انور' نور جہاں اور وہاں کے دو اور آدمی نکلے اور تیزی سے گزر کر چلے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نور جہاں چاہتی تھیں کہ خورشید انور صاحب سر پر قرآن اٹھا کر کہہ دیں کہ انہیں مجھ سے پیار نہیں ہے تو میں یقین کر جاؤں گی کیونکہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں اور انہیں مجھ سے پیار ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ٹمپل روڈ کی مسجد میں گئے اور وہاں جا کر خورشید صاحب نے قرآن سر پر رکھ کر کہا" مجھے نور جہاں سے کوئی محبت نہیں ہے میں بس احترام کرتا ہوں" سنا ہے کہ یہ سن کر نور جہاں بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں اور پھر ان کے تعلقات خراب ہونے لگے۔ قبل ازیں کافی عرصہ تک نور جہاں ایک مرد کا رول ادا کرتی رہیں اور خورشید انور ایک عورت کا رول ادا کرتے رہے۔ مگر اس واقعہ کا نقصان ہوا کہ نور جہاں اور خورشید انور Combination ٹوٹ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خورشید انور بہت باریک بین میوزک ڈائریکٹر تھے اور بہت باریکیوں تک ٹیون کا خیال رکھتے تھے اور نور جہاں کی آواز ہی ایسی تھی جو خورشید انور چاہتے تھے۔ اس رومانس نے مفادات پورے کرنے کی بجائے مفادات کو نقصان پہنچایا اور یہ معاملہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگرچہ خورشید انور کی دھنوں مین ناہید نیازی اور کوثر پروین کی آوازوں میں بھی گانے ہٹ ہوئے لیکن

''کوئل'' اور ''انتظار'' میں جو گانے نور جہاں کی آواز میں آئے تھے وہ اپنی جگہ تھے۔ یہ نہیں کہ ان گانوں میں نور جہاں کا کمال تھا۔ کمال تو خورشید انور کا تھا جو نور جہاں کی آواز کے مطابق دھنیں بناتے تھے اور پھر انہیں دس دس مرتبہ ریہرسل کرواتے تھے۔ جب گانا پرفیکٹ ہو جاتا پھر ہی اس کی ریکارڈنگ کرواتے۔ اس لئے فلم ''انتظار'' کے گانے نور جہاں کے آج کے گانوں سے سو گنا زیادہ اچھے ہیں اور نور جہاں پھر کبھی ویسے گانے نہیں گا سکیں۔

فلم انڈسٹری کے نیک نام لوگ

کہا جاتا ہے کہ فلم انڈسٹری میں جو عورت آتی ہے وہ گمراہ ضرور ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ بات ٹھیک ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسی باتیں ٹھیک نظر نہیں آتیں۔ میں نے نور جہاں کا ذکر کیا ہے تو میرا خیال ہے اگر وہ فلم میں نہ بھی ہوتیں تو ایک عام عورت کی حیثیت سے بھی ان کا کوئی رومانس سامنے آجاتا جیسا کہ اور ہزاروں عورتوں کے رومانس سامنے آتے ہیں جو فلم سے تعلق نہیں رکھتیں۔

فلم انڈسٹری میں بھی میں نے کچھ ایسی عورتوں کو دیکھا ہے کہ جس نیک نامی کے ساتھ فلم لائن میں داخل ہوئی اسی نیک نامی کے ساتھ ریٹائرمنٹ تک پہنچیں۔ چونکہ میرا تعلق شعبہ موسیقی سے ہے اس لئے ناہید نیازی کا نام لیتا ہوں۔ یہ ایک بہت اچھی نیازی پٹھان فیملی کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد سجاد سرور نیازی جو ایس ایس نیازی کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے وقتوں کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے خاندان کی روایات سے بغاوت کر کے اور بزرگوں کی پروانہ کر کے موسیقی کو اپنایا تھا۔ یہ غالباً 1930ء کی بات ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی گانے کا نام لیتا تو لوگ

اسے سید ھا کنجراور میراثی ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں دو اشخاص ایسے تھے جنہوں نے اپنے والدین برادری اور عزیز واقارب کی پروانہ کی اور اس لائن میں آئے۔ ان میں سے نامور تو رفیق غزنوی ہوئے۔

رفیق غزنوی انے زمانے میں گانے میں مہدی حسن سے زیادہ شہرت یافتہ تھے اور خوبصورت بھی انتہا کے تھے۔ ان کی کئی شادیاں ہوئیں اور ایک شادی موجودہ اداکارہ سلمیٰ آغا کی نانی سے بھی ہوئی جو انوری امر تسر والی کے نام سے مشہور تھیں۔ رفیق غزنوی کے والد نے بھی اپنے بیٹے سے قطع تعلق کر لیا ہوا تھا۔ وہ پنڈی کے امیر آدمی تھے اور کہا کرتے تھے کہ اپنے بیٹے سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا کیونکہ وہ اب کنجر ہو گیا ہے۔

دوسرے آدمی ایس ایس نیازی تھے۔ رفیق غزنوی کی طرح وہ بھی گریجویٹ تھے۔ اور انہوں نے بعد میں آ کر ریڈیو میں ملازمت کر لی اور آخری عمر میں سٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ گاتے بھی تھے اور تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتے۔ ایک زمانے میں ان کا یہ نغمہ بہت گونجا:

اک بار پھر کہو ذرا

یہ نغمہ پہلے شمشاد بیگم نے گایا تھا لیکن بعد میں اسے ناہید نیازی نے بھی گایا۔ گویا ناہید نیازی کو موسیقی اپنے والد سے ورثے میں ملی۔ یہ جب فلم میں آئیں تو بے حد خوبصورت اور جوان تھیں۔ جب شروع میں کوئی لڑکی فلم لائن میں آتی ہے تو لوگ سوچتے ہیں کہ نئی لڑکی ہے' کچھ جال وغیرہ پھیلائیں گے۔ خاص طور پر میوزک ڈائریکٹر۔ لیکن اگر کوئی خود خراب نہ ہونا چاہے تو کسی کو کسی

بھی جگہ خراب نہیں کیا جا سکتا۔

ناہید نیازی جب گانے کیلئے کسی پروڈکشن میں آتی تھیں توان کی والدہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں اور میں نے کسی ریہرسل میں یہ نہیں دیکھا کہ اس نے گاتے ہوئے یا ریہرسل کرتے ہوئے کبھی کسی سے آنکھ ملائی ہو۔ان کے سامنے گانے کا کاغذ پڑا ہوتا تھا اور نگاہیں گانے پر ہوتی تھیں۔وہ خود بات تک نہیں کرتی تھیں اور اگر کسی کو کوئی بات کرنا ہوتی تھی تو وہ ان کی والدہ سے بات کر سکتا تھا۔وہ جتنا عرصہ فلم میں رہیں ان پر کوئی ایک الزام بھی نہ آیا۔اور وہ اپنی پاکدامنی کی مثال چھوڑ کر بالآخر میوزک ڈائریکٹر۔ مصلح الدین کے ساتھ بیاہی گئیں۔

مصلح الدین بنگال کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والے تھے اور ذات کے وہ بھی پٹھان تھے۔ان میں اور ناہید نیازی میں کوئی رومانس نہیں ہوا تھا۔ دونوں خوبصورت تھے اور ظاہر ہے کہ ایک لڑکی کی ایک لڑکے سے شادی تو ہونی ہوتی ہے۔لڑکے نے اپنی بہن کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا تو شادی ہو گئی۔اس کے بعد یہ کچھ دیر یہاں رہے لیکن چونکہ مصلح الدین بنگلہ دیشی تھے اور ناہید پاکستانی تھی تو دونوں نے درمیانہ راستہ یہ نکالا کہ انگلینڈ میں جا کر Settle ہو گئے۔جب میں وہاں گیا تو میری ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔یہ وہاں ایک ہوٹل چلا رہے ہیں اور اس کے علاوہ ایک میوزک کا انسٹیٹیوٹ بھی بنا رکھا ہے۔ان کی زندگی بہت اچھی' سکھی اور اعتماد والی گزر رہی ہے اور ان کا بیٹا بھی بہت اچھا گویا ہے۔چنانچہ فلم میں جو الزامات آتے ہیں یہ ان کے بغیر ہی یہاں سے چلے گئے اور آج تک ان کی زندگی ٹھیک ہے۔

ایکٹر سوں میں میں شبنم کا ذکر کروں گا۔ وہ بھی ان چند ایکٹر سوں میں سے ہیں جن کا تعلق چکلے سے نہیں ہے جیسا کہ یہ خام مال اس منڈی سے آیا ہوتا ہے۔ یہ بنگال کی ہندو فیملی سے تعلق رکھتی ہیں اور جب ہمارا ان سے تعارف ہوا تو یہ روبن گھوش جو کہ عیسائی ہیں' سے شادی شدہ تھیں۔ انہیں فلم میں آئے پچاس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک ہی مرد نظر آتا ہے جو ان کا خاوند ہے۔ اور ان سے کوئی سکینڈل بھی منسوب نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فلمی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں ہے کہ ضرور ناکام ہوں اور پھر یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ فلم میں آکر ہر کوئی خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کی نفی کرتا ہوں کہ عورتیں فلم میں آکر خراب ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ ہے

کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

آغا گل اور سلطان راہی

فلم والوں کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت بے لحاظ ہوتے ہیں اور کسی کو بخشتے نہیں۔ میں بطور فلمساز ان دو لوگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے اس الزام سے باہر نظر آتے ہیں۔ اداکاروں میں تو سلطان راہی ہیں۔ یہ میری فلم قصہ خوانی کے سٹوری ہیرو تھے۔ ان سے فلم کیلئے بات چیت ہوئی اور معاوضہ طے پا گیا بلکہ اس مرحلے پر بھی انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے سینئر ہیں اور آپ کا حق ہے کہ مجھ سے رعایت لیں۔ چنانچہ آپ مارکیٹ سے جا کر میرا ریٹ پتا کر لیں اور اس کے بعد معاوضہ خود طے کر دیں۔ میں نے یہی کہا میں نے جو ریٹ طے کیا انہوں نے قبول کر لیا اور مجھے خاصی رعایت دی۔

اس کے بعد ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلیئے پشاور گئے تو وہاں حبیب ہوٹل میں قیام کیا۔ البتہ چھوٹے عملے نے ایک دوسرے درمیان درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ سلطان راہی نے کہا کہ میری فیملی بھی ساتھ جائے گی، روٹین میں بھی عام طور پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ پروڈکشن کا ایک کھاتہ کھلا ہوتا ہے اور جہاں دیگر بل ادا ہوتے ہیں وہاں فیملی کا بل بھی ادا ہو جاتا ہے۔ ان کی بیگم اور دو بیٹیاں بھی ساتھ گئیں۔ چنانچہ وہ ایک سنگل روم اور ایک ڈبل روم لے کر رہے۔ ہم نے آٹھ دس روز وہاں قیام کیا اور جب بل آیا تو سلطان راہی کے بل میں صرف ایک سنگل روم اور ایک آدمی کے کھانے کا خرچ درج تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید ہوٹل والے نے سلطان راہی کے اعزاز میں بل کم کر دیا ہو۔ اس لئے میں نے جا کر ہوٹل والے سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ باقی بل سلطان راہی صاحب نے خود اپنی جیب سے ادا کر دیا ہے۔

میں نے سلطان راہی سے کہا کہ بھائی یہ کیا معاملہ ہے اور آپ نے باقی کا بل اپنے پلے سے کیوں ادا کیا۔ یہاں تو ایک برادری آئی ہوئی ہے جس میں آپ سب لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کا تکیہ کلام سر جی تھا اور کبھی کبھی جان جی بھی کہتے تھے۔ کہنے لگے جان جی بات یہ ہے کہ آپ کی فلم میں اداکاری میں نے کی ہے میرے بیوی بچوں نے نہیں۔ انہیں تو میں اپنے ساتھ لایا تھا اس لئے ان کا بل میں نے ادا کر دیا ہے۔ میں ان کے جواب سے بہت متاثر ہوا کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ صورتحال اس کے برعکس ہوتی تھی۔ اکثر اوقات تو اداکار حضرات فرمائشیں بھی کیا کرتے تھے کہ میری بیوی یا بچوں کیلیئے یہ لے کر آؤ۔ سلطان راہی نے میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا بلکہ یہ بھی کیا کہ بعد میں جب پکچر Delay ہو گئی۔ تو جتنے پیسے بقایا تھے وہ بھی انہوں نے نہیں لئے اور کہنے لگے

کہ آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ میں آپ سے یہ پیسے لوں گا۔

یہ تو میں نے ایک اداکار کا ذکر کیا ہے اب ایک سٹوڈیو مالک کی بات کرتا ہوں۔ مرحوم آغا جی اے گل کچھ باتوں میں بہت نیک نام اور کچھ میں بہت بدنام تھے۔ ان کی نیک نامیاں تو سب جانتے ہیں لیکن بدنام اس لئے تھے کہ وہ پیسے کے معاملے میں کبھی کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ان کا سٹوڈیو فلم بنانے کے لئے کچھ پیسے ایڈوانس لے کر Raw material کریڈٹ پر دیتا تھا' فلم کی شوٹنگ اور دفتر کا کرایہ وغیرہ بھی کریڈٹ پر آجاتا تھا۔ جب فلم اختتام کو پہنچتی تو ان کا جتنا بھی بل بنتا تھا جو عام طور پر تین لاکھ روپے ہوتا تھا۔ وہ وصول کے بغیر پرنٹ بالکل نہیں دیتے تھے۔ تاہم فلم کی تیاری کے دوران وہ تمام رعائتیں بڑی فراخدلی کے ساتھ دیتے تھے۔

میرے ساتھ انہوں نے مسلسل مروت کا سلوک کیا۔ جب میری پہلی پکچر "اک لڑکی میرے گاؤں کی" بن رہی تھی تو یہ پکچر ایک ڈسٹری بیوٹر اور ڈائریکٹر کی وجہ سے الجھن میں پڑی۔ پھر یہ معاہدہ ہوا کہ میرا ڈسٹری بیوٹر اس پکچر کو مکمل کرے گا اور پرنٹ اٹھانے سے پہلے میری رقم ادا کرے گا۔ اس معاہدے کے ایک فریق آغا گل جی تھے۔ جنہوں نے یہ معاہدہ کروایا تھا۔ ہر چند کہ اس فلم کے مکمل نہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہ تھا بلکہ سارا قصور ڈسٹری بیوٹر ہی کا تھا لیکن سٹوڈیو کا جو پیسہ فلم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے رہ گیا وہ آغا صاحب نے برداشت کیا۔

جب دسری فلم "عجب خان آفریدی" بنی تو اس وقت ہمارے پاس پیسے تھے۔ اس لئے جو بل بنا میں نے پیسے آغا صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ آغا صاحب نے ان میں سے بھی دس بیس ہزار روپے اٹھا کر مجھے واپس کر دیئے اور کہا کہ یہ پیسے میں تمہیں اپنے لحاظ سے واپس کرتا ہوں۔

میری تیسری فلم ”قصہ خوانی“ بھی ایک سازش کا شکار ہو کر لیٹ ہوتی گئی اور پھر ہمیں ہیروئن بدلنی پڑ گئی۔ اگر سازش نہ ہوتی اور ہیروئن نہ بدلنی پڑتی تو خیال یہ تھا کہ یہ فلم تین ماہ میں مکمل کر کے ریلیز کر دی جاتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ فلم بہت پیسے کماتی کیونکہ یہ ہندکو کی پہلی فلم تھی اور اس کا موضوع بھی بہت دلچسپ تھا لیکن ہیروئن بدلنے اور سازش کی وجہ سے فلم رک گئی۔ اب پیسے ختم ہو گئے تھے۔ کچھ ادھار پکڑ کر مزید پیسے لگائے لیکن فلم پھر بھی مکمل نہیں ہو رہی تھی اور پھر ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میں نے سوچا کہ اس پر جو لاگت آچکی ہے اب اسے بھی جانے دیں اس عرصہ میں آٹھ سال گزر چکے تھے۔

ایک دن یونہی بیٹھے ہوئے تھے کہ آغا صاحب کہنے لگے کہ یار اُس پکچر کا کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا آغا صاحب پیسہ تو اپنے پاس ہے کوئی نہیں اور پکچر ابھی کافی بقایا ہے۔ کہنے لگے پھر بھی دیکھو کہ اس کا مارکیٹ میں کیا امکان ہے۔ میں نے کہا بہتر ہو گا اگر آپ بھی اسے ذرا دیکھ لیں۔ انہوں نے خود تو نہ دیکھی البتہ اپنے دو آدمی ساتھ بٹھا دیئے۔ انہوں نے پکچر دیکھی اور یہ رائے دی کہ اگر پکچر مکمل کر لی جائے تو فلاپ نہیں ہو گی۔ آغا صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ فلم مکمل کر لو۔ میں نے کہا کہ آغا صاحب ایک تو ابھی آپ کا بل دینا ہے اور پھر فلم مکمل کرنے کیلئے ابھی مجھے ساٹھ ستر ہزار روپے اور لگانا پڑیں گے اور ڈر یہ ہے کہ میرے پیسے بھی جائیں گے اور آپ کا بل بھی ادا نہیں کر پاؤں گا۔ کہنے لگے چلو یار اللہ مالک ہے۔ بل کی فکر تم چھوڑو اور اسے مکمل کرو۔ یا تو میرے پیسے واپس آجائیں گے یا تمہارے بھی چلے جائیں گے ۔ کہنے لگے یہ جوا کھیل سکتے ہو۔ میں نے کہا کہ کوشش کر لیتے ہیں

۔چنانچہ میں نے کچھ پیسوں کا انتظام کیا۔ساٹھ ستر ہزار روپے سے بھی زائد پیسے لگ گئے۔فلم مکمل ہوئی تو دیکھا کہ بطور فلم یہ ٹھیک نظر آرہی تھی۔اسے پشاور میں ریلیز کیا گیا۔اس کے مقابلے میں پشتو کی تین فلمیں لگی ہوئی تھیں۔اس نے ان کے مقابلے میں رش بھی لیا اور پہلے شو میں ہال کے اندر تالیاں بھی بجیں۔جب شو ختم ہوا باہر سے لوگ پوچھتے تھے کہ اس میں کوئی مسالہ ہے تو دیکھنے والے سر ہلا کر کہتے تھے نہیں۔دراصل ان ساتھ آٹھ برسوں میں فلم کا ٹرینڈ بدل چکا تھا۔ویسے بھی میں نے تو ایک فلم بنائی تھی۔ایک پاکیزہ اور دلچسپ فلم۔اس میں اچھے ڈائیلاگ' اچھی ایکٹنگ اور اچھے گانے رکھے تھے لیکن ان دنوں پشتو فلموں میں فحاشی کا ایک سیلاب برپا کر رکھا تھا جن میں ننگے ڈانس اور واہیات مکالمے ہوتے تھے اور وہ سب کچھ اس فلم میں نہیں تھا۔

ہم نے بمشکل اس فلم کی پبلسٹی کا خرچ پورا کیا اور چوبیس ہزار روپے سینما والے نے ایڈوانس دیئے ہوئے تھے۔ان میں یہ فلم گروی رہی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ فلم ایک آخری ڈسٹری بیوٹر کو پانچ سال پہلے بیس ہزار روپے میں دی تھی۔تو پتہ نہیں اس نے یہ کہاں چلائی۔لیکن آغا صاحب نے ہمیں یہ پکچر دے دی تھی۔مگر میرے علم میں نہیں کہ آغا صاحب نے کسی اور شخص کے ساتھ دو لاکھ روپے کی یہ رعایت کی ہو۔میں نے یہ رسید تو لکھ دی تھی کہ اس فلم کی آمدن میں سے میں بل ادا کروں گا لیکن آغا صاحب نے کبھی بل کا تقاضا نہیں کیا۔بلکہ وہ بعد میں اس فلم کا افسوس بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یار تمہارے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اور تمہارا پورے کا پورا پیسہ ڈوب گیا۔

اس طرح آغا صاحب دوسرے آدمی تھے جنہوں نے میرے ساتھ دو لاکھ روپے کی مروت کی۔ چنانچہ فلم لائن بھی مروتوں سے خالی نہیں۔اگرچہ اس میں بیشتر لوگ ماتھے پر آنکھیں رکھنے والے ہیں لیکن آغا صاحب جیسے اچھے لوگ بھی موجود تھے۔ آغا صاحب آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان میں بہت خوبیاں تھیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اگلے جہان میں اچھے مقام پر ہوں گے۔

ایک مجبور عورت

فلم لائن میں سہارے بہت تلاش کیے جاتے ہیں اور دو طرح کے ہوتے ہیں بعض مرد فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کرنے کیلئے کسی عورت کا سہارا لیتے ہیں اور بعض عورتیں فلم میں کام کرنے کیلئے کسی مرد کا سہارا لیتی ہیں۔ہم نے ایسے کئی لوگ دیکھے' جو فلم انڈسٹری میں آئے' کوئی حسین سہارا لیا ور فلمساز ' ڈائریکٹر یا اداکار بن گئے۔اسی طرح اگر کسی کی ''بہن'' قسم کی چیز ہوئی تو کسی پیسہ لگانے والے نے خوش ہو کر اس کو چانس دلا دیا۔چنانچہ عورتوں کی وجہ سے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بننے والے لوگ بھی کم نہیں ہیں لیکن کچھ عورتیں ان مردوں کا سہارا بھی لیتی ہیں جو فلم میں برسراقتدار ہوں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گانوں کے سلسلے میں میرے پاس پاکستان کی اسی پچاس فیصد فلمیں ہوتی تھیں اور لوگوں کا یہ خیال ٹھیک ہی تھا کہ اگر میں کسی کو Recommend کروں تو اسے کام مل سکتا ہے۔کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک خاتون ہوتی تھی جو فلم میں چھوٹے موٹے رول ادا کرتی تھیں اور اس سے اکثر میری سٹوڈیو میں ملاقات ہوتی تھی۔اچانک وہ کچھ عرصہ

کے لئے غائب ہو گئی اور جب بر آمد ہوئی تو سیدھی میرے پاس پہنچی۔اس کے ساتھ کوئی سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی اور کہنے لگی کہ قتیل صاحب آپ سے علیحدگی میں کچھ مشورہ کرنا ہے۔اس نے مجھے اپنے یہاں کے ایڈریس کے بارے میں بتایا اور گھر آنے کی تاکید کی۔میں وہاں گیا تو اس نے خاطر تواضع کیلئے کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔اور پھر مجھے کہنے لگی کہ فلم لائن بہت بری لائن ہے اور اس میں بہت برے لوگ موجود ہیں یہ میری بیٹی ہے' یہ میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے اور اس میں اچھی اداکارہ بننے کے آثار موجود ہیں۔لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ یہ دست بدست گھومے۔آپ ایک معزز آدمی ہیں میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں۔اس پر آپ کا ہر لحاظ سے حق ہے۔میں چاہتی کہ اس کی زندگی میں صرف ایک مرد ہی آئے اور وہ آپ ہوں۔اب آپ ہی اسے Establish کریں۔

یہ بہت بڑا لالچ تھا ویسے بھی میرا جوانی کا عالم تھا۔جب ایک کنواری لڑکی ہو اور اس کی ماں اسے جسمانی طور پر سپرد بھی کر رہی ہو تو اس میں بہت کشش ہو سکتی ہے۔لیکن میں نے اس خاتون سے کہا دیکھو تم فلم انڈسٹری میں رہ چکی ہو۔تم نے وہاں سے کیا پایا ہے اور تم زندگی بھر چند چھوٹے چھوٹے رول کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ہو سکتا ہے میں تمہاری نظر میں بہت عمدہ آدمی ہوں لیکن میں بھی دوسرے مردوں جیسا ہی ہوں۔اگر میں اسے داشتہ رکھ کر بعد میں بے وفائی کر جاؤں یا اس میں اچھی اداکارہ بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو یہ کہاں کی رہے گی۔اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس چکر میں نہ پڑو اور اسے کسی ٹریننگ میں ڈالو یا اور پڑھاؤ اور ایک دو سال تک اس کی شادی کر دو۔

مراجواب سن کر وہ سکتے میں آگئی اور اتنی حیران ہوئی کہ اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔پھر اس نے کہا کہ قتیل صاحب آپ نے میری توقع کے خلاف جواب دیا ہے اور میں اندر سے

ہل گئی ہوں۔اب میں رات بھر سوچوں گی اور کل آپ کو بتاؤں گی۔ میں نے کہا کہ میرا جواب ابھی سے سن لو کہ میں اس کیلئے تیار نہیں ہوں اب تم جو بھی فیصلہ کرو وہ تمہارا اپنا فیصلہ ہو گا' میں اپنا فیصلہ ابھی سے سنا چکا ہوں۔اس کے بعد وہ خاتون کبھی مجھے فلم میں نظر نہیں آئی۔دوسرے دن جواب کی توقع تھی لیکن وہ اس روز بھی نہیں آئی۔

کوئی چار پانچ سال بعد میں کراچی میں جبیس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور ہوٹل کے باہر ایک ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک ایک گاڑی میرے قریب سے گزری اور پھر مڑ کر واپس آئی۔اس میں وہی عورت بیٹھی ہوئی تھی وہ نیچے اتری اور مجھ سے لپٹ گئی کہنے لگی' قتیل صاحب آپ یہاں کب اور کیسے آئے۔میں نے بتایا کہ میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں آیا ہوں تو کہنے لگی کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیئے۔میں نے کہا اس وقت تو نہیں۔کہنے لگی اچھا آپ وقت بتائیں میں آکر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔میں نے وقت بتایا وہ مقررہ وقت پر آئی اور مجھے اپنی اسی بیٹی کے گھر لے گئی۔

وہاں جا کر اس نے میرے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا اور کہنے لگی کہ اگر آپ اس روز مجھے نہ ملے ہوتے تو آج میں آپ سے کسی اور حیثیت میں مل رہی ہوتی۔اس واقعہ کے بعد میں نے یہاں آکر دائی گیری کا کام سیکھ لیا تھا اور پھر دائی بن گئی۔اپنی اس بیٹی کی شادی میں نے ایک نیک لڑکے سے کر دی۔اس وقت تو وہ معمولی آدمی تھا لیکن اب اس کا کاروبار کافی ٹھیک ہو گیا ہے۔میری یہ بیٹی پاکدامن ہے اور میں بھی اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔مگر ان سب چیزوں کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔

میں اگر اپنی زندگی کی کچھ نیکیاں شمار کرتا ہوں تو یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ میں بہت گنہگار آدمی ہوں۔ ممکن ہے کہ ہر جگہ میں ایسا نہ کر پاتا لیکن اس ایک نیکی کا مجھے خدا جانے کیا کیا اجر دے گا۔ زندگی میں خدا نے میری بڑی عزتیں رکھی ہیں اور ان میں اس واقعہ کا بھی ہاتھ ہے۔

بیس روپے کی چوری

اب ایک ایسا واقعہ سن لیجئے جس میں آپ کو ضرورت کے تحت مجبوریوں کا خاکہ ملے گا۔ایک دن میں امان اللہ خان نیازی اور محبوب اختر سے ملنے کیلئے گیا۔یہ دونوں اصحاب ہی مجھے فلم میں لائے تھے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ راولپنڈی کا واقعہ ہے۔میں گیا تو اس ارادے سے تھا کہ امان اللہ صاحب سے کچھ قرض لوں گا لیکن ایک عجیب شرمیلا پن تھا کہ قرض مانگتے ہوئے بھی جان جاتی تھی۔میں صبح ہی صبح ان کے ہاں پہنچا تھا کہ کہیں وہ نکل نہ جائیں۔ چنانچہ جب میں وہاں پہنچا تو انہوں نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے اندر بیڈ روم میں ہی بلا لیا۔وہ خود نہانے کیلئے باتھ روم میں جانے والے تھے۔انہوں نے میلے کپڑوں میں سے پیسے نکال کر وہاں رکھے اور خود باتھ روم میں چلے گئے۔میں آدھ گھنٹہ سے ان کے پاس بیٹھا رہا لیکن مجھ سے پیسے مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔جب وہ پیسے وہاں چھوڑ کر اندر چلے گئے تو میرے ذہن میں آیا کہ ضرورت کے مطابق ان سے پیسے لے لوں۔وہ دس دس روپے کے متعدد نوٹ تھے چنانچہ میں نے ان میں سے باقاعدہ بیس روپے چوری کیے اور جیب میں رکھ لئے۔ویسے وہ کوئی دو تین سو روپے سے نکال کر پھر پہلی جیب میں ڈالتا۔ذہن میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ انہوں نے کہیں یہ پیسے گن کر نہ رکھے ہوں اور پھر وہاں

سے اٹھ کر چلا آیا۔ یہ زندگی کی پہلی چوری تھی۔اس سے پہلے ماں کے پیسوں میں سے تو میں گھر پر چوری کرتا رہا تھا لیکن باہر کی یہ پہلی چوری تھی۔

اس زمانے میں بیس روپے کافی ہوتے تھے چنانچہ میں نے ضرورت پوری کی۔ لیکن ذہن پر یہ بوجھ رہا۔ بہت عرصہ بعد میں نے امان اللہ صاحب کو بتادیا تھا کہ مجھے ایک چیز کیلئے معاف کر دیں کہ میں نے یہ گناہ کیا ہے۔ وہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ بہت عجیب آدمی ہو' مجھ سے پیسے مانگ لینے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں۔ بہر حال میں نے جب تک اس واقعہ کا اظہار کر نہیں دیا تھا۔ میرے ذہن پر بڑا بوجھ تھا۔ لیکن میں نے زندگی میں یہی ایک چوری کی۔

اب تھوڑی سی اور بری باتوں کا ذکر کرتا ہوں جو صرف تجربے کی حد تک بری رہیں۔ میں شروع ہی سے چرس اور بھنگ کو بری چیز سمجھتا تھا لیکن ایک مرتبہ دھوکے میں آکر بھنگ پینی پڑی جبکہ چرس میں نے خود تجربے کے طور پر پی۔ یہ واقعہ ساغر صدیقی سے متعلق ہے ۔جواب درویش شاعر کہلاتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انہوں نے ابھی کالے کپڑے نہیں پہنے تھے بلکہ نارمل کپڑے پہنتے تھے۔ ہم مشاعروں میں ایک ساتھ جاتے تھے۔ میں انہیں سمجھاتا تھا کہ آپ چرس کیوں پیتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے۔ قتیل صاحب یہ روشنی ہے اور اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ کسی روز آپ بھی پی کر دیکھیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور ایک بار ہم سیالکوٹ کے مشاعرے میں گئے۔ انہوں نے چرس بھری اور ان کے ساتھ جو کچھ اور پینے والے بیٹھے تھے انہوں نے بھی چرس بھری۔ یہ سب چرس پینے لگے تو ساغر صدیقی نے مجھے بھی چرس پلادی۔ چرس پی کر مجھے ایسے لگا جیسے آدمی الو کا پٹھا بن جاتا ہے۔ میری اس وقت یہی کیفیت تھی۔ ساغر صدیقی کے ساتھ بھی لطیفہ ہوا۔ ان کی

ایک مشہور غزل تھی:

جام چھلکاؤ میں شرابی ہوں

منہ نہ کھلواؤ میں شرابی ہوں

ہوا یوں کہ لوگ ہم سب کو اور خاص طور پر ساغر صدیقی کو بہت زیادہ چرس پیتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ جب یہ غزل پڑھنے کیلئے اٹھے اور ترنم سے پڑھنا شروع کیا تو جب یہ مصرع کہتے تھے کہ میں شرابی ہوں تو حاضرین آوازیں لگا دیتے تھے کہ نہیں آپ شرابی نہیں چرسی ہیں۔

ان کے ساتھ تو یہ ہوا اور ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ میں پہلی بار چرس پی کر مشاعرہ پڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں نظر آئے جسے میں جو پڑھ رہا ہوں وہ آنکھوں کے سامنے بھی لکھا ہوا آرہا ہے۔ چنانچہ میں اپنی آواز کی طرف توجہ دینے کی بجائے اسے پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

بڑی مشکل سے غزل پوری کر کے میں وہاں سے ہٹا۔ عام طور پر مجھ سے مزید کلام سنانے کی فرمائش ہوتی تھی لیکن اس روز یہ بھی نہ ہوئی۔ پھر رات کو مجھے بخار بھی ہو گیا۔ حالانکہ بظاہر چرس اور بخار کا آپس میں کوئی تعلق نہیں لگتا۔ شاید نفسیاتی طور پر ایسا ہوا تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے کہا کہ آپ نے مجھے جو روشنی دی تھی۔ اس نے تو میرے اندر اندھیرا بھر دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے ایک تجربہ کروا دیا ہے۔ اب میں زندگی بھر کے لئے اس سے تائب ہوں۔

بھنگ کا تجربہ یوں ہوا کہ ایک میوزک ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے جن کا نام کریم دادا خان تھا۔ ان کا گاؤں سرائے صالح ہری پور سے تین میل دور اور ایوب خان کے گاؤں ریحانہ سے ایک میل دور تھا۔ یہ ان دنوں وہاں گئے ہوئے تھے۔ میں جب لاہور سے ہری پور گیا تو ان کا پیغام آیا کہ میں یہاں

آیا ہوا ہوں۔آپ ملنے کیلیئے آجائیں۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ان کے پاس ان کے کوئی ساتھی بیٹھے تھے مگر وہ خود کوئی چیز رگڑ رہے تھے۔میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہنے لگے کہ سردائی سمجھا اور کہا کہ ضرور پیوں گا۔چنانچہ انہوں نے مجھے ایک گلاس بھر کر دیا جو میں نے پیا تو سرور سا محسوس ہوا۔اس کے بعد کھانا کھایا اور بہت سا کھایا۔پھر مجھے نیند آگئی اور اس میں میں نے عجیب نقشے دیکھے۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری چارپائی آسمان کی طرف جارہی ہے اور جب آدھے آسمان تک پہنچی ہے تو میرے نیچے سے چارپائی نکل گئی ہے اور میں دھڑام سے زمین پر آگرا ہوں۔اس طرح آنکھ کھل جاتی تھی۔پھر کبھی میں کانٹوں پر آجاتا تھا اور کبھی پھولوں میں چلا جاتا تھا۔کبھی جنت میں ہوتا تھا تو کبھی دوزخ میں۔عجیب عجیب نقشے سامنے آتے تھے اور چونک کر اٹھ جاتا تھا اور پھر سو جاتا تھا۔انہوں نے رات کے تقریباً آٹھ بجے مجھے اٹھایا تو میں بڑی مشکل سے جاگا اور میں نے کہا کہ یار یہ کیسی سردائی تھی۔کہنے لگے کہ یہ سردائی ہی تھی۔میں نے کہا پھر اس میں نشہ کیوں ہے۔کہنے لگے کہ میں نے تو بھنگ پلائی تھی۔چنانچہ بھنگ کا تجربہ یوں ہوا۔

ہمارے بہت اچھے اور پیارے دوست تنویر نقوی بھی یہی کام کیا کرتے تھے۔میں نے انہیں اپنا تجربہ بتایا تو کہنے لگے کہ آپ کے ساتھ ہی ایسا ہوا ہے ہمارے ساتھ تو کچھ نہیں ہوتا۔میں تو یہ پی کر شعر بھی لکھتا ہوں۔میں نے کہا کہ جناب آفرین ہے آپ پر۔

ماسکو یاترا

بچپن میں بہت نمازیں پڑھیں، اس کے بعد جب لوگوں کو فرقہ پرستیوں میں گھرے دیکھا تو میری

نمازیں بے قاعدہ ہو گئیں اور ہوتے ہوتے یہ نمازیں سمٹ کر عید اور جنازے کی نمازوں تک آ گئیں۔ لیکن کبھی کبھی یوں ہی نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ جب میں ماسکو گیا تو میرے ساتھ دو بنگالی پروفیسر تھے۔ ان میں سے ایک پروفیسر شوکت عثمان تھے جو بہت اچھے افسانہ نگار بھی تھے اور دوسرے پروفیسر سرور مرشد تھے۔ جب ہم لینن گراڈ پہنچے تو ہم نے تمنا کی تھی کہ ہمیں مساجد اور گرجے دکھائے جائیں ۔ چنانچہ ہمیں لینن گراڈ کی مسجد میں لے جایا گیا۔

یہ کالے پتھر کی بنی ہوئی ایک بہت خوبصورت مسجد تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امیر تیمور کے زمانے کی بنی ہوئی ہے۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور مسجد میں کوئی سوڈیڑھ سو مسلمان موجود تھے۔ میرا جی چاہا کہ یہاں نماز پڑھی جائے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا" چلو بھئی نماز پڑھیں "

انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں نے کہا" اچھا تو پھر میں نماز پڑھ لیتا ہوں"
وہ کہنے لگے "ٹھیک ہے ہم سگریٹ پیتے ہیں" چنانچہ میں نے وہاں جا کر نماز پڑھی لیکن انہوں نے نہیں پڑھی۔
اس طرح کا ایک واقعہ پاکستان کا بھی ہے۔ رحیم یار خان میں ایک مشاعرہ تھا جس کے منتظمین ہمیں شیخ زید بن سلطان النہیان کی شہر سے باہر واقع شکار گاہ دکھانے کیلئے لے گئے۔ وہاں ہم نے شکار گاہ میں ایک چھوٹی سی لیکن بڑی خوبصورت مسجد دیکھی۔ کوئی بھی اچھی مسجد ہو تو مجھے بہت انگیخت کرتی ہے۔ لہٰذا میں نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے وہاں پر نماز ادا کی۔ اس وقت ہمارے زیادہ اسلامی

شاعر احسان دانش بھی ساتھ تھے۔ان سے کہا کہ چلئے نماز پڑھتے ہیں۔کہنے لگے " بھئی ہمارے گھٹنوں میں درد ہے"

مجھے یہ بات کھلی اور لطف کی بات یہ ہے کہ بیشتر شعراء نے نماز ادا کی لیکن اُنہوں نے نماز نہیں پڑھی۔ حفیظ جالندھری اور احسان دانش یہ دونوں ہمارے شاعر اسلام ہیں۔ہم نے سینکڑوں مشاعرے ایک ساتھ پڑھے ہیں لیکن میں نے کسی جگہ ان دونوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔میں نے اپنے معتبر ساتھیوں سے بھی پوچھا کہ شاید میری نظر سے یہ واقعہ نہ گزرا ہو۔لیکن جب بھی میں نے کسی سے سوال کیا کہ آپ نے کبھی انہیں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو سب کا جواب نفی میں تھا۔میں کبھی کبھی سوچتا ہوں:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یہ لوگ جو اسلام کا زیادہ نام لینے والے تھے' اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن اس کی عملی شکل نہیں رکھتے تھے۔اس کے برعکس ہمارے جیسے لوگ جو اپنے آپ کو زیادہ گنہگار بھی سمجھتے ہیں اور اور جنہوں نے مذہب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بھی نہیں بنا رکھا' کبھی کبھی خلوص کی نمازیں بھی پڑھ لیتے ہیں۔ممکن ہے ہمیں اللہ تعالیٰ انہی کا اجر دے دے۔

اس سلسلے میں مجھے مرحوم شورش کا شمیری بہت یاد آتا ہے۔کبھی کبھی جب ان سے ملاقات ہوتی تھی تو کہتے تھے "قتیل صاحب! آپ میرے مسلک سے بہت دور ہیں' آپ یونہی سرخوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں' مجھے تو آپ کی رومانی شاعری بہت پسند ہے" ان کا تکیہ کلام سرخوں کے ساتھ

تھا۔ مگر وہ اپنے خیالات کے باوجود کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

میری زندگی کا جو بہت تھوڑا تجربہ ہے اس میں میں نے مذہب کا نام لے کر واقعی خدا کا خوف رکھنے والوں کو بہت کم دیکھا ہے۔ میرے مشاہدے میں اکثر ایسے لوگ آئے ہیں جو خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور کرتے بھی ہوں گے لیکن میں نے ان میں خدا کے بندوں کو خوش کرنے والے نہیں دیکھے۔ میں نے بہت نمازی دیکھے جو نمازیں تو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں لیکن اگر کوئی پڑوس میں بھوک سے مر رہا ہو تو اسے دیکھنے کے لئے نہیں جاتے۔ یہ زندگی کا ایسا رویہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں، ان کی مدد نہیں کرتے، اگر دوسروں میں کوئی خامی ہو تو ان کی تضحیک کرتے ہیں۔

والد کی وفات کے بعد جن لوگوں سے میرا واسطہ رہا ان میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو میرے والد کے مقروض تھے اور اللہ کے فضل و کرم سے دیندار کہلاتے تھے۔ رسیدیں وغیرہ تو تھیں نہیں لیکن چونکہ میں بڑا بیٹا تھا اس لئے جانتا تھا کہ کس سے کتنا قرض لینا ہے۔ پھر کچھ لوگوں کو میرے والد نے پیسے میرے ہاتھ میں بھیجے تھے۔ مگر جب والد فوت ہو گئے تو ان میں سے بعض افراد تو مکر ہی گئے اور کہا کہ ہم نے تو کوئی قرض دینا ہی نہیں اور بعض نے کچھ قرض مانا لیکن کہا کہ ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں تم معاف کر دو۔ اس طرح جان چھوٹی۔

ہمارے مقروضوں میں سے ایک آدمی ایسا تھا جس کے پاس مذہبی بڑائی جتانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ خدا سے بہت دور ہے۔ جب میرے والد فوت ہوئے تو یہ شخص ہری پور سے باہر تھا۔ واپس آیا تو اس نے خود آ کر مجھے بتایا کہ میں نے تمہارے والد سے بارہ سو

روپے قرض لیے تھے اور وہ میرے ذمے واجب الادا ہیں۔ مجھے ان بارہ سو روپوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا لیکن اس نے نہ صرف اس بارے میں بتایا بلکہ پانچ سو روپے لا کر مجھے دے بھی دیئے اور کہا کہ باقی کے پیسے میں تھوڑے تھوڑے کر کے دے دوں گا۔ یہ اس آدمی کی بات ہے جو ان دینداروں کی نظر میں بالکل بے دین تھا۔

چھوٹے شہروں میں اور نسبتاً کم پڑھے لکھے گھرانوں میں مرگ کے بعد رسوم پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ میرے والد کے فوت ہونے کے بعد کبھی قل ہوئے تو کبھی چہلم، چہلم والے دن تو یوں تھا کہ ہماری پنڈی اور ہری پور کی برادری اور شہروں والے لوگ اس طرح آئے ہوئے تھے جیسے کسی بارات پر آئے ہوں۔ یہ سب لوگ اس طرح ٹوٹ کر کھانا کھا رہے تھے کہ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ ہم مرحوم کیلئے خیرات کر رہے ہیں یا اس کے مرنے کی خوشی میں تقریب کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں بغاوت تو پہلے سے تھی۔ اس واقعہ کے بعد اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں تو ایسے انسان کی عزت کرتا ہوں جو خدا کے بندوں کو خوش رکھے اور خدا کی راہ میں دوسروں کو کچھ دے لیکن ایسے معاملات میں کوئی خرچ نہ کرے جن سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اللہ کا گنہگار ہوں تو مجھے زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ رحیم ہے اور مجھے بخش دے گا۔ لیکن اس کے بندوں سے میں نے جو زیادتیاں کی ہوئی ہوں گی انہیں وہ بخشے گا۔ خود اس کا

ارشاد ہے کہ اگر تم نے میرے فرائض ادا نہیں کیے تو میں تمہیں بخش دوں گا لیکن تم نے میرے بندوں سے جو زیادتیاں کی ہوں گی وہ بندہ ہی بخشے تو بخشے میں نہیں بخشوں گا۔

میرے سامنے جتنے بھی مصنوعی قسم کے دیندار آئے ان کا رویہ یہی رہا ہے کہ وہ مذہب کی آڑ میں کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یتیم تھا ٗمیری والدہ بیوہ تھیں اور میرا ایک بھائی اور ایک بہن بھی تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ امیر تھے لیکن ہمیں سرپرستی اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ لیکن مجھے جو بھی سرپرست اور رہنما ملے ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض تھی ٗ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

ان دیندار لوگوں کے برعکس میرے والد کا ایک ہندو دوست تھا۔ وہ شخص کباڑیا تھا اور پنڈی میں پرانے سامان کا کاروبار کرتا تھا۔ لکھ پتی آدمی تھا اور میرے والد کا جوئے کا ساجھی وال تھا اور دونوں مل کر جوا کھیلا کرتے تھے۔ دونوں کے ایک دوسرے سے کافی قریبی تعلقات تھے۔ جب میرے والد فوت ہوئے تو اس کا افسوس کا خط آیا۔ اس کے بعد ایک اور خط آیا جس میں وہ جتنے رنج کا اظہار کر سکتا تھا کیا تھا اور لکھا تھا کہ چند روز تک میں خود بھی آؤں گا۔ وہ قل اور چہلم کی رسموں کے دوران کسی روز آیا کیونکہ وہ ہندو تھا اور اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے ان رسموں میں میرا شامل ہونا بعض لوگوں کو ناگوار گزرے۔

وہ جب آیا تو جہاں میرے والد بیٹھا کرتے تھے وہاں بیٹھ گیا اور پورے چوبیس گھنٹے وہیں پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس دوران اس نے فروٹ کے علاوہ اور کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ یہ ایک قسم کا برت تھا جیسے

ہمارا روزہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اس ماتم میں ایک برت رکھا اور اس دوران آگ کی پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی اور پھر چلا گیا۔

بعد میں ہم نے جب اسے لکھا کہ چہلم ہے تو وہ چہلم کے ایک یا دو دن بعد آیا اور جہاں میرے والد بیٹھتے تھے وہیں بیٹھا اور جہاں میرے والد سوتے تھے اس چارپائی پر سویا اور زیادہ تر وقت خاموش رہا ۔البتہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد اس نے اپنا برت توڑا اور کھایا پیا۔ پھر مجھ سے کہا'' بیٹے تم یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے رہ گئے ہو 'تمہارے والد میرے بھائی تھے اور میں تمہارا چاچا ہوں۔ ہم میں کوئی فرق نہ سمجھنا اور زندگی میں کسی مرحلے پر بھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا تکلیف لکھنا'' پھر اس نے اس زمانے میں سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا ۔یہ 1935ء کی بات ہے اور اس وقت کا سو روپیہ آج کے دس ہزار روپے کے برابر ہوگا اور کہا کہ یہ میری طرف سے اپنے باپ کے سلسلے میں خیرات کر دینا۔

اس ہندو کا یہ کیریکٹر اس وقت دیکھا جب اپنے لوگ پیسے تو در کنار' رہنمائی کے پردے میں ایسے کاروبار بتاتے تھے جن میں ان کا اپنا مفاد ہو۔ بلکہ ان لوگوں نے میرے والد کے استعمال کی بہت سی چیزیں تبرک کے نام پر آپس میں بانٹ لیں۔ ان لوگوں کو میرے والد کے عمدہ فراک کوٹ' بوٹ' یا ویسٹ اینڈ کی گھڑیوں میں سے جو چیز بھی نظر آئی انہوں نے وہ چہلم کے اندر اندر ختم کر لی۔ اس کے مقابلے میں ان کے ایک غیر مسلم دوست کا رویہ قابل تعریف تھا۔ چنانچہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کم از کم میری زندگی میں وہ تجربات آئے ہیں جنہوں نے مجھے ان جعلی دینداروں سے بہت مایوس کیا ہے۔ کچھ اصل دیندار بھی ملے ہیں لیکن کوئی دیندار سینکڑوں میں سے ایک ہی آیا ہے' اور

جب آیا ہے تو مجھے ایسا لگا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بیٹھا ہوا ہوں اور کوئی صحابی آ گئے ہیں۔

میرے رشتہ داروں میں ہی ایک شخص تھا جسے ہم ملکا ماما کہا کرتے تھے۔ وہ معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد جب میں تکلیف میں تھا تو وہ ہمارے ہاں آتا تھا' بیٹھ جاتا تھا اور چائے پیتا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی کرتا تھا کہ ہماری مالی حالت کیسی ہے۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ میں اس سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ اس لئے جب وہ محسوس کرتا تھا کہ ہم تکلیف میں ہیں تو مجھے کہتا تھا کہ یہ بیس روپے رکھ لو ان کی فکر نہ کرنا جس وقت ہوں مجھے دے دینا۔ میں کہتا تھا کہ ضرورت نہیں ہے اور واپس کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن جب تک میرے حالات خراب رہے اور جب تک میں ہری پور میں رہا اس کا یہی رویہ رہا۔

والد کے انتقال کے بعد پہلے تین سال تو کچھ خوشحالی وغیرہ رہی لیکن اس کے بعد حالات کافی بگڑ گئے اور مجھے چھوٹی سی نوکری کرنا پڑی۔ پھر جائیداد سے بھی کچھ کرایہ آتا تھا لیکن اس کے باوجود میں مشکل میں تھا۔ چنانچہ غربت کو دور کرنے کیلئے میں نے ایک اور کام کیا ہوا تھا جو یہ تھا کہ لاہور سے ایک ماہنامہ رسالہ "گزارا" نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر طاہر میر اب بھی موجود تھے۔ انہوں نے لاہور ہی میں ایک ادارہ دار النشر کے نام سے قائم کر رکھا تھا اور ان کا اشتہار اسی پرچے میں چھپتا تھا کہ جو لوگ اپنے نام سے اشعار اور افسانے لکھوا کر مشہور ہونا چاہتے ہیں وہ ہم سے رجوع کریں۔ انہیں اس زمانے میں آرڈر آتے تھے کہ ہمیں اتنی غزلیں لکھ دیں چنانچہ وہ آٹھ آنے فی شعر کے حساب سے قیمت وصول کر کے چار آنے اپنے پاس رکھتے تھے اور چار آنے مجھے دیا کرتے تھے۔ اس طرح انہیں

جتنے آرڈر ملتے تھے وہ میرے پاس ہری پور میں پہنچ جاتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں اتنا کلام کلام لکھ کر بیچا کہ ایک ہندو رئیس دلشاد نشکلنک ' جو یہ کلام خریدتے تھے' نے میرے لکھے ہوئے کلام سے اپنے نام پر دو کتابیں چھپوائیں جن کے نام ''تیرے گیت'' اور میرے گیت'' تھے۔

میں یہ واقعہ اب شکایتاً بیان نہیں کر رہا بلکہ اس زمانے میں تو اس نے میرے لئے سہولت پیدا کر دی تھی اور میرا یہ روزگار بن گیا تھا کیونکہ آمدنی کم تھی جبکہ اخراجات وہی تھے جو پہلے سے چلے آرہے تھے۔ میں ملکاماما سے جو قرض لیا کرتا' جب طاہر میر صاحب کا منی آرڈر لاہور سے آتا تو وہ قرض چکا دیا کرتا تھا۔

غربت کا یہ بھی عالم تھا کہ تنخواہ بائیں روپے ماہوار ملتی تھی۔ ایک کلرک اور محرر کی اس زمانے میں یہی تنخواہ ہوتی تھی کیونکہ بیس روپے ماہانہ سے تنخواہ شروع ہوتی تھی اور ایک روپیہ سالانہ ترقی لگتی تھی۔ میں دو سال ملازمت کر چکا تھا۔ آمدن کم تھی اس لئے میں بنیے سے قرض لیا کرتا تھا اور اس سے ہم آٹا گھی اور شکر وغیرہ خریدا کرتے تھے۔ یہ قرض تنخواہ سے چکا دیا کرتا تھا۔

ایک مہینہ ایسا آیا کہ میں نے چھٹیاں بہت کیں۔ چھٹیاں تو محدود ہوتی ہیں جو پہلے ہی ایسی ہی سرگرمیوں کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں چنانچہ میں نے اس مہینے میں بلا تنخواہ چھٹیاں زیادہ لے لیں۔ اب تنخواہ کوئی نہ ملی اور میں نے بنیے کو بھی کوئی پیسہ نہ دیا اور خود بھی تکلیف میں رہا۔ دوسرے مہینے ایسا ہوا کہ میں ابھی تنخواہ لے ہی رہا تھا اور خیال یہ تھا کہ اس سے کہوں گا کہ بھائی اس ماہ کم لے لے

آئندہ ماہ چکا دوں گا کہ اس نے بڑی بے تکلفی سے تنخواہ مجھ سے چھین کر اپنی جیب میں ڈال لی اور کہنے لگا" اچھا تم دوکان پر آؤ گے تو پھر حساب کتاب کریں گے"

میں اتنا شرمیلا تھا کہ اسے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ میں نے وہ مہینہ انتہائی مشکل سے گزارا اور وہ بھی یوں کہ گھر کا کچھ اور سامان بیچا۔ لیکن خدا خوش رکھے میرے خریدار ہمیشہ متمول رشتہ دار ہی ہوتے۔

عبرت کا تازیانہ

ہری پور کے زمانے میں جن لوگوں سے ایک طرح کی تربیت حاصل کی ان میں پرچہ " نوجوان افغان" کے مالک محمد اکبر خان قریشی اور ان کے معاون ایڈیٹر تاج محمد خان تار خیلی بھی شامل تھے ۔اب یہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اکبر خان قریشی کبھی حبِ وطن کے جرم میں کافی عرصہ جیل میں رہے تھے اس لئے وہ اپنے نام کے ساتھ سابق اسیر فرنگ بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے میں اسیر فرنگ ہونا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ تاج محمد خان تار خیلی بڑے بیباک آدمی تھے۔ ان کے بیٹے شاہد آجکل لاہور ہی میں وکیل ہیں جبکہ دوسرے بیٹے فوج میں اچھے عہدوں پر تعینات ہیں۔
میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ میں اپنے رب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں اور بالخصوص ان لوگوں کی محفلوں میں جا کر بیٹھتا تھا جو عمر اور رتبے میں مجھ سے بڑے ہوں اور جنہیں میں ذہنی طور پر اپنے سے بڑا سمجھتا تھا۔ غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہاں بیٹھوں جہاں سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنے سے چھوٹوں میں بیٹھوں اور ان پر رعب ڈالوں

اور وہ میری باتیں سنتے جائیں اور مجھے جوابی طور پر کچھ نہ دیں۔

اکبر خان اور تاج محمد کے علاوہ "پیغام سرحد" کے ایڈیٹر قاضی عزیزالرحمان کی محفل میں آنا تھا جو صاحب علم آدمی تھے۔ پھر وہاں ایک مست قلندر انسان تھے' محمد حسین سرخپوش۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ سرخ لباس پہنتے تھے اور انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک آزادی نہیں ملے گی وہ سرخ وردی پہنے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا عہد نبھایا۔ لیکن لطیفہ یہ ہوا کہ آزادی بھی آ گئی تو اب وہ کیا کرتے۔ اب تو انہیں یہ کپڑے اتار دینے چاہئیں تھے۔ لیکن اب ان کا نام ہی سرخپوش پڑ چکا تھا اس لئے وہ مجبوراً وہی کپڑے پہنے رہے۔ یہ سادہ آدمی تھے اور زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور ہماری بزم ادب میں آیا کرتے تھے۔ انہیں علم و ادب کے سلسلے میں باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے ہم ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

ان سب کے علاوہ وہاں ترکی سے آئے ہوئے ایک صاحب بھی تھے جن کا نام لطفی آفندی تھا۔ مگر پیشے اور ترک ہونے کی مناسبت سے لوگ انہیں حکیم ترکی کہا کرتے تھے۔ اب یہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مدت ہوئی وہ ہندوستان میں آئے تھے اور پھر پاکستان بھی بن گیا لیکن یہ حکیم ترکی کے نام سے ہی مشہور رہے۔ انہوں نے یہیں شادی کی تھی اور یہیں ان کے بچے بھی ہوئے۔ بڑے ملنسار آدمی تھے۔ ان کے مطب کے پچھلے حصے میں ہر وقت چائے اور محفل چلتی رہتی تھے اور لوگ تاش کھیلتے رہتے تھے۔ ایک بار انہیں نجانے کیا سوجھی کہ پیچھے خط و کتابت کی تو ان کے کچھ رشتے دار برآمد ہوئے۔ ان سے ملنے کیلئے وہاں گئے تو وہاں ان کی وفات ہو گئی یعنی جہاں کی مٹی تھی وہیں پہنچ گئی۔

ان کے علاوہ اس وقت دوستوں میں جو لوگ تھے ان میں ایک ڈاکٹر عزیز بھی تھے جو بعد میں پنڈی میں کرنل عزیز ہو کر فوت ہوئے۔ پھر ایک گونندن کپور تھے جو میونسپلٹی میں ہیڈ کلرک تھے۔ ایک آغا فیاض علی شاہ جو خود شعر کہتے تھے اور ان کا ایک بیٹا بھی اچھا شاعر ہے جبکہ دوسرے بیٹے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ پھر ایک دوست حفیظ تھے۔ ایک اور دوست غلام جان خان تار خیلی ہوتے تھے جبکہ ایک اور پرسی چرم کولی تھے۔ ان دونوں کو چھوڑ کر باقی سب عمر اور رتبے میں مجھ سے بڑے تھے۔ ان سب دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ پھر ایک حکیم عبدالسلام تھے جو پہلے کانگرس میں رہے پھر مجلس احرار میں آ گئے۔

میں نے ان سب سے بہت کچھ سیکھا اور ان سے ہی کم علمی کے باوجود مجھے گفتگو کا طریقہ آیا اور محفل میں بیٹھنے کے آداب آئے۔ یہ چیزیں میں اپنے والد سے بھی سیکھ رہا تھا۔ میرے والد نے کاروبار تو کئی کیے لیکن ان کا جو مشغلہ ساری زندگی رہا' وہ جوا تھا۔ وہ نجی محفلوں میں فیروز ہری پوریا کے نام سے مشہور تھے۔ نام کے ساتھ یہ جو لاحقہ لگ جاتا ہے کسی کا نام ہوتا ہے تو ہی لگتا ہے۔ انڈیا کے کسی بھی علاقہ میں جو رئیس جواریا ہوتا تھا' وہ میرے والد کو جانتا تھا۔

میں اپنے والد کے ساتھ بہت رہا ہوں اور بہت بڑے بڑے جوئے دیکھے لیکن مجھے جوئے کی طرف رتی بھر رغبت نہیں ہوئی البتہ میں نے والد کی اور اچھی چیزوں کا اثر ضرور لیا۔ یا پھر میں جن لوگوں کا اثر لیا ہے ان کی فہرست میں نے اوپر گنوائی ہے یہ سب صاحب علم اور سیاست والے لوگ تھے۔ میں نے ان سے اثر لیا اور اپنی زندگی کی تعمیر کی۔

جب والد فوت ہو گئے اور بعد میں کچھ تکلیف کا زمانہ بھی آیا تو والد کے ایک دوست ملک قیوم تھے اور دوسرے پشاور والے جان صاحب تھے۔ ان کی ایک کارنیوال چلتی تھی اور ان کا پورے انڈیا میں ٹور ہوتا تھا۔ میں ملک قیوم صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے کہا" تم میرے بھتیجے ہو' اگر تمہیں کبھی پیسوں کی ضرورت ہو گی تو ویسے بھی دے دیں گے لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ تمہیں ہم کارنیوال کے ساتھ بھیج دیں۔ تمہارا عہدہ اسسٹنٹ منیجر ہو گا اور ہم تمہیں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ دیں گے۔ تم بس کارنیوال کے ساتھ رہا کرو گے اور ذرا چیک کر لیا کرو گے کیونکہ تم اپنے آدمی ہو"

اس زمانے کے لحاظ سے دو سو روپے بہت تنخواہ تھی لیکن میں نے کہا" میں یہ کام ہر گز نہیں کروں گا۔ اگر آپ مجھے یہاں کسی دوکان پر پچاس روپے ماہوار دے کر بٹھا دیں تو مجھے وہ تو قبول ہے لیکن میں کسی ایسے کام میں نہیں جانا چاہتا جس کا جوئے سے کوئی تعلق ہو" میں نے اس زمانے میں جوئے کی دو سو روپے ماہانہ کی پیشکش ٹھکرائی تو کچھ رشتے دار کہنے لگے" تم نے بڑا اچھا چانس ضائع کر دیا ہے۔"

اللہ کا فضل ہے کہ میرا ذہن کبھی ناجائز آمدن کی طرف نہیں گیا اور میں نے پیسے کے لئے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے اس وقت یہ عہد کیا تھا کہ محنت کروں گا اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری بھی کر لوں گا لیکن رزق حلال کھاؤں گا۔ میں نے اس دور میں رزق حلال کا عہد کیا تھا جب اس کا اتنا شہرہ نہیں تھا۔ آج رزق حلال کا بہت شہرہ ہے اور نوٹوں پر بھی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے جتنی حرام کاریاں ہوتی ہیں مجھے ان سے چڑ آتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں کس قدر منافقت ہے۔کسی دفتر میں جائیں تو وہاں قائداعظم کے نام سے ایک نعرہ لکھا ہوتا ہے اور اس کے نیچے بیٹھ کر اس کی سراسر خلاف ورزی ہو رہی ہوتی ہے۔لیکن اس کا مجھ پر یہ کرم رہا ہے کہ میں نے ہمیشہ محنت کر کے اور چھوٹے سے چھوٹا کام کر کے حلال کی کمائی کی ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے جسم میں جتنا بھی خون ہے وہ سارا حلال کی کمائی کا ہے اور اس پر مجھے فخر ہے میں اپنے آپ کو اس حاجی سے بہتر سمجھتا ہوں جو چارج کر کے آتا ہے اور پھر آ کر بلیک کرنے لگتا ہے۔اس سے میں وہ گنہگار بہتر ہوں جسے خدا کا خوف تو ہے۔میں دعا کرتا ہوں کہ خدایا میرا دم محنت کرتے ہوئے یا اپنے فن کی انجام دہی کرتے ہوئے نکلے۔

کئی بار غربت کی وجہ سے انسان کا ایمان ڈولتا بھی ہے۔جب میں میونسپلٹی میں کام کرتا تھا تو ایک ایسا موقع بھی آیا تھا۔ان دنوں مجھے چونگی پر لگا دیا گیا تھا اور چونگی میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ اگر کوئی محرر بد دیانتی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔وہاں ایک ہندو ساہو کار تھے ان کی منڈی تھی اور ان کا منشی ان محرروں سے مل کر غبن کیا کرتا تھا۔ایک دن وہ منشی میرے پاس بھی آیا اور مجھے اس نے طریقہ بتایا کہ اس طرح پہلے ایک رسید کاٹ دو اور پھر اس میں تبدیلی کر دو۔ جتنے پیسے آئیں گے اس میں سے آدھے تمہارے ہوں گے اور آدھے میرے۔

میں نے اس طرح کرنا شروع کر دیا۔کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے تو اصل سیٹھ میرے پاس آیا۔ وہ بہت نیک نام آدمی تھا۔اس نے مجھے کہا" یار تم تو بڑے اچھے باپ کے بیٹے ہو لیکن تم نے یہ کیا کام شروع کر دیا ہے"

میں سمجھ گیا کہ اس کو پتہ چل گیا ہے اور خاموش ہو کر کھڑا رہا۔اس نے میرے منہ پر پیار اور غصے

سے ملا ہوا ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا اور کہنے لگا" آئندہ ایسے مت کرنا اور یہ پرچی ہے اسے ٹھیک کر دو" میں اس کے ساتھ ہی لرز گیا۔ میں نے وہ پرچی ٹھیک کر دی اور شکر ہے کہ یہ کام شروع ہی میں چیک ہو گیا۔

یہ واقعہ میرے لئے عبرت کا تازیانہ بنا۔ اگر وہ سیٹھ زندہ ہے تو خدا اسے باقی زندگی خوش رکھے اور اگر وہ مر گیا ہے تو خدا اسے آخرت میں جو اچھی جگہ ہے وہ دے کر اس ہندو ساہوکار نے مجھے سیدھے راستے پر ڈال دیا۔

ہری پور میں ایک آزاد خیال اور ایڈوانس فیملی تھی جن کے ہاں میرا آنا جانا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً بیس اکیس سال تھی۔ اس فیملی میں کچھ بیٹیاں بھی تھیں لیکن جس لڑکی کا میں ذکر کرنے والا ہوں اس کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ اس لڑکی نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ مگر میرے دل میں ہمیشہ یہ تصور رہا ہے کہ میں جس دوست کے گھر میں جا رہا ہوں اس کی بہن میری بہن ہے اس طرح اگر محلہ ہے تو وہ اپنی عزت۔ اگر رومانٹک ذہن ہے بھی تو اس کی کچھ حدود ہیں۔ ان حدود سے باہر شاعرانہ ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ان حدود کے اندر رہ کر ایسا نہیں کر سکتے۔ چونکہ وہ لڑکی دوست کی بہن تھی اس لئے میں اسے ذہنی طور پر اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔

اس لڑکی نے خواہش ظاہر کی کہ ادیب فاضل کیا جائے۔ چونکہ میں شاعر تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ میں اس کی معاونت کروں گا اور مل کر پڑھا کریں گے۔ چنانچہ کتابیں خرید کر ہم نے مل کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ لڑکی نے پڑھنے کی تجویز محض قربت بڑھانے کیلئے

پیش کی ہے۔ کیونکہ جو عشقیہ شعر ہوتا تھا یا جس میں عشقیہ باتیں کرنے کی زیادہ گنجائش ہوتی تھی وہ اس پر انگلی رکھ کر کہتی تھی یہ شعر سمجھائیں۔ جب مجھ پر اس نادان لڑکی کے ارادے کھل گئے تو میں نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا اور اسے یہ تاثر دیتا تھا جیسے مجھے کسی چیز کی سمجھ نہیں آرہی ہے۔

ہمیں اس طرح پڑھتے ہوئے ابھی دس پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ ان سے اندازہ کیا کہ اب اگلا قدم مناسب رہے گا۔ان دنوں پنڈی میں کوئی بڑی مشہور فلم لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے پروگرام بنایا کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر پنڈی چلتے ہیں اور وہاں جاکر یہ فلم دیکھتے ہیں کیونکہ آپ کا گھر تو وہاں بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں گھر تو وہاں بھی ہے۔چلے چلتے ہیں۔ غرض وہ لڑکی' اس کا چھوٹا بھائی اور میں پنڈی روانہ ہوگئے۔

پنڈی میں ایک بہت مشہور دواخانہ تھا جس کا نام شاہی دواخانہ تھا اور حکیم عبدالخالق اس کے مالک تھے۔اس دواخانے کی ایک بہت بڑی بلڈنگ تھی جو کہ جامع مسجد کے سامنے واقع تھی۔اس بلڈنگ کو گرا کر کچھ اور بنا دیا گیا ہے۔ حکیم عبدالخالق کے ایک بیٹے ایوب صاحب تھے جو کہ میرے ہم عمر تھے اور جن سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ان دنوں میں جب پنڈی جاتا تھا تو ان کے ہاں جاکر رہتا تھا کیونکہ بہت کھلی جگہ تھی، کھانا پینا بھی اچھا تھا اور بے تکلفی سے باتیں بھی ہوتی تھیں ۔ میں نے انہیں پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ ہم فلاں دن آپ کے پاس رہنے کیلئے آرہے ہیں اور ہمارے ساتھ کوئی خاتون بھی ہوں گی۔

ہم دوپہر کا کھانا کھا کر لاری میں بیٹھ کر ہری پور سے پنڈی روانہ ہوئے۔ تقریباً دو گھنٹے کا سفر تھا۔

وہاں پہنچ کر ہم تین بجے والا شو دیکھنے کیلئے سینما گئے۔اس لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ چابی لے لو اور یہ کام ہے اور تم ہری پور چلے جاؤ کیونکہ میں تو دوسرا شو بھی دیکھوں گی اور کل صبح خود ہی قتیل صاحب کے ساتھ واپس آجاؤں گی۔وہ لڑکا واپس چلا گیا۔ہم نے فلم دیکھی' رات کا کھانا کھایا اور تنہا کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اس نے جس جس انداز سے مجھے رغبت دلائی اس لحاظ سے یہ میرے لئے امتحان کی رات تھی۔میں سوچتا تھا کہ میرے دوست نے اور اس کے والدین نے کیا سوچ کر اسے میرے ساتھ بھیج دیا ہے اور اگر میں غلط راستے پر چل پڑا تو ان کے اعتماد کا کیا حال ہو گا۔کیونکہ آج کا بویا ہوا بیج پودا بن سکتا ہے اور درخت بن سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ باتیں چھپی ہوئی تو رہتی نہیں۔پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ میں اپنے آپ پر بہت ناز کرتا ہوں لیکن اگر میں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو میں مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاؤں گا۔

ہم دونوں دو الگ الگ چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔اس نے چارپائی کے آخری حصے تک اپنا جسم رکھا ہوا تھا اور عجیب عجیب باتیں کر رہی تھی۔رات تقریباً ایک بجے کے قریب میں نے مصنوعی نیند لا کر خراٹے لینے شروع کر دیئے تو اس نے پھر مجھے جگایا لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی۔خیر رات گزر گئی اور جب ہم صبح کو اٹھے تو اس نے ناشتے پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور واپس ہری پور چلے گئے۔

میں جب شام کو پڑھنے کے وقت پر حسب معمول اس کے گھر گیا تو اس نے کہا کہ میں اب پڑھنا نہیں چاہتی یہ ساری کتابیں آپ ہی رکھیں۔اس کے بعد ہمارے آپس میں تعلقات بھی منقطع ہو

گئے۔ ''گجر ' ' میں اس واقعہ پر ایک نظم ہے۔ میری سبھی نظمیں زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ کو Touch کرتی ہیں۔

پنڈی سے بات جنس مخالف کی چلی ہے تو اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی ہے۔ یہ زمانہ یونینسٹ پارٹی کی حکومت کا تھا اور میرے دوست جگن ناتھ آزاد اس وقت لاہور میں تھے۔ ملک خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اور اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلانا ان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنی وزارت اطلاعات کے ذریعے تحریک رفاقت کے نام سے ایک تحریک چلا رکھی تھی۔ مولوی ابراہیم علی چشتی اس کے سربراہ تھے۔ یہ بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن ملائیت والا انداز ہی تھا۔ جگن ناتھ آزاد اس تحریک میں ان کے فیلڈ منیجر قسم کی چیز تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ مختلف شہروں میں مشاعرے کر کے لوگوں میں اتحاد اور رفاقت کی تلقین کریں اور لوگوں کو یہ بات سمجھائیں کہ وہ اپنے اپنے نظریات رکھنے کے باوجود شہری کے طور پر آپس میں مل جل کر رہیں۔ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں ہم تحریک رفاقت کا اجلاس کرتے تھے ' ایک دو ہفتے کے بعد وہاں ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔

ایک بار انہوں نے مجھے پنڈی سے بلایا اور بتایا کہ ملتان میں مشاعرہ ہے اس لئے تم آ جاؤ۔ جگن ناتھ آزاد میرے دوست بھی تھے۔ کچھ میں مقبول بھی تھا کیونکہ ترنم سے پڑھتا تھا اور کلام بھی نئے انداز کا تھا جو لوگوں میں سنا بھی جاتا تھا تو اکثر مشاعروں میں میں بلایا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ جنگ کے بعد کے زمانے میں ہو رہا تھا اور ان دنوں ریل گاڑیوں میں بہت رش ہوتا تھا۔ ہم نے انٹر کلاس کا ٹکٹ

لیا۔ کیونکہ اس زمانے میں سفید پوش قسم کے لوگ اس کلاس میں سفر کرتے تھے۔ ہمیں رش کی وجہ سے ٹرین میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی لیکن جگن ناتھ آزاد کے پاس ایک بڑے سائز کا کالے رنگ کا ٹرنک تھا جس میں ان کی فائلیں وغیرہ تھیں۔ یہ ٹرنک اس زمانے میں بڑے افسروں کی نشانی ہوتی تھی اور اس پر سفید رنگ سے نام لکھا ہوتا تھا جب قلی یہ ٹرنک اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتا تو پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی آفیسر ہے۔اس لئے جب قلی اس طرح ٹرنک لے کر ڈبے میں پہنچا تو کچھ لوگوں نے جگہ دے دی۔

سیٹ تو مل نہ سکی تھی اس لئے ہم نے ٹرنک لیٹرین کے پہلو میں فرش پر رکھا اور دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔خانیوال سے ایک سٹیشن پہلے مسافروں کا ایک ریلا ڈبے میں داخل ہوا اس میں ایک خوبصورت لڑکی' ایک بوڑھا بابا اور ایک جوان آدمی جس نے معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔وہ بھی داخل ہوئے بوڑھے نے جب ٹرنک پر کچھ جگہ دیکھی تو اس نے کہا کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو یہ لڑکی یہاں پر بیٹھ جائے۔ ہم دونوں تھوڑا تھوڑا سرکے اور وہ میری طرف بیٹھ گئی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ سال ہو گی لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح لگ کر بیٹھی کہ اس کی ران میری ران کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔میں بدحواس ہو گیا۔ اس بدحواسی میں نجانے کیا کچھ ہوا کہ اس سے باتیں ہونے لگیں۔

اس نے بتایا کہ یہ جو دو آدمی میرے ساتھ ہیں ان میں سے ایک میرا خاوند ہے اور ایک میرا سسر ہے۔میں اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی کیونکہ یہ آدمی اچھا نہیں ہے ۔اس نے مزید بتایا کہ میں اپنے میکے چلی گئی تھی لیکن یہ برادری بٹھا کر مجھے میری مرضی کے خلاف لے آئے ہیں۔ پھر اس نے مجھے

سرائیکی میں کہا کہ " تو میں کو نٹھا کھڑ" یعنی تم مجھے بھگا کرلے جاؤ۔ سردی کی وجہ سے میں نے اور جگن ناتھ آزاد نے اوپر کمبل لیا ہوا تھا لیکن اب وہ بھی اس کمبل میں شامل ہو گئی تھی۔ اب ہماری کچھ ہونٹوں سے گفتگو ہو رہی تھی اور کچھ ہاتھوں سے۔ پتہ نہیں اس نے مجھے اتنا جوانمرد کیوں سمجھا کہ دو لاٹھی والے آدمیوں کی موجودگی میں اور صرف دو گھنٹے کی ملاقات میں اس پر اتنا عاشق ہو جاؤں گا کہ جب ہم پلیٹ فارم پر اتریں گے تو میں اسے وہاں سے اٹھا کر بھاگ جاؤں گا اور ہم ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ جب سٹیشن آیا تو ہم اترے لیکن ہمارا ٹرنک اترتے ہوئے ان کے اور ہمارے درمیان کوئی سو قدم کا فاصلہ ہو گیا تو وہ کھڑی ہو کر پیچھے دیکھنے لگی کہ میرا ہیرو آئے گا اور مجھے ان سے نجات دلا دے گا۔

میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا کہ ابھی کچھ دیر اور کھڑے رہیے۔ وہ پہلے تھوڑی دیر کیلئے رُکی' پھر چلی اور آگے جا کر پھر رک گئی۔ اس بارے اس کے خاوند نے اسے چوٹی سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا کہ پیچھے کیوں دیکھتی ہے۔ اب وہ روتے ہوئے چلی۔ میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا کہ ہم اب دوسری طرف سے نکلیں گے تاکہ اس طرح سے کہیں پھر ہیروئن سے ملاقات نہ ہو جائے اور ہماری پٹائی نہ ہو جائے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد کئی دن تک میں سوچتا رہا کہ ہمارے ملک میں لڑکی کی مرضی کے خلاف اور زبردستی کی جانے والی شادی کا آخر کار انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کسی سے یہی کہے گی کہ مجھے بھگا کرلے جاؤ۔ یہاں تو پھر میاں بیوی کی عمروں میں بھی بڑا فرق تھا اور آدمی کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس کے علاوہ تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا تھا' وہ لڑکی اس کے ساتھ رہنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ سسرال میں پہنچنے کے بعد وہ پھر کسی کے

ساتھ بھاگ کر چلی گئی ہو۔

شاعروں کا استحصال

جگن ناتھ آزاد میرے بہت پیارے دوستوں میں سے تھے۔ یہ اصل میں تو تلوک چند محروم کی طرح عیسیٰ خیل کے رہنے والے تھے اور ان کی پیدائش بھی وہیں ہوئی تھی لیکن ان کا زیادہ تر وقت پنڈی ہی میں گزرا۔ تقسیم کے بعد جگن ناتھ آزاد کی شاعری اپنے وطن کی یاد کا نوحہ بنی رہی اور جو نظمیں انہوں نے کہیں ان میں وطن کی یاد کی بالادستی رہی اور جب تقسیم کے بعد ان کا پہلا مجموعہ ”وطن میں اجنبی،، کے نام سے آیا تو اس موضوع کی وجہ سے پاپولر ہوئے۔ شاعر تو وہ پہلے بھی اچھے تھے لیکن یہ موضوع لوگوں کو بھایا۔ چنانچہ وہ پاکستان میں اکثر بلائے جاتے تھے۔

میں ان کے حوالے سے آپ کو یہ ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ شاعر ایک ایسا طبقہ ہے کہ جس کا استحصال بہت ہوا ہے۔ امراء اور کھاتے پیتے لوگ ہی نہیں بلکہ سرکاری افسران اور سرکاری ادارے بھی ان کا بہت استحصال کرتے رہے ہیں۔ جہاں انہیں شاعر کی ضرورت پڑی تو یہ سوچے بغیر کہ شاعر کا پیٹ ہوتا ہے' اس کے بیوی بچے ہوتے ہیں اور اس کی ضرورتیں ہوتی ہیں ' کبھی تو شاعر کو قومی خدمت کے نام پر بلا لیا جاتا ہے اور کبھی اس چکر میں کہ آج آپ کے اعزاز میں کھانا ہے' آپ آیئے۔

اسی طرح کی بعض محفلیں میرے ذہن میں موجود تھیں کہ جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں پنڈی کے ایک رئیس نے چائے کا انتظام کیا اور اس مشاعرے میں جو دوسرے شاعر آئے ہوئے تھے ساتھ انہیں بھی بلا لیا۔ اس نے یہ قطعاً تاثر نہیں دیا کہ اس کے کوئی اور مقاصد بھی ہیں۔ جب ہم چائے پی

چکے اور میں اور جگن ناتھ آزاد ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو میز بان کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ ابھی کچھ ارشاد فرمایئے۔ میں نے اشارتاً کہا کہ ہمیں تو چائے پر بلایا گیا تھا اس لئے میں ذہنی طور پر کچھ سنانے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ لیکن کچھ لوگ کو سنانے کی عادت ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے سنانا شروع کر دیا۔

ہم کوئی سات آٹھ شاعر تھے جب میری باری آئی تو میں نے جیب سے دو روپے نکالے اور میز بان سے کہا یہ لیجئے جناب۔ وہ کہنے لگے یہ کیا ہے۔ میں نے کہا" چائے کی قیمت کیونکہ چائے پلا کر شعر نہیں سنے جا سکتے۔ اگر آپ کو شعر سننے ہیں تو معاوضہ نکالیے۔ یہ جگن ناتھ آزاد باہر سے آئے ہیں' یہ ان پیسوں سے کچھ خرید و فروخت کریں گے' پھر ہم لاہور سے آئے ہیں ہماری بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ آپ دو روپے کی چائے پلا کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم سے کلام سنیں گے تو یہ دو روپے رکھ لیجئے"

میری ان باتوں سے بدمزگی ہوگئی اور کچھ خوشامدیوں نے کہا کہ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اکثریت خوش ہوئی۔ چنانچہ جو دو شاعر پہلے پڑھ چکے تھے' وہی پڑھ چکے تھے اور باقی سب بغیر پڑھے ہی چلے آئے۔

جگن ناتھ آزاد نے اس واقعہ پر مجھے بہت داد دی بلکہ اپنے مضامین میں بھی بعد میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن شاعروں کے استحصال کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

کچھ عرصہ پہلے میں قطر میں گیا وہاں ایک مشاعرہ تھا۔ انہوں نے ہمیں معاوضہ دیا ہم نے شعر پڑھے

۔اب اس مشاعرے کے پیٹ سے ایک اور مشاعرہ نکلا کہ فلاں کے گھر پر آپ کی دعوت ہے۔ ہم اس دعوت میں گئے اور وہاں بھی کہا گیا کہ شعر سنائیں۔ میں نے کہا" میں تو نہیں سناتا کیونکہ آپ نے پہلے کہا نہیں تھا۔ اگر کہا ہوتا تو میں سوچتا کہ مجھے اس دعوت میں آنا چاہیے یا نہیں آنا چاہیے اور اب مجھے یہ بھی افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں لیکن میں شعر نہیں سناؤں گا کیونکہ میرا موڈ نہیں ہے اور میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہی نہیں۔" میں سمجھتا ہوں جو پیسوں کے بغیر شعر سناتا ہے وہ چاپلوسیا ہوتا ہے، اسکی کوئی انا نہیں ہوتی۔

وہاں بیٹھے ہوئے کچھ چمچے شاعروں نے کہا" جی کیا ہوا۔ آپ سنایئے" میں نے کہا " آپ سنائیں" چنانچہ انہوں نے شعر سنائے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ میزبان نے شاعروں کیلئے جو تحفے رکھے تھے' مجھ سے چھپ کر سب کو وہ دے دیئے اور مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ پھر اگلے سال جو اگلا مشاعرہ ہوا تو انہوں نے کہا" قتیل صاحب تو بڑے مغرور آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں کچھ نہیں پڑھا تھا" ساتھ ہی انہوں نے سفارت خانے کے کچھ لوگوں کو بھڑکایا کہ سفارتخانے کا بھی فلاں آدمی دعوت میں بیٹھا تھا اور اس کے باوجود انہوں نے کلام نہیں سنایا۔ میں شاعر ہوں اور میں نہیں سنانا چاہتا۔ چنانچہ انہوں نے سزا کے طور پر مجھے اس اگلے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا۔ جو شاعر گئے تھے انہوں نے واپس آکر مجھے کہا کہ وہ صاحب تو آپ سے ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ نے ان کی محفل میں کلام نہیں پڑھا تھا اور اس میں سفارتخانے کا آدمی بھی بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کا زور سفارتخانے پر ہے کیا وہ تنخواہ نہیں لیتے۔ وہ جب سرکاری کام کرنے یا یہ خدمت خلق کرنے

جاتے ہیں تو ان کی تنخواہ چل رہی ہوتی ہے پھر میں ان کا آلہ کار کیوں بنوں۔

اسی طرح میں جب اپنے ہاں کسی دوست کی دعوت کرتا ہوں تو اس کا اہتمام کرتا ہوں کہ اس محفل میں شعر و شاعری نہ ہو۔ اگر میں ایک شاعر دوست کو اپنے گھر بلا لیتا ہوں کہ آپ باہر سے آئے ہوئے ہیں تو آپ کے اعزاز میں یہ دعوت ہے۔ لوگ تو یہ کرتے ہیں کہ کچھ افسروں کو اور کچھ ایسے افراد کو بلا لیتے ہیں جن سے ان کے کام ہوتے ہیں اور ان کے کان میں یہ ڈالتے ہیں کہ آپ کی تفریح کا سامان کیا گیا ہے۔ اور چنانچہ دعوتوں میں کبھی کسی مہمان کو تکلیف نہیں دی اور نہ کہیں جا کر خود پڑھنا پسند کیا ہے۔ اس کے برعکس ایک دو شاعر جو انڈیا سے آئے تھے میں نے انہیں اپنے گھر پر بلایا اور ان سے عمداً اس لئے کچھ شعر سنے کہ میں ان کی کچھ خدمت کر سکوں۔ چنانچہ میں نے لوگوں سے چھپا کر اور جو مجھ سے ہو سکا ان کو دیا اور لفافے میں بند کر کے دیا اور ساتھ یہ کہا کہ آپ کو کچھ تحفہ دینا تھا لیکن آپ کی پسند کا نہیں پتہ ہے اس لئے آپ اپنی پسند کا تحفہ جا کر خرید لیجئے مگر جو گھٹیا یا کم ظرف لوگ ہوتے ہیں وہ نہ پڑھنے کی باتوں کو اپنا Point of prstige بنا لیتے ہیں۔

شاعروں کے اس طرح کے استحصال کے بارے میں میں نے سب سے پہلے احمد شاہ بخاری یعنی پطرس بخاری سے باتیں سنی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب وہ یو این او میں ہوا کرتے تھے اور ہر سال وہ پاکستان آ کر ایک محفل برپا کیا کرتے تھے جس میں ان دوستوں کو بلاتے تھے جنہیں وہ پسند کرتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں جونیئرز ' میں ان کا پسندیدہ آدمی تھا۔

پہلی بار جب سید امتیاز علی تاج کے گھر محفل ہوئی تو اس میں میرے علاوہ احمد ندیم قاسمی کچھ سکالرز اور بعض دوسرے لوگ موجود تھے۔ اچانک کسی نے کہا کہ شاعر حضرات بیٹھے ہیں ان سے کچھ کلام

سنا جائے تو پطرس صاحب نے سختی سے ٹوک دیا اور کہا" میں نے انہیں ملنے کیلئے بلایا ہے اور یہ شاعرانہ نشست نہیں ہے۔ اگر آپ وہ پسند کریں گے تو میں ان سے درخواست کر کے ایک الگ محفل رکھوں گا۔ یہ نہیں کہ جہاں کوئی شاعر آیا ہے آپ اسے کہیں کہ کچھ سناؤ اور سنانا شروع کر دے۔ یہ مناسب بات نہیں ہے"

اگر پطرس صاحب نے کہا ہوتا تو ظاہر ہے کہ میں، ندیم صاحب اور دوسرے ساتھی بھی ان کے حکم کی تعمیل کرتے لیکن میں نے ان کا یہ نکتہ پلے باندھ لیا کہ ہر جگہ شاعر سے نہ تو کسی کو فرمائش کرنی چاہیے اور نہ ہر جگہ شاعر کو سنانا شروع کر دینا چاہیے۔

پطرس صاحب مجھ سے بڑے تھے، پھر بھی وہ مجھے قتیل صاحب کہہ کر بلاتے تھے حالانکہ مجھے شرم آتی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ تم چھوٹے ہو اور میں بڑا ہوں یا ہم علمی سطح پر مجھ سے کمتر ہو اور میں برتر ہوں۔ وہ ایسا رویہ اختیار کرتے تھے کہ برابری کا احساس ہو اور دوسرے کا ارتقاء رکنے نہ پائے۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ تمہاری غزل ہے۔

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جائیں

یہ غزل ہم نے بارہا سنی ہے اور ہمارے ساتھی اس کی دھن بھی بنا چکے ہیں اور متعدد بار اسے گا بھی چکے ہیں۔ یہ غزل انہوں نے بعض اوقات کورس کے ساتھ گائی ہے، بعض اوقات قوالی کے انداز میں گائی ہے اور بعض اوقات کسی گلوکار نے تنہا بھی گائی ہے۔ اتنا بڑا اسکالر اگر میرے جیسے جونیئر کو اتنی زیادہ داد دے دے تو وہ ذہنی طور پر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ پرانے

قسم کے جو شاعر حضرات ہوتے ہیں اور جنہیں اساتذہ کہا جاتا ہے ان کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جونیئر شاعر کی صرف خامیوں کی اپنی خوردبین سے نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس کے کلام کے جو محاسن ہوتے ہیں انہیں نظرانداز کر جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر کے ہاں آنا جانا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان میں بھی یہ خوبی دیکھی کہ وہ دل کھول کر داد دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ اگر کسی کا کوئی کام ہوتا تھا اور اس میں ان کی شہرت کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا تو یہ کام بھی کر دیتے تھے۔

کام کرنے کے سلسلے میں سب سے اونچا نام عبدالمجید سالک کا آتا ہے۔ وہ اپنا آدھا دن اسی غرض سے واقف کر دیتے تھے۔ ان کے پاس گھر میں یا دفتر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ کسی کے لئے تو فون کر رہے ہوتے تھے اور کسی کے ساتھ خود بھی چھڑی اٹھا کر اور تانگے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں بلکہ پیسے بھی پاس سے خرچتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنی تحریر دکھانے کیلئے لاتا اور کہتا کہ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے تو اس کی خامی اس طرح بتاتے تھے کہ اس کی دل شکنی نہیں ہوتی تھی۔ پھر خوبی کی اس طرح تعریف کرتے تھے جیسے اس سے بہتر کہنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

اس ضمن میں ’’شاہکار‘‘ کے ایڈیٹر تاجور صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ میں اس زمانے میں انہیں ہری پور سے اپنی نگارشات چھپنے کیلئے کثرت سے بھیجتا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں چھپنے کیلئے کچھ بھیجا تو انہوں نے جواباً جو لکھا اس کے الفاظ کچھ ایسے تھے کہ قتیل شفائی ایک سنگلاخ سرزمین سے تعلق رکھتا ہے اور اس علاقے میں پیدا ہونا اس کی اپنی خوش قسمتی ہو نہ ہو لیکن اس علاقے کی ضرور یہ

خوش قسمتی ہے کہ قتیل شفائی جیسا خوش گو شاعر وہاں پیدا ہوا۔
جب مولانا تاجور کی لکھی ہوئی یہ رائے مجھ تک پہنچی تو سب جانتے ہیں کہ اگر کسی گھوڑے کو بھی تھپکی دے دی جائے تو وہ زیادہ بھاگتا ہے۔اسی طرح اس رائے نے میری زندگی پر خوشگوار اثرات کیے اور میں جو پہلے کچھ سست روی سے چل رہا تھا اب اس طرف اور بھی توجہ دینے لگا۔
ایک ایسا ہی واقعہ حفیظ ہوشیار پوری سے متعلق ہے ۔وہ غزل گوؤں میں عجیب طرح کا بانکپن رکھتے تھے اور ان کے کلام میں بڑی پختگی ہوتی تھی۔یہ زمانہ تقسیم سے ذرا پہلے کا تھا۔میں اور میرے ساتھ فکر تونسوی نظام ہوٹل میں بیٹھے تھے۔یہاں اس زمانے میں قرب وجوار کے ادیب حضرات آیا کرتے تھے اور حفیظ ہوشیار پوری بھی وہاں آتے تھے۔میں نے اس زمانے میں ایک غزل کہی تھی:

پربت پربت گھوم چکا ہوں' صحرا صحرا چھان رہا ہوں
ہر منزل کے حق میں لیکن' کافر کا ایمان رہا ہوں

اس غزل کا ایک اور شعر تھا:

دیکھ مری انمول شرافت' لٹ بھی گیا شرمندہ بھی ہوں
جیت بھی لی' اخلاص کی بازی ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

میں نے یہ غزل سنائی تو حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے کہا" قتیل میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔مجھے تمہارے ہاں نغمگی بہت شدت سے نظر آتی ہے۔لیکن ایک خامی پر ابھی سے دھیان دو گے تو آگے چل کر ٹھیک رہے گی" میں نے کہا"فرمایئے "تو کہنے لگے" مطلع کو چھوڑ کر باقی اشعار میں پہلے مصرع میں ردیف والا لفظ یا اس سے ملتی ہوئی آواز والا لفظ نہ آئے۔کیونکہ یہ صوت کو متاثر کرتا ہے

۔اس لیئے ابھی میرے سامنے بیٹھ کر اسے درست کرو" تو میں نے مذکورہ بالا شعر میں یوں تبدیلی کی۔

دیکھ مری انمول شرافت لٹ کر بھی شرمندہ ہوں میں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی' ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

کہنے لگے کہ اب ٹھیک ہے۔اس واقعہ کے بعد میں نے دوسرے شاعروں کے کلام پر بھی نظر رکھی اور ان میں بھی یہ خامی موجود پائی اور صوت کو مجروح ہوتے دیکھا۔ مگر اس کے بعد میرے ایک ہزار اشعار میں سے کسی ایک میں ایسی خامی آ گئی ہو تو ہو ورنہ میں نے یہ غلطی کبھی دوبارہ نہیں کی۔

تقسیم سے کوئی دس سال بعد کراچی کے شفیع عقیل صاحب جو اخبار جہاں کے ایڈیٹر ہیں' نے میرا ایک انٹرویو لیا اور اساتذہ کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ جن جن لوگوں سے میں نے سیکھا ہے ان میں ایک نام حفیظ ہوشیار پوری صاحب کا بھی ہے۔حفیظ صاحب نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو حیران ہوئے کہ یہ تو میرا شاگرد نہیں ہے۔ایک دن ملے تو کہنے لگے کہ یار بات سنو' تم میرے کب سے شاگرد ہو؟ میں نے کہا وہ تو میں آپ کو بتاؤں گا لیکن کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے۔کہنے لگے نہیں تم میرے شاگرد ہوتے تو مجھے فخر ہوتا لیکن ہو نہیں۔میں نے کہا کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ تم نے اپنے انٹرویو میں یہ ذکر کیا ہے۔میں نے وہی واقعہ یاد دلایا اور کہا" آپ نے مجھے وہ نکتہ سمجھایا تھا جس نے میری شاعری کے تیور بدل دیئے اور مجھ میں آخر تک جو مستقل خامی چلی جاتی' آپ نے اس کی اصلاح کر دی۔کیونکہ میں غنائی شاعر بھی کہلواتا ہوں۔اگر یہ خامی رہتی تو میری شاعری میں ایک دھبہ لگا ہوا نظر آتا" یہ واقعہ سن کر وہ آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ مجھے تو یاد بھی نہیں' تم نے

یاد دلا یا ہے تو اب مجھے یاد آیا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ پھر کہنے لگے " جب ذرا نام ہو جاتا ہے تو میرے شاگرد میری شاگردی سے مکرنے لگتے ہیں اور تم ہو نہیں اور ایک نکتہ پکڑ کر میرے شاگرد بن گئے ہو۔ اس لئے میرا ایمان ہے کہ ابھی دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی باقی ہیں"

بعد میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ چونکہ مجھے ایسے لوگ ملے جو لوگوں کی مدد کر کے راحت محسوس کرتے تھے' اس لئے ایک طرح سے مجھے ورثے میں یہ چیز ملی کہ اگر کوئی ایسا شخص ہے جس میں کچھ جوہر موجود ہے تو اس کے ساتھ چند قدم چلو تاکہ وہ منزل پر پہنچ جائے کیونکہ اسے منزل پر تو بہر حال پہنچ جانا ہے لیکن جو سفر وہ سو قدم کا چکر لگا کر طے کرے گا اگر اس کے ساتھ تم چلو گے تو وہ وہی سفر دس قدم چل کر ہی طے کرے گا اور منزل پر پہنچ جائے گا۔ اس طرح وہ تمہیں بھی یاد رکھے گا اور اس کا اپنا وقت بھی بچے گا پھر اس کے دل میں بھی نیکی کے جذبات پیدا ہوں گے۔

ادب میں تو میں نے اس قسم کے کئی کام کیے۔ فلم کا ایک واقعہ بھی یاد ہے جو بیان کرتا ہوں۔ سلیم رضا ایک عیسائی فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ انہیں میرا ایک پرانا دوست سرور سیال میرے پاس لے کر آیا اور کہنے لگا کہ اس سے گانا سنو اور اگر یہ اس قابل ہے تو اسے آگے بڑھاؤ۔ میں نے سنا تو مجھے ان کا گانا بہت پسند آیا کیونکہ بہت اچھا گاتے تھے۔ میں اس زمانے میں بطور نغمہ نگار چھایا ہوا تھا اور اسّی فیصد سے زائد فلمیں میرے پاس تھیں اور یہ شوق تھا کہ بہت زیادہ فلمیں پاس ہونی چاہئیں حالانکہ اب یہ خیال ہوتا ہے کہ بہت کم فلمیں پاس ہوں تاکہ زیادہ وقت صرف کیا جاسکے۔ بہر حال میں نے سلیم رضا کیلئے کچھ لوگوں سے کہا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی نئے آدمی کو ملواؤ تو اس کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ اس نے پہلے کہیں گایا ہے' ظاہر ہے کہ اسے گانے دیں گے تو وہ گائے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ جیسا منہ ویسا تھپڑ والا معاملہ کیا جائے۔ میں ان دنوں "اداکار" کا ایڈیٹر تھا۔ یہ فلمی ہفت روزتھا۔ میں نے اس میں یونہی ایک خبر چھاپی کہ سلیم رضا نے فلاں فلم کیلئے گانا گایا اور بہت کامیاب رہے۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کام کیا۔ اس وقت شاہ نور سٹوڈیو میں فلم " گلنار" بن رہی تھی اور میں اس کے گانے لکھ رہا تھا۔ وہاں نور جہاں ' شوکت صاحب اور دوسرے حضرات بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ امتیاز علی تاج بھی وہاں آتے تھے۔ میں نے سلیم رضا کو وقت دے دیا کہ وہاں آجانا۔ یہ آگئے میں نے نور جہاں سے کہا کہ ایک نیا لڑکا آیا ہے۔ ذرا اسے سنئے۔ انہوں نے سنا اور میں نے کہا کہ میڈم یہ بالکل طلعت محمود سے مشابہت نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ واقعی اچھا گاتا ہے اور اسے تھپکی بھی دی۔ میں نے یہ خبر بنا کر "اداکار" اور دوسرے پرچوں میں نمایاں طور پر چھپوادی۔ اس کے بعد سلیم رضا کی پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ وہ گانے تو پہلے ہی اچھے گاتے تھے لیکن میں نے انہیں شارٹ کٹ بنا دیا تھا اور پھر وہ ایسے مقبول ہوئے کہ ہر طرف ان کی آواز گونڈس پندرہ سال چلنے کے بعد سلیم رضا صاحب کی بد قسمتی یہ ہوئی کہ ایک گلوکارہ کوثر پروین ہوتی تھیں (اب یہ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) ان دونوں کی جذباتی وابستگی ہو گئی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے ۔ ویسے تو مذہب بیدار نہیں ہوتا لیکن ان معاملات میں مذہب بیدار ہو جاتا ہے۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آچکے ہیں اور سلیم رضا عیسائی اور کوثر پروین مسلمان ہیں تو اندر ہی اندر سلیم رضا صاحب کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ سارے میوزک ڈائریکٹر

مسلمان تھے۔انھوں نے واچ کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر یہ اس حد تک پہنچے کہ ایک دن میں کسی مشاعرے کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان گیا تو یہ وہاں موجود تھے۔میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو کہنے لگے کہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔اس طرح کوثر پروین کو بھی ڈرایا دھمکایا گیا اور ان دونوں میں دوری ہو گئی۔ بعد میں کوثر پروین نے ایک میوزک ڈائریکٹر اختر اکھیاں سے شادی کر لی اور یہ دل برداشتہ ہو کر کینیڈا چلے گئے۔میں ایک بار کینیڈا گیا تو میں ابھی ٹورنٹو میں تھا کہ مجھے ان کا فون ملا کہ میں مینٹوبر میں ہوں اور سنا ہے کہ آپ کا یہاں کا بھی پروگرام ہے۔ اس لئے جب یہاں آئیں تو ضرور مل کر جائیں۔

مشاعروں میں میرا ساتھ اکثر ضمیر جعفری صاحب کے ساتھ ہوتا ہے۔پروین حنا سید اور حمایت علی شاعر بھی اس وقت ساتھ تھے۔وہاں گئے تو پتا چلا کہ سلیم رضا صاحب کے دونوں گردے خراب ہو گئے تھے اور حکومت نے ان کو پاس سے دو مصنوعی گردے لگوا کر فری دیئے ہیں اور اب انہیں ہفتے میں ایک ہسپتال میں جانا پڑتا ہے اور زیادہ گھومنے پھرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اب یہ کمزور ہو چکے تھے اور رنگ بھی کچھ سیاہ ہو گیا تھا۔لیکن اس طرح ملے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پھر اس نے کہا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک فاقہ ہ زدگی سے مر چکا ہوتا کیونکہ وہاں میرا کمائی کا کوئی انتظام نہیں رہا تھا۔میں نے پوچھا کہ روزی کا یہاں کیا انتظام ہے تو کہنے لگے کہ یہاں تو بیماروں کیلئے الاؤنس ہوتا ہے۔لیکن میں وہ پسند نہیں کرتا اور میں نے میوزک کی کلاس کھول رکھی ہے اور ٹیوشن سے گزر اوقات کرتا ہوں۔

ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص راج تھا جو ہندو تھا اور امریکہ کی ایک ریاست میں رہتا تھا۔اس ریاست کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں بہت سے ہندوستانی لوگ آباد ہیں جنہیں انگریز شروع شروع میں دھوبی اور حجام وغیرہ کے کام کرنے کیلئے ہندوستان سے ساتھ لے کر گئے تھے اور ان کی بولی اب بھی پوربی ہے۔راج کی کچھ دلچسپی شاعری سے بھی تھی۔

ہم جس پارٹی کے ساتھ گئے تھے انہوں نے ہمارے ساتھ بالکل خرکاروں والا سلوک کرر کھا تھا۔وہ ہمیں آرام بھی نہیں کرنے دیتے تھے اور امریکہ اور کینیڈا کے آٹھ دس شہروں میں ہمیں تیز تیز گھما چکے تھے۔ سلیم رضا نے مجھ سے کہا کہ آپ یہاں رکیے اور میں نے اس شخص راج کا ایک ایل پی کرنا ہے جس کیلئے آپ کا کلام منتخب کرر کھا ہے۔اس نے مجھے ایک ہزار ڈالر دیئے۔میرے باقی ساتھی تکلیف میں تھے اور میں نے انہیں بھی حسب ضرورت کچھ پیسے دیئے۔پھر سلیم رضا نے مجھے ایک بکس بھی تحفہ کے طور پر دیا۔اس کی خصوصیت یہ ہے کہ سفر کیلئے بہت موزوں ہے اور اسے چاہے دسویں منزل سے نیچے گراؤ ٹوٹتا نہیں۔پھر انہوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنی اور راج کی گاڑی میں دو روز میں پورے علاقے کی سیر کروائی۔

افسوس یہ ہوتا ہے کہ سلیم رضا کی آواز بھی مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ گئی۔یہ نہیں کہ تعصب صرف ہمارے ملک میں ہی ہے بلکہ مذہبی تعصب دوسرے ممالک میں بھی موجود ہے پھر بھی جب کوئی اچھا فنکار اس مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے تو مجھے بہت رنج اور افسوس ہوتا ہے۔

طفیل ہوشیار پوری اور مشیر کاظمی

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے جو بیان کرتا ہوں‘ اس میں خودستائی نہیں ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

انسان کو صرف وہی کام کرنا چاہیے جو وہ کر سکتا ہے۔اسے اپنے آپ سے اور اس کام سے انصاف کرنا چاہئے جو خواہ مخواہ اس کی جھولی میں ڈالا جا رہا ہو۔ تمہیدی طور پر میں یوں کہوں گا کہ میں فلمساز بھی رہا ہوں اور جو پہلی فلم میں نے شروع کی وہ ''اک لڑکی میرے گاؤں کی '' تھی۔ مجھے سب کہتے رہے کہ اس کی ڈائریکشن آپ کریں۔ کہانی اور ڈائیلاگ بھی خود لکھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اچھے ڈائیلاگ لکھ سکتا ہوں اور مصنف اور شاعر سے بہتر ڈائریکشن کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے کہا کہ میں بنیادی طور پر نغمہ نگار ہوں اور میرے صرف دو ہی ٹائٹل ہوں گے ایک نغمہ نگار کا اور دوسرا فلمساز کا۔ چنانچہ میں نے کہانی 'ڈائیلاگ اور ڈائریکشن تینوں ہی باہر سے لیں۔

باقی فلموں میں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ جب ہندکو فلم ''قصہ خوانی'' بنائی تو اس میں بھی یہی کیا حالانکہ ہندکو میری مادری زبان ہے اور میں بہت اچھے ڈائیلاگ لکھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے کہانی 'ڈائیلاگ اور ڈائریکشن تینوں چیزیں باہر سے لیں اور خود صرف نغمے ہی لکھے۔ میں یہاں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں صرف وہی کام کرتا ہوں جو کہ میں کر سکتا ہوں اور جس پر مجھے عبور رہے۔

جس زمانے میں محترمہ فاطمہ جناح اور جنرل ایوب کے درمیان الیکشن تھا' اس زمانے میں خدا جانے کیا وجہ تھی کہ پروگریسو ہونے کے باوجود میرا جھکاؤ صدر ایوب کی طرف تھا حالانکہ ان کی طرف سے کوئی لالچ یا مفاد بھی نہیں تھا۔ حبیب جالب اس کے برعکس یہ کہہ رہا تھا کہ:

ایسے دستور کو میں نہیں مانتا

مگر اس مسئلے پر میرا اور اس کا اختلاف بھی رہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ صدر ایوب ذاتی طور پر ٹھیک آدمی ہیں۔ مگر وہ کہتا تھا کہ تم ذاتی باتیں چھوڑو' یہ شخص جو نظام لے کر آیا ہے وہ اس ملک کا بیڑا غرق کر

دے گا اور اس ملک کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ لیکن میں جالب سے لڑتا تھا اور بعض اوقات تلخ بھی ہو جاتا تھا۔ بعد میں آکر میں نے جالب سے اس کا اعتراف بھی کیا کہ میں غلط تھا اور میں نے تم سے جو تلخ گوئی کی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔

جنے لگی۔

صدر ایوب ہی کے دنوں کا واقعہ ہے کہ میں احمد ندیم قاسمی صاحب اور کچھ دوسرے رائل پارک میں اپنے ایک دوست موجد صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ محکمہ اطلاعات کے ایک سینئر آفیسر جہانگیر خان وہاں آئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے " قتیل صاحب میں ایک بہت بڑے آدمی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں"

وہ پہلے کسی فلم میں ہیرو بھی آچکے تھے اور میرے دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے میں نے بے تکلفی سے کہا" یہاں پر سب سے بڑے آدمی تو جنرل ایوب ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ وہی سمجھ لیں" کہا کہ یہاں پر سب سے بڑے آدمی تو جنرل ایوب ہیں۔ کہنے لگے " آپ وہی سمجھ لیں۔ بہر حال میں آیا ہوں اور کام یہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں آپ سٹیج پر مجمع کو شاعر کے طور پر کنٹرول کریں اور آپ جو کہیں گے وہی معاوضہ ہو گا"

وہ کہنے لگے " آپ بتا دیں کہ آپ فلم میں کیا کماتے ہیں، ہم اس سے بھی دو ہزار روپے زائد آپ کو دیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو سفر خرچ بھی ملے گا۔ پھر صدر صاحب خوش ہو کر جو دیں گے وہ اس کے علاوہ ہو گا"

اس زمانے کے لحاظ سے یہ دس بارہ ہزار روپے ماہانہ کی پیشکش بنتی تھی لیکن میں نے جہانگیر صاحب سے کہا" میں اگرچہ صدر ایوب کا حامی ہوں اور انہیں ووٹ بھی دوں گا لیکن میں جلسے یا سٹیج کا شاعر نہیں ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے کبھی اس طرح کی سیاست بازی میں آکر حکمرانوں کی قصیدہ گوئی نہیں کی۔اس لئے آپ مجھے معاف ہی رکھیں البتہ موجد صاحب کے اوپر "محفل" کے دفتر میں طفیل ہوشیار پوری صاحب ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے بہترین آدمی ہیں۔آپ وہاں چلے جائیے وہ ایسی چیزیں لکھتے ہیں اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں۔اس لئے جلسے کیلئے ٹھیک ٹھاک رہیں گے" جہانگیر صاحب کہنے لگے" اس مشورے کا شکریہ لیکن مجھے تو آپ کیلئے کہا گیا ہے۔اس لئے آپ غور کر لیں میں کل پھر آپ سے رابطہ کروں گا"

اگلے دن وہ پھر وہاں پر آئے اور دوبارہ وہی بات کی۔ میں نے پھر انہیں اپنا وہی مؤقف دہرایا اور کہا" میں یقیناً ان کا حامی ہوں مگر یہ کام کر نہیں سکتا کیونکہ میری فطرت کے خلاف ہے" چنانچہ وہ اوپر چلے گئے مگر اس وقت طفیل ہوشیار پوری وہاں موجود نہیں تھے۔اس لئے ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس کی بجائے بعد میں ان کا رابطہ مشیر کاظمی سے ہو گیا۔مشیر کاظمی فلموں میں اداکاری بھی کر لیتے تھے اور نغمہ نگاری بھی مگر تک بند قسم کے شاعر تھے۔ان کا راجہ حسن اختر کے ہاں آنا جانا تھا جو پہلے منٹگمری میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔راجہ حسن اختر نے ہی انہیں جہانگیر صاحب سے Recommend کیا تھا۔اور جب یہ جہانگیر صاحب سے ملنے کیلئے گئے تو پہلے ہی اتارنا بھی جانتے تھے۔اس لئے انہوں نے جہانگیر صاحب کو اپنے آئینے میں اتار لیا۔

مشیر کاظمی جلسوں میں جا کر لمبی لمبی نظمیں سنانے لگے انہیں اس کے صلے میں روٹ پرمٹ ملے اور

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔اس طرح ایک غیر شاعر کے سر پر ہما بیٹھ گیا اور اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب کھایا۔اس طرح جو موقع طفیل صاحب کو ملنے والا تھا وہ انہیں مل گیا۔ طفیل صاحب کو اگر یہ موقع مل جاتا تو دوسری بات تھی کیونکہ وہ کم از کم شاعر تو تھے مگر مشیر کاظمی صاحب تو تُک بند تھے۔اس طرح طفیل صاحب کی حق تلفی تو ہوئی لیکن اس کی تلافی بعد میں جا کر جنرل ضیاء کے دور میں ہو گئی۔

صدر ایوب

جنرل ایوب جس کسی پر مہربان ہوتے تھے پوری طرح ہوتے تھے اور اشاروں کنایوں میں پوچھ لیا کرتے تھے کہ جس سے وہ مخاطب ہیں اس کی ضروریات کیا ہیں۔میرا شروع سے رویہ یہ تھا کہ اپنے لئے کوئی کام کہنا سر پر پہاڑ اٹھانے کے برابر ہوتا تھا لیکن میں دوسروں کیلئے فراخدلی سے کہہ بھی لیا کرتا تھا اور لڑ بھی لیا کرتا تھا۔

ایک بار مجھے صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری کا ٹیلیگرام موصول ہوا کہ پنڈی میں فلاں دن فلاں وقت پر آ کر صدر صاحب سے ملاقات کرو۔ حسب پروگرام میں وہاں گیا۔میرے اپنے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہوتی تھی البتہ میرے دوست احمد ظفر کی پنڈی میں گاڑی ہوتی تھی اور ان کے بھائی ڈرائیور بھی کر سکتے تھے' چنانچہ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر میں ایوان صدر پہنچا۔

جب میں صدر صاحب سے ملنے کیلئے گیا تو وہ کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے مجھ سے باتیں پوچھیں۔ ایک تو انہوں نے ہری پور کے بارے میں تفصیلات پوچھیں جو میں نے وضاحت سے بیان کیں۔اصل میں انہیں میری یہ بات بھا گئی تھی کہ جب گزشتہ بار انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا

کہ کیا تم ہری پور کے رہنے والے ہو تو میں نے کہا تھا کہ میں ہری پور کا رہنے والا تو یقیناً ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہاں ہزاروں آدمی اور بھی رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ فخر ہے کہ آپ نے مجھے شاعر کے طور پر پہچانا ہے اور آپ مجھے جو ملاقاتوں سے نواز رہے ہیں اس میں میری شاعری کو دخل ہے۔

صدر ایوب کو یہ چیز پسند تھی کیونکہ ذہنی سطح پر وہ علاقائیت کے قائل نہیں تھے وہ اپنے آپ کو پورے پاکستان کا باشندہ سمجھتے تھے اور پاکستانی ہونے پر انہیں بھی فخر تھا۔ اس لئے اگر کوئی شخص علاقائیت سے ہٹ کر بات کرتا تھا تو وہ خوش ہوتے تھے۔ اس حوالے سے اب بھی باتیں ہوئیں تو انہوں نے کہا کہ یونہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا کیا حدود اربعہ ہے۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے کہ اچھا کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ میں نے کہا کہ ہمارا علاقہ بڑا پسماندہ ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے گزارش کی تھی کہ یہاں تعلیمی سلسلہ زیادہ ہونا چاہیئے۔ کہنے لگے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے کتاب " FRIENDS NOT MASTWRS " کی ساری رائلٹی وہاں کے سکولوں کو دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات میرے علم میں ہے لیکن اس علاقے کی پسماندگی اس سے بھی زیادہ چاہتی ہے اور اس کیلئے میری تجویز یہ ہے کہ وہاں پر ایک لائبریری بنے جس میں ادبی ' مذہبی ' سائنسی اور تکنیکی کتابیں ہوں اور اسے بڑے سائنٹیفک بنیاد پر چلایا جائے اور لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ اس لائبریری کا نام آپ کے نام پر ہونا چاہیے۔ کہنے لگے کہ تم نے یہ بڑی اچھی تجویز پیش کی ہے' اس لئے میں چاہوں گا کہ یہ لائبریری تمہارے نام سے ہی منسوب ہو۔ میں یہ جواب سن کر بڑا خوش ہوا کہ اتنا بڑا آدمی مجھے یہ بات کہہ رہا

ہے۔اس موقع پر ہی انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ اس لائبریری کا تخمینہ لگا کر کسی وقت مجھے پوری تفصیلات سے آگاہ کرنا۔

انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا کہ یہ لے لو اور بچوں کو مٹھائی کھلا دینا۔ میں تو اس غرض سے گیا نہیں تھا لیکن اکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ پریذیڈنٹ تھے۔ پھر انہوں نے مجھے کہا کہ روزگار کا ذریعہ کیا ہے۔ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ گزر بسر ہو جاتی ہے اور کچھ پیسے فلم سے آجاتے اور کچھ مشاعروں سے۔ اس کے بعد جب میں باہر کے لئے نکلا تو اعلان ہوا کہ قتیل شفائی صاحب کا ڈرائیور گاڑی لائے، لہذا وہ مانگی ہوئی گاڑی آگئی۔ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک ہزار روپیہ تھا۔ اس کے بعد جب میں لاہور آیا تو ایک روز مجھے گورنر ہاؤس سے اطلاع آئی کہ آپ کیلئے پرمٹ ہیں۔ آپ آکر یہ روٹ پرمٹ لے لیں۔ میں نے سوچا کہ صدر ایوب جو پوچھ رہے تھے اس کی روشنی میں یہ کیا ہے۔ ہر انسان کے دل میں کچھ لالچ بھی ہوتا ہے میں للچایا بھی لیکن ساتھ یہ بھی چاہا کہ یہ نہ ہو کیونکہ یہ ٹھیک نہیں ہے اور یہ باتیں انسان کو رسوا کرتی ہیں۔ لیکن صدر صاحب نے یکطرفہ کارروائی کر کے ایک طرف تو ایک ہزار روپیہ لفافے میں ڈال کر پکڑا دیا اور دوسرا یہ پرمٹ بجھوا دیئے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جس دن مجھے گورنر ہاوس سے یہ اطلاع ملی تھی اس سے اگلے ہی دن اخبارات میں یہ اعلان ہو گیا کہ اب تک جتنے روٹ پرمٹ جاری کیے گئے ہیں وہ سب منسوخ ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ روٹ پرمٹ منسوخ ہو گئے ہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ

میں لالچ میں آکر فالتو آمدنی کی غرض سے یہ پرمٹ لے لیتا اور اس کے بعد یہ لالچ نجانے مجھ سے کیا کچھ کرواتا۔

یہ واقعہ اگر ہو گیا ہوتا تو مجھ پر یہ ایک سچا الزام ہوتا۔ جبکہ اس کے بعد جب صدر ایوب مستعفی ہو کر چلے گئے اور جنرل یحییٰ کا زمانہ آیا اور ان کے بعد بھٹو صاحب کا زمانہ آیا تو الطاف گوہر صاحب پر ایک کیس بنا اور اس میں میرا ذکر آ گیا کہ قتیل شفائی کو خفیہ فنڈ سے بیس ہزار روپے ادا کیے گئے۔

دراصل یہ وہی بیس ہزار روپے تھے جو الطاف گوہر صاحب نے فلم کے سلسلے میں ایک اور محکمے کو درمیان میں لا کر مجھے ایڈوانس کے طور پر چیک کے ذریعے دیئے تھے لیکن یہ پیسے اتنے کم تھے کہ ڈاکومنٹری فلم بنا کر بھی مجھے کوئی بچت نہ ہوئی۔ میں نے بمشکل اپنا خرچ پورا کیا اور میری محنت اکارت گئی۔ یہ پیسے کسی کانفیڈ نشل اکاؤنٹ سے نہیں تھے بلکہ فلم کے سلسلے میں مجھے دیئے گئے تھے۔ میرے بہت ہی عزیز اور محترم دوست مختار مسعود ہیں جنہوں نے ""آواز دوست"" کتاب لکھی ہے ۔جب انہوں نے یہ خبر پڑھی تو انہیں حیرت ہوئی کہ قتیل شفائی نے یہ کام کیونکر کیا۔ تو انہوں نے تحقیق کی تو انہیں پتہ چل گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ بہر حال یہ بات اخبارات میں آ گئی۔ میں نے اس کی تردید بھی بھجوائی لیکن جو سرخیاں جمی تھیں وہ بڑی تھیں اور اس کے مقابلے میں تردید بہت چھوٹی اور ایک کالمی تھی اور کسی نے دیکھی اور کسی نے نہ دیکھی۔

جب الطاف گوہر صاحب اس مقدمے سے فارغ ہوئے تو ان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ مجھ پر مقدمے کی تو کچھ وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن آپ تو خواہ مخواہ ہی رگڑے گئے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی کے ہاتھ سے یہ ہوا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو کیس میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔ میں نے

کہا مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

روس میں کچھ ایام

صدر ایوب ہی کے دور حکومت میں ایک ادبی و ثقافتی وفد مرتب کیا گیا جس میں مغربی پاکستان سے میں تھا اور مشرقی پاکستان سے دو بنگالی سکالر تھے جن کے نام پروفیسر سرور مرشد اور پروفیسر شوکت عثمان تھے۔ مؤخر الذکر مغربی پاکستان میں آتے جاتے رہتے تھے اور ہم سے واقف تھے۔ وہ بڑے اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ہم تینوں تین ہفتے کے دورے پر روس گئے۔ انڈیا کے علاوہ ملک سے باہر یہ میرا پہلا دورہ تھا۔

اس وقت گلڈ کے سیکرٹری جنرل جمیل الدین عالی تھے۔ میں اس وقت کوئی عہدیدار نہیں تھا البتہ سنٹرل ایگزیکٹو کا رکن تھا۔ میرے دورہ ماسکو کا سن کر عالی صاحب پریشان ہوئے اور مجھے کہنے لگے کہ آپ کے خیالات و نظریات پہلے ہی بائیں بازو کے ہیں' اب تو آپ وہاں سے پورے سرخے بن کر آئیں گے۔ میں نے کہا کہ عالی صاحب! میں کوئی احمق نہیں ہوں بلکہ کچھ سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ میرا تو طریقہ یہ ہے کہ جہاں سے کوئی اچھی چیز ملتی ہے لے لیتا ہوں لیکن جو پسند نہیں ہوتی' اسے میں قبول نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر میں لبرل ہوں۔ آغاز میں مسلم لیگ سے وابستہ رہا ہوں لیکن ان کی دو چیزیں ناپسند ہوں گی انہیں بھی مسترد کر دوں گا۔ میری اب کسی سیاسی پارٹی سے Commitment نہیں ہے۔ میں اپنے ذہن سے سوچتا ہوں۔ اب میری ادب کے ساتھ اور اپنے ملک کے ساتھ ایک ہی کومٹمنٹ اور وہ یہ ہے کہ میں زندگی میں کسی استحصال کرنے والے کا ساتھ نہیں دوں گا اور ملائیت کا ساتھ بھی نہیں دوں گا اور بالکل انہی چیزوں پر چلوں گا جو علامہ اقبال

سکھا گئے تھے۔اس کے علاوہ کسی توہم پرستی میں نہیں پڑوں گا۔مزاروں پر جا کر دعائیں نہیں مانگوں گا اور اگر مانگوں گا تو اللہ تعالیٰ سے مانگوں گا۔اسی طرح غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والوں کے ساتھ کبھی مفاہمت نہیں کروں گا۔اب اگر روس بھی استحصالی رویہ اختیار کرے گا تو میں اس سے بھی انکار کروں گا۔ اگر روس کے بارے میں دور کے ڈھول سہانے والی آپ کی بات صحیح ہوئی تو میں وہاں سے جو خیالات لے کر آؤں گا وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔

ماسکو روانگی کیلئے میں اور دونوں بنگالی سکالرز کراچی میں جمع ہوئے اور وہاں سے ایک ساتھ ماسکو روانہ ہوئے۔میرے ذہن میں یہ تھا کہ روس میں پہنچتے ہی ہمیں ایک دھچکا لگے گا اور ہماری برین واشنگ شروع ہو جائے گی۔دھچکا یوں لگا کہ ہمیں کہا گیا تھا کہ آپ کی روس روانگی کی اطلاع آپ کے سفارت خانے کو دے دی گئی ہے اور آپ روس میں قیام کے دوران ان سے رابطہ رکھیں گے۔ لیکن ہم نے ماسکو پہنچ کر ائیر پورٹ پر چاروں طرف دیکھا تو ہمیں دور دراز تک اپنے سفارت خانے کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔البتہ سوویت رائٹرز یونین کے ایک دو عہدیدار وہاں موجود تھے جو ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب صدر ایوب بھی دورہ روس پر گئے ہوئے تھے اور ہمیں توقع تھی کہ کسی نہ کسی شہر میں ہماری ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ماسکو میں پہلے ہی دن ہمیں احساس ہو گیا کہ سوویت حکومت کا ہمارے ساتھ سلوک سرد مہری کا ہے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ ایک روسی خاتون جس کا نام سوویتلانہ تھا کی ڈیوٹی لگا دی تھی جو ترجمان کے فرائض INTER PRETER

انجام دیتی تھی۔ ہمیں ایک اکیس منزل ہوٹل یوترانہ میں ٹھہرایا گیا تھا۔اس ہوٹل کے تقریباً اکیس سو کمرے تھے اور فلور گراؤنڈ پر چار بڑے بڑے ریستوران تھے۔

عام طور پر طریق کار یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے وفد کے ارکان کو ملک میں پہنچتے ہی ایک الاؤنس دے دیا جاتا ہے تاکہ ارکان اپنی ضروریات مناسب طریقے سے پوری کرسکیں۔ ہمیں سوویت حکومت کی طرف سے ایسی کوئی سہولت نہ دی گئی بلکہ ہمارے کھانے پینے کی ذمہ داری بھی سوویتلانہ ہی کو سونپی گئی۔ جب ہم ریستوران میں کھانے کے لیے جاتے تو وہ بل پر دستخط کر دیتی تھی۔ایک دن وہ کسی وجہ سے نہ آسکی تو ہم رات کو بھوکے ہی سوئے۔

اس طرح ہمیں بجائے اس کے کہ تعلیمی اداروں میں گھمایا جائے' وہ ہمیں سیاح کی طرح کبھی سرکس دکھانے کیلئے لے جاتے اور کبھی کوئی عمارت۔جب ہم ایک رات فاقے میں رہے تو ہم نے احتجاج کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بھوکے ملک سے آئے ہیں جہاں کے لوگ فاقے کرتے ہیں تو یہ بات ذہن سے نکال دیں۔ پاکستان کے لوگ یہاں کے لوگوں سے زیادہ کھاتے ہیں اور ہمیں فاقے کرنے کی عادت نہیں ہے۔ خیر سویتلانہ نے معذرت کی کہ یہ میری غلطی ہے۔

اس واقعہ سے اگلے روز ہم پاکستانی سفارتخانے گئے تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک چپڑاسی تھا اور اس کے علاوہ کوئی شخص نہیں تھا۔ ہم نے پوچھا کہ سفیر صاحب اور دیگر افسران کہاں ہیں تو اس نے کہا کہ وہ سب ماسکو سے باہر ہیں' آپ اپنی آمد کے بارے میں اس رجسٹر میں تحریر کر دیں۔ ہم تینوں نے اپنے نام اور پتے درج کیے اور رابطے کیلئے ٹیلیفون نمبر بھی لکھ دیئے۔ لیکن ہمارے ساتھ کسی نے

کوئی رابطہ نہ کیا۔

اس دورے کے دوران میرے دل میں یہ بڑی تمنا تھی کہ کہیں کوئی اُردو یا پنجابی بولنے والا مل جائے کیونکہ میرے ساتھی بنگالی سکالروں میں سے ایک تو سرے سے اُردو جانتے ہی نہ تھے جبکہ دوسرے صاحب ابھی اُردو بولنا سیکھ رہے تھے اور میں ان کی اُردو درست کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ میں فرسٹ فلور پر لابی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دیکھا کہ دو سکھ سردار بحری فوج کی وردی پہنے آرہے تھے۔اس وقت میرے دونوں بنگالی باہر گئے ہوئے تھے کیونکہ ان کے مقاصد کچھ اور ہوتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں کچھ ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرتا تھا جبکہ وہ سور کا گوشت پسند کرتے تھے۔

میں اٹھ کر سردار صاحبان کی طرف بڑھا اور انہیں ست سری اکال کیا۔وہ سن کر بڑے خوش ہوئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔میں نے بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔میں نے کہا کہ آئیں کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھیں۔وہ کہنے لگے کہ مسئلہ کیا ہے۔میں نے کہا کہ مسئلہ پنجابی کا ہے اور کتنے دنوں سے میں نے پنجابی میں بات نہیں کی۔جس پر وہ بیٹھ گئے اور میرے لئے کچھ سنیکس منگوائیں اور خوب باتیں ہوئیں۔ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اترا۔

اس عرصے میں سفارتخانے سے فون آیا کہ سفیر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔یہ فون کسی اہلکار نے کیا تھا اور وہ میرے نام ہی سے واقف تھے۔ اگر میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ وہ انہیں بلاتے ہی نہیں۔ ہم ان سے ملنے کیلئے گئے تو وہ وہاں پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔پروفیسر سرور مرشد اس دوران میں روس سے واپس جا چکے تھے۔سفارتخانے میں ہمیں چائے اور بسکٹ پیش کیے گئے اور سفیر صاحب

نے ہم سے پہلی بار ملاقات نہ ہو سکنے کی معذرت کی۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی پاکستانی اخبارات یااور کوئی ادبی کتابیں وغیرہ ہیں تو انہوں نے نفی میں سر ہلایااور کہا کہ یہاں بہت دشواریاں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب کوئی وفد آئے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں تو کہنے لگے کہ ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن ان کا یہ رویہ بتارہا تھا کہ انہیں ضرور اطلاع ہو گی۔

ہوا یوں کہ فضل الرحمان خان جو صدر ایوب کے رشتہ دار تھے اور میرے کلاس فیلو تھے' وہ مغربی جرمنی میں سفیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے ماسکو روانگی سے قبل انہیں خط میں لکھا تھا کہ میں ماسکو سے آپ کے ہاں آؤں گا' اس طرح میں نے انگلینڈ میں بھی اپنے بچوں اور دوستوں کو کچھ خطوط لکھے تھے کیونکہ وہاں سے مجھے انگلینڈ بھی جانا تھا۔ لیکن مجھے کسی بھی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔

وہاں ریڈیو نے میری کچھ ریکارڈنگ کی تھی اور معاوضے میں مجھے کچھ روبل مل گئے تھے مگر روسی کرنسی کو روس سے باہر کوئی پوچھتا نہیں تھا جبکہ مجھے مغربی جرمنی اور انگلینڈ بھی جانا تھا۔ چنانچہ میں نے روس میں پاکستانی سفیر سے کہا کہ مجھے پانچ پاؤنڈ کی ضرورت ہے کیونکہ میرے پاس ٹکٹ تو ہے لیکن مجھے کسی خط کا جواب نہیں آرہااور اگر لندن میں کوئی مجھے لینے کیلئے ائیر پورٹ پر نہ پہنچا تو مجھے سخت دشواری ہو گی۔ وہ کہنے لگے کہ مجھے افسوس ہے ہم سے اس کا انتظام نہیں ہو گا۔ پھر کہنے لگے کہ میں دفتر میں کسی سے پوچھتا ہوں اور مجھ سے تبادلے میں پورے روبل وصول کر کے ان کے عوض پانچ پاؤنڈ عنایت کیے حالانکہ ان کے پاس فنڈز ہوتے ہیں اور اگر کوئی پاکستانی تکلیف میں ہو تو وہ اس

کی مدد کرتے ہیں اور انہیں ان فنڈز کا حساب بھی نہیں دینا پڑتا۔

جب میں ماسکو سے انگلینڈ روانہ ہوا تو جس جہاز میں میں سفر کر رہا تھا وہ کراچی سے بذریعہ ماسکو لندن جارہا تھا۔اس جہاز میں بیٹھتے ہی دو آدمی پیچھے سے میرے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ قتیل شفائی ہیں۔میں نے کہاہاں تو کہنے لگے کوئی تکلیف ہو تو بتایئے۔میں نے کہا کہ میرے پاس پانچ پاؤنڈ تو ہیں لیکن ممکن ہے کہ وہاں مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت پیش آئے تو ان دونوں نے مجھے دس دس پاؤنڈ نکال کر دے دیئے۔

جب جہاز جا کر ائیر پورٹ پر رکا تو میں نے یہ دیکھا کہ میں نے جن جن لوگوں کو خطوط لکھے ہوئے تھے وہ سب مجھے لینے کیلئے ائیر پورٹ پر موجود تھے۔انہیں دیکھ کر کچھ جان میں جان آئی۔میں نے ان سے کہا کہ آپ نے میرے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیا تو کہنے لگے کہ ہم نے تو آپ کو کئی کئی خط لکھے ہیں اور تار بھی دیئے ہیں۔حیرت ہے کہ آپ کو کچھ بھی نہیں ملا۔

جب میں وہاں سے واپس لاہور آیا تو میرے لاہور پہنچنے کے بھی تقریباً دو ہفتے کے بعد مجھے ایک پیکٹ ملا جس میں فضل الرحمان صاحب سفیر پاکستان اور ان سب لوگوں کے خطوط بھی شامل تھے۔

حالانکہ میں اس دوران تقریباً تین ہفتے تک انگلینڈ میں بھی قیام پذیر رہا تھا۔

اس دورہ ماسکو کے بعد میں نے عالی صاحب سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ میں سرخاب بن کر آیا ہوں میں تو اپنا خون سفید کر کے آیا ہوں۔کیونکہ ہمارے ساتھ روس والوں کا رویہ قطعی ناروا تھا۔انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہم لوگ جو وہاں آرہے ہیں سب پروگریسو ہیں اور غالباً اسی لئے روس بھیجے بھی جارہے تھے کہ ہم تعصبات رکھ کر کوئی بات نہیں کریں گے۔لیکن روس والوں نے ایک تو

ہمارے ساتھ ادیبوں کی بجائے سیاحوں والا برتاؤ کیااور دوسرے سرد مہری سے پیش آئےاور ہمیں فاقے کروائے۔ لیکن میں نے کہاکہ ان سب چیزوں کے باوجود میں سوشلزم سے تو منحرف نہیں ہوں لیکن روس والوں کا یہ رویہ دیکھ کراب میں پہلے سے کہیں زیادہ قوم پرست بن کر واپس آیا ہوں۔

روس سے روانگی سے قبل جبکہ صدر ایوب بھی وہیں تھے تو میں نے ایک خط صدر ایوب کو تحریر کیا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ میرے دونوں ساتھیوں کی اور خاص طورپر میری بڑی خواہش تھی کہ یہاں آپ سے ہماری ملاقات ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکااور ہم آپ کو یہاں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں نے یہ خط پاکستانی سفارتخانے کی معرفت بھجوایا تھااور ظاہر ہے کہ صدر صاحب کے نام کوئی خط سفارتخانے کے عملے کیلئے صحیفہ آسمانی کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ میرا وہ خط صدر ایوب تک پہنچادیا گیا۔

۔صدر ایوب سے جب ایوان صدر میں مذکورہ بالا ملاقات ہوئی تو اس موقع پر انہوں نے مجھ سے اس خط کا تذکرہ بھی کیا تھااور پوچھا کہ دورۂ روس کیسا رہا۔ میں نے بتایا کہ غیروں سے تو کوئی شکوہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اپنوں کا رویہ بھی مناسب نہیں تھااور انہیں پانچ پاؤنڈ والا واقعہ سنایا۔ شاید تمام سفارتخانے ایسے ہی کرتے ہوں لیکن مجھے اس واقعہ سے بہت رنج ہوا تھا۔

دو حماقتیں

زندگی میں حماقتیں اور بھی کی ہوں گی لیکن ان میں سے تین حماقتیں بلکہ ظلم ایسے بھی مجھ سے

سرزد ہوئے ہیں کہ آج بھی میرے ذہن کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ان میں سے ایک کا تعلق اقبال بانو سے بھی ہے۔اقبال بانو سے میرے جذباتی تعلقات چل رہے تھے اوران کے تمام اموراور مسائل میرے ذمے ہی ہوتے تھے۔انہوں نے روہتک کی جائیداد کے سلسلے میں یہاں ایک کلیم (ClAIM)داخل کیاہواتھاجس کی پیروی میں ہی کر رہاتھا۔ایک دن ان کی ملتان میں اسی سلسلے میں پیشی تھی اور جوافسر بحالیات اس کی سماعت کر رہے تھے وہ میرے جاننے والے تھے۔ اقبال بانو کے پاس کوئی کاغذات وغیرہ نہیں تھے پھران کا کیس زائدالمعیاد بھی تھالیکن میں نے کسی نہ کسی طرح کیس رکوادیاتھااوراس کی پیروی بھی خود ہی کر رہاتھا۔جب مذکورہ پیشی تھی تواس سے ایک روز پہلے میں لاہور میں تھااور یہاں یہ اطلاع آچکی تھی کہ میرے سسر شدید علیل ہیں۔چنانچہ میری بیوی ہری پور جاچکی تھی۔اس پیشی سے ایک دن پہلے میری بیوی کامجھے فون آیاکہ والد صاحب یعنی میرے سسر فوت ہوگئے ہیں اور آپ چلے آیئے۔میں نے کہاکہ ٹھیک ہے۔

اس کے بعد میں نے اقبال بانو سے فون پر بات کی اور بتایاکہ میرے سسر فوت ہوگئے ہیں اس لئے آپ کل جاکراگلی تاریخ لے لیں۔ پھر میں سنبھال لوں گا۔انہوں نے اسی طرح پریشانی کے عالم میں کہاکہ وہ تو فوت ہوگئے ہیں اور وہ تو واپس نہیں آئیں گے لیکن اگراگلی تاریخ نہ ملی اور فیصلہ یکطرفہ ہو گیاتوبہت نقصان ہوگا۔

میں سسر کے جنازے میں شرکت کی بجائے ملتان چلاگیا۔میری زندگی میں یہ ایک ایساواقعہ ہے کہ اب بھی اپنے آپ کواپنی بیوی کی طرف سے‘ مرحوم کی طرف سے اوراپنے ضمیر کی طرف سے مجرم سمجھتاہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ میری پھوپھی زاد بہن کے شوہر بزرگ اور معزز آدمی تھے۔ان کے ساتھ کسی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔انہوں نے مجھے سخت سست کہا۔جوانی کا عالم تھا میں اپنے غصہ پر قابو نہ پاسکا اور میں نے انہیں تھپڑ دے مارا۔مجھے وہ کیفیت آج تک نہیں بھولتی کہ اس خلاف توقع تھپڑ پر جس طرح ان کا سر اضطراری کیفیت میں ہلا وہ آج بھی میری نظروں کے سامنے گھومتا ہے۔یہ منظر آج بھی میرے ذہن کو اذیت دیتا ہے۔یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے تو میں ہاتھ اٹھا کر اپنے اللہ سے دعا مانگتا ہوں۔لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اللہ اپنے جرائم تو معاف کر دے گا اور اگر نمازیں بھی نہ پڑھی ہوں گی تو وہ بھی معاف کر دے گا لیکن میرا یہ جرم شاید وہ معاف نہ کرے۔

مجھ سے قربت بڑھنے سے پہلے اقبال بانو کی ایک چوری ہوئی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ چوری خاکوانی فیملی کے ایک رئیس نے ان کے ہاں کروائی ہے جس کی یہ پہلے داشتہ رہ چکی تھیں۔اب خاکوانی خاندان بڑا اثر ورسوخ والا تھا اور اقبال بانو کا کیس ایک طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔اعجاز حسن بٹالوی میرے دوست تھے۔میں نے ان سے بات کی اور ہم یہ کیس ہائی کورٹ میں لے گئے۔ ہم نے ہائی کورٹ سے ایسے وارنٹ جاری کروائے کہ وہ شخص گرفتار ہو کر حوالات میں چلا گیا۔اب میں شہر میں دندناتا پھر رہا تھا اور یہ بھی نہ سوچا کہ ملتان ان کا اپنا شہر ہے اور یہ بڑے اثر ورسوخ والے اور زور والے لوگ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تھانے میں خود بھی گیا اور جا کر ایس ایچ او سے باتیں کرتا رہا جبکہ یہ خاکوانی شخص مجھے دیکھتا رہا۔

میرے ملتان کے دوستوں نے کہا کہ تم آ گئے ہو تو ہم تمہیں کچھ ہونے نہیں دیں گے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ تم ہماری موجودگی میں بھی بچ کر چلو کیونکہ تم نے خاکوانی خاندان کی عزت خاک میں ملا دی

ہے اور ایسا کام کر دیا ہے جو پہلے ان کے ساتھ کبھی کسی نے نہیں کیا اور جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ عشق کے پاگل پن میں آدمی ایسے ایسے کام بھی کر جاتا ہے جن میں جان کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔

لتا منگیشکر

1961ء میں جب میں انڈیا کے سفر پر گیا تو میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹا نوید تھے۔ بمبئی میں جب میں مقیم تھا تو مجھے میرے شاعر دوست اندیور نے بتایا کہ لتا منگیشکر کو جب میری بمبئی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بھی پہلے سے تہیہ کر رکھا تھا کہ مشرق کی اس عظیم گلوکارہ سے بہر حال نیاز حاصل کروں گا۔ چنانچہ اندیور صاحب نے اس ملاقات کو یوں طے کیا کہ جب سٹوڈیو میں ان کے گانے کی ریکارڈنگ ہو گی تو وہیں ہماری ملاقات بھی ہو جائے گی۔

اس روز اندیور صاحب کے لکھے ہوئے دو نغمات کی ریکارڈنگ ہونی تھی۔ جب میں ریکارڈنگ روم میں پہنچا تو پہلے نغمے کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ اس موقع پر کلیان جی آنند جی جو دو بھائی میوزک ڈائریکٹرز ہیں' ریکارڈنگ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لیکن انہوں نے دو ٹیکوں کے درمیان میں میرا ایسا استقبال کیا اور مجھے ایسی عزت دی جس نے تھوڑے سے وقت کی ملاقات کو مستقل دوستی میں بدل دیا۔

پھر جب پہلے نغمے کی ریکارڈنگ ختم ہوئی تو لتا جی خود چل کر مجھ تک پہنچیں اور گفتگو کا سلسلہ کچھ اتنا

طویل ہو گیا کہ دوسرے نغمے کی ریکارڈنگ میں تاخیر ہونے لگی۔ میں نے لتا جی سے کہا" باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں آپ پہلے ریکارڈنگ کروا لیجئے"

لتا جی نے کہا" ریکارڈنگ بعد میں ہو جائے گی' باتوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹنا چاہیے" چنانچہ باتوں کا سلسلہ نہ ٹوٹا اور میوزک ڈائریکٹرز کلیان جی آنند جی نے ریکارڈنگ کسی اور دن پر ملتوی کر دی۔

گفتگو کے موضوعات وہی شعر و موسیقی تھے البتہ خاص بات یہ ہوئی کہ لتا جی نے میری یہ تجویز قبول کر لی کہ میری دس غزلوں کا ایک لانگ پلے ریکارڈنگ بنایا جائے اور یہ تمام غزلیں صرف لتا جی نے گائیں۔ میوزک ڈائریکٹر کے لئے میں نے سجاد کا نام پیش کیا جسے لتا جی نے قبول کر لیا اور ہماری دوسری ملاقات لتا جی کے گھر" پربھو کنج" میں طے پائی جب مقررہ وقت پر میں ان کے گھر پہنچا تو لتا جی کو گھر کی دہلیز پر منتظر پایا۔ وہ ایک سفید ساڑھی پہنے' زیورات سے بے نیاز سادگی کی ایک خوبصورت مثال پیش کر رہی تھیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ میرے سامنے ایک اپسرا کھڑی ہے۔ میں نے لتا جی کی سادگی میں جو حسن دیکھا وہ حسن زیورات اور بھڑکیلے لباسوں سے لدی ہوئی خواتین میں کبھی نظر آیا۔

میرے ہمراہ میری بیوی اور میرا چار سالہ بیٹا نوید قتیل بھی تھا جو ماشاءاللہ اب جوان ہو چکا ہے اور ایک شوقیہ گلوکار کے طور پر اپنی شہرت کا آغاز کر چکا ہے۔ لتا جی ہم سب کو دیکھ کر پہلے سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے چائے سے فارغ ہو کر ہمیں ایک کمرے میں سجی ہوئی اپنی بہن

اوشا منگیشکر کی تصاویر بھی دکھائیں اور ساتھ ہی اوشا جی سے ہمارا تعارف کروایا اور ہم لوگ تھوڑی دیر میں ان سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

1961ء کے بعد 1979ء میں انڈین فلمساز منوج کمار نے میری ایک غزل:

کب تلک شمع جلی یاد نہیں
شام غم کیسے ڈھلی یاد نہیں

کی ریکارڈنگ کے موقع پر مجھے بمبئی آنے کیلئے کہا۔ چنانچہ پورے اٹھارہ برس بعد میں' میری بیوی اور نوید قتیل جواب جوان تھا' عازم بمبئی ہوئے۔ چونکہ میری غزلیں کھندر کپور اور لتا جی کی آواز میں ریکارڈنگ ہونی تھی اس لئے میری بڑی تفصیل کے ساتھ لتا جی سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن وہ میری بیوی اور بیٹے کی آمد سے بے خبر رہیں۔

چند دنون بعد ہر ماسٹر وائس ریکارڈنگ کمپنی نے تاج محل ہوٹل میں لتا جی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ پیش کیا جس میں بمبئی کی فلم انڈسٹری کے سینکڑوں لوگ مدعو کیے گئے اور پاکستان کی نمائندگی کے لئے مجھے اور میرے بچوں کو مدعو کیا گیا۔ جب یہ تقریب شروع ہوئی تو سب سے پہلے مجروح سلطانپوری صاحب نے لتا جی کے لئے ایک نظم پڑھی' پھر مرحومہ نرگس جی نے انگریزی زبان میں ایک یادگار تقریر کی اور کچھ لوگوں کی تقریروں کے بعد جب کھانے پینے کا مرحلہ آیا تو ہم لتا جی سے دور ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ اچانک لتا جی ہماری طرف آتی دکھائی دیں۔

انہوں نے آتے ہی میری بیوی سے کہا" ارے آپ کب آئیں۔ قتیل صاحب نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ آپ بھی آئی ہوئی ہیں"

میری بیوی نے نوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" میرے علاوہ آپ کا پرانا ننھا مہمان بھی ہمارے ساتھ ہے" لتا جی نے جوان ہو گئے اس بچے کو حیرت سے دیکھا اور اسے دعا دی۔

میں اس واقعہ کے بعد اب تک حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں کہ ایک معروف آرٹسٹ نے پورے اٹھارہ سال بعد ایک گھریلو عورت کو کیسے پہچان لیا۔ کیا یہ اس آرٹسٹ کی عظمت کی دلیل ہے یا ایسا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔

ممتاز مفتی

جب کوئی شخص نئے ابھرتے ہوئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو وہ برسوں کا سفر مہینوں میں اور مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کر لیتا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے اور وہ بلا جھجک آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ شعر و شاعری میں ڈاکٹر تاثیر' تاجور صاحب' سالک صاحب' حفیظ ہوشیار پوری اور اپنے استاد احمد ندیم قاسمی کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی سے میں اس میدان میں آگے آیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ شاعری سے پہلے میرا رجحان افسانہ نگاری کی طرف تھا اور میں اس حد تک افسانے لکھنے لگا تھا کہ انہیں دوسرے درجے کے افسانے کہا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے ساقی دہلی اور سنگ میل کے علاوہ دوسرے ادبی پرچوں تک بھی پہنچ گئے تھے۔

میں نے ممتاز مفتی صاحب کی چند چیزیں پڑھی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ میں جن موضوعات کو چھیڑتا ہوں اور انہی موضوعات کے قبیلے کے سرخیل ہیں۔ اس وقت تک میں شاعری میں ندیم صاحب سے استفادہ کر رہا تھا۔ لیکن ندیم صاحب کا فسانوی کا انداز میرے رجحانات سے بالکل مختلف

تھا۔ مفتی صاحب نفسیات کی بھول بھلیاں اور جنسی موضوعات زیر بحث لاتے تھے۔ میرا ذہن بھی ادھر ہی تھا۔

ایک دن میں نے سوچا کہ ممتاز مفتی صاحب سے مشورہ کروں۔ میں نے ایک افسانہ لکھا اور مفتی صاحب کے پاس لے گیا اور کہا" میں افسانے لکھ رہا ہوں اور آپ سے کچھ مشورہ لینا ہے۔ آپ میری رہنمائی کریں"

کہنے لگا" اچھا افسانہ سناؤ۔ یہ افسانہ چار یا پانچ فل سکیپ کاغذات پر مشتمل تھا"

میں نے سنایا تو مفتی صاحب نے اس پر جس طرح رائے زنی کی وہ میری توقعات کے بر خلاف تھی کیونکہ وہ مجھ سے ہمیشہ مروّت سے پیش آتے تھے لیکن افسانہ سن کر مجھے کہنے لگے" یار تم نے یہ افسانہ لکھا ہے"

میں نے کہا" جی میں نے افسانہ ہی لکھا ہے"

کہنے لگے" نہیں' یہ افسانہ نہیں ہے"

میں نے کہا" آپ اسے کیا نام دیں گے؟"

کہنے لگے" یہ کچھ بھی نہیں ہے"

میں نے کہا" آپ کا کیا خیال ہے۔ امپرومنٹ ہو سکتی ہے"

کہنے لگے" نہیں قطعاً نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی گنجائش ہی نہیں" یہ سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن میں نے ان کی رائے کو سچ مانا اس لئے کہ میں بطور نامور افسانہ نگار کے ان کا دل سے معترف

تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ افسانہ واقعی اتنا ہی برا ہو گا جتنا یہ کہہ رہے ہیں۔اس کے بعد میں نے وہی افسانہ کچھ اور لوگوں کو بھی دکھایا انہوں نے کہا کہ اگرچہ یہ پائے کا افسانہ نہیں ہے مگر پھر بھی اچھا افسانہ ہے۔اور اس میں تمام افسانوی ضرورتیں موجود ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ میں ان دنوں ویسے بھی یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ میں ان دونوں اصناف ادب میں سے کونسی ایک رکھوں۔ چنانچہ مفتی صاحب کے یہ کلمات میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ان کے ان کلمات سے میری کافی دل شکنی بھی ہوئی لیکن اس فیصلے میں بھی مدد ملی کہ میں شاعری اور افسانہ نگاری میں سے کونسی چیز اختیار کروں۔

شاید مفتی صاحب کو یہ واقعہ یاد بھی نہ ہو۔ لیکن مجھے بہر حال یاد ہے اور میں اب بھی سوچتا ہوں کہ انہوں نے یہ رائے دینے میں اتنی شدت کیوں اختیار کی۔ ورنہ بزرگوں کا قاعدہ تو یہ ہوتا ہے کہ نئے لکھنے والوں کو سمجھاتے ہیں مگر بات لیکن سے شروع کرتے ہیں اور پھر اصل مقصد تک پہنچ جاتے ہیں۔اس واقعہ کے بعد میں نے افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور شاعری کی طرف مکمل توجہ دی۔

انڈیا کا سفر

انڈیا میں نے بچپن میں بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت میں بالکل بچہ تھا اور اس وقت کے واقعات مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے خواب کے کچھ دھندلے دھندلے منظر ہوں۔ یہ میں اپنی پھوپھی، پھوپھا اور ان کی بیٹی کے ساتھ گیا تھا۔ وہ ذرا پیر پرست قسم کے لوگ تھے اور مزاروں پر آتے جاتے تھے۔ انہیں اجمیر شریف، کلیر شریف، دہلی میں نظام الدین اولیاء کے مزار اور تاج محل جسے اس وقت

تاج بی بی کا مزار کہا جاتا تھا' پر جانا تھا۔

اس کے بعد میرا انڈیا کا سفر 1952 ء میں ہوا۔ یہ تقسیم کے بعد میرا انڈیا کا پہلا سفر تھا۔ دہلی چیمسفورڈ کلب کا ایک مشاعرہ تھا جس میں پاکستان سے مجھے بلایا گیا تھا اور اس کے اہتمام کرنے والوں میں کنور مہندر سنگھ بیدی' ساحر ہوشیار پوری اور جگن ناتھ آزاد تھے۔ چنانچہ میں دہلی گیا۔ یہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا بھی میرا پہلا موقع تھا اور میں نے لاہور سے دہلی تک کا سفر ہوائی جہاز میں کیا۔ فوکر جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا تو جگن ناتھ آزاد وہاں مجھے لینے کیلئے آئے تھے۔ ان سے مدت بعد ملاقات ہوئی۔ وہ میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے میرے قیام کا بندوبست ساحر ہوشیار پوری صاحب کے گھر میں کیا تھا۔ یہ ایک بڑا گھر تھا اور کبھی اس میں جوش ملیح آبادی رہا کرتے تھے۔ یہ پل بنگش کے علاقے میں واقع تھا اور اب یہ جگن ناتھ آزاد صاحب کو الاٹ ہو چکا تھا اور انہوں نے اس کا کچھ حصہ ساحر ہوشیار پوری صاحب کو دیا ہوا تھا' جو وہاں رہتے تھے۔

ساحر ہوشیار پوری کا اصلی نام اوم پرکاش ہے۔ لیکن ان کی دوسری شادی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی تھی اور انہی کے ساتھ وہ وہاں رہ رہے تھے۔ ان کی دو سالیاں اپنے وقت کے مشہور ہیرو میاں نجم الحسن اور ایک بریگیڈیئر صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں' جو تقسیم کے بعد پاکستان میں رہ رہے تھے۔

میں دونوں کا مشترکہ مہمان تھا لیکن جگن ناتھ آزاد صاحب کے سٹڈی روم میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں لگادی گئی تھیں جہاں میں رات کو سوتا تھا۔ دن میں ویسے بھی سارا وقت دعوتوں میں گزر جاتا تھا۔

مشاعرہ ہوا۔ چیمسفورڈ کلب جگمگا رہا تھا اور ایک عجیب سماں پیش کر رہا تھا۔ دہلی میں بڑی آزادی کا زمانہ تھا اور اس کلب میں آنے والے سبھی لوگ پینے پلانے والے تھے۔ مشاعرے والوں نے کلب کے بارے کے علاوہ اپنے بار کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ کیونکہ وہاں تقریباً نوّے فیصد شعراء پینے والے تھے۔

میرے جانے سے یہ مشاعرہ ہندو پاک ہو گیا حالانکہ میں یہاں سے اکیلا ہی گیا ہوا تھا۔ جب کسی مشاعرے یا محفل موسیقی میں اس طرح پینے پلانے والے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں تو انہیں کوئی اچھی چیز ایک عام آدمی سے دس گنا زیادہ اچھی لگتی ہے یہ ماحول تھا اور لوگ خوب داد دے رہے تھے۔

دلیپ کمار صاحب سے بھی اس مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔

لاہور میں کرفیو کے زمانے میں میں نے ریڈیو کے لئے ایک غزل لکھ کر جگن ناتھ آزاد صاحب کو دکھائی تھی۔ انہوں نے یہ غزل ناپسند کی تھی لیکن ریڈیو پر یہ غزل حاصل مشاعرہ رہی اور میرے اچھے تعارف کا ذریعہ بنی تھی۔ اس مشاعرے میں جب میری باری آئی تو میرے ذہن میں یہ غزل آئی۔ میں نے کہا کہ میں آج کے وقت کو تھوڑا پیچھے لے جانا چاہتا ہوں اور وہی واقعہ بیان کیا البتہ جگن ناتھ آزاد صاحب کے نام کا حوالہ نہ دیا۔ اور کہا کہ اس روز بھی جگن ناتھ آزاد میرے ساتھ تھے اور آج بھی یہاں میزبان ہیں۔ اس لئے میں یہ غزل ان کی نذر کرتا ہوں:

تمہاری انجمن سے اٹھ کر دیوانے کہاں جاتے

میں نے جب یہ غزل سنائی تو لوگوں نے ایک ایک شعر پانچ پانچ بار پڑھوایا اور جیسے یہ غزل لاہور میں میری شہرت کا باعث بنی تھی، اس طرح دہلی میں بھی یہ میری شہرت کا باعث بنی اور اس

مشاعرے کے بعد بیسیوں نامور شاعروں نے اس زمین میں غزلیں کہیں اوراسی غزل کو شکیل بدایونی جیسے شاعر نے چار فلموں میں اس کا چربہ کر کے استعمال کیااور چنانچہ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مجروح صاحب نے اس بات کو ہوادی کہ شکیل نے قتیل کی غزل چوری کرلی ہے۔یہ بات اخبارات میں بھی آئی۔اس طرح میر اتعارف ہوتے ہوتے اور زیادہ ہو گیا۔

اس سے تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میری ایک غزل تھی:

اک جام کھنکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

پاکستان میں یہ غزل ماسٹر غلام حیدر کی ٹیون میں نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ ہونی تھی اور سید شوکت حسین رضوی کی فلم میں لی جانی تھی کہ اچانک ایک دن انڈیا کے ریڈیو سے سنا کہ ایک غزل لتا کی آواز میں گائی جارہی تھی جس کی ردیف تھی' رات گزرنے والی ہے۔اب بعض ردیفین ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں ردیف ہی نمایاں ہوتی ہے۔اگر وہ ردیف کسی اور جگہ استعمال کرلی جائے تو اصل غزل کی حیثیت ہی کوئی نہیں رہتی مثلاً

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم سو جاؤ

اب اس میں "ستارو تم تو سو جاؤ" ایک بڑی دلکش ردیف ہے۔اگر فلم کی حد تک کوئی اور شخص "ستارو تم تو سو جاؤ" ردیف رکھ کے غزل ڈال لے تو قطع نظر اس کے کہ اس کے باقی مصرے اس کے اپنے ہوں گے، یہ چوری کہلائے گی۔مجھے اس سے بہت صدمہ ہوا۔میں نے ماسٹر غلام حیدر نے اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ ردیف آچکی ہے۔اس لئے اب اس غزل کو روک لیا جائے۔اس طرح فلم گلنار کی یہ غزل جس میں نور جہاں کی اس وقت کی آواز تھی،اور

جس کی دھن بھی ماسٹر غلام حیدر نے بہترین بنائی تھی رہ گئی۔

میں نے اس واقعہ کے بعد راج کپور صاحب کو لکھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ چٹھی راج کپور صاحب تک نہیں پہنچنے دی گئی۔ اس دوران یہ بات اخبارات میں بھی آچکی تھی۔ چنانچہ جب شکیل صاحب نے میری چوری کی تو یہ بات بھی اخبارات میں آگئی۔ میری ان چوریوں کی وجہ سے جب میرا بار بار نام آیا اور اس کے بعد میں بمبئی پہنچا تو کئی پارٹیاں میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ جس شخص کی یہاں چوری چلتی ہے' اب جبکہ وہ خود یہاں آیا ہوا ہے تو اس سے اصل چیز کیوں نہ لی جائے۔ یہ 1952ء کا واقعہ ہے۔

سن باون کو گزرے ہوئے تو بہت عرصہ گزر گیا ہے لیکن انڈیا میں میرے کلام کی چوری اب تک نہیں رکی اور بقول ندا فاضلی' اس سے کوئی انکار نہیں کہ انڈیا میں جتنی بے دردی سے میرا کلام لوٹا گیا ہے اس کے ساتھ کہیں اور ایسا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ کسی بڑے یا چھوٹے شاعر کا نام لے لیں۔ اس نے میری کچھ نہ کچھ چوری کی ہوگی اور کچھ نے تو تقریباً پورے کا پورا گیت بھی چوری کیا ہوگا۔ مجھے نہ تو اس کا معاوضہ دیا' نہ سکرین پر میرا نام آیا اور نہ مجھ سے اس کی اجازت لی گئی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ میرے اس گیت کا بھی ہے کہ:

مجھے آئی نہ جگ سے لاج
میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

یہ گیت آج سے کوئی بیس بائیس برس پہلے پاکستانی فلم "ناز" میں موسیقار نثار بزمی کی دھن میں شریف نیئر صاحب نے اپنی فلم میں شامل کیا۔ چونکہ گیت کی ادبی حیثیت بھی تھی اس لئے میں نے اسے "شمع" دہلی میں بھی چھپوادیا تھا۔ یہ گیت آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے ہندوستان اور پاکستان کے گویوں پر ایسا سوار ہوا کہ جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی طرح اسے استعمال کر رہا تھا۔

یہ گیت سب سے پہلے بغیر اجازت کے میں نے برمنگھم میں بی بی سی ٹیلیویژن سے استعمال ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک گیت ہے " گھنگرو ٹوٹ گئے" جو بہت خوبصورت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو میرا گیت ہے۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ اس کے دو چار دن بعد بی بی سی والے میرا انٹرویو لینے آئے تو میں نے انہیں کہا" آپ کے ادارے تو بڑے بااصول ہیں لیکن میرا ایک گیت آپ کے یہاں چل رہا ہے۔ ایک تو بغیر اجازت ایسا ہو رہا ہے اور دوسرا میرا نام بھی ساتھ نہیں لیا جاتا"

کہنے لگے" جی اگر گانے والے رئیس خان نے بتایا ہوتا تو ہم ساتھ آپ کا نام بھی دے دیتے۔ بہر حال اب یوں کرتے ہیں کہ آپ کے انٹرویو کے ساتھ اسے دوبارہ چلاتے ہیں" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے میرے مفصل انٹرویو کے ساتھ یہ گیت دوبارہ نشر کیا تو پھر لوگوں کو پتا چلا کہ یہ میرا گیت ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ بغیر اجازت کے کوئی کلام استعمال کرتے ہیں' وہ اصل مصنف سے تو رجوع کر نہیں سکتے چنانچہ وہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس گیت میں بھی کم زکم چار شعری غلطیاں کرتا چلا گیا اور

جگہ جگہ یہ گیت غلط سکرپٹ کے ساتھ گایا جاتا رہا۔ یہ غلطیاں ایک عام موسیقی نواز یا شعری فہم رکھنے والے کیلئے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن باذوق آدمی کو یہ غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔

انڈیا کے پنکج اداس صاحب سے کچھ دوستانہ تعلقات بھی تھے اور انہوں نے ایک بار دعوت بھی کی تھی لیکن جب میں ادھر آیا تو پتا چلا کہ انہوں نے یہ گیت "گھنگرو ٹوٹ گئے" گایا اور اس طرح یہ گیت جلوٹا صاحب اور پھر ایک خاتون بھوپالی نے گایا اور تو اور میں دہلی آیا تو جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں میرے پاس گراموفون کمپنی والے آئے اور کہنے لگے "یہاں آپ کے قوالوں میں سے ایک صاحب آئے تھے اور کچھ گا گئے ہیں۔ یہ تو ہم نے لوگوں سے سنا ہے کہ ان کا گایا ہوا گیت آپ کا ہے لیکن اس گیت میں جو بند ٹھیک نہیں لگتا آپ ذرا اسے سن لیں" میں نے سنا تو پہلے تین بند تو میرے ہی تھے جن میں پہلے جیسی کچھ غلطیاں بھی تھیں لیکن چوتھا بند انہوں نے خود ہی شامل کر دیا تھا۔ یہ قوال غلام فرید صابری صاحب کے بھائی مقبول صابری نے گایا تھا۔ تاہم گراموفون کمپنی والوں نے اسے بغیر اجازت ہونے کی وجہ سے روک لیا پہلے تو انہوں نے چوتھا انترا کاٹا اور پھر مجھ سے اس گیت کی اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دے دی۔

پھر ایک بار پتا چلا کہ سلمیٰ آغا نے یہ گیت ایک انڈین فلم کیلئے گایا ہے۔ اصل میں محمود سپرا نے یہ گیت اپنی ایک فلم میں رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن جب ان دونوں کی ناراضی ہو گئی تو سلمیٰ آغا نے جلدی جلدی یہ گیت پلے بیک کے طور پر ریکارڈ کروا دیا حالانکہ اس نے اس فلم میں کام بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مجھے آج تک ادائیگی نہیں کی گئی۔ اس کے بعد میرے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ یہ گیت پنجابی میں ہونا چاہیے اس کا مکھڑا یہی رہے لیکن باقی گیت پنجابی میں ہو۔ اس شخص نے مجھ

سے اجازت لے کر اور مجھ سے پنجابی میں یہ گیت لکھوا کر استعمال کیا۔

اس گیت کے بارے میں میں نے جتنا بیان کیا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ استعمال ہوا ہے اور بغیر اجازت استعمال ہوا ہے۔ بلکہ میں نے انڈیا میں ایک گجراتی فلم میں اس کو پورا ترجمہ بھی دیکھا۔ اور یہ بھی سنا کہ کچھ اور زبانوں میں بھی ترجمہ کر کے اسے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ گیت میری زندگی میں دیکھتے دیکھتے ایک Folk song کی حیثیت اختیار کر گیا ہے لیکن جنہوں نے اس گیت پر ڈاکہ زنی کی، انہوں نے مجھے بہت ہی نقصان پہنچایا۔

صرف یہی نہیں بلکہ میرے کچھ اور گیت بھی چوری ہوئے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

اسی طرح ایک اور گیت:

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں

یہ گیت بھی چوری ہوئے اس کے علاوہ جو گیت چوری ہوئے ان میں سے کچھ جو مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں۔

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

مؤخر الذکر گیت تو چار مرتبہ چوری ہوا۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ میں بمبئی میں کیفی اعظمی صاحب کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم پروڈیوسر میرے پاس آئے اور کہا کہ میری فلم "ایکبار کہو" کی دو تین ریلیں ساتھ ہی پروجیکشن ہال میں دیکھ لیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فلم کی کہانی قتیل شفائی

سے شروع ہوتی ہے اور ہیروئن شاعر کی فین ہے۔ ہیرو اس کی اس کمزوری سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ قتیل شفائی کی ایک نئی کتاب آئی ہے۔ وہ لاتا ہے اور اسے اس میں سے یہ نظم سنا کر اظہار محبت کرتا ہے۔

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

میرے ساتھ اس وقت جو لوگ بیٹھے تھے ان میں میرے شاعر دوست کیفی اعظمی بھی بیٹھے تھے جنہوں نے اس فلم کے گانے لکھے ہوئے تھے۔ اور انہیں شاید اس بات کا نہیں پتا تھا۔ چنانچہ جب ہم وہاں سے اٹھ کر دوبارہ کیفی صاحب کے ہاں آئے تو وہ پروڈیوسر سے بڑے ناراض تھے۔ پروڈیوسر نے مجھ سے کہا کہ جی ایک تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ پہلے سے آپ سے اجازت نہیں لی اور دوسرے آپ سے اس کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر تم مفت میں اسے استعمال کرنے کی اجازت لینا چاہتے تھے تو وہ تو تم استعمال کر چکے ہو لیکن اگر معاوضہ ادا کر کے اجازت لینا چاہتے تھے تو وہ تم اب ادا کر دو۔ لیکن وہ صاحب نجانے کیوں مجھ سے ناراض ہوئے کہ آخر ناراض رہے۔

زندگی میں ہر انسان کی کچھ حسرتیں ہوتی ہیں اور اگر کبھی قدرت انہیں پورا کرتی ہے تو بڑی شان سے کرتی ہے۔ بچپن میں فلم اور گراموفون ریکارڈوں کے حوالے سے میری کچھ تمنائیں ہوتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اچھے شعر کہوں اور میرا کلام سہگل گائے۔ یا پھر میرا کلام سریندر

گائے۔اس کا ایک گانا تھا:

یاد نہ کر دل حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

یہ گانا سپر ہٹ تھا اور جگہ جگہ نوجوان گاتے تھے۔اس لئے تمنا تھی کہ سریندر میرا کلام گائے۔اس کے علاوہ قوالوں میں محمد علی فریدی کے ریکارڈ میرے پاس تھے۔یہ ہری پور کے نزدیکی گاؤں شاہ محمد میں اپنے کسی جاننے والے دوست کے پاس آیا کرتے تھے اور وہاں گانے کی محفل ہوتی تھی۔میں ان کی آواز کا بڑا عاشق تھا اور جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی ایسا سمبندھ ہو کہ یہ میری کوئی چیز گادیں۔

ان گلوکاروں کے علاوہ میرے ذہن میں دو میوزک ڈائریکٹر مدن موہن اور سی رام چندرا بھی تھے جن کے بارے میں ذہن میں یہ خواہش تھی کہ یہ میرے گیتوں کی دھن بنائیں۔یہ میری شروع کی تمنائیں تھیں۔اب دیکھئے کہ قدرت کیسے ان تمناؤں کے پورے ہونے کا وقت لاتی ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر بھی ہوتا کیا ہے۔

چند سال پہلے میں انگلینڈ گیا تو میں وہاں اپنے ایک بیٹے اور ایک دوست سوہن راہی کے ساتھ بیٹھا تھا تو ایک فون آیا۔فون کرنے والے نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا" مرا نام سی رام چندرا ہے۔ شاید آپ مجھے جانتے ہوں"

مجھے توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ اتنا بڑا میوزک ڈائریکٹر خود مجھے فون کر سکتا ہے۔اس لئے میں نے کہا " میں ایک رام چندرا کو جانتا ہوں جو بہت مشہور میوزک ڈائریکٹر ہیں۔اگر آپ وہ ہیں تو آپ کو

کون نہیں جانتا لیکن اگر آپ کوئی اور ہیں تو پھر اپنا تعارف کروا دیجئے''

وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے '' میں وہی ہوں۔ دراصل آپ جب پچھلی بار بمبئی آئے تھے تو مجھے آپ کے آنے کا دیر سے پتا چلا تھا۔ آپ کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ پھر وہاں ایک سندھ کے ہندوار جن داسمانی تھے مجھے پتا چلا کہ ان کے پاس آپ کا کلام ہے۔ میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ انڈیا میں میرے سوا اور کوئی قتیل صاحب کا کلام استعمال نہیں کر سکتا''

انہوں نے مجھ سے پوچھا '' کیا یہ بات ٹھیک ہے ''

میں نے کہا '' یہ بات ٹھیک تو نہیں ہے '' خیر مجھے کہنے لگے '' آج میں شام کی فلائٹ سے جا رہا ہوں اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ آپ یہاں ہیں ' اس لئے آپ اپنے صاحب خانہ سے کہیے کہ وہ مجھے ایڈریس سمجھا دیں اور میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں''

میرے لئے تو یہی کافی تھا کہ میں جسے چاہتا ہوں وہ میوزک ڈائریکٹر مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس لئے میں نے کہا '' یہ نہیں ہو گا بلکہ آپ اپنا ایڈریس بتایئے میں آپ کے پاس پہنچتا ہوں '' انہوں نے ایڈریس بتایا اور میں ' میرا بیٹا اور سوہن راہی وہاں پہنچے۔ ان کا حلیہ سن رکھا تھا کہ اونچے قد کے ' گوری رنگت اور وسکی کا گلاس ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو دروازے تک اٹھ کر آئے پھر بات چیت ہوئی۔

میں نے انہیں بتایا '' یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میرا کلام سننا چاہتے ہیں ورنہ میری تو کئی سال پہلے سے تمنا تھی کہ آپ کے ساتھ میں کسی فلم میں ہوں''

کہنے لگے '' فلم تو اب بعد میں دیکھی جائے گی ' میری خواہش یہ ہے کہ میں آپ کے کلام کا غیر فلمی

ایل پی بناؤں"

میں نے کہا" ٹھیک ہے' یہاں تو میرے پاس کلام نہیں ہے۔ میں عنقریب پاکستان جانے والا ہوں۔ وہاں سے میں آپ کو پندرہ غزلیں بھیج دوں گا' اس میں سے آپ جو غزلیں استعمال کرنا چاہیں کریں۔ یہ غزلیں آپ کی ملکیت ہوں گی' آپ معاوضے کا فکر نہ کریں۔ یہ میری طرف سے نذرانہ ہوگا اور میں معاہدہ بھی ساتھ ہی لکھ کر بھیج دوں گا"

کہنے لگے" معاوضہ تو خیر آپ کو کمپنی کی طرف سے ملے گا کیونکہ میں اپنے لئے بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ معاوضہ نہ لوں ' اس لئے آپ کو معاوضہ تو لینا ہی ہوگا۔"

وہ اس شام بمبئی روانہ ہو گئے۔ بعد میں میں پاکستان آیا اور حسب وعدہ یہاں سے یہ چیزیں رجسٹری کے ذریعے پوسٹ کر دیں۔ کئی دن گزر گئے لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اچانک ایک دن کسی بھارتی پرچے میں یہ خبر پڑھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے اور وہ چل بسے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے دوہرا صدمہ ہوا۔ ایک تو اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے کا اور دوسرے مرنے والے کی خواہش کے پوری نہ ہو سکنے کا۔

اسی طرح بمبئی کا واقعہ ہے کہ مجھے سریندر کا فون آیا اور کہا" میں ایک پرانا ایکٹر ہوں۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں"

میں نے کہا" آپ مجھے دیکھیں گے تو میں بھی بوڑھا ہوں"

کہنے لگے" آپ کلام سے تو بوڑھے نظر نہیں آتے"

کہنے لگے" فلم میں تو آج کل میں نہیں آرہا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری آواز اب

بھی ٹھیک ہے۔آپ کرم کیجئے کیونکہ میں آپ کا کلام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں‘‘

میں نے کہا’’جی بہتر میں آپ کو خط لکھ کر بھیج دوں گا۔آپ کو میرا جو کلام پسند آئے لے لیجئے‘‘ میں نے ان سے کہا’’ میں آپ سے ملنے کیلئے آؤں گا‘‘ لیکن پھر بہت سے مشاعرے آن پڑے اور میں کلکتہ چلا گیا۔ پھر مصروفیت کی وجہ سے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ میں نے انہیں خط لکھنے اور کچھ کلام بھیجنے کا وعدہ کرر کھا ہے۔

واپس لاہور آکر تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔انہوں نے مجھے جو ایڈریس دیا تھا وہ مجھ سے کھو چکا تھا۔جب یاد آیا تو میں نے ’’شمع‘‘ دہلی والوں کو لکھا کہ ان کا ایڈریس بھیج دیں۔ اس کے بعد پھر یہ بات ذہن سے نکل گئی۔اس طرح سال ڈیڑھ سال گزر گیا۔اور پھر پتا چلا کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

محمد علی فریدی صرف قوالی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ریکارڈوں کیلئے گیت بھی گاتے تھے۔میں یہاں سمن آباد ہی میں پرانے مکان میں رہتا تھا تو ایک دن دوپہر کے وقت مجھے پتا چلا کہ کوئی آدمی ملنے کیلئے آیا ہے۔نام پتا کروایا تو نوکر نے بتایا کہ ان کا نام محمد علی فریدی ہے۔میں یہ نام سن کر چونکا۔باہر نکل کے دیکھا تو باہر ایک لمبی داڑھی والا آدمی کھڑا تھا۔اب میں نے انہیں ان کی جوانی میں دیکھا تھا۔وہ کلین شیو ہوتے تھے اور خالص پنجابی پہلوانوں والی پگڑی باندھتے تھے۔لیکن غور سے دیکھا تو وہی تھے۔

میں نے کہا’’آیئے تشریف رکھیے اور بتایئے کہ کس طرح تکلیف کی‘‘

کہنے لگے’’ آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔میں

پرانے زمانے کا آدمی ہوں اور پہلے دربار گولڑہ شریف میں آپ کی ایک غزل گاتا رہا ہوں جو مرحوم پیر صاحب بہت پسند کرتے تھے۔ وہ غزل تھی:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

میں نے کوئی دس سال تک یہ غزل گائی ہے اور مرحوم پیر صاحب کی خوشنودی حاصل کی۔ اب مجھے خیال آیا ہے کہ آپ سے کچھ اور چیزیں لے لوں اور گاؤں"

میں نے کہا" یا حضرت! اب میں آپ کو جو بتانے والا ہوں' آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر سنیے کہ میں ہری پور میں رہنے والا ہوں۔ موضع شاہ محمد آپ جایا کرتے تھے اور آپ کا ایسا حلیہ ہوا کرتا تھا اور آپ یہ گایا کرتے تھے"

وہ میری باتیں سن کر اچھل پڑے اور کہنے لگے " آپ نے اس زمانے میں مجھے سنا اور دیکھا ہوا ہے"

میں نے کہا" میں آپ کا بڑا قدردان اور فین ہوں"

سن کر بڑے خوش ہوئے اور انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا" میری اپنی تمنا تھی کہ آپ میرا کلام گائیں لیکن اس زمانے میں میرا کلام اس قابل تھا ہی نہیں۔ اب اگر قدرت نے موقع دیا ہے تو میں آپ کی خدمت کروں گا"

چنانچہ میں نے انہیں کچھ چیزیں دیں۔ لیکن ان کا زمانہ اب گزر چکا تھا۔ بہت ہی بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور اب گانے کا انداز بھی بدل چکا تھا۔ اس لئے میرا اکیلا کلام بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ بہرحال مجھے ان کے آنے سے جو خوشی ہوئی وہ کبھی کبھی حاصل ہوتی ہے۔

بمبئی کا مشاعرہ

شعروں کی مقبولیت سے شاعروں کو راحت ہوتی ہے البتہ بعض اوقات راحتوں کی شکل بدل جاتی اور ہوتا یوں ہے کہ داد تو ملتی ہے لیکن بڑی پریشان کر کے۔ مدراس کے ایک مشاعرے پر گیا تو واپسی پر ''مغل اعظم'' فلم کے پروڈیوسر کے آصف نے مجھے بمبئی میں روک لیا۔ اس وقت ان کی فلم ''محبت اور خدا'' بن رہی تھی اور وہ اس کے گانے مجھ سے لکھوانا چاہتے تھے۔ ان کے ایک ہندو دوست نے میری دعوت کی جس میں چند ایک دوسرے شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا۔

کھانے کے بعد شعری نشست ہوئی اور عین اس وقت جب میں نے اپنا کلام سنانا شروع کر چکا تھا تو ایک معزز شخص جو کہ لباس سے سیٹھ لگتا تھا اور جس کی سب عزت کر رہے تھے۔ وہاں آیا۔ میں نے ابھی ایک یہ شعر پڑھا تھا لہذا غزل پھر سے پڑھنا شروع کر دی۔ غزل یہی تھی:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

جوں جوں میں پڑھتا جا رہا تھا ان صاحب کے چہرے پر غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب مقطع ختم ہوا تو چونکہ اس آخری شعر میں میرا نام نہیں تھا تو وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا'' صاحب یہ آپ کی اپنی غزل ہے؟''

میں نے کہا'' جی''

کہنے لگے ''نہیں آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ تو قتیل شفائی کی غزل ہے'' کے آصف بھی ہنسے اور مجھے بھی سمجھ آگئی کہ یہ شخص مجھے کیوں گھور رہا تھا۔ چونکہ وہ دیر سے آیا تھا اور اس نے اناؤنسمنٹ نہیں سنی تھی اس لئے وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی بمبئی کا شاعر ہے اور قتیل شفائی کی غزل اپنے نام سے

پڑھ رہا ہے ۔

کے آصف نے کہا" سیٹھ جی یہ قتیل شفائی ہی ہیں۔اور پاکستان سے تشریف لائے ہیں" یہ سن کر اس شخص نے بہت معذرت کی اور اگلے دن اپنے ہاں دعوت بھی رکھی۔

جب میں اگلے روز اس دعوت میں شرکت کیلئے گیا تو وہ پھر بہت معذرت کرنے لگا۔ میں نے کہا" آپ نے تو مجھے بہت بڑی داد دی ہے" تب کہیں جا کر وہ شخص کچھ مطمئن ہوا۔

انڈیا میں میرے بہت سے کلام کی چوری کی وجہ سے میرا نام کافی مشہور ہو چکا تھا چنانچہ جب میں وہاں گیا تو کے آصف کے علاوہ اور بھی بہت سے پروڈیوسروں نے اپنی فلموں کے لئے مجھ سے گیت لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ جب اس طرح کوئی غیر ملکی آکر پہلے سے وہاں موجود لوگوں میں دراڑ پیدا کر دے تو محسوس تو ہوتا ہے۔ لیکن میرا معاملہ یہ نہیں تھا کیونکہ میں وہاں عملاً جا کر کوئی گڑ بڑ نہیں کر رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ مدارس سے واپسی پر بمبئی میں وشوامتر عادل کے گھر میں میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ دیوالی کی رات کی وجہ سے چلا گیا۔

میرا مقصد تو دوستوں کو ملنا تھا اور ساحر کو پتا تھا کہ وہاں بہت سے لوگ دیوالی کی وجہ سے اکٹھے ہوں گے اس لئے وہ مجھے وہاں ساتھ لے گیا تھا۔ چنانچہ وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ جن میں میں کیفی اعظمی، سردار جعفری، وشوامتر عادل اور کے آصف بھی شامل تھے۔ کے آصف میرے پاس آئے اور کہنے لگے" مولانا آپ نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی اور ہمیں تو آپ کی وہ غزل چاہیے تھی۔

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

میں چونکہ بیوی کو دہلی میں ساحر ہوشیار پوری کے گھر چھوڑ آیا تھا' اس لئے جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن کے آصف کے اصرار پر مجھے وہاں رکنا پڑا۔ میں جب ان کی فلم کے گانے لکھ رہا تھا تو ایک طوفان مچ گیا اور اعتراض ہوا کہ یہ غیر ملکی یہاں گانے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ یہ ہماری یونین کا ممبر نہیں ہے ۔ مجھے کچھ اور پروڈیوسروں کی طرف سے بھی ایڈوانس پیسے مل چکے تھے۔ اس لئے میں کچھ پریشان ہوا۔

اس وقت وہاں رائٹرز یونین کے سیکرٹری قمر جلال آبادی تھے جو میرے لاہور کے زمانے کے دوست تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ان کے پاس یونین کی ممبر شپ نہیں ہے تو انہیں ممبر شپ دے دیتے ہیں۔ انہوں نے خلوص دل سے چاہا کہ میں ممبر بن جاؤں۔ چنانچہ میں نے ان کے کہنے پر درخواست دے دی تو انہی لوگوں نے یہ پوائنٹ کھڑا کر دیا کہ کوئی غیر ملکی آدمی اس یونین کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اب وہاں دو گروپ بن گئے۔ ایک وہ گروپ تھا جو بڑے بڑے پیسے لے کر فلموں پر چھایا ہوا تھا اور دوسرا چھوٹا گروپ جس میں شامل افراد کو کم معاوضہ ملتا تھا اور کام بھی کم ملتا تھا۔ یہ دوسرا گروپ میرے وہاں جانے سے بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ ان کی بہت حق تلفی ہو رہی تھی۔ اس دوسرے گروپ نے میرے حق میں کہا کہ ان لوگوں کو اعتراض کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے جبکہ یہ خود ایک شخص کی چوری کرتے ہیں اور جب وہ خود آتا ہے تو اسے کام کرنے نہیں دیتے اور ممبر شپ نہیں دیتے۔ اس زمانے میں میری ایک بیٹی کو گردن توڑ بخار ہوا تھا اور میں اس کے علاج کیلئے جگہ جگہ تدبیر کر رہا تھا۔ اور بمبئی جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں ایک ڈاکٹر سنہا تھے جو ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور میں ان سے مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس یونین کو بھی معلوم تھی

اور انہوں نے ازراہ تضحیک میرے لئے بیس ہزار روپے کی امداد منظور کی اور کہا" ہم ممبر شپ تو نہیں دے سکتے لیکن یہ عطیہ پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ شاعر برادری سے ہیں اور بیٹی کا علاج کروالیں"

مجھے جب اس کا پتا چلا تو میں نے اس پر احتجاج کیا اور کہا " میں یہاں بھیک مانگنے کیلئے نہیں آیا اور نہ ہی میں آپ کی فلموں میں گانے لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے پروڈیوسروں سے پوچھئے کہ وہ کیوں مجھ سے گانے لکھوانا چاہتے ہیں"

جب میرا یہ خط انہیں پہنچا تو ایک گروپ نے ان سے کہا کہ انہوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے' آپ دستور میں ترمیم کیجئے اور ہم انہیں اپنا ممبر بنائیں گے۔ چنانچہ یونین کی طرف سے مجھے ممبر شپ نہ دینے کا فیصلہ واپس لیا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں اور واپس چلا آیا۔

اس زمانے میں میں یہاں سب سے بڑا گیت نگار تھا۔ اگر میں وہاں رک جاتا تو وہاں سب سے بڑا نہ ہوتا بلکہ بہت سے بڑوں میں ایک ہوتا۔ میرے پاس گرودت کا کچھ ایڈوانس تھا' آنے سے پہلے میں نے انہیں ان کا ایڈوانس لوٹانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ ہم یہ پیسے واپس نہیں لیں گے کیونکہ Defaulter ہم ہیں۔

اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ جو بڑے شعراء تھے اور میرے دوست بھی تھے' پس پردہ وہی میرے مخالف تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں انڈیا میں گانے لکھوں کیونکہ ان پر سیدھی زد پڑتی تھی۔ لیکن یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے میرا بہت سا کلام استعمال کیا ہوا تھا۔ البتہ ان میں ایک مست

قلندر آدمی اندیور تھا جس کے گھر میں ٹھہرا ہوا بھی تھا۔اس زمانے میں وہ آمدن کے اعتبار سے دوسرے درجے کا شاعر تھا۔اس نے میرا ساتھ دیا۔انڈیا میں گانے لکھنے کا ایک اور مرحلہ بھی آیا۔ منوج کمار صاحب وہاں کے چوٹی کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اور نامور ایکٹر تھے جب یہ لاہور آئے تو مجھ سے ملنا چاہا کیونکہ انڈیا میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔صاحب ذوق آدمی تھے اور شعری ذوق انہیں ورثے میں ملا ہوا تھا۔ان کے والد بھی شاعر تھے اور خضر تخلص کرتے تھے۔جب یہ 1987ء میں یہاں آئے تو میں ان سے ملنے کیلئے ایک مقامی ہوٹل میں گیا۔لابی ہی میں ان سے ملاقات ہو گئی کہنے لگے '' ہم تو آپ کے بڑے مداح ہیں''

ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔جس کا نام کنال تھا۔کہنے لگے '' اب یہ فلموں میں ہیرو بھی آرہا ہے'' پھر بیٹے کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''چلو بیٹے انہیں ان کی غزلیں سناؤ ''تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہی مجھے میری غزل سنادی۔ اس کی ٹیون بھی اس نے خود ہی بنائی تھی۔اس بے تکلفی کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلقات بڑھے تھے۔

انڈین شاعروں کا سلوک

یہ غالباً 1961ء ہی کی بات ہے جب انڈیا کے دوست شاعروں نے مناسب سمجھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھے کام سے روک دیں۔اس زمانے میں وہاں جو ایک دو مخلص دوست ملے ان میں او پی نیئر کا نام بھی بہت اونچائی پر رکھتا ہوں۔یہ شخص اتنا کھرا' منہ پھٹ اور سچا تھا کہ نقصان اٹھالیتا تھا مگر سچ سے باز نہیں آتا تھا۔یہ اس کا وہ زمانہ تھا جب اس کے تعلقات اپنی دوسری بیوی آشا بھونسلے سے بگڑ چکے تھے۔

آشا بھونسلے اور لتا منگیشکر آپس میں بہنیں ہیں کسی وقت جبکہ او پی نیئر فلم میں بالکل نووارد تھے' لتا منگیشکر نے نیئر صاحب کو گانے کا وقت نہیں دیا تھا اور روایت یہ ہے کہ نیئر صاحب نے اس وقت طے کر لیا تھا کہ وہ زندگی بھر لتا منگیشکر سے گانا نہیں گوائیں گے چنانچہ انہوں نے اوّل سے آخر تک یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ لتا کے بغیر بھی چل سکتے ہیں۔ انہوں نے لتا کی بہن آشا بھونسلے سے شادی کر لی اور آشا نے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا کہ ان کی آواز میں جو Expression ہے یہ او پی نیئر کی دین ہے۔ آشا کی طرف سے یہ بات کہنا بہت بڑی بات ہے کیونکہ انہوں نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب وہ نیئر صاحب سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔

لتا سے تو ان کے تعلقات پہلے سے ہی خراب تھے' اب آشا بھونسلے سے بھی قطع تعلق ہو گیا تو ان کے پاس زیادہ کام کاج نہ رہا۔ کیونکہ پروڈیوسرز زیادہ تر انہی دو آوازوں کو پسند کرتے تھے۔ اس سے ایک بار پہلے جب میں انڈیا گیا تھا تو نیئر صاحب نے مجھے کہا تھا کہ آپ بمبئی آجائیں تو ہم مل کر کام کریں گے۔ کیونکہ میں شاعری کے سلسلے میں اپنا سٹائل تھوڑا سا بدلنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں بالکل نچلی سطح پر کام کرتا تھا اب میں تھوڑا سا اوپر آکر کام کروں گا۔ جس کیلئے مجھے آپ کی شاعری کی مدد درکار ہے۔

اس بار جب میں وہاں گیا تو نیئر صاحب بہت خوش ہوئے اور ہر دوسرے تیسرے روز جگہیں بدل بدل کر میری دعوتیں کرنے لگے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ تلملائے ہوئے سے رہتے ہیں لیکن غیور اتنے تھے کہ ان دونوں بہنوں سے مصالحت کر لیں اور ان سے گانے گوائیں یہ قبول نہیں تھا۔

لوگ او پی نیئر کے اس حد تک معترف تھے کہ انہیں Master of Rhythm کہتے تھے اور پورے صفحے پر ان کا نام دیتے تھے اور پکچر بک جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ ان کے فن سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر لتا اور آشا کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی جو پوری فلم کے بوجھ کو سہار سکے۔ چنانچہ نیئر صاحب بھی اس صورتحال کی وجہ سے اندر سے ملے ہوئے تھے۔

میرے ایک دوست بابا بہادر شاہ تھے جو اب انتقال کر چکے ہیں۔ آخر میں وہ دمے کے مرض کے سپیشلسٹ بن کے کام کر رہے تھے۔ لیکن شروع میں وہ بمل رائے پارٹی میں ایکٹنگ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے بمل رائے سے میرا ذکر کیا، مجھ پر یہ اللہ کا بڑا کرم رہا ہے کہ فلم کے سبھی بڑے لوگ میرے نام سے واقف تھے۔ چنانچہ بابا بہادر شاہ سے بمل رائے نے کہا "میں قتیل صاحب سے اگلی فلم کے گانے لکھواؤں گا تم ان سے بات کرو"

انہوں نے بابا بہادر شاہ سے کہا " آپ گانے قتیل صاحب کے رکھیں لیکن میوزک میرا ہو" اور پھر میری وجہ سے لاکھ روپے سے نیچے آتے نیئر صاحب اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ ایک روپیہ بھی معاوضہ نہیں لیں گے۔

اب پھر آوازوں کا سوال پیدا ہوا تو نہ تو میں نے اور نہ بابا بہادر شاہ نے ان کے سامنے لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کا نام لیا کیونکہ وہ بڑے نازک دل کے مالک تھے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ انہیں یہ بات ناگوار گزرے۔ یہ بڑا اچھا Combination ہوتا لیکن اس بات کی ضمانت کون دیتا کہ آشا بھونسلے گائے گی۔ چنانچہ یہ معلوم رہ گیا۔

نیئر صاحب کے پیار کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک نیا فلیٹ لیا اور اس کا ایک کمرہ میرے لئے ریزرو کر دیا اور اس کے باہر قتیل شفائی کے نام کی نیم پلیٹ لگا دی اور مجھ سے کہا کہ میں نے یہ کمرہ مستقل طور پر آپ کیلئے ریزرو کر دیا ہے۔ آپ جب بھی بمبئی آئیں گے، یہیں ٹھہریں گے۔ اس واقعہ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان جنگوں کی وجہ سے اٹھارہ سال کا وقفہ پڑ گیا تو اس وقفے کے بعد جب میں بمبئی گیا تو اب نیم پلیٹ تو دروازے پر نہیں تھی لیکن نیئر صاحب کا پیار اب بھی اسی طرح قائم تھا۔ اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ نیئر صاحب اب میوزک ڈائریکٹر کی بجائے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن چکے تھے اور ان کے جو ٹھاٹھ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر تھے وہی ٹھاٹھ اب ڈاکٹر کے طور پر تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑے ڈاکٹر کی طرح وہ مصروف تھے اور ان کی اچھی خاصی کمائی تھی۔

میں نے پوچھا" یہ تبدیلی کیوں آئی ہے"

کہنے لگے "کام تو کوئی کرنا ہی تھا اور اس کام کا مجھے پہلے سے شوق تھا۔ البتہ پہلے صرف دوستوں کا شوقیہ علاج کرتا تھا اور اب میں نے اسے ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ کیونکہ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں یا تو جوتے مار کر کام کرو یا پھر جوتے کھا کر کرو۔ میں نے اس انڈسٹری میں بہت جوتے مارے ہیں۔ کام اب بھی کر سکتا ہوں لیکن اب کام جوتے کھا کر کر سکتا ہوں اور وہ مجھے گوارا نہیں ہے"

او پی نیئر کے علاوہ میری دوسری دوستی راجندر کرشن سے بنی۔ تقسیم سے پہلے گجرات کے قریب کسی

گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں کوئی تخلص بھی رکھا ہوا تھا۔ پھر یہ شملہ میں ملازمت کرتے رہے لیکن بعد میں بمبئی آ گئے۔ یہ بڑے بذلہ سنج ' دوست اور شاعری میں انوکھے تیور کے آدمی تھے۔ لیکن دوسرے شاعروں کی طرح ان کی اس طرح کی پبلک ریلیشننگ نہیں تھی کہ انہیں ایوارڈ وغیرہ ملیں۔ وہ سب سے زیادہ کام کرتے تھے اور ایک زمانہ وہ تھا کہ مدراس کی فلم انڈسٹری پر ان کی پوری طرح Manoply تھی۔

وہ نہ صرف فلم کے گانے اور ڈائیلاگ لکھتے تھے بلکہ فلم کے دوسرے کام بھی انکی مرضی سے کیے جاتے تھے۔ چنانچہ مصروفیت کے باعث ان کا ایک قدم بمبئی میں ہوتا اور دوسرا مدراس میں۔ پھر شان یہ تھی کہ اگر فلم مدراس کی ہے تو اس کا میوزک بمبئی کے ایک ہوٹل کے کمرے میں بن رہا ہے جہاں پر میوزک ڈائریکٹر ان کے زیر ہدایت کام کر رہا ہے۔

ایسے پر زور آدمی تھے کہ مزاحیہ گانے بھی لکھتے تھے اور کلاسیکل بھی۔ انہوں نے ہر ایک رنگ میں گانے لکھے۔ میں جب بمبئی گیا تو میری ان سے پہلی ملاقات ڈاکٹر نارنگ کے گھر پر ہوئی۔ ڈاکٹر نارنگ نے لاہور سے فلم کیریئر کا آغاز کیا تھا اور پنچولی کی فلم میں ہیرو بھی آ چکے تھے۔ راجندر کرشن ان دنوں ڈاکٹر نارنگ کی کسی فلم کے گانے لکھ رہے تھے۔ راجندر کرشن نے اس زمانے میں میری وہاں دعوت کی ،جب وہاں شراب کی مکمل بندش تھی۔ یہ مرارجی ڈیسائی کا زمانہ تھا جنہوں نے شراب کی بجائے پیشاب پینا شروع کر رکھا تھا۔ لیکن فلم انڈسٹری کی کوئی دعوت شراب کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ راجندر کرشن نے میرے اعزاز میں جو دعوت کی اس میں انڈسٹری کے سب بڑے بڑے لوگ بلائے۔ میرے راہبر میوزک ڈائریکٹر ایس ایم بابل تھے جو اب یہاں ہیں اور

معذور ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔ انہوں نے خود پہلے ہی بہت زیادہ پی لی تھی اور جب مجھے ساتھ لیا تو زیادہ پینے کی وجہ سے صحیح راستہ بھول گئے۔ تقریباً دو تین گھنٹے تک مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر گھماتے رہے۔ آخر میں نے کہا کہ ٹیکسی چھوڑ دیئے اور پیدل ہی گھر ڈھونڈتے ہیں۔

ہم ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر مدن موہن ایک پان والے کی دوکان سے پان لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو پیار اور ناراضی کے ملے جلے انداز میں میرے سینے پر مکا مار کر کہنے لگے " ظالم تو نے اس کی ساری پارٹی تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ ابھی ابھی لوگ کھانا کھا کر گئے ہیں اور اس نے مسلسل تین گھنٹے تمہارا انتظار کیا ہے"

میں نے کہا "ہمیں ان کے گھر لے کر تو چلیں" مدن موہن راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور جانتے تھے کہ میں بھی ہری پور اور پنڈی کا رہنے والا ہوں۔ اس لئے مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے اور دو تین ملاقاتوں میں ہی بہت قریب آ گئے تھے۔

وہ ہمیں ساتھ لے کر راجندر کرشن کے گھر گئے جو کہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ راجندر نے مجھے دیکھا تو بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا" یار پھر بھی شکریہ کہ تم آ گئے ہو۔ وہ بوتل میں تھوڑی سی پڑی ہے، اگر پینی چاہو تو پی لو اور وہ تھوڑا سا کھانا پڑا ہے۔ اگر کھانا چاہو تو کھا لو۔ اس کے علاوہ اب اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال جو میرے ساتھ ہوا ہے وہ ان لوگوں سے پوچھ لو" مجھے یہ سن کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ معافی تو مانگی لیکن معافی مانگ کر بھی کیا ہو سکتا تھا کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ شراب پر پابندی ہونے کے باوجود اس نے ساری فلم انڈسٹری کو بلایا ہوا تھا اور نجانے کس

طرح اتنی ساری شراب کا اہتمام کیا۔اور شراب بھی پھر سکاچ تھی۔ پھر اس نے اس دعوت پر اس وقت کے حساب سے اتنا پیسہ خرچ کیا تھا جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔ شرمندگی تو بہت ہوئی لیکن ہمارے تعلقات بہت بڑھ گئے۔

اٹھارہ برس کے بعد 1979ء میں میں جب دوبارہ بمبئی گیا تو سب سے پہلا فون جو مجھے آیا وہ راجندر کرشن کا تھا۔اس نے فون پر مجھے کہا"سناؤ پٹھان' تم آگئے ہو۔مجھے امریک سنگھ آنند نے بتایا کہ پٹھان آگیا ہے۔اب میری پارٹی خراب کرنے کا کب ارادہ ہے"

میں نے کہا" راجندر جی اب تو جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی پارٹی کروں اور آپ اسے خراب کریں"

کہنے لگے" بات تو وہی ہے۔اگر تمہاری پارٹی خراب ہوئی تو پھر بھی تو میرا ہی نقصان ہے"

بہر حال میں نے کہا" میں ملنے کیلئے تو آج ہی آپ کے پاس آرہا ہوں، باقی پارٹی خراب کرتے رہیں گے" میرے ساتھ میرے بیوی بچے بھی تھے اور اس شخص نے ایک نہیں بلکہ تین مہینے کے قیام کے دوران درجنوں دعوتیں کیں۔اس نے میرے بیٹے نوید کو اپنا دوست بنالیا اور مجھے ہنس کے کہتا تھا" تم تو میرے ریٹائرڈ دوست ہو' اصل دوست تو یہ نوید ہے"

پھر نوید کو اور میری بیوی کو بہت سے تحفے لے کر دیئے حالانکہ اسے لاہور بھی نہیں آنا تھا کہ اسے اس سب کچھ کے بدلے میں کچھ اور ملنے کا لالچ ہوتا۔

راجندر کرشن ریس کا رسیا تھا اور ریس کھیلنے والوں میں یہ وہ خوش نصیب ہے کہ جس نے جیک پاٹ جوئے میں پچاس لاکھ روپے جیتے۔جیک پاٹ یہ ہوتا ہے کہ اس میں براہ راست شرط

نہیں لگائی جاتی بلکہ پانچ پانچ روپے کے ٹکٹ لے کر کچھ گھوڑوں کے نمبر بتانے پڑتے ہیں اور پہلی سے آخری ریس تک اگر یہ نمبر ملتے چلے جائیں تو جیتنے پر بھی پانچ پانچ روپے جمع ہوتے ہیں جو کہ لاکھوں میں ہوتے ہیں، وہ اس ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کو جن کے نمبر مل جائیں' دے دیئے جاتے ہیں۔ اس کی خوش قسمتی کہ جس دن اس نے جیک پاٹ میں حصہ لیا یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا اور اس کا نکل آیا۔ یہ واقعہ میرے 1961ء میں انڈیا سے لوٹ آنے کے تین چار سال بعد پیش آیا تھا۔

راجندر کرشن ایک تو فلم سے کافی پیسہ کما رہا تھا جب جیک پاٹ میں بھی اس کا پچاس لاکھ روپیہ نکل آیا تو اس نے بہت سی جائیداد بھی خریدی اور کاروبار میں بھی بہت سارو پیہ لگایا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ بیٹے صرف باپ پر انحصار کر رہے تھے اور جب میں 79ء میں انڈیا گیا تو میں نے پوچھا کہ یہ بیٹے کیا کر رہے ہیں تو کہنے لگا "بس باپ کا مال کھا رہے ہیں اور انہوں نے کیا کرنا ہے۔ پھر آرٹسٹ بنے بیٹھے ہیں۔ گلا ہے نہیں اور شور مچاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ساز بجانا جانتے نہیں لیکن اندر ہزاروں روپے قیمت کے ساز پڑے ہیں" غرض وہ بیٹوں سے بہت نالاں تھا لیکن چونکہ آمدنی بہت ٹھیک تھی اس لئے چپ ہو رہا۔

میرے ایک اور دوست امریک سنگھ آنند کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور امرتسر سے "پگڈنڈی" نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے۔ پارٹیشن سے پہلے تو ان کا لاہور آنا جانا تھا لیکن پارٹیشن کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ رسالہ بند کر کے بمبئی چلے گئے ہیں چنانچہ جب میں پارٹیشن کے بعد پہلی بار انڈیا گیا تو میں تہیہ کر کے گیا تھا کہ اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ چنانچہ جب وہاں گیا تو

راجندر نے کہا" امریک نے بتایا ہے کہ وہ پٹھان آیا ہے۔میں نے راجندر سے کہا کہ وہ سکھ کہاں ہے۔کہنے لگا کہ یہ اس کا فون نمبر ہے خود فون کر لو۔میں نے فون کیا تو وہی بول رہا تھا۔میں اسے کہتا تھا کہ تم واقعی سکھ ہو کیونکہ وہ جو کوئی بھی کام کرتا تھا غیر معمولی انداز میں کرتا تھا"

مجھے کہنے لگا" آپ بھابی سمیت میرے گھر میں رہیں گے"

میں کہا" آج تو میں ادھر ہی رہوں گا کل پھر تمہاری طرف رہ لوں گا"

کہنے لگا"نہیں ایک دن نہیں بلکہ دس دن"

میں نے کہا" دس دن کیا کرو گے "

کہنے لگا" آپ کو دس دن ہی رہنا پڑے گا" چنانچہ اس نے مجھے دس دن اپنے گھر رکھا۔یہ بات باور کرانے کیلئے کہ اس گھر میں کوئی چیز تمہارے مذہب کے خلاف نہیں ہونی اس نے صبح اٹھتے ہی مجھے کہا" چلو یار تھوڑی دور پیدل چلتے ہیں اور پھر مارکیٹ سے کچھ سودا لے کر گھر میں دے دیتے ہیں" چنانچہ وہ مجھے ساتھ لے گیا۔مارکیٹ میں ایک مسلمان قصاب کی دوکان تھی۔اسے مخاطب کر کے کہنے لگا" دیکھو بھئی محمد رمضان یہ میرے مہمان لاہور سے آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں ساتھ اس لیے لے کر آیا ہوں کہ گوشت تم سے لے کر جانا ہے۔ ویسے بھی گوشت تو میں تم سے ہی لے کر جاتا ہوں لیکن اب ان کے لئے ذرا اچھا گوشت دینا" دراصل وہ مجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں مسلمان قصاب سے گوشت لا رہا ہوں اور تمہیں جھٹکے کا گوشت نہیں کھلاؤں گا۔میں نے کہا" تم واقعی سکھ ہو"اور جگہ جگہ یہ واقعہ سنایا۔

صابر دت

بمبئی میں صابر دت میرا منتظر تھا جسے میں نے پہلے پہل 1956ء میں مشرقی پنجاب کے ایک شہر سنگلور کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ اس وقت یہ ایک بچہ سا تھا اور اپنے آپ کو کشمیری لال ذاکر کا کزن بیان کرتا تھا۔ یہ چونکہ بہت جونیئر تھا اس لئے اس کے نام کو حوالہ بنا کر آگے بڑھنے کیلئے اپنا تعارف کرواتا تھا۔ بمبئی جانے سے پہلے میں نے امرتسر ٹیلیویژن سے نشر ہونے والے ایک مشاعرہ میں اس لڑکے کو پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس مشاعرے کے بعد ہی مجھے اس کا ایک خط بھی یہاں ملا تھا۔ جس سے پتا چلا کہ وہ بمبئی میں ایک پرچہ فن اور شخصیت نکال رہا ہے۔ اس نے خط میں بھی یہی لکھا کہ اس پرچے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں۔

جب میں بمبئی گیا تو میں جتنا عرصہ وہاں رہا وہ اس طرح میرے ساتھ رہا جیسے بدن کے ساتھ سایہ ہوتا ہے۔ وہ روزانہ صبح میرے پاس پہنچ جاتا اور پھر رات تک ہر پروگرام میں میرے ساتھ رہتا۔ البتہ اس دوران ایک شخصیت اور میرے ساتھ شامل ہوئی جو صرف شام کیلئے تھی۔ اس کا نام دیویانی چوبل تھا اور یہ رسالہ سٹار اینڈ سٹائل میں دیوی کے نام سے کالم لکھتی ہے۔ یہ مرہٹن عورت ہے اور بڑے دبنگ اور کھلے انداز میں کالم لکھتی ہے جیسے کہ اب بمبئی میں رواج ہے۔

دیوی سے قربت یوں ہوئی کہ وہ سپورٹس کلب میں حاجی علی کے مزار کے سامنے رہتی تھی اور اس سے یہ طے تھا کہ ہم شام کو وہاں سے اسے ساتھ لے کر رات کو میرے اعزاز میں ہونے والی پارٹی میں اکٹھے جائیں گے۔ میرے اعزاز میں ہر روز بلا ناغہ کوئی نہ کوئی پارٹی ہوتی تھی۔

جب میں بمبئی گیا تو صابر دت نے فن اور شخصیت ایڈیشن کی تیاری شروع کر دی اور میرے وہاں ہونے سے یہ فائدہ ہوا کہ پرچہ جلد ہی تیار ہو گیا۔ یہ چھ صفحات کا پرچہ تھا اور تین مہینے میں اس کی

چھپائی بھی ہو گئی۔ میں ہوم سک ہو کر جلد واپس آنا چاہتا تھا لیکن سنیل دت صاحب نے کہا'' آپ اس پرچے کا افتتاح اپنے ہاتھ سے کر کے جائیں۔ سنیل دت صاحب یہیں جہلم کے رہنے والے ہیں اور بڑے صاحب علم و فضل آدمی ہیں'' پرچے کا افتتاح ہوا اور میں واپس چلا آیا۔ یہ 1982ء کا واقعہ ہے۔

اس سے پہلے 1979ء میں جب اٹھارہ سال کے وقفے کے بعد انڈیا گیا تو دوستوں کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ میرے دو ماہ وہاں قیام کے دوران میرے اعزاز میں اتنی کثرت سے پارٹیاں ہوئیں کہ بعض اوقات ایک دن میں دو دو پارٹیاں بھی ہوئیں۔ یہاں ایک پارٹی کا ذکر خاص طور پر کروں گا جسے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔ یہ پارٹی میرے لئے تو باعث فخر تھی ہی لیکن پارٹی دینے والے کیلئے بھی یہ باعث فخر تھی۔

یہ پروڈیوسر موہن کمار کی دعوت تھی جو میرے بڑے دیرینہ دوست پروڈیوسر اور ڈائریکٹر جے اوم پرکاش کے برادر نسبتی ہیں۔ انہوں نے یہ پارٹی بمبئی کے ایک بڑے ہوٹل سنتور میں دی اور کوشش یہ کی کہ فلم انڈسٹری کا ہر وہ آدمی جو بمبئی میں موجود ہے اس پارٹی میں آنے سے رہ نہ جائے۔ چنانچہ فلم پروڈکشن کے لوگوں کا ایک دریا امڈ آیا تھا اور صرف وہی آدمی نہیں آئے تھے جو بمبئی میں موجود تھے۔ اس دعوت میں کم و بیش ساڑھے تین یا چار سو آدمی موجود تھے۔ اس دعوت کے ٹھاٹھ یہ تھے کہ سب سے پہلے تو بمبئی کی ریت کے مطابق پینے کا اہتمام کیا گیا تھا کیونکہ وہاں کوئی پارٹی اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں پینے کا انتظام نہ ہو۔ اس کے بعد گانے کا

انتظام تھا جس میں کچھ لوگوں نے میری غزلیں اور گیت گائے۔ان میں نابینا گلوکار رویندر خصوصاً قابل ذکر ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر غزل سنائی کہ جب میں فلم انڈسٹری میں داخل ہوا تھا اور سنگر بننا چاہتا تھا تو میں نے قتیل صاحب کو یہ غزل ٹرائل کے طور پر سنائی تھی۔انہوں نے غزل سنا کر سماں باندھ دیا۔وہ جتنے اچھے کمپوزر ہیں اتنی اچھی آواز بھی ہے۔اللہ کی دین ہے کہ بعض آنکھوں والے اندھے ہوتے ہیں اور بعض اندھوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔رویندر کی محبت کو میں اب تک یاد کر رہا ہوں اور ان کی تصویریں بھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی ہے اور اسے بھی موسیقی سے شغف ہے تو انہوں نے خاص طور پر خواہش ظاہر کر کے اس کے ساتھ تصویر بنوائی۔

میوزک پروگرام کے بعد مشاعرہ ہوا تو اس میں تمام نامور شاعروں کو اور فلم اور ادب سے تعلق رکھنے والے میرے دوستوں کو مدعو کیا گیا تھا۔سب نے اپنا اپنا کلام سنایا حتیٰ کہ نوشاد صاحب، کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری بھی اس میں بطور شاعر شریک ہوئے تھے۔حسن کمال نے بڑی خوبصورتی سے اس میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔اس درمیان میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی دور دروازے سے بھاگتا ہوا چلا آرہا ہے۔وہ قریب آیا تو دیکھا کہ یہ فلمسٹار پران تھے۔وہ آتے ہی سامنے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا" پروگرام چلتا رہے گا مگر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں راجستھان میں شوٹنگ کر رہا تھا۔وہاں مجھے معلوم ہوا کہ قتیل صاحب کے اعزاز میں تقریب ہے اور اس کے لئے مجھے بھی دعوت ہے۔اگر دعوت نہ بھی ہوتی تو پھر بھی میں

یہی کرتا۔ میں وہاں سے بذریعہ سڑک چلا اور گھر جانے کی بجائے سیدھا یہاں آ گیا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں اور میرے لئے ایک پیگ لاؤ۔ پیگ لگا کر انہوں نے کہا کہ اب میں ایک گیت سناؤں گا" چنانچہ انہوں نے وہی گیت "کہ گھنگرو ٹوٹ گئے" نرت کے ساتھ تحت اللفظ سنایا۔ مجھے اس گیت کا وہاں جو مزا آیا وہ کسی گانے والی کی میں نہیں آیا۔ پھر جب وہ بیٹھے بیٹھے پورے موڈ میں آ گئے تو جب بھی کوئی موقع آتا تھا تو سو کا نوٹ میرے سر سے وار کے بیروں کی طرف پھینک دیتے تھے۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہاں ایک یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ مجلس کے شروع ہونے سے پہلے مجھے ایسی جگہ بٹھایا گیا تھا جہاں سے سب کو گزر کر آنا تھا۔ جو آتا تھا باری باری مجھ سے ہاتھ ملا کر گزرتا تھا اور اس کی ایک تصویر لی جاتی تھی۔ اس طرح ایک اتنا البم بن گیا جس سے سینکڑوں تصویریں ہیں اور یہ زندگی کی بہترین یادگاریں ہیں جو اب بھی میرے پاس پڑی ہوئی ہیں۔

اس تقریب میں راج کپور صاحب کا ایک پیغام موصول ہوا کہ مجھے ضرور آنا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس دعوت میں موجود نہیں ہیں اور میری نظر میں وہ بمبئی کے بڑے لوگوں میں سے ایک تھے اور میں چاہتا تھا کہ وہ بھی آئیں۔ لیکن پیغام آنے کے بعد صورتحال واضح ہو گئی۔ وہ دراصل دمہ کے مریض تھے۔ ان کے علاوہ امیتابھ بچن بمبئی میں موجود نہیں تھے۔

دیو آنند آئے تو دور سے انہوں نے آواز دی کہ قتیل صاحب ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی غزل مار لی۔ میری ایک غزل تھی۔

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں

ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

یہ غزل ان کے شاعر نے ذرا سی تبدیلی کر کے اپنی فلم میں رکھی ہوئی تھی۔ میں اس بات کو محسوس کیے ہوئے تھا۔ دیو آنند نے جب یہ کہا تو مجھے ان پر بڑا پیار آیا۔ وہ آکر مجھ سے گلے ملے تو میں نے کہا" دیو جی آپ جو کچھ مجھ سے کہہ چکے ہیں اس کے بعد تو میرا جو کچھ بھی ہے وہ مارنا تو کیا آپ حق کے طور پر لے سکتے ہیں"

ان سے میرے اچھے تعلقات بن گئے۔ اور پھر جب میں دوبارہ انڈیا گیا تو ان سے پروگرام یہ بنا تھا کہ اگر پاکستان اور انڈیا کے درمیان کبھی کوئی پروڈکشن ہوئی تو ہم مل کر فلم بنائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب آپ دوبارہ یہاں آئیں اور میری کوئی فلم شروع ہونے والی ہو تو اس کے پورے گانے لکھ دیں۔ یوں ان سے تعلقات بن گئے۔

بمبئی میں دیو آنند کے بھائی چیتن آنند کا میں اس وقت سے معترف تھا جب انہوں نے" نیچا نگر" بنائی تھی۔ وہ زمانہ سٹیج کے انداز کی بڑی تصنع والی فلمیں بنانے کا تھا۔ انہوں نے حقیقت کے بڑا قریب رہ کر نچلے طبقے کے متعلق یہ آرٹ فلم بنائی تھی۔ مرحوم رفیع پیرزادہ نے اس میں ولن کا بہت خوبصورت کردار ادا کیا تھا۔ یہاں حمید اختر صاحب ہیں۔ یہ بھی اس میں داڑھی لگا کر ایک کریکٹر کر چکے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ انہیں تھوڑی سی دمے کی شکایت تھی اور وہ بابا بہادر شاہ کے مریض تھے۔ بابا بہادر شاہ کے ہاں کہیں میرا ذکر چل نکلا تو انہوں نے کہا کہ میں تو قتیل صاحب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے خط لکھا تو میں نے جواب دیا کہ ان سے کہیے کہ میں ان سے پہلے سے انہیں

پسند کرتا ہوں۔اور ""نیچا نگر"" سے ان کا فین ہوں۔ پھر ان کے ساتھ خط و کتابت ہوتی رہی۔ خط و کتابت سے قربت ہو گئی۔جب میں بمبئی گیا تو ان کی فلم ""قدرت"" بن رہی تھی۔انہوں نے مجھے دعوت میں چائے پر بلایا اور کہنے لگے "" میرا ارادہ تو تھا کہ اپنی اگلی فلم انار کلی میں آپ کو زحمت دیتا۔لیکن اب اس فلم میں ایک الجھن پڑی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ایک تھیم سانگ ہے۔ وہ کئی شاعر لکھ چکے ہیں لیکن میری مرضی کا نہیں آیا۔ شاعر بات سمجھ نہیں پا رہے۔اگر آپ محسوس نہ کریں تو اس کا ایک یہ والا گانا سر دست مجھے لکھ دیں۔وہ انار کلی والا سلسلہ تو ہے کہ اس کے گانے آپ ہی لکھیں گے""

میں نے پوچھا کہ ""قدرت"" کے گانے کون لکھ رہا ہے تو کہنے لگے "" مجروح سلطانپوری لکھ رہے ہیں""

میں نے کہا"" اصولاً تو یہ ہے کہ آپ ان سے مجھے کہلوا دیں""

کہنے لگے "" انہیں پیسے دے دیئے گئے ہیں۔وہ لکھ نہیں پائے تو ان کے بعد ہم نے فاضلی صاحب سے کہا۔ندا فاضلی بھی بات تک نہیں پہنچ پائے۔ان کے بعد کسی اور کو بھی کہا تھا اور اب آپ چوتھے آدمی ہیں۔اس لئے اجازت لینے کا مرحلہ تو گزر چکا ہے"" ان کی بات ٹھیک تھی۔میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ شاعر سیچوئیشن کی تہہ تک پہنچ جائے پھر تو وہ لکھ لیتا ہے ورنہ مشکل ہوتی ہے۔

میں نے انہیں گیت لکھ کر دیا۔اور یہ ٹیون بننے کے لئے موسیقار آر ڈی برمن کے پاس چلا گیا۔اس کے بعد ایک طوفان مچ گیا اور پتا چلا کہ مجروح سلطانپوری صاحب کو اعتراض ہے کہ قتیل صاحب

تھیم سانگ کیوں لکھ رہے ہیں۔ ہمارا کریڈٹ خراب کر دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ اچھا خاصا دوست تھا اور اب اسے شکایت پیدا ہوئی ہے۔

آنند صاحب نے میرے سامنے فون کیا اور کہا کہ کیا معاملہ ہے۔ تو مجروح سلطانپوری صاحب نے کہا" قتیل صاحب کو ہم سے پوچھنا چاہیے تھا"

انہوں نے کہا" بات تو آگے نکل چکی ہے اور آپ نے سارا معاوضہ لے لیا ہے"

کہنے لگے "پھر بھی انہیں پوچھنا چاہیے تھا اور ہم یہ دوستی میں کہہ رہے ہیں" میں نے اشارہ کیا اور انہوں نے کہا" اچھا بھئی وہ آپ سے اجازت لے لیں گے۔ جب آئیں گے تو میں انہیں کہہ دوں گا"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں فون کر کے کہا" مجروح صاحب میں نے تو ان سے بہت سی باتیں پوچھ لی تھیں لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو شکایت ہے تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو وہ گانا دے دوں"

کہنے لگے" اچھا ہم سوچ کر کل بتائیں گے"

دوسرے دن میں نے پوچھا تو کہنے لگے" آپ اس شرط پر گانا لکھیں گے کہ وہ مجھے مزید ایک گانے کے پیسے دے دیں"

میں نے کہا" یہ تو آپ کا اور ان کا معاملہ ہے" اب دوسری طرف یہ بات ہے کہ انہی مجروح سلطانپوری صاحب نے میرا گیت "گھنگرو ٹوٹ گئے" یہی مکھڑا رکھ کے اور آگے تھوڑی سی تبدیلی کر کے استعمال کیا تھا اور فلم "دھرم کانٹا" کیلئے یہ کام کر چکے تھے۔ انہوں نے میری اجازت کے بغیر

ایسا کیا تھا۔اور جب یہ گانا فلم میں آچکا تھاتواس کے بعد حمید اختر کہیں بمبئی گئےاور انہوں نے کہا" یہ تو قتیل صاحب کا گیت ہے""تو کہنے لگے "ان سے کہنا کہ ہمارے پروڈیوسر نے تمہارے گھنگرو ہمارے سر میں مار دیئےاوراب تم اس کا سکینڈل نہ بنالینا" پھر بھی میں نے انہیں خط میں لکھا تھا کہ آپ نے کر لیاہے تواب کوئی بات نہیں۔

میرے گیت سے توانہوں نے پہلے پیسے کمائے اوراب جب میں اپنا گیت لکھ رہا تھاتوانہیں اعتراض ہو رہاتھا۔ بہر حال چیتن آنند نے کہا" ان کی بات بڑی بیہودہ ہے۔ ہم انہیں پہلے سب گانوں کے پیسے دے چکے ہیں اوراب گیت آپ لکھیں اور ہم انہیں گیت کے اور پیسے دیں' یہ غلط ہے۔ ہم کوئی پیسہ انہیں نہیں دیتے۔آپ گیت ریکارڈ ہونے دیجئے۔ "

یہ ناگوار سی صورت بنی تواخبارات میں یہ بھی سلسلہ چل نکلااور پھر اُردو اور پنجابی کا مسئلہ بھی چل نکلااورانہوں نے الزام لگایا کہ پنجاب والے پنجاب والوں کی رعایت کرتے ہیں۔ان کا اشارہ چیتن آننداور میری طرف تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے ہم میں کافی دیر ناچاقی رہی۔اس ناچاقی کی وجہ سے رنجشیں بڑھتی گئیں اور یہ سلسلہ بہت دیر تک رہا۔جب میں دوبارہ گیاتو صلح ہوئی اورانہوں نے مجھے گھر پر بلا کر چائے وغیرہ پلائی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا غصہ دور ہو گیاہے تو کہنے لگے کہ زندگی کے دن کتنے ہیں۔اس لئے ان معاملوں کو چھوڑو۔

شانتارام سے ملاقات

بمبئی میں میری جو یادگار ملاقاتیں ہوئی ہیں ان میں سے ایک ہدایتکاروی شانتارام سے ملاقات

تھی۔ میرا بچپن سے فلمیں دیکھنے کا رجحان کچھ ایسا تھا کہ Artistic فلمیں مجھے زیادہ پسند آتی تھیں۔ چنانچہ شروع میں مجھے غیر شعوری طور پر شانتارام کی فلمیں اچھی لگتی تھیں۔ان میں ایک عجیب ماحول اور ایک عجیب بانکپن ہوتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس ڈائریکٹر کی کوئی ایسی فلم نہیں ہو گی جو میں نے دیکھی نہیں ہو گی۔اس کی جو فلم میں یہاں پاکستان میں نہیں دیکھا سکا وہ میں نے بمبئی جا کر دیکھی۔

ایک مرحلہ ایسا آیا کہ دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں وی شانتارام سے مل کر اپنے جذبات کا اظہار کروں کہ میں انہیں کیا سمجھتا ہوں۔ جب میں 1961ء میں انڈیا گیا اس وقت تو اتنی خواہش نہیں تھی لیکن جب 1979ء میں دوبارہ انڈیا گیا اور اس دوران شانتارام کی اور بھی فلمیں دیکھ چکا تھا تو ان سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ ایک بار تو وہ بیمار تھے جبکہ دوسری بار وہ پونا گئے ہوئے تھے۔

بالآخر 1979ء میں ایک ایم آئی گراموفون کمپنی کے وہاں کے منیجر مسٹر ڈوبے سے میں نے کہا کہ شانتارام جی سے میری ملاقات کا بندوبست کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر شانتارام جی کو میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ قتیل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بخوشی دو دن کے وقفے سے ملاقات کا وقت دے دیا۔ ہم ان کے سٹوڈیو میں گئے۔ان کا کمرہ بہت سادہ تھا مگر آرٹسٹک تھا اور اس میں ایک عجیب قسم کا حُسن تھا۔اس میں تصاویر یا کوئی اور آرائشی چیزیں نہیں تھیں۔

ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے پاؤں چھوئے۔ کہنے لگے " بیٹھئے آپ یہ کیا تکلیف کر رہے ہیں"

میں بیٹھ گیا تو انہوں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا" قتیل صاحب میں معافی چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔اس لئے اپنے بارے میں ذرا بتادیں تاکہ میرا اور آپ کا تعارف ہو جائے"

میں نے کہا" جی آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔آپ کو مجھے جاننا بھی نہیں چاہیے اس لئے کہ ہمارے ملک الگ ہیں اور میرا کوئی کام یہاں تجارتی پیمانے پر آیا نہیں جس سے آپ مجھے جانیں۔البتہ میں آپ کو جانتا ہوں اور جو میرے آنے کا مقصد ہے وہ مجھی سے متعلق ہے" پھر میں نے انہیں ان کی فلموں اور اپنے جذبات کے بارے میں بتایا اور کہا" میری یہ تمنا تھی کہ میں آپ کے پاؤں چھوؤں جو کہ میں نے چھو لئے ہیں۔اور شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہم میں یعنی مسلمانوں میں کسی کے بھی پاؤں نہیں چھوئے جاتے بلکہ یہ بات بعض اوقات مذہب کی حدوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں مذہب سے اسے الگ رکھتے ہوئے یہ سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن میں آپ سے اپنی عقیدت کے اظہار کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں آیا۔"

میرے الفاظ سن کر ان کی حالت کچھ ایسی تھی جیسے کوئی اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوتا ہے اور پھولتا بھی نہیں ہے۔ میں نے پھر انہیں ان کی کچھ بہت پرانی فلموں کے بارے میں بتایا۔جب میں نے ایک فلم "مایا مچھندر" کے بارے میں بتایا تو حیران ہو کر کہنے لگے " آپ نے وہ فلم بھی دیکھی ہے" میں نے کہا" ہاں جی دیکھی ہے اور میں نے اس کا ایک گانا بھی اپنی زبانی سنایا جو یہ تھا کہ :

گورکھ جاگ مچھندر آیا۔

پھر میں نے ان کی فلموں "امر جیوتی" "آدمی" کے بارے میں بتایا اور کہا کہ آپ نے فلم

"پرچھائیں" میں کمال کا کام کیا ہے۔اور پھر چندر موہن کے بعد آپ نے "شکنتلا" کے دوسرے رنگین وروشن میں جو کام کیا ہے وہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ چندر موہن کے بعد اتنا اچھا کام کریں گے۔اس طرح میں نے ان کی فلموں پر بھرپور تنقید کی تو کہنے لگے " بالکل ٹھیک ہے اور آپ تو میرے بارے میں پوری طرح جانتے ہیں اور شاید کوئی انڈیا کا آدمی بھی اتنا زیادہ نہ جانتا ہو۔" مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے " آپ کی کوئی چیزیں کبھی ادھر انڈیا میں نہیں آئیں"

میں نے کہا" آئی ہیں۔میرا ایک گانا ادھر آیا تھا:

الفت کی نئی منزل کو چلا

کہنے لگے وہ آپ کا ہے۔وہ بہت حیرت زدہ تھے اور کہنے لگے کہ میں نے تو یہ گانا بلیک میں خریدا تھا۔ میں نے کہا"میں جانتا ہوں کہ یہ گانا پاکستان سے سمگل ہو کر ادھر آتا تھا اور یہاں بلیک میں بکتا تھا" کہنے لگے "یہ گانا تو میں نے بہت زیادہ پسند کیا تھا اور یہ تو اب بھی میری لائبریری میں ہے " کہنے لگے " آپ کا کوئی اور گانا جو ادھر آیا ہو" میں نے کہا" جی اور بھی کئی ہیں لیکن آجکل ایک گیت چل رہا ہے " گھنگرو ٹوٹ گئے" پھر چونک کر کہنے لگے " اچھا وہ بھی آپ کا ہے۔وہ تو میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے"

"جگجیت اور چترا دونوں نے مل کر ان کی غزلوں کا ایک ایل پی بنایا ہے جو میں نے آپ کو پیش بھی کیا ہے" کہنے لگے "وہ تو میں نے سنا ہے۔وہ ان کا کلام ہے "

"جی ہاں وہ رچنائیں ان کی ہی ہیں"

مسکرا کر کہنے لگے " پھر تو میں آپ کو جاننے لگا ہوں۔اچھا اپنی کوئی چیز سنایئے" چنانچہ میں نے

اپنی کچھ غزلیں اور ایک دو گیت انہیں سنائے اور میں نے دیکھا کہ وہ بالکل ٹھیک موقع پر داد دے رہے تھے۔

میں نے جب کلام ختم کیا تو کہنے لگے " یہ سب اُردو ہے"

میں نے کہا" جی بالکل اُردو ہے"

کہنے لگے " پاکستان میں یہی اُردو چلتی ہے" میں نے کہا" ہاں"تو کہنے لگے " اچھا تو پھر کیا بات ہے کہ یہاں پر اُردو کے جو میرے پاس شاعر آتے ہیں وہ مجھے جو کچھ سناتے ہیں مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی"

میں نے کہا" جی وہ اُردو نہیں بلکہ سنسکرت ہوتی ہوگی" میں نے مذاق کیا تھا مگر وہ جواباً کہنے لگے " سنسکرت تو مجھے آتی ہے۔البتہ عربی میں ہوتا ہوگا۔اصل میں وہ لوگ اپنی اردو کا رعب ڈالنے کیلئے ایسے ایسے مکلف اور باترکیت شعر سناتے ہیں۔جنہیں عام آدمی سمجھ ہی نہیں پاتا" وہ مجھے کہنے لگے " میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں آپ کی کچھ غزلیں اور گیت رکھوں گا لیکن اس وقت میری کوئی فلم سیٹ پر بن نہیں رہی۔تو کیا آپ مناسب سمجھیں گے کہ آپ اپنی کچھ چیزیں مجھے بھیج دیں اور مجھے اجازت دیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز کسی سیچوئیشن پر پوری آتی ہو تو میں وہ لے لوں اور میں اس کی قیمت دوں گا"

میں نے کہا" جی آپ نے میرے لئے فخر کا مقام پیدا کر دیا ہے کہ شانتارام نے بھی مجھ سے میرا کلام مانگا تھا۔میرے لئے یہی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔پھر یہ طریقہ ٹھیک بھی نہیں ہوتا کیونکہ مجھے پتا ہی نہیں کہ آپ کی فلم کی کہانی کیا ہے اور میں یونہی ہوا میں ایک تیر چھوڑ دوں۔اگر

لگ گیا تو لگ گیا اگر نہ لگا تو نہ سہی" چنانچہ میں نے کہا" اگر زندگی رہی اور پھر آنا ہوا اور آپ کوئی فلم بنا رہے ہوئے تو میں سیچوائیشن سن کر کوئی گیت لکھوں گا اور مزا بھی آئے گا" وہ اس وقت بیاسی سال کے تھے مگر بالکل چاق و چوبند اور ذہنی طور پر روشن تھے۔

دوبے اس بات چیت سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ "انا، آپ دونوں کے درمیان اتنی خوبصورت گفتگو ہو رہی ہے مگر مجھے ایک افسوس ہو رہا ہے کہ اس موقع پر کیمرہ نہیں ہے" انہوں نے کہا" پتا کیجئے شاید ہمارا فوٹو گرافر ہو"

پتا چلا کہ وہ چار دن کی چھٹی پر ہے۔ انا مرہٹوں میں احترام کے ساتھ بزرگوں اور بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ خیر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس یادگار ملاقات کی تصویر نہ ہو سکی۔ لیکن بہر حال یہ ملاقات میری ان یادگار ملاقاتوں میں سے ایک ہے جن کی مجھے تمنا تھی جو پوری بھی ہوئی۔

منوج کمار صاحب کی فلم کے ایک اپنے لکھے ہوئے گانے کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں جب میں بمبئی گیا تو شروع میں تو کچھ دن میں ان کے گھر میں رہا' اس کے بعد کسی اور جگہ منتقل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ دراصل منوج صاحب زیادہ سوشل آدمی نہیں ہیں۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتے تھے اور نچلی منزل میں ان کے والد رہتے تھے جو خضر تخلص کرتے تھے۔ ان سے میری بیٹھک ہو جاتی تھی۔ خضر صاحب کے دوستوں میں قمر جلال آبادی بھی شامل تھے جو میرے پرانے دوست تھے میری وجہ سے انہوں نے کچھ اور بھی آنا بڑھا دیا جس سے گپ شپ کا موقع مل جاتا تھا۔ منوج صاحب کا وہ عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی فلم "کرانتی" جس میں دلیپ کمار صاحب نے بھی کام

کیا تھا۔ایک ایسی فلم تھی جو منوج صاحب کے گھر میں بوریوں میں نوٹ بھر کے لائی تھی۔یہ اس فلم کا زمانہ تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے والد گھنٹوں فرسٹ فلور پر رہتے تھے جبکہ ان کی والدہ سیکنڈ فلور پر رہتی تھیں۔

منوج صاحب خوشحال بھی تھے اور گھریلو معاملات بھی ٹھیک تھے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے والد سب کچھ ہونے کے باوجود ایک مطمئن آدمی نہیں ہیں۔حالانکہ وہ اپنے ڈسٹری بیوشن آفس کے مالک اور انچارج بھی تھے۔جب شعر سناتے تھے تو ان میں کوئی نکتہ ایسا آجاتا تھا جو ان کے اندر کی بے چینی کو ظاہر کرتا تھا۔

وہ پہلے پاکستان کے اپنے واقعات سناتے تھے کیونکہ وہ اصل میں ضلع شیخوپورہ کے گاؤں جنڈیالہ شیر خان کے رہنے والے تھے اور منوج کمار صاحب بعد میں ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ننھیال ہری پور کے تھے۔اگرچہ منوج کے والد مجھ سے کھل کر باتیں نہیں کرتے تھے پھر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بے چین اور بے سکون آدمی ہیں۔وہ تفصیل نہیں بتاتے تھے لیکن ایک دن تفصیل از خود سامنے آگئی۔

میں گیا تو وہ کچھ پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے اور کہنے لگے "آج منوج سے آپ کی ملاقات ہو گی"

میں نے کہا" جی اصل میں تو آپ سے بیٹھک ہو جاتی ہے۔مل گئے تو مل لیں گے ورنہ پھر ملاقات ہو جائے گی"

کہنے لگے " نہیں ضرور ملیں اور آپ ہی کا ایک شعر ہے وہ انہیں میری طرف سے سنا دیجئے کہ :

میں ریت کے دریا پر کھڑا سوچ رہا ہوں

اس شہر میں پانی تو یزیدوں نے پیا ہے

انہوں نے یہ شعر سنایا تو ساری داستان کھل کر میرے سامنے آگئی۔ اور ان کی بے اطمینانی اور بے سکونی کا سارا منظر میرے سامنے آگیا۔ میں نے کہا" جی آپ نے بڑا مشکل کام میرے سپرد کیا ہے۔ یہ ایک باپ اور بیٹے کے درمیان کی بات ہے۔ اس میں بُرا بنوں گا۔ مجھے نہیں پتا کہ منوج صاحب کتنی برداشت کے آدمی ہیں۔ اگرچہ حوالہ آپ کا ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی آبگینے کو ٹھیس لگ جائے"

کہنے لگے" نہیں آپ اسے میری طرف سے یہ شعر سنا دیں"

یہ ذمہ داری لینے کے بعد حسب معمول ان سے ملاقاتیں تو ہوتی رہیں لیکن میں بار بار حوصلہ کرتا تھا اور پھر ارادہ ترک کر دیتا تھا اور منوج صاحب سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ جب میں نے انہیں یہ شعر سنایا تو منوج صاحب ایک بے حس و حرکت مجسمہ بن کر رہ گئے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک جمے ہوئے انسان کی مانند نظر آرہے تھے۔ میں محسوس کر گیا کہ یہ شعر ان کی طبیعت پر بہت ناگوار گزرا ہے لیکن چونکہ انہیں میرا ابھی احترام ہے اور پھر باپ کا حوالہ بھی آتا ہے اس لئے وہ کچھ کہنے سے گریزاں ہیں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اپنا بہت رد عمل ظاہر کرتے۔

یہ واقعہ شاید قمر جلال آبادی کے سامنے ہوا یا شاید ان کے علم میں تھا۔ چونکہ قمر جلال آبادی بھی لاہور سے خضر صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور پھر دونوں کا مشغلہ بھی شعر و شاعری

تھا۔

خیر جب میں لاہور چلا آیا تو میں منوج کمار صاحب کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتا تھا۔ ایک تو خط و کتابت سے اور دوسرے خبروں سے میں ان کے بارے میں جانتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ منوج صاحب کے والد ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی سے باہر کسی ندی یا جھیل کے کنارے گئے اور ڈرائیور کو گاڑی ہی میں بٹھا کر خود پوجا پاٹ کے لئے اور یا کسی اور فریضے کے لئے پانی کے قریب گئے تو پاؤں پھسلنے سے گہرے پانی میں جا گرے اور ڈوب گئے۔ ڈرائیور نے کچھ دیر انتظار کیا اور بعد میں جا کے دیکھا تو وہ ڈوب چکے تھے اور فوت ہو چکے تھے۔

عام لوگوں کے لئے تو یہ محض ایک خبر تھی مگر میں یہ خبر پڑھ کر کانپ اٹھا اور میرے ذہن میں اس کا سارا پس منظر گھوم گیا اور میری سمجھ میں آگیا کہ خضر صاحب نے اپنے بیٹے منوج کمار کو جب شعر سنانے کیلئے مجھے کہا تھا تو اس کا مطلب کیا تھا۔

قمر جلال آبادی

قمر جلال آبادی کا نام غیر معروف تو نہیں ہے لیکن اب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا تعلق فلم سے ہے۔ وہ پچھلے چالیس پینتالیس سال کے عرصے سے فلم سے منسلک ہیں اور ابتدائی دور میں انہوں نے اپنی تخلیقات فلم میں پیش کر کے بہت معرکے کئے۔ انہوں نے فلمی گانوں کے علاوہ ڈائیلاگ بھی لکھے۔ اور پھر ایک فلم بھی پروڈیوس کی۔ لیکن بطور نغمہ نگار ان کے گانے بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ وہ ابھی تک فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں لیکن اب وہ صورت نہیں ہے اب تو وہ بس ایک روایت سی نبھا رہے ہیں۔ کوئی پرانا چاہنے والا آجاتا ہے تو وہ کچھ لکھوا لیتا ہے۔

میں ان کی ایک اور حیثیت پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ تقریباً پینتالیس برس پہلے لاہور میں گیلانی پریس کے نام سے ایک بہت مشہور پریس تھا۔اس کے مالک بابو نظام الدین تھے جن کے بیٹے غوری برادری کہلاتے تھے۔انہی میں سے ایک غوری فلم ایکٹر بھی ہوئے۔ بمبئی میں چارلی اور غوری دو مزاحیہ اداکاروں کی جوڑی تھی۔ یہ مذاحیہ اداکار غوری اس بابو نظام الدین فیملی ہی سے تھے۔

ان کے پریس ہی میں ہفتہ وار ''سٹار'' کا دفتر تھا۔اس پرچے کے ایڈیٹر قمر جلال آبادی تھے۔اس زمانے میں ہر اس پرچے نے جو اشاعت بڑھانا چاہتا تھا یا تو معمہ بازی رکھی ہوئی تھی یا کوئی بزم انجمن بنائی ہوتی تھی تا کہ لوگ بزم کے ممبر بنیں اور پرچے کی اشاعت بڑھے۔ اس پرچے میں بھی پریم لیگ کے نام سے ایک ادبی و غیر سیاسی بزم بنائی گئی۔ اگرچہ اس کا مقصد بھی ایسے ہی باقی بزموں جیسا تھا لیکن قدرتی طور پر پریم لیگ کا حلقہ اتنا پھیلا کہ آج کے بیشتر سینئر لکھنے والوں میں سے اس پریم لیگ کے ممبر تھے۔

مبتدی ہونے کی شکل میں چھپنے کی جو ہوس ہوتی ہے وہ ہوس یہ پرچہ پوری کرتا تھا۔اس میں چھپنے والے اس کے ارکان لطیفے بھی لکھ کر بھیج دیتے تھے اور اچھے اچھے افسانے اور نظمیں بھی۔ غرض ممبر کا یہ حق ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بھیج کر چھپوا لے۔ ہوتے ہوتے پورے ہندوستان میں بالعموم اور صوبہ سرحد اور پنجاب میں بالعموم ہر شہر میں اس پریم لیگ کی برانچیں قائم ہو گئیں۔ان برانچوں کے باقاعدہ اجلاس ہوا کرتے تھے جن کی کارروائیاں باقاعدہ ''سٹار'' میں چھپا کرتی تھیں۔

مرحوم ساحر لدھیانوی اور انجم رومانی میرے ساتھ اس پرچے سے متعارف ہوئے تھے۔ بلکہ فارغ بخاری ، رضا ہمدانی بھی اس پرچے سے متعارف ہوئے اور ہماری ملاقاتیں بھی ایسی ہوئیں کہ ضلع

ہزارہ کی تاریخ کا پہلا مشاعرہ جو میں نے یوم اقبال کے موقع پر 1939ء میں ہری پور میں منعقد کیا تھا اسے ترتیب دینے والی بھی پریم لیگ ہی تھی۔ جس کے ارکان کا میں وہاں پر سربراہ تھا۔ چنانچہ قمر جلال آبادی، نفیس خلیلی اور اختر رضوانی کو ہم نے باہر سے مہمان شعراء کے طور پر بلوایا تھا۔
اس طرح میں نے پشاور میں زندگی کا جو پہلا مشاعرہ پڑھا وہ بھی پریم لیگ کے پشاور کے صدر حبیب ایشیائی صاحب نے منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے میں ہری پور سے میں گیا تھا اور لاہور سے قمر جلال آبادی اور اختر رضوانی کو بلوایا گیا تھا۔ چنانچہ پریم لیگ کی وجہ سے مجھے پشاور کے احباب سے قربتیں حاصل ہوئیں اور کم و بیش یہی صورتحال دوسرے شہروں کی بھی تھی۔ پریم لیگ کے ممبران کی آپس میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور "سٹار" میں ایک دوسرے کے نام ان کے پیغامات بھی چھپتے تھے۔
ہر چند کہ پرچے کے مالکان کا مقصد یہ نہیں تھا لیکن اس پرچے کی وجہ سے ممبران میں مسابقت کا سلسلہ چل نکلا اور ان کی ذہنی تربیت ہوتی رہی۔ پرچے کے مالکان کا مقصد تو صرف اس کی اشاعت بڑھانا اور فروخت میں اضافہ کرنا تھا۔ ان کا یہ مقصد بھی پورا ہوا اور قدرتی طور پر ایک حلقہ بھی بن گیا جس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔
قمر جلال آبادی "سٹار" سے ہٹ کر "پرتاپ" میں ایک قطعہ بھی لکھتے تھے یہ پرچہ ایک خاص نقطہ نظر رکھتا تھا لیکن جب میں نے قمر صاحب کو قریب سے دیکھا تو پنڈت ' VEGETARIAN اور اپنے مذہب کے بہت پابند تھے لیکن ہندو مسلم سکھ معاملات میں انتہائی روادار، مشفق اور صاف ستھرے ذہن کے آدمی تھے۔ وہ لوگوں کی خدمت کرنے والے

تھے اور بمبئی میں جا کر بھی انہوں نے وہاں کی رائٹرز ایسو سی ایشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے ادیبوں کی جو خدمت کی وہ شاید اتنے خلوص کے ساتھ کسی اور نے نہ کی ہو گی۔ یہ انہی کی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ جب پریم لیگ قائم ہوئی تو اس میں بھی لکھا تھا کہ اپنے اپنے سیاسی نظریات پر قائم رہتے ہوئے آپ اس لیگ کے ممبر بن سکتے ہیں۔ یہ محض ادبی لیگ ہے اور اس میں شعر و سخن اور علم و ادب کی ترویج کے فرائض انجام دیئے جاتے ہیں۔

قمر صاحب اب بھی سلامت ہیں اور خدا انہیں اور سلامت رکھے۔ وہ محض ایک فلمی شخصیت ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا ہمیشہ ادب سے بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کا اپنا ایک شعر ہے:

تجھ سے تیری یاد اچھی ہے جو مجھ سے شرماتی ہی نہیں
تو جا کے کبھی آتا ہی نہیں یہ آ کے کبھی جاتی ہی نہیں

انگریز کے خلاف جدوجہد کے زمانے میں ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہوئی۔ یہ پینتالیس برس پہلے کی رباعی ہے۔ اب شاید اس میں وہ کشش نہ ہو لیکن اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت اچھی رباعی ہے۔

بلبل جب اسیر دام ہو جاتا ہے
کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے
بن جاتے ہیں آسمان کے تارے آنسو
جب ملک کوئی غلام ہو جاتا ہے

کمال امروہوی

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

میرا یہ گیت انڈیا اور پاکستان دونوں میں ہی بہت مقبول ہوا۔ اور اس کی وجہ سے ہر باذوق شخص مجھے جاننے لگا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان کا کوئی ریکارڈ وہاں کی گراموفون کمپنی جاری نہیں کرتی تھی حالانکہ ہزماسٹر وائس کمپنی جو آجکل یہاں ای ایم آئی کے نام سے کام کر رہی ہے ایک بین الاقوامی کمپنی تھی اور اس کے دونوں ملکوں کی شاخوں کی ملکیت بھی ایک ہی تھی۔ لیکن یہاں کا کوئی ریکارڈ باضابطہ طور پر وہاں جاری نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ یہ ریکارڈ پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں سمگل ہو کر انڈیا گیا اور وہاں ستر روپے میں بکا جبکہ یہاں اس کی قیمت ڈھائی تین روپے تھے۔ جب یہ ریکارڈ سمگل ہو کر ہزاروں کی تعداد میں انڈیا پہنچ گیا تو کمپنی نے مجبور ہو کر اسے باضابطہ طور پر اپنی بمبئی برانچ سے بھی جاری کیا۔ میرے علم کے مطابق کسی پاکستانی گیت کا وہاں سے باضابطہ طور پر جاری ہونے والا پہلا ریکارڈ تھا۔

میری یہی غزل مینا کماری سے میرے تعارف کا باعث بنی۔ مینا کماری ایک باذوق خاتون تھیں۔ ادب

سے دلچسپی رکھتی تھیں اور خود بھی شعر کہنے کا ذوق رکھتی تھیں۔ غالباً اسی ذوق کی وجہ سے کمال امرو ہوی صاحب سے ان کی شادی بھی ہوئی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب وہ کمال صاحب کی بیوی کی حیثیت سے وقت گزار رہی تھیں۔ ہوا ایسا کہ کمال صاحب سے میرا تعارف پہلے سے تھا جب میں بمبئی گیا تو چونکہ یہ مجھ سے سینئر تھے اس لئے میں اپنا فرض سمجھ کر ان سے ملنے کیلئے گیا۔ یہ میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے۔ آہستہ آہستہ یہ شفقت بے تکلفی میں بدل گئی اور ہم دوستی کی اس نہج پر آ گئے جہاں انسان ایک دوسرے کو بے تکلفی سے مخاطب بھی کر سکتا ہے۔ ایک دو ملاقاتوں میں ہم بہت قریب آ چکے تھے۔

کمال صاحب ' ڈائیلاگ کے معاملے میں اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ آج بھی شاید لوگوں میں ان کی اس شہرت کو چھونے کی ہمت کم ہو۔ کیونکہ میں خود لفظیات اور لفظیات کی صوت کا طالب علم ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے یہ علم مجھے ودیعت کر رکھا ہے اس لئے میں نے دیکھا کہ ان کے مکالموں میں بھی وہی چیز موجود تھی۔ ان مکالموں میں غنائیت یا موسیقی تو نہیں تھی لیکن یہ ایسے متاثر کن جملے ہوتے تھے جو ختم ہونے کے بعد دل کے ساتھ چپک کر رہ جاتے تھے۔ میری کمال صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔

انہوں نے میری شاعری کے اس پہلو کو پہلے سے محسوس کر رکھا تھا اور جب انہوں نے اس بارے میں مجھ سے بات کی تو میں نے کہا "صاحب وہ تو شاعری ہے اور شاعری میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے لیکن آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ کے یہاں الفاظ کی یہ کیا Jugglery ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ قانون کا ایک غلط فیصلہ بھی آپ کے ڈائیلاگ کے زور سے صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ مثال

کے طور پر چندر موہن کی ایک فلم میں جب نسیم بانو ملکی بنتی ہے اور اس کے تیر سے کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے اور اس پر مقدمہ چلتا ہے تو سیدھی بات تو یہ ہے وہ قاتل ہے اور اسے سزا ملنی چاہیے لیکن شہنشاہ فیصلہ یہ دیتے ہیں کہ چونکہ اس نے تمہیں بیوہ بنایا ہے اس لئے تم بھی اسے بیوہ بنا دو۔ اب یہ فیصلہ بالکل غلط تھا لیکن آپ نے ڈائیلاگ کے زور سے وہ جادو کیا کہ کسی نے یہ سوچا ہی نہیں کہ بادشاہ نے کتنا غلط فیصلہ دیا ہے۔ بلکہ اس ڈائیلاگ پر ہال میں ہر شو میں تالیاں بجتی تھیں"

کمال صاحب میری بات سن کر بڑے ہنسے اور پھر مجھے ایک کاغذ دکھا کر کہنے لگے " یہ دیکھئے یہ ایک جملہ ہے اس کے آٹھ الفاظ ہیں۔ انہی آٹھ الفاظ کو میں یوں کہتا ہوں تو ان کا تاثر یہ بنتا ہے لیکن جب میں ایک لفظ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر وہ جملہ ادا کرتا ہوں تو اس کا اثر بالکل بدل جاتا ہے چنانچہ میں جب ڈائیلاگ لکھتا ہوں تو اکثر جملے تو خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں لیکن جہاں ذہن ذرا اٹکتا ہے تو میں اس طرح یہ جملے پڑھتا ہوں۔ اور الفاظ کی ترتیب بدل کر تنہا کمرے میں باقاعدہ ڈائیلاگ بول کے دیکھتا ہوں۔ تب جا کر کہیں یہ ڈائیلاگ کاغذ پر لکھتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرا ہر ڈائیلاگ وہی اثر رکھتا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے"

کمال صاحب سے میں نے الفاظ کی جگہ تبدیل کرنے کا یہ فن سیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی مجھ سے بڑا ہو یا چھوٹا ہو لیکن اگر مجھے اس میں کوئی روشنی نظر آئے تو میں ضرور یہ کوشش کرتا ہوں کہ اس روشنی سے اپنے آپ کو تھوڑا سا منور کرلوں۔ زندگی بھر میرا یہی دستور رہا ہے۔ میں نے سکھا نے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا لیکن سیکھنے کا دعویٰ ضرور کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کمال صاحب سے باقاعدہ سوال کر کے ان کی اس خوبی کے بارے میں پوچھا۔

کمال صاحب نے مجھ سے کہا" ہماری بیگم آپ کی شاعری کی دلدادہ ہیں اور محض ریکارڈوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس آپ کی تصنیف بھی موجود ہے" اس وقت تک میری ایک ہی کتاب "گجر" آئی ہوتی تھی۔انہوں نے مجھے کہا" میری بیگم چاہتی ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں" میں نے ہامی بھر لی۔

میرے ذہن میں مینا کماری کے نام کا بڑا رعب تھا۔میں سوچتا تھا کہ وہ اتنی بڑی آرٹسٹ اور اتنی بڑی ہیروئن ہیں کہ میں ان سے کس طرح ملوں گا۔ان کا معاملہ بالکل الٹ تھا۔چنانچہ جب ہم کھانے پر بیٹھے تو پہلے تو مینا کماری میری کتاب لائیں اور پھر بڑی مؤدب ہو کر کہنے لگیں" اس پر اپنا آٹو گراف دے دیں" پھر "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" کا ریکارڈ لائیں اور اس پر بھی آٹو گراف لیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں ہلکا سا لرزہ آجاتا تھا۔جب کھانے کے لئے بیٹھے تو ان کے ہاتھ سے دو بار چمچ گرا۔جب میں بات کرتا تھا تو ان پر کچھ ایسا اثر ہوتا تھا جیسے میں ان کی نظر میں بہت بڑا ہوں اور وہ مجھے Face نہیں کر پا رہیں۔اس کا تجزیہ یہی ہے کہ جس طرح میں ان کے فن سے بہت متاثر تھا اسی طرح وہ بھی فنکار اور شاعرہ اور میری شاعری کی دلدادہ ہونے کی وجہ سے جب میں پہلی بار ان کے سامنے گیا تو ان پر بھی وہی اثر ہوا جو مجھ پر ہوا تھا۔

ایک بات جو خاص ہوئی وہ یہ تھی کہ کھانے پانچ سات بنے ہوئے تھے۔میں نے ان میں سے ایک کھانے کی اس طرح داد دی جیسے کوئی سخن فہم آدمی غزل کے اس شعر کی داد دیتا ہے جسے شاعر بھی اپنا حاصل غزل شعر سمجھتا ہے۔اس کھانے پر میں نے داد دی تو دونوں میاں بیوی میری طرف دیکھنے لگے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچا اور کہا کہ ہمیں اس بات کا پتا ہی نہیں تھا کہ آپ

یہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔

میں کوئی تین ماہ تک بمبئی میں رہا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ یہ کرتے تھے کہ جب بھی ان کے ہاں انوکھی چیز پکتی تھی تو اکثر ان کا آدمی مجھے تلاش کر کے لے جاتا تھا اور وہ مجھے کھانے میں شامل کرتے تھے۔

بظاہر ان کی زندگی بڑی اچھی تھی لیکن ادھر اُدھر سے کانوں میں آواز بھی پڑ جاتی تھی کہ کوئی گڑ بڑ بھی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے آسودہ نہیں ہیں بالخصوص مینا کماری۔ اس زمانے میں "پاکیزہ " فلم کا ابتدائی حصہ فلمایا جا رہا تھا۔ میں سیٹ پر گیا تو دونوں میاں بیوی نے میرے ساتھ تصویر بھی بنوائی۔ مجھے بالکل ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ ان میں کوئی اختلاف ہے لیکن جب میں انڈیا سے واپس آ گیا تو بعد میں پتا چلا کہ دونوں میں اختلافات بڑھ گئے ہیں اور علیحدگی بھی ہو گئی ہے۔

مگر اس خاتون کی عظمت دیکھئے کہ جب علیحدگی ہوئی تو فلم ادھوری تھی اور اس پر لاکھوں روپے لگے ہوئے تھے۔ اگر وہ چاہتی اور آرٹسٹ نہ ہوتی تو کمال صاحب سے بدلہ لیتی اور فلم کا باقی کام نہ کرتی۔ لیکن بہت سے اختلاف رکھنے کے باوجود مینا کماری نے باقی فلم مکمل کروائی اور سنا ہے کہ آخری دنوں میں بیماری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھیں کہ فلم میں کام کر سکیں لیکن انہوں نے کمال صاحب کیلئے اس میں کام کیا۔

اس کے بعد کے دن ایسے آئے کہ انہوں نے اپنے دکھ درد کو مٹانے کیلئے شراب کا سہارا لیا اور گرتے گرتے اس حالت کو پہنچیں کہ بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم معاشرے کو فیشن کے طور پر بھی برا بھلا کہتے رہتے ہیں لیکن اس خاتون کے ساتھ معاشرے نے جو کیا وہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ

ایک ایسی خاتون تھی کہ جس شخص کے ساتھ بھی اس کا رابطہ ہوا وہ پھلا پھولا۔ آج کے کئی بڑے نام مینا کماری کے نام سے وابستہ ہیں کیونکہ مینا کماری نے ہ شخص کو فائدہ پہنچایا۔ مگر ان سب بڑے ناموں کے باوجود مینا کماری بہت چھوٹی ہو کر مری اور جن کو اس نے بڑا بنایا تھا انہوں نے اس کی کوئی خبر نہ لی۔ سنا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے جنازے میں جتنے لوگوں نے شرکت کی وہ بمبئی کی فلم انڈسٹری کے لئے کوئی قابل فخر بات نہیں۔ خدا اسے جنت دے اور اس کی روح کو سکون دے کیونکہ یہاں اس نے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔

ہم ہر مرنے والے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کی جگہ پر نہیں ہو گی لیکن وہ اتنی بڑی آرٹسٹ تھی کہ اس مرنے والی کے بعد واقعی آج تک اس کی جگہ پر نہیں ہوئی۔

گلزار دینوی

مینا کماری کے ذکر کے ساتھ جو اور نام ذہن میں ابھرتے ہیں ان میں گلزار کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ پنجاب اور پنجاب میں بھی ایک چھوٹی سی جگہ دینہ کے رہنے والے سردار ہیں۔ لیکن جب وہ بمبئی پہنچے تو بالوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ شروع شروع میں گلزار دینوی کے نام سے مختلف ادبی پرچوں میں لکھا کرتے تھے۔ وہ خصوصاً امرتسر سے نکلنے والے پرچے "پگڈنڈی" میں باقاعدگی سے لکھا کرتے تھے۔

نوجوان تھے اور شروع ہی میں انہیں یہ موقع ملا کہ وہ بمل رائے ٹیم کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ خدا نے انہیں بڑی صلاحیتیں دی ہوئی تھیں۔ شعر کہتے تھے، نثر لکھتے تھے، اور ڈائریکشن کا بھی شوق

تھا۔ وہ اسی سلسلے میں بمل رائے کے پاس ایک مدت تک کام کرتے رہے اور وہاں سے بہت کچھ سیکھا ۔ چنانچہ مینا کماری کے پسندیدہ لوگوں میں سے ایک وہ بھی تھے۔

ان کے بارے میں داستانیں تو بہت سی مشہور ہیں مگر میں ان داستانوں سے ہٹ کر گلزار کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور بمبئی کے بہت بڑے ہجوم میں انہوں نے اپنی پہچان پیدا کر رکھی تھی۔ دیکھنے میں وہ کوئی اتنا قابل فخر نوجوان بھی نہیں تھا کہ ہم کہیں کہ وہ رانجھے جیسا خوبصورت آدمی تھا اور ہیریں اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس کی زندگی میں جو نام آئے وہ ہیروں سے کم نہ تھے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مینا کماری اس کی زندگی میں کہاں تک آئی لیکن یہ درست ہے کہ یہ دونوں دوست تھے۔ اور مینا کماری انہیں اچھا جانتی تھی۔ اس کے بعد راکھی بنگال کی بہت خوبصورت عورت تھی اور چوٹی کی ہیروئن تھی۔ وہ باقاعدہ ان کی شادی میں آئیں۔ دونوں نے شادی کی اور اس سے ایک بچی بھی پیدا ہوئی۔ جس کا نام انہوں نے بوسکی رکھا اور اس مناسبت سے گلزار نے اپنے مکان کا نام بوسکیانہ رکھا پھر دونوں کی علیحدگی بھی ہوگئی لیکن نجانے راکھی اب تک راکھی گلزار کیوں لکھ رہی ہے۔ جبکہ علیحدگی کو بھی کوئی دس بارہ دس سال ہو چکے ہیں۔

جب میں بمبئی گیا تو اس سے پہلے سے میر ان کے ساتھ تھوڑا سا تعارف تھا وہ یوں کہ تبرکاً بالواسطہ تعارف ہو چکا تھا۔ یہ گلزار صاحب کی بڑائی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنی یہ ایک کتاب مجھے پیش کی تو اس پر لکھا تھا۔۔۔ قتیل شفائی صاحب کے نام جن کی انگلی پکڑ کر میں نے اس رستے پر چلنا

سیکھا۔۔۔ میں پتا نہیں اتنا بڑا ہوں یا نہیں لیکن یہ الفاظ لکھنے والا یقیناً بڑا ہے۔

چنانچہ جب میں وہاں گیا تو انہوں نے مجھے دعوت پر بلایا۔ اس وقت تک ان کی فلم ''میرا'' چل چکی تھی جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی تھی۔ مگر چونکہ گلزار کی فلم تھی اس لئے میرے ذہن میں تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ گلزار صاحب خود بھی یہ تجزیہ کر رہے تھے کہ یہ فلم جو ان کی نظر میں اچھی تھی فلاپ کیوں ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے اس فلم کا ایک خاص شو میرے لئے کیا۔ اس میں میرے ساتھ میرا بیٹا اور میری بیوی بھی تھیں۔ اس زمانے میں میری راتیں دعوتوں میں صرف ہو جاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بمبئی کے لوگ بڑے زندہ دل ہیں اور ان کا دن دس گیارہ بجے رات کے بعد شروع ہوتا۔ چنانچہ یہ محفلیں تین چار بجے صبح کے وقت ختم ہوتی تھیں اور مجھے سونے کا موقع کم ملتا تھا۔

انہوں نے فلم دیکھنے کی دعوت دی اور ہم وہاں گئے تو نیند پوری نہ ہو سکنے کی وجہ سے مجھے درمیان میں اونگھ آجاتی تھی۔ ایک بار اونگھ آئی تو میں نے بیٹے سے کہا کہ اگر مجھے اونگھتے دیکھو تو فوراً کہنی مار دینا۔ کیونکہ انہوں نے جتنے پیار سے فلم کا اہتمام کیا ہے اس لحاظ سے میرے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہو گی۔

ہمارے علاوہ وہاں سادہ سے خدوخال والا ایک اور چہرہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس وقت تو نہیں پہچانا لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ دیپتی نول تھیں۔ وہ امرتسر کی رہنے والی ایک خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی تھی۔ چونکہ گلزار بھی اسی قبیلے کا شخص تھا اس لئے اب وہ اس کی زندگی میں دوست کی حیثیت سے آئی ہوئی تھی۔ پکچر دیکھنے کے بعد یہ مجھے بھی اچھی لگی لیکن دو چیزوں کی اس میں مجھے بھی

کمی محسوس ہوئی۔ایک تو یہ ہے کہ ہماری پبلک جو کچھ بچپن میں معجزاتی قسم کی چیز سن چکتی ہے فلم میں اگراس سے انحراف کر لیا جائے تو پبلک اس کا ساتھ نہیں دیتی۔مثال کے طور پر شریف نیئر یہاں کے بہت بڑے آرٹسٹ اور ہدایتکار ہیں انہوں نے فلم ''شیریں فرہاد'' بنائی۔اس میں انہوں نے یہ کیا کہ بجائے اس کے لوگوں کو پہلے سے سنی سنائی کہانی دوبارہ سنا دیتے' انہوں نے اس موضوع پر ریسرچ کی اور دودھ کی نہر والی روایتی کہانی سے انحراف کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس میں کچھ نئے کردار بھی شامل کیے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی فلم فلاپ ہو گئی۔اس کے بر عکس ''لیلیٰ مجنوں'' کی روایتی کہانی کے مطابق اس موضوع پر کئی فلمیں بنی ہیں لیکن یہ کبھی فلاپ نہیں گئیں۔

''میرا'' کے ساتھ یہ ہوا کہ چونکہ اس میں گلزار نئے ذہن کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے کہانی کو روایت سے ہٹ کر لیا۔اب اصل کہانی جو لوگوں نے سنی ہوئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب میرا گاتی ہے تو محل کو آگ لگ جاتی ہے۔ اب گلزار نے اس معجزاتی کہانی سے ہٹ کر یہ کیا کہ میرا جہاں بیٹھ کر گا رہی ہے وہاں دیئے کسی زنجیر کے ساتھ لٹک رہے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے۔ چنانچہ کسی دیئے کا تیل چھلک کر لکڑی کے دروازے پر پڑ جاتا ہے جو آگ پکڑ لیتا ہے اور یوں محل کو آگ لگ جاتی ہے۔یہ سائنٹیفک بات تھی اور اس میں بھگوان کا آگ لگانے میں عمل دخل نہیں تھا۔چونکہ یہ بات روایت سے ہٹ کر تھی اسلئے لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اس کے علاوہ میرا بائی کے مشہور بھجن ہیں جن کی دھنیں پہلے سے بنی ہوئی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے:

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

اب اس کی ایک مانوس دھن ہے جو میں نے بھی بچپن میں سنی تھی اور بعد میں بھی جن لوگوں نے یہ بھجن گائے اس کی وہی مانوس دھن استعمال کی۔ لیکن گلزار نے ان سب کی دھنیں بدل دیں اور اب ان کی نئی دھنیں بنائیں۔ اس لئے فلم کا میوزک دیکھنے والوں کو بالکل متاثر نہ کر سکا۔ چنانچہ فلم کی کہانی میں عقلی موڑوں اور ان نئی دھنوں کو لوگوں نے پسند نہ کیا اور یہ فلم بھی رہ گئی۔

سننے کی حد تک یہ بات بھی آئی ہے کہ گلزار صاحب کی زندگی میں اس کے بعد بھی آگے چل کر رومانس کے کچھ مراحل آئے ہیں لیکن میں خود ابھی تک ان کی تصدیق یا تردید نہیں کر پایا۔

دھرمندر

مینا کماری کے حوالے سے جو ایک اور نام سامنے آتا ہے وہ دھرمندر کا ہے۔ اتفاق سے دھرمیندر بھی بنیادی طور پر سردار ہیں مگر بالوں کے بغیر۔ یہ 1960ء کے قریب نیا نیا نام رکھ کر بمبئی آئے۔ یہ بہت جی دار اور با اصول ہیں۔ شروع میں ان کی کچھ فلمیں فیل ہوئیں لیکن یہ حوصلے سے آگے بڑھتے رہے۔ اب ان کی عمر کچھ بڑھ بھی گئی ہے۔ لیکن بظاہر زیادہ عمر کے لگتے نہیں ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اب ہیرو بن چکا ہے لیکن اب بھی بیٹے سے زیادہ کامیابی ان کے قدم چوم رہی ہے۔

ان کی طرف سے شعر و شاعری کی سرپرستی کیے جانے کے بارے میں کئی داستانیں سننے میں آئی ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک محفل میں ایک گائیکہ میری غزل گا رہی تھیں تو انہوں نے خوش ہو کر اپنا سونے کا لاکٹ اتار کر گائیکہ کو دے دیا اور اسے مالا مال کر دیا۔ ان کی سخاوت کی اور لوگوں کی مدد کرنے کی اسی طرح کی اور بھی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔

میں جب بمبئی گیا تو دل میں ان سے ملنے کا خیال تھا۔ پتا چلا کہ وہ فلم ''رضیہ سلطان'' کے سیٹ پر موجود ہیں۔ میں نے کمال امروہوی صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے تصدیق کی چنانچہ میں' میرا بیٹا نوید اور صابر دت سیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ غلام کا رول کر رہے تھے اور انہوں نے کالا میک اپ کیا ہوا تھا۔ عجیب بات ہے کہ انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ اسی دوران کمال صاحب نے جو ہمارے ساتھ تھے کہا کہ یہ قتیل صاحب ہیں۔ مجھے بڑے پیار سے ملے اور اس طرح گلے لگا لیا جس طرح سالہا سال کے دوست ہوں۔ پھر مجھ سے خیریت دریافت کی' کھانے پینے کا چھوٹا سا انتظام کیا اور پھر ایک ساتھ کچھ تصویریں ہوئیں۔

اس کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ میں کچھ غیر ضروری دعوتوں میں الجھا ہوا تھا جبکہ وہ پہلے ہی سے فلموں کے سلسلے میں بہت مصروف تھے۔ لیکن بعد میں میرے دوست صابر دت جنہوں نے وہاں سے قتیل شفائی نمبر نکالا ہے' بتایا کہ میرے انڈیا سے چلے آنے کے بعد جب ان کی دھرمیندر سے ملاقات ہوئی تو اس میں یہ طے پایا کہ میں اب جب بمبئی جاؤں گا تو وہ اپنی فلموں کے گانے جس حد تک میں لکھ سکا مجھ سے لکھوائیں گے۔ یہ 1979ء کا واقعہ ہے۔

کے آصف اور نگار سلطانہ

1961ء میں مرحوم کے آصف نے مجھے اپنی فلم کے گانوں کے لئے بمبئی میں روکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ فلم ''محبت اور خدا'' بنا رہے تھے۔ اس وقت تک فلم ''مغل اعظم'' ریلیز ہو کر آصف کا بہت نام پیدا کر چکی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس پر ایک کروڑ روپیہ خرچ آیا تھا جبکہ اس زمانے میں

فلم دس لاکھ روپے میں بن جاتی تھی۔ یہ فلم بہت زیادہ پیسہ کمارہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ مشہور ہورہاتھا کہ آصف دلیپ کمار کی بہن سے شادی کرناچاہتے ہیں لیکن چونکہ یہ پہلے سے نگار سلطانہ سے شادی شدہ ہیں اس لئے دوسری شادی کی راہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ پھر چونکہ دلیپ صاحب بھی آصف صاحب سے اس نئے رشتے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے بھی یہ شادی ہو نہیں پارہی ۔وہ کہتے یہ مناسب نہیں، لیکن بہن کوورک نہ پائے۔ لوگ آصف کو تنقید کا نشانہ بھی بنارہے تھے۔ اگران کی ایک ہزار جگہ پر تعریف ہوتی تھی توساتھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کا جنسی پہلو بہت کمزور ہے۔

اس سے پہلے کے آصف کے کھاتے میں اپنی ممانی ستارہ کا اغوا بھی پڑاہواتھا۔ستارہ اپنے زمانے کے مشہور ہدایتکاراور اداکارنذیر صاحب کی بیوی تھی اورڈانسر تھی۔آج کا زمانہ تواسے نہیں جانتا لیکن پچھلے زمانے کے لوگ جانتے ہیں کہ وہ کتنے پائے کی ڈانسر تھی۔ وہ محبوب صاحب کی فلم روٹی میں ہیروئن آئی تھیں اورانہوں نے اپنی صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑدیئے تھے۔اس کے علاوہ وہ متعدد فلموں میں بھی ہیروئن آچکی تھیں۔

نذیر صاحب بہت خوبصورت آدمی تھے' بطور مردان کی شخصیت بہت پرکشش تھی اور اداکاری میں بھی ان کا اپنا ایک سٹائل تھا۔جہاں تک کے آصف کا تعلق ہے' وہ واجبی سی شکل و صورت کے آدمی تھے بلکہ بعض صورتوں میں توخوبصورتی کے معیار سے ذرانیچے گرے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ''مغل اعظم'' کی وجہ سے انہیں بہت شہرت مل گئی تھی اوربقول نگار سلطانہ اس

شہرت پر پہنچ کر کوئی بھی لڑکی کے آصف کی طرف راغب ہو سکتی ہے۔

چنانچہ یہی ہوا ہو گا کہ دلیپ صاحب کی بہن ادھر راغب ہو گئی ہوں گی۔ ویسے بھی کے آصف صاحب اب نگار سلطانہ کے ساتھ نہیں رہ رہے تھے بلکہ جوہو ہوٹل میں دریا کے کنارے ایک خوبصورت کاٹیج لے کر رہ رہے تھے۔ وہیں وہ اپنی فلم کا کام بھی کرتے تھے اور پتا یہ چلتا تھا کہ اب بھی دلیپ صاحب کی بہن کے ساتھ ان کا پیام رسانی ہو رہی ہے جسے لوگ ناپسندیدہ قرار دے رہے تھے۔

اسی زمانے میں میری ملاقات نگار سلطانہ کے ساتھ ہوئی۔ نگار سلطانہ ایک بہت ہی خوبصورت خاتون تھیں، وہ شعر وشاعری کی دلدادہ تھیں اور جب ترنم سے پڑھتی تھیں تو دل موہ لیتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تانیث میں باتیں نہیں کرتی تھیں تذکیر میں باتیں کرتی تھیں مثلاً میں آیا اور میں گیا۔ اس طرح مردوں کی طرح باتیں کرتی تھی۔ انہیں بچپن ہی سے اس طرح باتیں کرنے کی عادت تھی۔

ان سے میری پہلی ملاقات تو آصف نے ہی کروائی تھی۔ یہ ایک دن گھومتے ہوئے مجھے ان کے پاس لے گئے تھے۔ اس وقت ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی نگار سلطانہ سے ایک دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اتنی دیر میں حیدرآباد سے مجھے ایک مشاعرے کی دعوت موصول ہوئی۔ نگار سلطانہ پیدائشی طور پر حیدراآباد سے تعلق رکھتی تھیں۔

جب مشاعرے کی دعوت آئی تو اس زمانے میں حبیب جالب صاحب بھی انڈیا پہنچے ہوئے تھے۔ قبل ازیں میں اور وہ دہلی میں ایک ساتھ مشاعرہ بھی پڑھ چکے تھے۔ جہاں سے میں مدراس چلا گیا تھا

اور مدراس سے واپس آ کے آصف صاحب کے لئے بمبئی ٹھہر گیا تھا جبکہ جالب صاحب بعد میں دہلی سے بمبئی آئے اور غالباً بڑے غلام علی کے ہاں ٹھہرے کیونکہ ان کے بیٹے سے ان کے مراسم تھے۔ جالب صاحب مجھ سے ملنے کیلئے آجاتے تھے۔ میں مشہور نغمہ نگار اندریو کے ساتھ رہ رہا تھا۔ جالب صاحب اس زمانے میں خاصے غیر ذمہ دار آدمی تھے۔ کوئی احتیاط نہیں کرتے تھے۔ جو جی میں آیا کہہ دیتے تھے۔ کسی کو ملال ہوتا ہے تو ہو اور اگر ان کی ذات پر کوئی حرف آتا ہے تو آئے اس وجہ سے اکثر دوست ایک حد تک ان سے تنگ رہتے تھے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جسے قدرت نے قوت برداشت کچھ زیادہ ہی دی ہے۔ نصیحتیں تو کرنے لگ جاتا ہوں لیکن کسی سے تنگ نہیں آتا۔

جب جالب صاحب میرے پاس آئے تو پوچھا" سنا ہے آپ حیدر آباد جارہے ہیں"

میں نے کہا" ہاں جارہا ہوں"

کہنے لگے" میں بھی جارہا ہوں"

میں نے کہا" دعوت نامہ آیا ہے"

کہنے لگے" آجائے گا"

میں نے پوچھا" کس طرح"

'کہنے لگے" آپ منگوا کردیں گے"

میں نے کہا" ٹھیک ہے" جالب کے لئے دعوت نامہ منگوانا کوئی مشکل بات نہیں تھی کیونکہ ان کا نام تو تھا ہی چنانچہ میں نے جب مشاعرے کے منتظمین سے کہا تو انہوں نے بخوشی انہیں دعوت نامہ بھیج دیا۔

اب مجھے معلوم تھا کہ اس دعوت نامے کے ساتھ جو کوفت برداشت کرنی ہو گی' وہ مجھے ہی برداشت کرنی ہو گی۔ بہر حال جالب صاحب کو دعوت نامہ آگیا اور وہ حیدر آباد چلے گئے۔ میں جس ٹرین میں روانہ ہوا اس میں مشہور خاتون میوزک ڈائریکٹر اوشا کھنہ ان کے والد اور بمبئی کے کچھ دوسرے شعراء بھی تھے۔ حیدر آباد میں مشاعرہ بھی تھا اور ساتھ کوئی میوزک پروگرام بھی تھا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ نگار سلطانہ حیدر آبادی ہونے کے ناتے وہاں موجود ہیں اور مشاعرہ بھی پڑھیں گے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔

وہاں راجہ راج دھن گیر بھی موجود تھے جو نواب کے مصاحبین میں سے تھے۔ وہاں ہندو راجہ کہلواتے تھے۔ راجہ صاحب ایک چھوٹی سی ریاست کے خود بھی مالک تھے اور انہوں نے باہر سے آئے ہوئے شعراء کی دعوت کی۔ اس میں نگار سلطانہ بھی موجود تھیں۔ ہم پہلی بار ایک محل میں داخل ہوئے تھے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو ایک سڑک بہت دور تک چلی جا رہی تھی۔ راستے میں پہریدار بھی کھڑے تھے۔ ہم کافی فاصلہ طے کر کے اندر محل تک پہنچے۔ اس دعوت میں جانے والوں میں معرکے کے انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نکسلواڑی اور نگار سلطانہ بھی شامل تھیں۔

اس دعوت میں ایک بہت خوبصورت چہرہ بڑی خصوصیت کے ساتھ نظر آ رہا تھا جو راجہ دھن راج گیر کی بیٹی کا تھا۔ ان کا نام اندرا تھا۔ اور یہ حسن کا مجسمہ تھیں۔ یہ انگلش کی شاعرہ تھیں۔ پتا چلا کہ مخدوم صاحب روزانہ راجہ صاحب کے ہاں حاضری دینے جاتے ہیں اور جا کر اندرا جی کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے بھی اندرا جی کو دیکھا اور وہ واقعی اس لائق تھیں کہ:

تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کریں

وہاں دھن راج گیر کا کردار بھی سامنے آیا۔انہوں نے اپنی جوانی میں اور تو جو کچھ کیا ہو گا وہ الگ ہے مگر انہوں نے اپنے زمانے کی خوبصورت اور مشہور ترین ہیروئن زبیدہ سے بھی شادی کرر کھی تھی جو ہندوستان کی پہلی متکلم فلم میں ہیروئن بھی آچکی تھیں۔ لیکن جوانی گزر جانے کے باوجود اس بڑھاپے میں بھی راجہ صاحب کی حسن پرست طبیعت باقی تھی۔

جہاں میں بیٹھا تھا اس سے آگے نگار سلطانہ تھیں اور ان سے دھن راج گیر بیٹھے ہوئے تھے۔اس عمر میں بھی جبکہ اکثر لوگ زندگی سے ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں، وہ نگار سلطانہ سے کہہ رہے تھے کہ نگار تم ہاں تو کرو میں اب بھی تمہیں جواہرات میں تول سکتا ہوں۔ نگار کن اکھیوں سے کبھی میری طرف دیکھے اور کبھی تھوڑا سا جواب دے۔ اصل میں وہ کے آصف کی بیوی تھیں اور میں آصف صاحب کا دوست تھا اس لئے کچھ حجاب سا تھا۔

اس وقت وہاں سب لوگ پیئے ہوئے تھے اور جس کے جی میں جو آرہا تھا کہے جا رہا تھا۔ نگار سلطانہ کے ایک بھائی بھی وہاں موجود تھے مگر ایسے بھائیوں کی اپنی تو کوئی حیثیت ہوتی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نامور خاتون تھیں اور ان لوگوں کی کفیل بھی تھیں۔ پھر بھی وہ بظاہر منہ سا بنا کر یہ تاثر دے رہے تھے کہ دھن راج گیر کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر یہ سب نمائشی تھا۔

یہ محفل بہت دیر تک رہی۔ میں نے دیکھا کہ دھن راج گیر صاحب کو رومانس کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے آگاہی تھی۔ مجھے پوچھنے لگے " اقبال بانو کا کیا حال ہے؟" میں بہت پریشان ہوا۔اور کہا" جی بس ٹھیک ہے"۔ کہنے لگے" بھئی میں تو آپ کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں"

میں نے کہا" اب تو سلسلہ منقطع ہو چکا ہے"

کہنے لگے " آپ کی طرف سے یا ان کی طرف سے "

میں نے کہا" بس دونوں ہی کی طرف سے سمجھ لیجئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے اکتا چکے تھے" کہنے لگے " اچھا اس معاملے میں آدمی اکتا بھی جایا کرتا ہے" وہ اس طرح کی زندہ دلی کی باتیں کر رہے تھے۔ مشاعرے میں پنجاب کے یونینسٹ وزیر بھیم سین سچر جو اس وقت گورنر تھے۔ وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ اس دن مجھے محسوس ہوا کہ اپنے علاقے کے رہنے والے ہم وطنوں سے پیار ایک لازمی سی چیز ہے۔ اور اس میں بعض اوقات درمیان میں مذہب وملت بھی نہیں آتا۔ مثال کے طور پر بنگالی مسلمان، مغربی پاکستان کے مسلمان کی نسبت بنگالی ہندو کو نسبتاً زیادہ چاہتا تھا۔ کیونکہ زمین اور زبان کا رشتہ بڑی چیز ہوتی ہے۔

جب ہم مشاعرے میں بیٹھے ہوئے تھے تو اس کی صدارت گورنر لالہ بھیم سین سچر کو کرنی تھی۔ وہ خالص پنجابی آدمی تھے۔ جالب چونکہ جونیئر تھے اس لئے وہ انہیں نہیں جانتے تھے لیکن مجھے جانتے تھے جب آ کر وہ کرسی صدارت پر بیٹھے تو سب سے پہلے پوچھا" ہمارے قتیل شفائی آئے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں"

میں نے سنا تو اٹھ کر آیا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرا منہ چوما۔ پھر انہیں جن شاعروں کے نام یاد تھے ان کے بارے میں پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے۔

انہوں نے اگلے روز گورنر ہاؤس میں باہر سے آئے ہوئے سب شعراء کو دعوت دی اور اس میں خاص طور پر مجھے مدعو کیا۔ جب میں نے جالب کے بارے میں بتایا تو اسے بھی خاص طور پر مدعو کیا۔ اگرچہ دعوت تو سب کیلئے تھی لیکن ہمارا تعلق چونکہ پنجاب سے تھا اس لئے انہوں نے ہمیں

خصوصی طور پر مدعو کیا۔اس کے علاوہ وہاں سے ایک پرچہ ''ملاپ'' نکلتا تھا۔اس کے سٹاف کے ان سب ارکان کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے مجھے اتنی عزت دی کہ یہ مشاعرہ اور یہ تقریب میرے لئے یادگار بن گئے۔انہوں نے حقیقی معنوں میں ہم وطن ہونے کا حق ادا کر دیا۔

وہ زمانہ کچھ ایسا تھا کہ سب ہی زیادہ پیتے تھے لیکن جالب صاحب کچھ زیادہ ہی پی جاتے تھے اور اس کے بعد ان کی شوخیاں سامنے آتی تھیں جو بعض اوقات حد سے بڑھی ہونے کی وجہ سے کچھ ناگوار ہو جاتی تھیں۔میں نے بمبئی سے حیدر آباد کے لئے روانہ ہونے سے قبل ان سے کہا تھا کہ میں اور آپ ایک ساتھ تو رہیں گے لیکن اس شرط پر کہ میں آپ کے پینے کے معاملے میں باقاعدہ مداخلت کروں گا اور آپ پر سنسر لگاؤں گا کہ آپ کو کتنی پینی ہے۔کہنے لگے کہ بالکل یہ تو ہونا ہی چاہیے۔

جب ہم حیدر آباد آ گئے تو انہوں نے میرے علاوہ تو جو کیا سو کیا۔لیکن میری موجودگی میں بھی ایک واقعہ کیا۔ہم ایک ریستوران میں بیٹھے تھے وہاں مرحوم شاعر شاہد صدیقی اور کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ہمارے درمیان دو پیگ کا معاہدہ تھا۔ان کے دو پیگ پورے ہوئے تو اس دوران شاہد صدیقی اور ان کے ایک دو ساتھیوں نے جو دوسرے ٹیبل پر بیٹھے تھے انہیں حیدر آبادی انداز میں سلام کیا۔یہ سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی خود بھی اٹھ کر ان کی میز پر چلے گئے۔انہوں نے ایک اور پیگ دیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر وہ بھی اٹھا لیا۔

دو پیگ وہاں سے اور لگانے کے بعد انہوں نے اپنی غزل شروع کر دی۔ میں نے شاہد صاحب سے کہا کہ مولانا اب کام سے گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب زیادہ پی لیتے تھے تو جو غزل کی فرمائش کرتا، اسے غزل سنانی شروع کر دیتے تھے۔ ہم چونکہ فارغ ہو چکے تھے اس لئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے غزل ختم کی تو میں نے کہا کہ آیئے کہنے لگے آتا ہوں اور پھر ایک اور غزل شروع کر دی۔ جب یہ بھی ختم ہوئی تو میں نے کہا کہ اب تو آیئے۔ کہنے لگے کہ قتیل صاحب آپ بھی محتسب بن جاتے ہیں کبھی تو ہمیں کھلا رہنے دیجئے میں نے کہا اچھا بیٹھے رہیں، اس وقت سے تم کھلے ہو۔

شاہد صدیقی کچھ گرم ہونے لگے تو میں نے کہا کہ نہیں اب اسے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ دل کا بہت اچھا آدمی ہے۔ بس یہی ایک کمزوری ہے کہ زیادہ پی لے تو یہ حال ہو جاتا ہے۔ ہم نے جالب صاحب کو چھوڑا اور خود وہاں سے اٹھ کر ادھر گھومنے کیلئے چلے گئے۔ اب میں اور جالب ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں بارہ بجے شب کے قریب اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تو یہ ابھی نہیں آئے تھے۔

چار بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو یہ جالب صاحب تھے۔ حلیہ ایسا تھا جیسے کسی نے بہت پیٹا ہو۔ انہوں نے آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لئے۔ اپنے آپ کو بہت سی گالیاں دیں اور کہنے لگے کہ میں بہت ایسا ویسا ہوں' آپ کی بات نہیں مانتا اور نتیجہ برا نکلتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ہوا کیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں گانا سننے کیلئے چلا گیا تھا اور وہاں جا کر تھوڑی سی اور پی لی۔ گانا سنتے سنتے میں سو گیا۔ تین بجے کے قریب آنکھ کھلی تو وہاں سے نکل آیا۔ تانگے میں بیٹھ کر یہاں تک

آیا ہوں اور جب پیسے دینے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی' اس لئے جو آدمی باہر کھڑا ہے۔ پہلے تو اسے پیسے دیں۔ میں نے کہا کہ ظالم! پیسے تمہارے نہیں گئے بلکہ میرے گئے ہیں کیونکہ اب آگے کا سارا خرچ میرے ذمے ہو گا۔ چنانچہ اسے میں نے پیسے دیئے اور جالب صاحب سو گئے۔ مجھے اس واقعہ کا دکھ نہیں ہوا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں یہ جاتے ہیں وہاں یہ سب تو ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے حسب حال یہ شعر ٹھیک کہا ہے کہ:

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

لیکن اب اگر جالب صاحب کو دیکھیں تو وہ بہت ذمہ دار اور سلجھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہے جیسے وہ کچا سونا تھا اور تجربات کی کٹھائی میں پڑ کے کندن بن گیا ہے۔ اس وقت تو وہ وہاں ہے جہاں اس کے کھاتے میں بہت سی قربانیاں اور اصول پرستیاں جمع ہیں اور وہ ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کرے کہ اس ملک میں اس کی جو شان ہے وہ برقرار رہے اور وہ کہیں اصول پرستی کی سیاست میں فلور کراسنگ کا شکار نہ ہو جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس فلور کراسنگ کا شکار نہیں ہو گا۔

حیدر آباد کا یادگار مشاعرہ

جب ہم بمبئی سے روانہ ہو کر حیدر آباد ریلوے سٹیشن پر پہنچے ہی تھے تو ایک آدمی نے دور سے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے حیدر آبادی شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس اس شخص کے بارے میں اندازہ کیا کہ وہ حیدر آباد کا کوئی مسلمان ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو وہ کہنے لگے کہ کیا آپ مسلمان ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں۔ میں نے کہا ہاں تو کہنے لگے کہ میں آپ سے بات کرتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ یہاں کے مسلمانوں کی حالت آپ خود دیکھ لیں گے۔ میں اتنا مجبور ہوں کہ

رات سے فاقے میں تھا اور صبح صبح نکل کر ادھر آیا ہوں۔ آپ کو دیکھا تو خیال آیا کہ آپ سے گزارش کروں کہ میری کچھ امداد کریں۔ آگے پھر اللہ مالک ہے۔ وہ بالکل سچا نظر آرہا تھا چنانچہ جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اسے دیا۔

یہاں سے پتا چلا کہ وہ حیدرآباد جہاں مسلمانوں کی بڑی شان و شوکت تھی' اب زوال کے اس نکتے پر پہنچ گیا ہے کہ مسلمان بہت تنگدست ہیں۔ انڈین حکومت کے تسلط کے بعد حیدرآباد میں اگرچہ اجتماعی اعتبار سے کچھ ترقیاں ہوئیں لیکن مسلمانوں کی حالت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لیکن اس میں قصور حیدرآباد کے عام مسلمانوں کا بھی نہیں تھا بلکہ یہ قصور نظام دکن کا تھا جس نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی اور رضاکار تحریک کے قاسم رضوی صاحب نے بھی تشدد کی تحریک چلادی تھی اور یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کی حکومت ہے ' وہ نظام کے بھی مخالف تھے اور ہندوؤں کے بھی۔

اس تحریک میں رضاکاروں نے ہندوؤں کو بہت تنگ کیا تھا چنانچہ نظام اور ہندو دونوں ہی چاہتے تھے کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کے نام پر جو انقلاب آیا اسے بہانہ بنا کر انڈین حکومت نے بھی مداخلت کی اور رضوی صاحب کے بہت سے رضاکار مارے گئے۔ ان رضاکاروں کی عجیب انداز سے ٹریننگ ہوئی تھی کہ یہ واقعی ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے۔ یہ ایک مذہبی جنون تھا جس کے بعد ہندوؤں نے جہاں جہاں مسلمانوں کو دیکھا، انہیں نقصان پہنچایا۔ یہ اس تحریک ہی کا ردعمل تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی حالت بڑی دگرگوں ہو گئی تھی البتہ نظام فیملی کا سلسلہ ابھی ویسا ہی تھا۔

نظام دکن کے بڑے صاجزادے معظم جاہ نے شاعروں کی دعوت کی۔ یہ رات کا کھانا تھا اور ہم یہ کھانا آٹھ بجے کی بجائے زیادہ سے زیادہ دس بجے تک کھا سکتے تھے۔ لیکن گیارہ بج گئے اور کھانا نہ کھلایا گیا۔ میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ ابھی تو وہ جاگے ہیں اور اب سرکار تیار ہو کر بلائیں گے کیونکہ وہ رات کا کھانا بارہ بجے کھاتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ان بڑے لوگوں کے بارے میں وہی خناس تھا۔ اس لئے میں نے کہا" اب اور انتظار نہیں ہو سکتا کیونکہ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ ویسے بھی ہم کوئی درباری نہیں ہیں"

وہاں کے لوگ اس چیز کو ناپسند کرتے تھے کہ ہم نظام صاحب کے خلاف کوئی بات کہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم نہیں بلکہ اپنی ذات کے اندر ذہنی اعتبار سے حاکم ہیں جبکہ مسلمان محکوم طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نظام کے بیٹے کے بارے میں شکایت بھی سننا نہیں چاہتے تھے اور اس فیملی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میری باتیں سن کر دو چار اور شعراء بھی میرے ساتھ مل گئے تھے۔ ہم نے کہا" جو کھانا پکا ہوا ہے' آپ وہ اٹھا لایئے' جیسا بھی ہے ہم کھا لیں گے"۔ پتا نہیں وہ کہاں سے کھانا لے کر آئے۔ ہم نے کوئی گیارہ بجے کے قریب یہ کھانا کھایا اور ان سے ملے بغیر واپس آ گئے۔

ہمیں اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے معظم جاہ صاحب کے کھانے میں شرکت نہیں کی بلکہ بعد میں جب یہ پتا چلا کہ وہاں جاتے ہوئے کئی بار جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے تو خوشی ہوئی کہ ہم ان سے ملے بغیر ہی واپس آ گئے۔ حیدر آباد کو زوال آ چکا ہے لیکن نظام کے ٹھاٹھ اب بھی وہی تھے

اور رعایا سے اب بھی انہی پرانے آداب کی توقع کی جاتی تھی۔

وہاں گھومے پھرے تو وہاں کا حیرت انگیز سالار جنگ میوزیم بھی دیکھا۔ نواب سالار جنگ بھی اسی طرح کے نواب تھے جیسے کہ نظام کے مقربین میں سے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک لحاظ سے باقی نوابوں سے مختلف تھے کہ یہ ایک بہت بڑے میوزیم کو خزانہ دے کر گئے تھے۔ یہ میوزیم ایک بہت بڑی عمارت پر مشتمل تھا اسے دیکھتے ہوئے آدمی تھک جاتا ہے۔ اس میوزیم میں دنیا کی ہر چیز موجود ہے اور اس میں موجود سب کچھ انہوں نے تنہا جمع کیا۔ اس لیے ایسے ایسے نادر مجسمے دیکھنے میں آئے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ انہی میں سے ایک مجسمہ مرمر کا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ ابھی نہا کر پانی سے نکلا ہے اور اس کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک خشک مجسمہ تھا۔

اسی طرح میوزیم میں ایک شعبہ گھڑیوں کا تھا جس میں ناخن کے برابر گھڑی سے لے کر ہاتھی کے برابر گھڑی موجود تھی۔ ایک گھڑی ایسی بھی تھی جس میں سے ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک آدمی ہاتھ میں ہتھوڑا لیے باہر نکلتا ہے اور گھنٹے پر ہتھوڑا مار کر ٹن ٹن کرتا ہے اور اس کے بعد واپس چلا جاتا ہے اور وہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس گھڑی کو دیکھنے کیلئے وہاں قطاریں بنی ہوئی تھیں اور بہت رش ہوتا تھا۔

میوزیم میں تصویروں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ دنیا کے دوسرے بہت سے مصوروں کے علاوہ ایک پوری دیوار چغتائی صاحب کی تصویروں سے بھری ہوئی تھی۔ غرض اس میوزیم میں بہت سی نادر چیزیں موجود تھیں۔ اب یہ میوزیم انڈیا گورنمنٹ کی تحویل میں ہے۔ یہ میوزیم اربوں روپوں کی مالیت کا ہے۔

وہاں کی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کی عمارت بھی پر شکوہ ہے۔اس یونیورسٹی میں ساری زندگی اُردو کی ترویج کو مرکز بنا کر تعلیم دی جاتی رہی۔ مگر سچی بات یہ ہے مجھے وہاں کوئی بات اُردو کی ترویج کی نظر نہیں آئی۔ وہاں لوگ اتنا عرصہ تنخواہیں لے کر انگریزی زبان کی اصطلاحات کو اُردو میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اصطلاحات وہیں کی وہیں رہیں۔ بعض تراجم تو اتنے مشکل نظر آئے کہ اصل اصطلاح آسان نظر آئی۔

اس کے علاوہ کچھ اور عمارتیں' ادارے اور آثار ایسے نظر آئے جو ایک شخص حکومت اور اس کے ہم مذہبوں کو حاصل مراعات کی عکاسی کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر رونا آتا تھا کیونکہ غربت کا اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ مسلمان لڑکیوں کیلئے رشتے کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ والدین کے پاس پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ لڑکیوں کی شادیاں کر سکیں۔ان حالات میں ہمارے عرب بھائیوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا۔اب گزشتہ دس بارہ برسوں میں عربوں نے وہاں آنا شروع کیا۔

اس عرب شیخ کے ایجنٹ پہلے سے وہاں موجود ہوتے تھے اور چونکہ عربوں میں کثرت ازواج کوئی بری چیز نہیں' اس لئے وہ ایک خوبصورت لڑکی دیکھ کر اس کے والدین سے بات کرتا۔ وہ ماں باپ کا حق مہر ادا کرتا اور لڑکی کو شادی کر کے ساتھ لے جاتا۔ پھر سال چھ مہینے کے بعد لڑکی کو طلاق دے کر واپس اس کے گھر بھیج دیتا۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کو غربت اس نہج تک جا پہنچی کہ وہاں پر بیٹیاں قربانی کی بھینٹ چڑھیں۔

اب جب اُردو کا ہندوستان میں بہت زیادہ نام لیا جاتا ہے تو مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس طرح قومی تشخص کے نام پر انہوں نے انگریزی زبان کا بائیکاٹ کر کے نقصان اٹھایا اسی طرح اب یہ

ہندی کا بائیکاٹ کر کے مزید نقصان اٹھائیں گے۔ کیونکہ اب ہندوستان کی بشمول حیدر آباد کے سرکاری زبان ہندی ہے۔ اس لئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا نہ دے اور مسلمان بہت سا وقت اُردو پر لگا دیں۔ اور ہندی میں کمزور رہ جائیں اور بالآخر معاشی طور پر ایک بار پھر نقصان اٹھائیں۔ بہر حال یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ اگرچہ دیکھنے کی حد تک اُردو کی خدمت بھی ہو رہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی بچہ میٹرک پاس کر کے آئے گا تو وہ ہندی رسم الخط کو کیسے پڑھیگا۔

حیدر آباد میں مشاعرے کے بعد دوسرے روز میوزک پروگرام تھا جس میں اوشا کھنہ بھی شامل تھیں۔ اس پروگرام میں میوزک ڈائریکٹر اقبال قریشی بھی شامل تھے۔ جو بڑے اچھے گلوکار بھی تھے۔ اس زمانے میں میری ایک غزل ہندوستان اور پاکستان میں بہت مشہور تھی:

گرمئ حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

اوشا کھنہ نے یہ غزل سٹیج پر آکر سنائی۔ میں نے اس غزل کی اور بہت درجنوں دھنیں سنی ہیں لیکن جو مزا اوشا کھنہ کی دھن اور آواز سن کر آیا' وہ اپنی جگہ ہے۔ اوشا نے یہ غزل گا کر ساری محفل کو لوٹ لیا۔ پھر جب ہم لوٹ کر بمبئ آئے تو وہاں آکر میں نے جی بھر کر اوشا کی زبانی یہ غزل سنی۔ اب تو وہ کافی فلموں کا میوزک بھی دے رہی ہیں۔

اوشا کھنہ کی آواز میں یہ غزل گاتے ہوئے جو سوز تھا بعد میں اس کی وجہ بھی پتا چل گئی کہ ان کے اندر جنس مخالف کی طرف سے سوز دروں تھا۔ پھر ان کی فلم ساز' ہدایتکار ساون کمار سے شادی ہو گئی

اور شادی کے بعد علیحدگی بھی ہو گئی۔ لیکن اب بھی جب میں اشتہارات دیکھتا ہوں تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ علیحدگی کے باوجود میاں کی فلموں میں بیوی کا میوزک ہوتا ہے۔

ابراہیم جلیس

میرے نزدیک حیدر آباد کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک میں اپنے عزیز ترین دوست مرحوم ابراہیم جلیس کا ذکر نہ کروں۔ ابراہیم جلیس ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ جب وہ حیدر آباد میں تھے تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔اس وقت نوجوان لکھنے والوں میں شوق تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں کسی غریب' مزدور یا کسان کے بیٹے نظر آئیں اور طبقوں کے تضاد کی عکاسی کر سکیں۔ لیکن جلیس صاحب اس سے بھی کچھ آگے تھے۔وہ اس زمانے میں جب اپنے دوستوں کو خط لکھتے تھے تو اس میں اپنی ذاتی زندگی کا نقشہ اصل زندگی سے ہٹ کر لکھتے تھے۔
ایک دوست کو انہوں نے خط میں لکھا کہ سینے میں درد ہو رہا ہے' کھانسی بھی ہے' خدا جانے کونسی بیماری ہے۔اس کا تو اب بعد میں ہی پتا چلے گا لیکن اس وقت بارش نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ تیز بارش ہو رہی ہے اور مکان کی چھت ٹپک رہی ہے۔اس کے نیچے ایک کونے میں بیٹھا میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ جبکہ صورتحال یہ تھی کہ جلیس صاحب بہت تنومند آدمی تھے۔ قد بھی اونچا تھا اور صحت اتنی اچھی تھی کہ اگر کسی کو تھپڑ ماردیں تو اس کا جبڑا توڑ دیں۔اس طرح ان کا گھر بھی بہت خوبصورت تھا اور یہ ایک طرح سے رئیسوں کی حویلی تھی جس کی چھت سے بارش کے پانی کے ٹپکنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس زمانے میں قاسم رضوی صاحب نے رضاکاروں کی جو تحریک چلائی تھی اس سے بہت سے نوجوان گمراہ ہوئے تھے جن میں سے ایک ابراہیم جلیس بھی تھے۔ جلیس صاحب نے حیدرآباد ریڈیو سے رضوی صاحب کی ہمنوائی شروع کردی اور جب ریاست کا زوال ہو گیا تو وہ انڈیا سے ہوتے ہوئے پاکستان پہنچے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنی پہلی مشہور کتاب تقسیم کے بعد "دو ملک ایک کہانی" کے نام سے لکھی۔ اس سے پہلے وہ اور ابھی مدہ کتابیں لکھ چکے تھے جن میں "چالیس کروڑ بھکاری"۔ "زرد چہرے" اور "تکونا دیس" شامل تھیں۔ ان کی یہ افسانوں کی کتابیں بہت مقبول ہوئی تھیں۔ لیکن پارٹیشن کے بعد لکھی گئی ان کی کتاب "دو ملک ایک کہانی" ایک طرح کا سفرنامہ تھا اور اس میں دونوں ملکوں کے حالات پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی۔

انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے قاسم رضوی کی تحریک سے متاثر ہو کر جو کچھ کیا تھا وہ غلط تھا اور وہ خواہ مخواہ ایک رجعت پسندانہ فعل میں شریک ہو گئے تھے جس سے حیدرآباد کے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور ان کا بہت قتل عام ہوا۔ چنانچہ انہوں نے یہاں آکر ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں پیش پیش رہ کر بہت کام کیا۔ وہ پہلے تو کافی عرصہ لاہور ہی میں رہ کر اپنی سرگرمیاں کرتے رہے اور بعد میں کراچی چلے گئے۔

ان کے علاوہ حیدرآباد میں روزنامہ "ریاست" کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔ سہمے ہوئے مسلمانوں کا حوصلہ بندھانے میں اس پرچے نے بہت اہم رول ادا کیا۔ اس کے مالک نواب عابد علی خان تھے۔ وہ نواب تو تھے لیکن ان کا اپنے سٹاف اور دیگر ملنے والوں سے رویہ انتہائی دوستانہ اور بردرانہ تھا۔ وہ ایسے چشمہ فیض رکھنے والے آدمی تھے کہ جس کسی کا کام ہوتا یہی سمجھتے کہ یہ کام کرنا ان کا فرض ہے۔

چنانچہ اس اخبار سے انہوں نے جو کام کیا اور جس طرح اُردو کی خدمت کی وہ اب تک جاری ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس پرچے کے ایڈیٹر بھی جلیس صاحب کے بھائی ہیں اور اس پرچے میں ایک مدت سے کام کررہے ہیں۔ دیکھا جائے تو پورے پرچے کو انہی نے سنبھال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں پر جو علمی و ادبی سرگرمیاں ہوتی ہیں ان میں بھی جلیس صاحب کے بھائی پیش پیش نظر آتے ہیں۔

میں حیدر آباد میں چار مرتبہ جاچکا ہوں۔ پہلی مرتبہ تو 1961ء میں ہی گیا تھا جس وقت جالب صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ اس کے کوئی دو سال بعد پھر گیا۔ آخری اور چوتھی بار میں 1980ء میں وہاں گیا۔ اس میں حسب معمول نواب عابد علی خان پیش پیش تھے۔ انہوں نے وہاں میرے ساتھ بہت قریبی رابطہ رکھا۔ پھر وہاں جو مشاعرہ ہوا میں اس کے انتظامات اور حاضری کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ مشاعرہ ٹکٹ سے منعقد کیا گیا تھا اس کے باوجود اس میں حاضری پندرہ سولہ ہزار سے کم نہیں تھی جس میں سے پانچ چھ ہزار کے وقت عورتیں تھیں۔ بے شک حیدر آباد میں اُردو کی تہذیب دم توڑ چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں پر اس تہذیب کا جو کھنڈر باقی ہے اس کی بھی اپنی ایک شان ہے۔

مشاعرے سے لطف اندوز ہونے کا جو سلیقہ میں نے حیدر آباد کے لوگوں میں دیکھا وہ کم ہی کہیں نظر آیا ہے۔ بر محل داد دینا بر محل ہوٹ کرنا اور بر محل جملہ بازی سے لطف اندوز ہونا۔ کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے بیشتر شعراء موجود تھے۔ پاکستان سے میں اور حمایت علی شاعر گئے ہوئے تھے۔ میری نظریں ایک شاعر کنول پرشاد کنول کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ان کا یک

گیت پارٹیشن سے پہلے میں نے کسی رسالے میں پڑھا تھا:

دیکھ اڑتے پنچھیوں کو کیوں رے من ڈولتا ہے

اس کی زمین اور اس کا صوتی اثر مجھ پہ کچھ ایسا اثر کر گیا کہ یہ گیت میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس مشاعرے سے پہلے بھی میں ایک بار کنول صاحب سے مل چکا تھا لیکن حیدر آباد جاتے ہی اس بار بھی کنول صاحب سے ملنے کو بہت جی چاہا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ آپ جو کچھ لکھ چکے ہیں اس سے میرا پیچھا چھڑائیں۔ میں تو اس مصرعے سے متاثر ہو کر دو تین چیزیں لکھ چکا ہوں اور اچھی چیزیں لکھ چکا ہوں لیکن یہ مصرع مجھے ہمیشہ Haunt کرتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس سے تاثر لے کر میں آگے بڑھتا چلا جاؤں۔ لیکن کنول پرشاد کنول سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں یہ باتیں کنول پرشاد کو نذر عقیدت پیش کرنے کیلئے کہہ رہا ہوں۔ بعض چیزیں بعض لوگوں سے ہو جاتی ہیں لیکن اس مصرع میں انہوں نے کوئی ایسی چیز کہی ہے جو اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن اس ایک مصرعے میں میں نے اتنی چیزیں پنہاں دیکھی ہیں کہ یہ مصرع اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔

اس مشاعرے میں پروفیسر مغنی تبسم سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اس مشاعرے کے منتظمین میں سے تھے۔ اور ہمیں اپنی برادری کے لوگ سمجھ کر ہماری خدمت کرتے رہے میں نے دیکھا کہ وہ پینے کے معاملے میں تھوڑی بداحتیاطی کر رہے تھے تو ایک دوست کی حیثیت سے میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ ہنس دیئے اور پینا چھوڑ دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کسی اور جگہ جا کر پی رہے ہیں۔ تو میں نے پوچھا کہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی کرتے آئے ہیں تو مجھے جواب ملا کہ نہیں۔ اصل میں جب سے ان کی اہلیہ فوت

ہوئی ہیں تو یہ شدید تنہائی محسوس کرنے لگے ہیں اور اس تنہائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ انہوں نے شراب کو بنالیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور اس میں مداخلت ٹھیک نہیں ہے۔ زندگی کا ساتھی بچھڑ جائے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک دن نواب عابد علی خان صاحب کے گھر دعوت تھی۔ لوگ کھانے پر آئے، انہوں نے اس دن وہاں کے ایک بہت اچھے گویے مٹھل کے گانے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے خصوصاً میری ایک دو غزلیں گائیں۔ اس تقریب میں پروفیسر مغنی تبسم آ گئے وہ اس حالت میں تھے کہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر محفل میں بیٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی حالت تشویشناک نظر آ رہی تھی۔

اس سے پہلے وہ مجھے کہہ چکے تھے کہ کل صبح چھ بجے کے جہاز سے مجھے دہلی جانا ہے اور کسی سرکاری معاملے میں میری وہاں مصروفیت ہے۔ جب حالت کچھ اور بھی بگڑی تو اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے کوئی وصیت کر رہا ہو۔ ہم نے کہا کہ انہیں ہسپتال میں پہنچاتے کہیں معاملہ زیادہ گڑبڑ ہو جائے۔ لیکن عابد علی خان صاحب کہنے لگے کہ آپ فکر نہ کیجئے یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ انہوں نے پی بہت زیادہ لی ہے۔ بہر حال آپ اس واقعے کا انجام کل دیکھیں گے۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم ہوٹل چلے گئے۔

اگلے دن عابد صاحب کے کوئی ایڈیٹر میرے پاس آئے۔ انہیں میرے پاس کسی اور سلسلے میں آنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کا کیا حال ہے۔ وہ کہنے لگے کہ کیوں کیا ہوا ہے۔

میں نے رات کی بات بتائی تو وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ وہ تو دہلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت وہاں میٹنگ میں ہوں گے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

عابد صاحب کے یہ ایڈیٹر میرے پاس اس سلسلے میں آئے تھے کہ جب میں پہلی بار 1961ء میں حیدر آباد آیا تھا تو میں نے ایک درزی سے شیروانی بنوائی تھی۔ اس درزی کے ہاں سے جگر صاحب، مجروح صاحب اور دوسرے سب جونیئر اور سینئر شاعر اکثر شیروانیاں بنوا چکے تھے۔ اس کی فٹنگ ایسی تھی کہ میں نے کبھی کسی اور شیروانی کی ایسی فٹنگ نہیں دیکھی۔۔۔ مجھے اُسی روز واپس بھی روانہ ہونا تھا، چنانچہ میں نے رات کے مشاعرے میں عابد صاحب سے اس درزی کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ اس کا نام جوبلی ٹیلرز ہے۔ اور اب وہ آدمی تو نہیں موجود البتہ اس کی اولاد موجود ہے۔ چنانچہ عابد صاحب نے صبح نو بجے اپنے اس آدمی کو میرے پاس بھیجا تھا۔

ہم بزاز کی دکان پر گئے۔ کپڑا پسند کیا اور یہ کپڑا دس بجے ٹیلر کو دیا۔ اس نے ناپ لیا۔ چار بجے مجھے روانہ ہونا تھا اور ٹھیک ساڑھے تین بجے وہ ٹیلر شیروانی پہنا کر رخصت ہوا۔ حالانکہ میں نے رات عابد صاحب سے کہا تھا کہ اتنی جلدی شیروانی نہیں بن سکتی لیکن اس سے عابد صاحب کے خلوص اور ان کے اثر ورسوخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب میں بزاز کی دکان پر گیا اور پیسے دینے لگا تو اس نے پیسے نہ لیے اور کہا کہ ہمارا عابد صاحب سے لین دین ہے ہم خود ہی معاملہ کر لیں گے۔ درزی نے بھی یہی کہا۔ اس طرح عابد صاحب کی شاعروں کی پذیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی یہ شیروانی ایک طرح سے مجھے گفٹ کر دی۔

بھوپال کا مشاعرہ

سلیقے کے سامعین ایک تو حیدر آباد دکن کے مشاعرے میں ملے اور دوسرے بھوپال کے ایک مشاعرے میں۔ بھوپال ایک مسلم ریاست تھی اور مسلمان حکمرانوں کا ذوق تو رہا ہے کہ وہ شعر و موسیقی پر زیادہ توجہ دیتے رہے ہیں۔ ہندو راجے اور مہاراجے پہلوانی اور موسیقی پر توجہ دیتے رہے ہیں لیکن شاعری کا ایک میدان ایسا تھا جہاں مسلمان حکمرانوں کی اجارہ داری تھی۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا کے مصداق بھوپال میں بھی مسلمان حکمرانوں کے زیر اثر لوگ شعری ذوق رکھتے تھے۔

نواب حمید اللہ خان علم و ادب اور سیاست میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان کے علم و ادب کی سرپرستی کے انداز علامہ اقبال کی کتابوں سے بھی ظاہر ہیں جنہوں نے ضرب کلیم ان کے نام منسوب کی اور ان کے شیش محل میں جہاں یہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے' علامہ اقبال نے جو کچھ کہا اس کا حوالہ اپنی نظموں میں بھی دیا۔

میں نے بھوپال کے بارے میں بہت سی داستانیں سنی ہوئی تھیں اور تمنا تھی کہ میں بھی بھوپال دیکھوں۔ شاعری کی برکت سے مجھے یہ موقع بھی میسر آگیا۔ اور جب بھوپال گئے تو پرانے دوستوں میں سے شعری بھوپالی ملے جن سے مختلف مشاعروں میں پہلے سے ملاقات ہو چکی تھی۔ میں بھوپال اور شعری بھوپالی کو لازم و ملزوم بھوپال کی پہچان سمجھتا تھا۔

پرچہ ''افکار'' پارٹیشن سے پہلے یہیں سے نکلتا تھا اور بعد میں کراچی منتقل ہو گیا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے افکار کے پہلے شمارے سے لکھنا شروع کیا تھا چنانچہ یہ چیزیں ذہن میں لے کر میں بھوپال پہنچا۔ پہلے تو وہاں کے دستور کے مطابق ہمیں شہر کی سیر کے لئے لے جایا گیا۔ شہر

دیکھااور اس کے خاص خاص محلات دیکھے۔اس کے بعد مشاعرے کی رات آگئی۔

اس مشاعرے کی صدارت باجپائی صاحب کررہے تھے۔ان کے بارے میں تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ وہ اُردو کے حامی نہیں ہیں۔میرے خیال میں انہوں نے اس مشاعرے کی صدارت اس لئے قبول کی تھی کیونکہ وہ اس تاثر کی تردید کرنا چاہتے تھے۔یہ مشاعرہ جس جگہ ہوا اسے اقبال گراؤنڈ کا نام دیا گیا تھا۔یہ ایک بہت بڑا گراؤنڈ تھا جس کے آس پاس عمارتیں ہیں۔بیچ میں ایک گراؤنڈ ہے جس میں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ شہر کے چار پانچ چوکوں میں سپیکر لگا دیئے گئے تھے۔چنانچہ اس گراؤنڈ میں موجود ہزاروں آدمیوں کے علاوہ بے شمار لوگ ان چوکوں میں کھڑے ہوکر بھی مشاعرہ سن رہے تھے۔یہ چیز وہاں کی جدت تھی اور ظاہر کر رہی تھی کہ یہ پورا شہر علم وادب اور شعروشاعری سے دلچسپی رکھتا ہے ورنہ لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال ہو تو لوگ احتجاج کرتے ہیں لیکن بھوپال میں یہ انتظام وہاں کے لوگوں کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔

اس مشاعرے میں بھی کیفیت حیدر آباد دکن والی تھی اور باذوق سننے والے موجود تھے اور بے جا ہلٹر بازی نہیں تھی۔اس مشاعرے سے پہلے وہاں ایک دعوت ہوئی چونکہ شرکاء میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی موجود تھے اس لئے ملحق میزوں پر دو طرح کا کھانا رکھا گیا تھا۔ایک ویجیٹیرین کھانا تھا اور دوسرا نان ویجیٹیرین۔ہم گوشت خور لوگ زیادہ تر گوشت کی بنی ہوئی چیزیں پسند کرتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ میں تو ویجیٹیرین کھانا کھاؤں گا۔

جب میں اس میز پر پہنچا جو ویجیٹیرین لوگوں کیلئے مختص تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں بھی کباب اور کوفتے وغیرہ پڑے ہیں۔میں نے حیرت سے کہا کہ میں نے تو سبزی کھانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

لیکن یہاں تو دال کے علاوہ زیادہ تر چیزیں گوشت ہی کی بنی ہوئی تھیں۔ کوفتے دیکھے تو وہ پنیر کے تھے۔ کباب دیکھے تو وہ بھی کسی سبزی کے بنے ہوئے تھے مگر یہ سب کچھ ایسا لذیذ بنا ہوا تھا کہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

جب ایک بار جنرل ضیاءالحق انڈیا گئے تھے تو انہوں نے واپس آکر کہا تھا کہ وہاں تو سبزیاں بہت اچھی پکتی ہیں اور یہاں پر لوگ نجانے ایسی سبزیاں کیوں نہیں پکاتے۔ میں جنرل ضیاءالحق کا یہ بیان پڑھ کر ہنسا اور تائید کی کیونکہ جب تک کوئی وہاں سے کسی سپیشل دعوت سے یہ سب کچھ کھا کر نہ آئے تو اسے یقین نہیں آسکتا کہ سبزی اور دالوں سے اتنی لذیذ چیزیں بھی بن سکتی ہیں۔ حکیم نیرؔ واسطی کی بڑی اہلیہ نواب فیملی سے تھیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ان سے کہا تھا کہ مجھے بھی یہ سب کچھ سکھایئے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہم لاہور آنے والے ہیں اور وہاں آپ کی بیگم کو سکھائیں گے لیکن کسی وجہ سے وہ یہاں نہ آسکے مگر ہمیں ان کھانوں کا شوق اتنا تھا کہ جب میری بیوی اور بہو انڈیا گئیں تو انہوں نے وہاں سے یہ کھانے پکانے سیکھے اور اب یہ صورت ہے کہ ہمارے گھر میں بھی کسی ہندوستانی یا ہندو گھر سے کم ویجیٹیرین چیزیں نہیں پکتیں اور ان کھانوں میں بھی ہم خود کفیل ہو گئے ہیں۔

مشاعروں کا ذکر چلا ہے تو ایک اور مشاعرہ یاد آرہا ہے یعنی علی گڑھ کا مشاعرہ۔ یہ مشاعرہ بھی غالباً 1955ء کا ہے۔ ہم دہلی کے کسی مشاعرے میں گئے ہوئے تھے تو کنور مہندر سنگھ بیدی کی معرفت ہمیں علی گڑھ کے مشاعرے میں بلوایا گیا۔ اس مشاعرے کی روایت ہے کہ لڑکے ذرا ذرا

سی بات پر ہوٹ کرنے کیلئے تل جاتے ہیں اور بمشکل ہی کوئی ایسا موقع ہوگا کہ پورا مشاعرہ شروع سے آخر تک صحیح سلامت اور بغیر ہوٹنگ کے سن لیا گیا ہو۔

اس مشاعرے کے ذکر سے پہلے میں پاکپتن میں ہونے والے اس انڈو پاک مشاعرے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس مشاعرے سے تقریباً چھ ماہ پہلے منعقد ہوا تھا اور جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی اور انڈیا کے بہت سے دوسرے نامور شعراء نے بھی شرکت کی تھی۔ کنور صاحب سیاسی آدمی نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر ہیں۔ اگرچہ شاعروں میں ایک حد تک نظریہ بھی ہوتا ہے لیکن اس مشاعرے میں جتنے شعراء نے بھی شرکت کی ان کی براہِ راست سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے جن کے غیر ضروری حبِ وطن نے غیر ضروری طور پر جوش مارا اور ایسے ہی ایک شخص نے کشمیر کے موضوع پر نظم شروع کر دی۔ اس نظم کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور یہ محض مہمانوں کی دلآزادی کیلئے پڑھی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ یہ سیاسی جلسہ نہیں ہے اور نہ اس میں شامل لوگ کشمیر کے جھگڑے میں شامل ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے مہمان ہیں اور ہم نے انہیں ادبی نمائندوں کے طور پر بلوایا ہے۔ چنانچہ میری مداخلت کے بعد صاحب صدر نے اس آدمی کو روک دیا۔ چنانچہ یہ مشاعرہ بخیر وخوبی انجام کو پہنچا۔

اب اس مشاعرے کے بعد جب علی گڑھ کا مشاعرہ ہوا تو اس میں بھی کچھ ایسی صورتحال پیش آگئی۔ ایک تو وہاں کے سامعین پہلے ہی گلے پڑتے تھے اور پھر جب کسی نے مجھے دیکھا تو اسے بھی کشمیر یاد آگیا اور اس کا حبِ وطن بھی اسی طرح جاگا جیسے کسی کا پاکستان میں جاگا تھا۔ اس نے کہا کہ جی

میں ایک نظم قتیل صاحب کی نذر کرتا ہوں جس کا عنوان ہے "کشمیر" اس مشاعرے کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی کر رہے تھے وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے کشمیر کے آگے بولنے نہیں دیا اور کہا کہ میں یہ نظم پڑھنے کی بالکل اجازت نہیں دوں گا۔ اس محفل کو ادبی محفل ہی رہنے دیجئے اور اسے سیاست میں مت گھسیٹئے۔ قتیل صاحب وہاں کے سیاسی لیڈر نہیں ہیں بلکہ شاعر ہیں۔ ان صاحب نے کہا کہ پھر میں صدارت نہیں کروں گا اور یہ مشاعرہ برخاست کر دیتے ہیں۔ چنانچہ پھر کہیں جا کر وہ صاحب باز آئے۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر قوموں اور ملکوں کے درمیان اسی طرح صحیح سوچ رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو کم از کم بعض مقامات پر تو ہم ایسی چیزوں کو روک سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی شخص کا کوئی بھی نظریہ ہو سکتا ہے لیکن اس نظریے کے پرچار کیلئے میدان اور ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے میدان میں ہی اچھی لگتی ہے۔ اگر یہ سیاسی جلسے ہوتے تو کشمیر کے موضوع پر نظمیں ٹھیک تھیں مگر یہ ادبی محفلیں تھیں۔ اس لئے ادھر جو میں نے کہا وہ پسند کیا گیا اور ادھر جو کنور صاحب نے کیا اسے بھی پسند کیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد یہ مشاعرہ ٹھیک طرح چلا اور سنتے ہیں کہ یہ مشاعرہ علی گڑھ کے ان ایک دو گنے چنے مشاعروں میں سے تھا جس میں ہوٹنگ بھی نہیں ہوئی۔

مدراس اور کلکتہ کے مشاعرے

مدراس میں میں دو بار گیا۔ پہلی بار 1961ء میں میں وہاں گیا تھا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا تو مدراس سے مشاعرے کی دعوت آئی۔ جب میں وہاں گیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پارٹیشن کو تھوڑا عرصہ

گزرنے کے باوجود وہاں تعصبات قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔اور وہاں کے مسلمان کھلے عام ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنتے تھے اور ہندو مسلم فساد کے ڈر سے اپنی شخصیت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے رسم و رواج پر عمل کرتے تھے اور یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ بھی وہاں موجود تھی۔

جب یہاں سے احمد آباد گئے تو وہاں تو اس سے بھی زیادہ دیکھا اور دیکھا کہ مسلم لیگ کا دفتر کھلا ہے اور اس میں قائدِ اعظم کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ بہت حیرت ہوئی۔ پتا چلا کہ قائدِ اعظم کے آباؤاجداد احمد آباد ہی سے تھے اور مہاتما گاندھی کے آباؤاجداد بھی وہاں کے ہی تھے۔ اس لئے وہاں پر مسلم لیگ کا دفتر یا قائدِ اعظم کی تصویر کوئی ایسی بات نہ تھی۔ البتہ اب مسلم لیگ کا کردار وہ نہیں رہا تھا جو پارٹیشن سے پہلے تھا۔ اب اس میں تبدیلی آچکی تھی۔

مدراس کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری فلم "قاتل" والی غزل بہت مشہور تھی۔

الفت کی نئی منزل کو چلا

تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں

مدراس کے مشاعرے میں جب میں اپنا کلام سن چکا تو دیکھا کہ لمبی لمبی داڑھیوں والے دو آدمی میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ سے ایک گزارش ہے۔ میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے کہ مشاعرے کے دوسرے دور میں آپ اپنی غزل "الفت کی نئی منزل کو چلا" سنائیں۔ میں نے ہزار سمجھایا کہ وہ فلم کی غزل ہے اور آپ مجھ سے یہ سن کر بہت بے مزہ ہوں گے۔ مگر وہ نا مانے اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ غزل آپ کی زبان سے سننے کی بڑی تمنا ہے۔ چنانچہ خاص طور پر اس غزل کے لئے اناؤنسمنٹ ہوئی اور اس کی فرمائش کی گئی۔ میں نے تحت اللفظ یہ غزل پڑھی۔ اور اس پر مجھے جو داد ملی

وہ نا قابل فراموش ہے۔ مجھ سے اس کا ایک ایک مصرح چار چار بار پڑھا یا گیا اور پتا چلا کہ یہی وہ غزل تھی جس کی وجہ سے مجھے وہاں بلایا گیا تھا۔

وہیں سے ہم احمد آباد گئے جہاں پرانے مسلمان بادشاہوں کے آثار دیکھے اور پتھر کی جالیوں کا کام دیکھا جن کا جواب نہیں تھا۔ایک مسجد میں بھی پتھر کی جالیاں دیکھیں۔اس کے ایک مینار کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر اسے اوپر سے دھکا دیا جائے تو ہلتا ہے۔اس لئے اسے مینار لرزاں بھی کہتے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مینار سنگ لرزاں سے بنا ہوا ہے۔

ہمارے ساتھ مشہور خاتون سیدہ اختر حیدر آبادی تھیں جو خاکسار تحریک میں بھی کام کر چکی تھیں۔ انہیں خطیبہ ہند بھی کہا جاتا تھا۔ وہ بہت موٹی تھیں۔وہ کچھ انجمنوں کی عہدیدار تھیں اور مشاعروں اور دوسری تقاریب میں ہر جگہ آگے آگے رہتی تھیں۔جب ہم مینار کے اوپر چڑھے تو یہ ذرا سا ہلتا ہوا نظر آیا۔ سیدہ اختر سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔وہ بنگلور کی رہنے والی تھیں بعض اور مشاعرہ کرنا چاہتی تھیں۔ان کے ساتھ بہت تعلقات بن گئے تھے لیکن بعض اوقات ایک جملہ تعلقات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

جب ہم مینار لرزاں سے نیچے اترے تو کہنے لگیں کہ دیکھا میں نے کہا تھا کہ یہ مینار ہلتا ہے۔میں نے کہا بیگم اختر یہ مینار ہمارے ہلانے سے تو نہیں ہلا البتہ آپ کے اوپر جانے سے ہلا ہے۔وہ یہ جملہ سننے کے بعد بالکل خاموش ہو گئیں اور اس کے بعد جتنا عرصہ ہم ایک ساتھ رہے۔انہوں نے بول چال بند رکھی اور بنگلور کا پروگرام بھی گول کر دیا۔

دراصل سیدہ اختر حیدر آبادی بہت موٹی تھیں اور خواہ مخواہ جی چاہتا تھا کہ ان سے کوئی شرارت کی

جائے۔ اس وقت ہمارے ساتھ پاکستان سے سحاب قزلباش بھی تھیں۔ سیدہ اختر کے بال اتنے لمبے تھے کہ بلا مبالغہ ٹخنوں تک پہنچتے تھے اور کنگھی کر کے انہیں کھلا چھوڑتی تھیں۔ موٹی تو سحاب قزلباش بھی تھیں مگر یہ اچھی شکل وصورت والی تھیں۔ یہ کہنے لگیں کہ مجھے نظر آتا ہے کہ اختر کے بال مصنوعی ہیں۔ ہم نے کہا کہ نہیں مصنوعی بال اتنے زیادہ سنبھالے ہی نہیں جا سکتے۔ کہنے لگیں نہیں کسی طرح ان کے بال ٹیسٹ کر کے مجھے بتاؤ۔ جوانی کا زمانہ تھا اور شرارتیں کرنے کے دن تھے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو وہ میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔ میں نے عمداً یہ کیا کہ ان کے بیٹھتے ہوئے بال ذرا ادھر رکھ کے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ بال اٹک گئے اور جب میں نے سیٹ بدلوانے کیلئے انہیں اٹھنے کو کہا تو چونکہ بال اٹکے ہوئے تھے اس لئے ان کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بال کھینچنے سے انہیں تکلیف ہوئی۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ میں نے یہ عمداً کیا ہے۔ لیکن سحاب قزلباش کیلئے تصدیق ہو گئی اور اب یہ محترمہ چین سے بیٹھیں۔ اگر انہیں پتا چل جاتا تو یقیناً اس روز ناراضی ہو جاتی۔ میں نے زندگی میں اتنے لمبے بال کسی کے نہیں دیکھے۔

اب ایک مشاعرہ کلکتے کا سن لیجئے۔ ہندستان کے مشہور، خوش گو اور خوش گلو شاعر بیکل اتساہی پاکستان میں بھی آ چکے ہیں اور یہاں بھی مشاعرے لوٹ چکے ہیں، مشاعرے کے اچھے شاعر ہیں اور بڑے دھڑلے سے مشاعر پڑھتے ہیں۔ میں 82ء میں جب بمبئی میں تھا تو مجھے ان کا فون آیا کہ کلکتہ میں میرا جشن منایا جا رہا ہے۔ میں نے آپ کی صدارت تجویز کی ہے۔ اس لئے آپ وقت نکال کر آیئے۔ کلکتہ نہیں دیکھا تھا، اس لئے میں نے ہامی بھر لی۔ چنانچہ ہم کلکتہ چلے گئے۔ وہاں جو مشاعرہ ہو رہا تھا اس کے سرپرست شہزادہ سلیم نامی ایک صاحب تھے جو مشاعرے کے اخراجات

بھی اٹھارہے تھے لیکن پیچھے سے چکوال کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنی چکوال کی بولی نہیں بول سکتے تھے اور کلکتہ کے لہجے میں اُردو بولتے تھے۔

جب کلکتہ ائیر پورٹ پر پہنچا تو یہی مجھے لینے کیلئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دوسرے شعراء بھی تھے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو ایک بارونق بازار میں سب سے پہلے تو یہ نظارا دیکھا کہ پانچ چھ سو عورتوں کا ایک جلوس گزر رہا تھا اور ان میں سے ایک دو لیڈر عورتیں مکے تان کر نعرے لگا رہی تھیں۔ میں نے کلکتہ آنے سے پہلے سنا ہوا تھا کہ یہاں کے لوگ بڑے AGITATORS ہیں چنانچہ جب یہی عورتوں کا جلوس دیکھا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے کلکتہ کی پہلی جھلک تو دیکھ لی۔ تو وہ لطیفہ یاد آگیا کہ ایک بار کلکتے میں مردوں کا جلوس نکلا اور یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ بس کا کرایہ بڑھ گیا ہے اور ہمیں روز کا ایک آنہ فالتو دینا پڑے گا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد عورتوں کا ایک جلوس نکلا کہ اب حکومت نے بس کا کرایہ کم کر دیا ہے اور اس طرح ہمارے خاوند کے پاس روزانہ ایک آنہ بچ جائے گا اور یوں ایک ماہ میں اس کے پاس جو دو روپے بچ جائیں گے وہ ان سے وسکی پیئے گا۔

اس بازار سے آگے پہنچے تو دیکھا کہ انتارش ہے کہ جیسے چونٹیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گزر رہی ہوں۔ کلکتہ کے بارے میں یہ سچ لگا کہ واقعی یہ دنیا کا مصروف ترین اور اسی وجہ سے غلیظ ترین شہر ہے۔ یہاں سے ہو کر ہم اپنے ہوٹل میں پہنچے اور اس کے بعد سیر کا پروگرام بنا۔

مجھے شوق پیدا ہوا کہ ولیم کالج دیکھا جائے۔ سوچا تھا کہ وہ زمین پر کھڑی ہوئی کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی لیکن جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ یہ کالج تو سارے کا سارا زیر زمین ہے۔ جب ہم وہاں

پہنچے تو اس وقت کالج میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں چونکہ دو دن کے لئے کلکتہ گیا تھا اس لئے پھر یہ کالج نہ دیکھ سکا اور دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ یہ کالج بھی دیکھتا۔ بہرحال میں نے اپنے طور پر اس کالج کے بارے میں کچھ معلومات لیں۔

انہی داستانوں میں سے ایک داستان سبھاش چندر بوس کی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے انگریز سے بھی ٹکر لی اور کانگرس سے بھی۔ انگریز سے ٹکر لینے کی وجہ تو ظاہر تھی لیکن کانگرس سے اس لئے ٹکر لی کیونکہ وہ عدم تشدد کے قائل نہیں تھے اور کہتے کہ طاقت کا جواب طاقت سے دینا چاہیے۔ اس لئے وہ ہندوستان سے نکل کر جاپان جا پہنچے اور وہاں جا کر انہوں نے جاپانیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج قائم کی جس میں ہندو سکھ، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے۔

جنرل شاہنواز اسی زمانے میں جنرل بنے۔ پھر آ کے وہ ہندوستان میں کانگرس میں شامل رہے۔ اگرچہ وہ کام کرتے بھی رہتے اور ان کے جہاز کو حادثہ پیش نہ آتا یعنی مر نہ بھی جاتے اور زندہ بھی رہتے تو جاپان کے ساتھ شکست تو ان کی بھی ہو جانی تھی لیکن اس سے پہلے ایک چیز نے ساری دنیا کو ہلا دیا کہ لوگ عدم تشدد ہی نہیں بلکہ تشدد کی پالیسی بھی سامنے رکھ کر لڑنے کیلئے تیار ہیں۔ اور انگریز سے نفرت اتنی بڑھ چکی ہے کہ لوگ اپنے ملک سے باہر نکل کر اور فوج بنا کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔

میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ جہاں جہاں ان کے ٹھکانے تھے میں جا کر وہ سب دیکھوں گا لیکن چونکہ کلکتہ میں قیام بہت مختصر تھا۔ اس لئے میں وہ ٹھکانے نہ دیکھ سکا۔ سبھاش چندر بوس کو وہ لوگ

نیتا جی کہتے ہیں۔ انہوں نے گزرتے ہوئے بتایا کہ نیتا جی یہاں کیا کیا کرتے رہے۔ میں صرف ان کا مجسمہ ہی اچھی طرح دیکھ پایا جو ایک پارک میں لگا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے کچھ پھول پڑے ہوئے تھے کیونکہ جو بھی نیا آدمی آتا تھا وہ وہاں کچھ پھول رکھ جاتا تھا۔ میں نے بھی کچھ پھول لے جا کر ان پر نچھاور کئے میں سمجھتا ہوں کہ کلکتے کے سفر میں ایک مجاہد آزادی کے قدموں میں پھول رکھ دینا میرا حاصل سفر تھا۔

پونا کا مشاعرہ

بمبئی کے سفر میں میرے ذہن میں پونا بھی تھا۔ پونا بمبئی سے تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور پارٹیشن سے پہلے فلم انڈسٹری کا ایک یونٹ وہاں موجود تھا۔ میرے دوست اور مشہور فلم ڈائریکٹر ڈبلیو زیڈ احمد کا وہاں پر فلم سٹوڈیو بھی تھا۔ پونا میں انہوں نے صاحب علم وادب لوگوں کو جمع کر رکھا تھا اور باقاعدہ ایک ٹیم بنا رکھی تھی۔ جس میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور مسعود پرویز وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ جب کوئی شاعر یا پڑھنے لکھنے والا وہاں جاتا تھا تو وہ اس کی خدمت کرتے تھے اور کچھ حاصل کرتے تھے۔ اس لحاظ سے پونا بھی میرے ذہن میں تھا۔ ویسے بھی مجھے کہیں سے دعوت نامہ آتا ہے تو میرے لئے کشش کا باعث اس جگہ سے وابستہ کچھ یادیں ہوتی ہیں یا پھر اگر وہاں کوئی نادر چیز ہو تو اس جگہ کیلئے کشش محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ پونا کا دعوت نامہ ملا تو ذہن میں تھا کہ وہاں جا کر وہ سٹوڈیو دیکھوں گا جہاں ''من کی جیت'' اور ''ایک رات''، جیسی فلمیں ڈبلیو زیڈ احمد نے بنائی تھیں۔ میرے ساتھ میرے دوست اندیور بھی تھے۔ یہ 1961ء کا واقعہ ہے۔ ہم نے وہاں مشاعرہ بھی پڑھا۔ وہاں داد دینے کا اندازہ وہ نہیں تھا جو

دوسرے شہروں میں تھا۔ وہاں داد دینے کا یہ انداز تھا کہ جب شاعر کلام سنانے کیلئے سٹیج پر آتا تو تالی بجادی جاتی اور جب وہ واپس جانے لگتا تو پھر تالی بجادی جاتی۔ میری بیوی اور بچہ بھی ساتھ تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر انہوں نے میری عزت افزائی یوں کی کہ صدر مشاعرہ اٹھے اور کہا کہ جو کلام پڑھا گیا اس میں سب سے اچھا کلام قتیل صاحب کا رہا اور وہ اس مقابلے میں جیت گئے۔ اس لئے ہم انہیں اس جیت پر ایک کپ' ان کی بیوی کو ساڑھی اور ان کے بچے کو کھلونا دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ چیزیں ہمیں دیں اور ہم خوب تالیوں کی گونج میں وہاں سے واپس آ گئے اور دوسرے دن وہ سٹوڈیو دیکھا جس میں اتنی اچھی فلمیں بنی تھیں۔

انڈیا کے اسی ٹور میں لدھیانہ کے ایک مشاعرے میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ لدھیانہ ساحر کا گھر ہے اور ساحر لدھیانوی خود بھی اس مشاعرے میں موجود تھا۔ ساحر کے بچپن کے دوست اور نئے جاننے والے بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساحر عوام کا محبوب شاعر تھا۔ ساحر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Teenagers کا شاعر تھا لیکن اس سے بطور شاعر اس کی مقبولیت اور حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس عمر کے لوگ بھی تو ہمیشہ یہی رہیں گے۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ اس وقت کے اس مشاعرے کی طرف لوٹتا ہوں۔

ہم مشاعرے سے پہلے ایک دوسرے کو مجاز کے لطیفے سنا رہے تھے۔ ایک مشاعرے کا لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ مجاز کلام پڑھ رہے تھے تو اچانک ایک بچہ رونے لگا۔ مجاز بڑے جملہ باز تھے انہوں نے فوراً مائیک سے کہا:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

اس بات پر وہاں بڑا قہقہہ پڑا۔ یہ لطیفہ ہو چکا تھا اور جب ہم مشاعرے میں پہنچے تو میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹا تھے۔ یہ اس وقت سامعین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب کلام سنانے کیلئے سٹیج پر گیا تو نیچے سے میرے بیٹے نوید نے جس کی عمر کوئی چار سال تھی آواز دی "ابا جی"۔ اب بجائے اس کے کہ کوئی نقش فریادی والی بات کرے' میں نے خود ہی ساحر کو مخاطب کر کے کہہ دیا:

نقش فریادی ہے میری شوخی تحریر کا

لوگ سمجھ گئے اور بہت محفوظ ہوئے۔

1885ء میں سہارن پور میں ایک مشاعرہ ہوا تو لکڑی کا کام کرنے والی ایک فرم کے صاحبان اختیار میری شاعری کے دلدادہ تھے۔ اب بھی وہ لکڑی کی بنی ہوئی کوئی چیز تحفہ کے طور پر میرے لئے بھیج دیتے تھے۔ اس مشاعرہ میں شرکت کیلئے ہم گئے تو انہوں نے پوچھا کہ آپ ہمارے پاس آئیں گے۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی یہاں پاکستان سے گئی ہوئی ایک شاعرہ بسمل صابری نے کہا کہ ہاں جی بالکل ہم آئیں گے۔ اب نہ میں اس شاعرہ کو کچھ کہہ سکا اور نہ ہی مدعو کرنے والے افراد کو۔ خیر وقت مقررہ پر میں نے دیکھا کہ وہ خاتون وہاں موجود نہیں تھیں۔ میں نے شکر ادا کیا اور حسب وعدہ خود اس فرم میں چلا گیا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ خاتون پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں اور اپنی پسند کی بہت سی چیزیں پہلے ہی ایک پارسل کی شکل میں پیک کروا چکی تھیں۔ میں گیا تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

وہ صاحب مجھے کہنے لگے کہ آپ بھی کچھ چیزیں پسند کر لیجئے۔ میں نے کہا کہ شاعرہ جو چیزیں پسند کر چکی ہیں وہی ہمارے لئے کافی ہیں اور ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ میں نے سوچا کہ اس خاتون کو

تھوڑا سا نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ وہاں آ کر میں نے اس خاتون سے کہا کہ نکالو میرے حصے کی آدھی چیزیں۔ وہ ذرا کسمسائی لیکن میں نے کہا کہ تمہیں وہاں کس نے بلایا تھا اس لئے اب آدھی چیزیں نکالو۔

اس سال امرتسر میں بھی ایک مشاعرہ ہوا تھا اور میرے بمبئی کے قیام کے دوران اس مشاعرے کے منتظمین نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ایک تو خود امرتسر کے مشاعرے میں پاکستان واپسی پر شرکت کروں اور دوسرے پاکستان سے بھی جن شاعروں کو چاہوں بلوالوں۔ انہوں نے بسمل صابری کو بلوانے کیلئے کہا تھا۔ مشاعرے میں ہم نے شرکت کی تو سردار صاحبان وسکی لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب لڑکی سٹیج پر آئی تو نعرے تو اسی وقت لگ گئے۔ اس کے بعد کلام سنا تو اس کی داد بھی اچھی تھی اس لئے دوبارہ سہ بارہ بھی انہیں سنا گیا۔ وہ مشاعرہ خیریت سے گزرا تو ہم آ گئے۔

لطیفہ یہاں سے بنا کہ کوئی تین ماہ بعد اسی انجمن کا ایک خط آیا اور انہوں نے پرانے مشاعرے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ہم اب ایک اور مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں جس کے شعراء کی فہرست منسلک ہے۔ میں نے فہرست دیکھی تو اس میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور دوسرے شعراء کے نام تھے اور آخر میں بسمل صابری کا نام لکھا ہوا تھا۔ ناموں کے آگے انجمن نے جو معاوضہ منظور کیا وہ درج تھا۔ فیض صاحب کا معاوضہ آٹھ سو روپے تھا اس طرح سب شاعروں کا بشمول میرے معاوضہ بھی اتنا ہی درج تھا لیکن آخر میں بسمل صابری کے نام کے آگے معاوضہ بارہ سو روپے لکھا ہوا تھا۔ ہم یہ خط پڑھ کر بہت ہنسے۔ اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کسی زمانے میں جالندھر میں پاکستان کا ایک قونصل خانہ ہوتا تھا۔ چودہ اگست آیا تو انہوں نے سرکاری

طور پر لکھا کہ پاکستان کے شعراء یہاں آئیں کیونکہ ہم قومی دن کے موقع پر ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ لینا دینا ظاہر ہے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی فی سبیل اللہ والا معاملہ جو اکثر ہی شاعروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سرکاری ملازمین اس دن کی اپنی تنخواہ نہ لیں۔ ان کی تنخواہیں اور الاؤنس تو چل رہے ہوتے ہیں بلکہ وہ مشاعرہ منعقد کرنے کا فنڈ بھی آدھا کھا جاتے ہیں تو اس قومی خدمت کے لئے لاہور سے شاعروں کی ایک بس بھری گئی۔ جس میں بیٹھ کر ہم سب جالندھر پاکستان قونصل خانے میں چلے گئے۔

وہاں قونصل خانے کے سربراہ عبدالرحمان صاحب نامی ایک صاحب تھے۔ جب ہم وہاں گئے تو ہمارے اس قافلے میں عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، سید عابد علی عابد ناصر کاظمی میں اور بہت سے دوسرے شعراء شامل تھے۔ یہ سب معزز اور گنے چنے ہوئے لوگ تھے اور گھروں سے ہی کھاتے پیتے تھے۔ ہمارے کھانے پینے کا انتظام انتہائی ناقص کیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب ہم نے نہانے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا کہ باہر کنوئیں پر جا کر نہا لیں۔ میں ان دنوں میں خاصا تیز ہوتا تھا میں نے کہا کہ کیوں غسل خانے کو کیا ہو گیا ہے۔ تو کہنے لگے کہ وہاں صاحب کے ایک مہمان نہا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سب لوگ تمہارے صاحب کے سائلان آئے ہوئے ہیں۔ تم انہیں جانتے ہو کہ یہ سب کتنے مرتبے والے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم صاحب کو یہاں بلا کر لاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ صاحب تو اس وقت سو رہے ہیں۔ سالک صاحب بہت بردبار آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ چلو یار چھوڑو۔ ہم تو قومی کام کیلئے یہاں آئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو احساس نہیں ہے تو چلو چھوڑو۔

شام کا کھانا آیا تو انہوں نے سبزی ' دال اور تھوڑا سا بکرے کا گوشت پکایا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے پاس سرکاری اخراجات کیلئے بے پناہ فنڈ ہوتے ہیں لیکن یہ کھانا دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی اور کھانے کے ساتھ کوئی میٹھی چیز نہیں تھی۔ اسی دوران قونصل خانے کے سربراہ عبدالرحمان صاحب بھی وہاں آ گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ذبیحہ گاؤ یہاں ممنوع ہے۔ لیکن کیا ذبیحہ مرغ بھی یہاں ممنوع ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو یہی دکھ رہا ہوں کہ یہ بھی ممنوع ہے کیونکہ جو کھانا ہمیں دیا گیا ہے اس میں تو یہ موجود نہیں۔ کہنے لگے کہ اچھا تو آپ مرغ کھانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب ہم اپنے گھر میں مرغ ہی کھاتے ہیں۔ ویسے بھی جب کوئی مہمان آئے تو اسے دال اور بھات نہیں کھلایا کرتے اور پھر کھانے کے ساتھ ایک میٹھا بھی ہوتا ہے۔ میں نے انہیں بہت شرمندہ کیا۔ وہ کھسیانے ہو کر وہاں سے گئے۔

سالک صاحب نے ان کے جانے کے بعد کہا کہ شاباش قتیل تم نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ ہم پرانی قسم کے وضعدار لوگ ہیں اور بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہم میں یہ کہنے کی ہمت نہیں رہی۔ تم نے بجا طور پر سچائی کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ تو ایک نوجوان کی سی شوخی کا راستہ ہے۔ اب آپ بوڑھوں کی وضعداری دیکھیئے۔

یہ وہی زمانہ تھا جبکہ وسکی پی جاتی تھی۔ شاعر ہر مشاعرے میں پیتے تھے۔ وسکی کا انتظام وہاں پر ہمارے جالندھر کے دوستوں نے کیا تھا۔ سب شاعر حضرات وسکی پی رہے تھے۔ صرف سالک صاحب نہیں پی رہے تھے باقی جتنے شاعر وہاں پر موجود تھے سب پینے والے تھے۔ سالک صاحب وہاں بیٹھے شراب کے بارے میں لطیفے سنا رہے تھے۔ سب نے ان سے کہا کہ آپ لطیفہ وغیرہ بعد

میں سنائیے۔ پہلے آپ ہمارے ساتھ وسکی پیجئے۔
انہوں نے کہا کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ ویسے تم لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں اور تمہیں بھی بنا کر دیتا ہوں۔ لیکن سب لوگ بضدر ہے کہ آج تو آپ کو ہمارے ساتھ پینا ہی پڑے گی ورنہ ہم بھی نہیں پیئں گے۔ صوفی تبسم اور عابد علی عابد نے بھی ان سے کہا کہ پی بھی لو یار۔ ہم سب نے انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ انہوں نے بھی کوارٹر پیگ وسکی ڈال کر اس کا سوڈا واٹر سے بھر لیا۔ باقی سب لوگ تو تیز پیتے رہے لیکن یہ بھی تھوڑی تھوڑی کر کے پیتے رہے اور ساتھ ساتھ لطیفہ بھی سناتے رہے۔ ایسے وضعدار بزرگ آج کہاں ملیں گے۔ یعنی انہوں نے دوسروں کا دل رکھنے کیلئے وہ کام کر لیا جو انہوں نے زندگی بھر کبھی نہیں کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کام انہوں نے کراہت ہی سے کیا ہو گا۔ جب اٹھے تو یہ لطیفہ کیا کہ اپنے ساتھ والے آدمی کو ایک ہلکا سا تھپڑ مار کر کہنے لگے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اب میں نشے میں آگیا ہوں اور صوفی! اب تم بھی میرے سامنے نہ آنا کیونکہ میں نشے میں ہوں اور تمہیں بھی ماروں گا۔

یہاں سید عابد علی عابد کا ذکر آیا ہے۔ میں نے اتنے کھلے دل کے اور اتنے صاحب علم لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ کھلے دل کے اس طرح کہ اگر آپ ان کے پاس چلے گئے ہیں اور آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور آپ ان سے کوئی چیز پوچھ لیتے ہیں تو وہ اپنی تمام مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنا یہ فرض سمجھ لیتے تھے کہ ان کے پاس اس بارے میں جو علم ہے وہ آپ کو دے کر ہی رخصت کریں۔ گفتگو کا ایسا میٹھا سلیقہ تھا کہ وہ سننے والے کی سطح پر آ کر بات کرتے تھے۔ وہ آج کی

تنقید کی زبان سے بہت دور تھا۔ اگر ان کے سامنے کوئی عالم بیٹھا ہوتا تو اسی سطح کی بات کرتے لیکن اگر ان کے سامنے کوئی طالب علم بیٹھا ہوتا تو وہ اس کی ذہنی سطح کے مطابق انتہائی سلیس زبان میں بات کرتے تھے۔ میں جب بھی ان کے پاس گیا ہوں تو وہاں سے اٹھتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ آج میرے علم میں اضافہ ہوا ہے اور جیسے میں یہاں آنے سے پہلے بے علم تھا اور اب کسی فرشتے نے میرے اندر یہ سارا علم جذب کر دیا ہے۔

یہ نہیں کہ انہیں صرف شاعری اور ڈرامے پر ہی قدرت حاصل تھی بلکہ موسیقی کے بارے میں انہیں علمی اور عملی سطح پر جتنا عبور حاصل تھا' وہ بہت کم ہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ میں ایک بار اپنی کتاب ''مطربہ'' لے کر ان کے پاس گیا۔ یہ طوائف کے موضوع پر ہے اور مجھے قبل ازیں اس کتاب پر انعام بھی مل چکا تھا مگر اس کتاب کے آغاز میں دیباچہ کوئی نہیں تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ میں اس عالم سے اس کا دیباچہ لکھواؤں۔ پھر ذہن میں یہ بھی تھا کہ جب اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو گا تو یہ دیباچہ طوائف کے بارے میں اچھا تعارفی مضمون ہو گا۔ میں اس سے پہلے عابد صاحب سے بات کر چکا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ میں خود نہیں لکھ کر دے سکوں گا۔ اس لئے کسی ایسے آدمی کو ساتھ لاؤ جو تیز لکھتا ہو اور جسے میں دیباچہ Dictate کرا سکوں۔

ارشاد حسین کاظمی میرا جونیئر دوست تھا اور لکھتا بھی تیز تھا۔ وقت بھی اس کے پاس تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر ایک دن عابد صاحب کے پاس چلا گیا۔ عابد صاحب نے اسے کاغذ اور قلم پکڑایا اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر طوائف کا پورا پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دیباچہ بھی لکھوا دیا۔ جب ہم

واپس آنے لگے تو میں نے دیکھا کہ ارشاد حسین کاظمی کا لکھا ہوا مجھ سے نہیں پڑھا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ رف کاغذ مجھے دے دو۔ میں صاف لکھ لوں گا۔ لیکن اس کی لکھائی مجھ سے پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگا کہ آپ یہ میرے پاس چھوڑ دیں میں سب کچھ صبح لکھ کر آپ کو لا دوں گا۔ وہ جتنا لائق اور جتنی خوبیوں کا مالک ہے اتنا ہی غیر ذمہ دار بھی ہے۔ غیر ذمہ دار بھی ایسا ہے کہ اور کسی کا اتنا نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس کا اپنا زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں مجھے جو نقصان پہنچا وہ ناقابل تلافی ہے۔اس واقعہ کو جب دس پندرہ دن گزر گئے تو میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا کہ میں نے تھوڑا سا کر لیا ہے اور تھوڑا سا باقی ہے۔اسی طرح تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ میں نے اس سے پھر کہا کہ اب کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنے والا ہے۔اس لئے مجھے اب وہ دیباچہ دے دو۔ کہنے لگا کہ اچھا میں لے کر آؤں گا۔ خیر ایک دن وہ چار صفحے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آ گیا اور کہنے لگا کہ باقی چالیس صفحوں کا مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ کہاں گئے۔ میں یہ سن کر سر پیٹ کر رہ گیا۔ یہ چار صفحے وہی ہیں جن میں انہوں نے میرے بارے میں اور میرے کلام کے بارے میں تعریفی کلمات کہے ہیں اور میں یہ کبھی کبھی تبرکاً استعمال کر لیتا ہوں۔ لیکن جو اصل دیباچے کے چالیس صفحات تھے وہ ایک بیوقوف اور غیر ذمہ دار دوست کی وجہ سے کھو گئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں میری ایک بہت قیمتی چیز ایک ایسے دوست کی وجہ سے کھو گئی ہے۔

1979ء میں جب میں بمبئی میں تھا اور رسالہ ''فن اور شخصیت'' کا قتیل شفائی نمبر پریس میں تھا تو اس زمانے میں اداکار' فلمساز اور ہدایت کار سنیل دت نے ایک تجویز سے اتفاق کیا کہ رسالہ ''فن اور شخصیت'' کے لئے ایک بینیفٹ مشاعرہ کیا جائے۔ یہ مشاعرہ اندور میں رکھا گیا کیونکہ وہاں کچھ

لوگوں نے سنیل دت صاحب کو ویسے بھی بلا رکھا تھا۔ان کا خیال تھا کہ وہ کام اور مشاعرہ دونوں ایک ساتھ ہو جائیں گے۔

سنیل دت ایک بہت سوشل آدمی ہیں اور رفاہی کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔انہیں اُردو سے اس لئے بہت گہرا لگاؤ ہے کیونکہ وہ بنیادی طور پر جہلم کے رہنے والے تھے اور ان کا بچپن اُردو ہی کے ماحول میں گزرا تھا۔وہ پارٹیشن کے بعد انڈیا میں گئے تو پھر بھی ان کا زیادہ تر کام کاج اُردو ہی میں رہا۔وہ بی ایس سی پاس اور صاحب علم و بصیرت آدمی تھے۔پھر ''فن اور شخصیت'' کے مالک و مدیر صابر دت صاحب سے ان کی برادری بھی بنتی ہے اور سنیل دت چاہتے تھے کہ ان کی کچھ مدد بھی ہو جائے۔چنانچہ طے پایا کہ مشاعرہ اندور میں ہو گا۔

یوں تو وہ آل انڈیا مشاعرہ تھا لیکن میری موجودگی سے اسے انڈو پاک مشاعرہ بنا دیا گیا۔حسب پروگرام سب لوگ اندور میں پہنچے۔مشاعرہ تو خیر ٹھاٹھ کا ہونا ہی تھا اور ہوا بھی لیکن بہت سی دوسری دلچسپ چیزیں بھی اندور جا کر سامنے آئیں۔سب سے بڑے گلوکار امیر خان اور موسیقار رئیس خان دونوں اندور ہی سے تھے۔گویا کہ گویوں کا ایک پورا خاندان اندور سے متعلق ہے۔ادھر پٹیالہ گھرانا مشہور ہے۔اسی طرح موسیقی کا اندور گھرانا بھی پاک و ہند میں مشہور ہے۔اس کے علاوہ روپ متی باز بہادر کی مشہور داستان بھی اسی علاقے سے متعلق ہے۔ چنانچہ طے پایا کہ وہاں کچھ ایسے مقامات دیکھے جائیں جن کی کچھ تاریخی حیثیت ہو۔

سنیل دت صاحب اور ان کے پرستاران گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ وہاں سے آئے۔ایک قصبہ مانڈو پہنچے جہاں ایک پرانا قلعہ ہے وہاں کچھ پرانے آثار موجود تھے۔ایک طرف تو باز بہادر کا محل تھا۔

اس سے کچھ دور دوسری طرف روپ متی کا مزار تھا۔ باز بہادر اور روپ متی کی کہانی کچھ یوں ہے کہ روپ متی ایک ہندو شہزادی تھی۔ باز بہادر ایک مسلمان بادشاہ تھا۔ دونوں ہی میں قدر مشترک موسیقی تھی۔ دونوں موسیقی کے دلدادہ تھے۔ دونوں کی اس حوالے سے قربت ہوئی اور پھر شادی ہوئی۔ لیکن اس کا انجام ٹریجڈی پر ختم ہوا۔ ہم ایک محل کے اوپر گئے اور وہاں سے دوسرے محل کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور تصور میں ہم سب تاریخ کے اس دور میں پہنچ گئے۔ ہم میں سے ہر شخص نے اپنے آپ کو باز بہادر اور اس طرف روپ متی کو موجود پایا۔

ہم نے گائیڈ سے تفصیل کے ساتھ یہ کہانی سنی۔ یہ کہانی وہاں کے بچے بچے کو از بر یاد ہے ۔حالانکہ دونوں الگ الگ مذہبوں سے تھے اور وہاں پر ہندو اور مسلمان دونوں طرح کے لوگ موجود تھے۔ لیکن اس کہانی کے بارے میں ہم نے ہندو یا مسلمان کسی میں بھی اختلاف رائے نہیں پایا۔ شاید اس کہانی کو روحانیت میں بھی لے جایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے Artistic معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے درمیان موسیقی کا پل تھا۔ وہاں کے لوگ جن میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس داستان کو فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔

ہم نے وہاں بادشاہ کے محل کے علاوہ رانیوں کی آرام گاہیں اور تالاب بھی دیکھے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ کسی راجہ کی داستان سنائی جاتی ہے کہ اس کی بہت سی رانیاں تھیں۔ وہاں پر برگد کا ایک بہت بڑا درخت تھا' دن کے وقت وہاں چمگادڑیں الٹی لٹک رہی تھیں۔ اس کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ یہاں کا راجہ زمانہ قدیم میں بہت اچھا راجہ تھا لیکن اس کی رانیوں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ چنانچہ اس راجہ یا بادشاہ نے انہیں بد دعا دی جس سے وہ سب چمگادڑیں بن گئیں اور ابھی تک

وہاں الٹی لٹک رہی ہیں۔ ہم اس طرح کی دیو مالائی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ پھر اندور میں وہ ٹھکانے دیکھے جہاں اہل موسیقی نے ریاض کئے۔ پھر وہاں کی خاص چیز کچلے کے درخت تھے۔ جو دواؤں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

مجھے کسی نے کہا تھا کہ اندور جاؤ تو وہاں کچلے کے درختوں پر شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں تو ان کا شہد لانا کیونکہ وہ اعصاب کے لئے بہت اچھا ہے۔ مجھے اس زمانہ میں رعشے کی شکایت تھی۔ بہت تلاش کیا اور وہ شہد حاصل کیا۔ میرے لئے اندور کی یہی سوغات تھی۔

وہیں ہمیں سنیل دت کی سربراہی میں خاص طور پر ایک مندر میں لے جایا گیا۔ اس کے بارے میں روایت یہ ہے کہ یہ سرزمین ہندو یا پھر پوری دنیا کا پہلا مندر تھا۔ یہ ایک ایسی عمارت تھی جیسی کہ ہندو طرز تعمیر کی ایک پر شکوہ عمارت ہوتی ہے اور اندر سے اس کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ بہت نیچے جا کر ایک مندر آتا ہے جس میں مورتیاں سجی ہوئی ہیں اور پجاری بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ اندر لوبان اور صندل کی خوشبوئیں مچل رہی تھیں۔ میں تو باہر کھڑا ہوا تھا لیکن سنیل دت ایک روشن خیال آدمی تھے۔ وہ مجھے ساتھ لے گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بھگوان کا گھر ہے اور سب انسانوں کے لئے ہے اس لئے آپ باہر کیوں رکتے ہیں۔ آپ تو خود دیوتا اور شاعر ہیں اس لئے اندر آیئے۔ وہ مجھے نہ صرف اندر لے گئے بلکہ اُس جگہ پر بٹھایا جہاں خاص آدمیوں کو بٹھایا جاتا ہے اور پوجا کی جاتی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر سارے رسم ورواج دیکھے۔

ویسے تو میں پہلے ہی ان کی عظمت کا قائل تھا لیکن اس سفر کے دوران اور وہاں قیام کے بعد ان کی

ساری خوبیاں کھل کر میرے سامنے آئیں تو گویا اس سفر میں مشاعرے کے علاوہ روپ متی باز بہادر کی پوری داستان اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی اور دنیا کا پہلا مندر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اس کے علاوہ کچلے کا شہد بھی زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ جس میں تھوڑی سی کڑواہٹ بھی تھی۔اس کے علاوہ وہاں کے موسیقی کے گھرانے دیکھے اور پھر راستے میں میو چھاؤنی دکھائی دی۔مجھے یاد آیا کہ جنگ کے زمانے میں ہمارے ایک عزیز وہاں ہوتے تھے کیونکہ اس زمانے میں فوجیوں کی نئی تقرریاں وہاں ہوتی تھیں۔چنانچہ وہ چھاؤنی بھی دیکھی۔

میں واپس پاکستان آیا تو اپنے ہری پور کے عزیزوں سے کہا کہ میں وہ چھاؤنی بھی دیکھ کر آیا ہوں جہاں آپ کے بزرگ کام کرتے تھے۔تو ان کی بیوی مجھ سے پوچھنے لگیں کہ بتایئے وہ کس قسم کا شہر ہے۔جب میں نے آثار بتائے تو وہ کہنے لگیں بالکل ٹھیک ہے۔

اندور کے مشاعرے کے بارے میں یہ بات بھی ہے کہ وہاں کے لوگ موسیقی سننے والے ہی نہیں بلکہ اچھے گویئے بھی تھے اور برمحل داد دیتے تھے۔پھر گویّا ہو یا شاعر داد اس کی کمزوری بن جاتی ہے اور وہ کھل کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس مشاعرے میں بھی ہزاروں آدمی تھے اور لوگوں نے خوب سنا۔مشاعرہ بہت خوب رہا اور کہا جاتا ہے کہ یہ اندور کی تاریخ کا سب سے بڑا مشاعرہ تھا۔اس کا سارا کریڈٹ سنیل دت صاحب کو جاتا ہے ۔اس مشاعرے سے جتنی آمدنی ہوئی وہ رسالہ ”فن اور شخصیت“ کو دی گئی۔اس طرح ایک ادبی پرچے کی جائز مدد بھی ہو گئی۔

میرٹھ میں نوچندی کا مشاعرہ

میر ٹھ میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے جسے نوچندی کا میلہ کہا جاتا ہے۔ یہ میلہ ہمہ گیر قسم کا ہوتا ہے اور کئی دن تک رہتا ہے۔ اس میں مختلف تماشے' ناچ گانا اور رنگارنگ پروگراموں کے علاوہ ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا کرتا ہے۔ اس میلے میں دور تک باقاعدہ بازار بنے ہوتے ہیں جن میں سے دنیا کی ہر چیز ملتی ہے۔ آس پاس کے لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور وہاں آکر کھیل تماشے دیکھتے ہیں اور خرید و فروخت کرتے ہیں۔

مجھے بھی وہاں نوچندی کے ایک مشاعرے میں ایک بار جانے کا موقع ملا۔ میں دہلی گیا ہوا تھا جہاں میں اس مشاعرے میں شرکت کیلئے میر ٹھ گیا۔ اس میلے میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ایسا ہی ہنگامہ مشاعرے میں بھی برپا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دس بیس آدمیوں کی ایک ٹولی ایک طرف سے آتی ہے اندر جھانکتی ہے اور دوسری طرف سے باہر نکل جاتی ہے۔ کسی کو مشاعرہ پسند آتا تو بیٹھ جاتا ورنہ آگے چل دیتا۔ غرضیکہ لوگ یوں آجا رہے تھے جیسے یہ مشاعرہ نہیں بلکہ کوئی ورائٹی شو ہو۔ بہر حال ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اگرچہ سامعین بدل رہے تھے لیکن داد اسی طرح چل رہی تھی۔ وہاں سے مجھے تین ساڑھے تین ہزار روپے کا جو معاوضہ ملا وہ بہت زیادہ رش ہونے کی وجہ سے کسی نے میری جیب سے نکال لیا۔ میں نے شرم کے مارے کسی کو بتایا بھی نہیں کیونکہ شاعروں سے ایسی بہت سی داستانیں وابستہ ہیں کہ وہ جھوٹ موٹ کی چوری کا بہانہ گھڑ کے دوبارہ معاوضہ بھی لے لیتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا۔ واپسی کے لیے چونکہ گاڑی کا انتظام تھا۔ اس لئے چپکے سے میں واپس آگیا۔ یہ تلخ تجربہ میر ٹھ میں ہوا۔

ایک اور تلخ تجربہ جے پور کے مشاعرہ میں ہوا۔ یہاں کا مشاعرہ بہت ٹھاٹھ کا تھا۔ اس میں بھی گائیڈ

کنور مہندر سنگھ بیدی تھے۔اصل میں ہم لوگ مشاعرے کے لئے انبالہ گئے تھے جہاں سے مجھے دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے کے لئے آنا تھا۔ ساتھ کچھ پاکستانی شعراء تھے جن میں انور مسعود بھی شامل تھے۔ان دو تین شاعروں کو ہم وطن ہونے کی وجہ سے میں نے پورے مشاعرے کیلئے بک کروادیا تھا۔ہم وہاں گئے اور مشاعرہ پڑھا۔یہ شکر کرتا ہوں کہ وہ وہاں اچھے رہے۔ وہ اچھے شعراء تھے میں نے تو صرف سفارش کی تھی۔ویسے بھی میں ایسے لوگوں کی سفارش نہیں کرتا جو اچھا کلام نہ کہتے ہوں کیونکہ عزت کا سوال ہوتا ہے۔

وہاں ہمیں جودھا بائی کے بھائی راجہ مان سنگھ کا محل دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یہ راجہ اکبر اعظم کے سالے تھے۔یہ محل بہت بڑا تھا اور ہم نے سوچا کہ اگر راجہ مان سنگھ کا محل اتنا بڑا ہے تو شہنشاہ اکبر اعظم کا محل کتنا بڑا ہو گا۔وہ محلوں کا شہر ہے اور وہاں اور بھی بہت سے راجاؤں کے محل ہیں۔بازار سے گزریں تو دورویہ ایسی عمارتیں ہیں جو محل ہی کا ایک حصہ دکھائی دیتی ہیں۔

اس مشاعرے کے منتظم راہی شہابی تھے۔ان کی خوبی یہ تھی کہ انہیں سو پچاس اشعاریوں ہی یاد ہوتے تھے۔وہ نظم کے شاعر ہیں' بڑی اچھی نظم کہتے ہیں اور پھر پوری کی پوری نظم زبانی سناتے چلے جاتے ہیں۔بہت جوش ولولے سے کلام پڑھتے ہیں۔ہمیں اس مشاعرے میں بہت سے راجستھانی شاعروں سے کلام سننے کا موقع ملا۔اس مشاعرے میں ایک راجستھانی خاتون شاعرہ بھی شریک تھیں۔یہ شروع میں راجستھانی زبان میں شعر کہتی تھیں لیکن بعد میں انہوں نے اُردو میں شعر کہنے شروع کئے۔انہوں نے وہاں کمال کرکے دکھایا اور مشاعرے کو لوٹا۔

ایک شاعر سٹیج پر آئے اور انہوں نے مزاحیہ انداز میں کلام سنانا شروع کیا۔ان کی نظم میں مشاعرے

کے تقدس کے بارے میں کچھ نئے مضامین شامل تھے جن سے انہوں نے ثابت کیا تھا کہ مشاعرہ کوئی لہو ولعب قسم کی چیز نہیں ہوتی بلکہ یہ بڑے محترم اور مکرم لوگوں سے اظہار خیال کی جگہ ہوتی ہے اور بڑی مقدس جگہ ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ مضمون تھا جب یہ مشاعرہ ختم ہوا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے اپنا جوتا تلاش کرنا شروع کیا لیکن وہاں میرا جوتا موجود نہیں تھا۔ اب جوتے کی روایت تو یہ ہے کہ :

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

لیکن اب جوتے کی چوری کی بات مسجد سے نکل کر مشاعرے تک آگئی تھی۔ اب وہ جو شاعر ہ گاہ کو ایک مقدس جگہ بیان کر رہے تھے میرے ذہن میں ان کا خیال آگیا اور مجھے ان کی بات کا یقن آگیا کہ یہ مشاعرہ گاہ مسجد سے پیچھے نہیں ہے۔ وہاں سے بھی جوتے چرائے جاتے ہیں اور یہاں سے بھی جوتا چرایا گیا۔

خوشتر گرامی

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہونے والی جنگوں سے پہلے دہلی میں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ 1956ء سے لے کر 1961ء تک باقاعدہ رہا۔ یوں وہاں کثرت سے آنا جانا رہا اور اس دوران وہاں دہلی کلاتھ مل کے مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ دہلی کلاتھ مل والوں کی لائل پور میں بھی ایک کلاتھ مل تھی جسے لائل پور کاٹن مل کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ ہر سال بہ اہتمام ایک ہندو پاک مشاعرہ

باقاعدگی سے دہلی میں کرواتے تھے اور ایک مشاعرہ لائل پور میں کرواتے تھے۔اس طرح ادھر کے شاعر ادھر اور ادھر کے شاعر ادھر کثرت سے آتے جاتے تھے۔

میں ایک ایسا شاعر تھا جسے ہر مشاعرے میں دونوں جگہ بلوایا جاتا تھا۔اس زمانے میں روی چوپڑا دہلی کلاتھ مل کے پبلک ریلیشنگ آفیسر تھے۔یہ لاہور کے رہنے والے تھے اور لاہور کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔اس کے بھائی یہاں سیکرٹری لیول کے آدمی تھے۔یہ لڑکی گلبرگ کی رہنے والی تھی اور سب ماڈرن لوگ تھے۔اس لئے جب شادی ہوگئی تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوا۔دہلی میں بھی یہ میاں بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔

ان کے علاوہ اس کلاتھ مل کے لاہور ہی سے متعلق ایک اور معتمد افسر ساہنی تھے۔ ان دونوں افسران کی وجہ سے وہاں کے مشاعرے میں بڑی گھما گھمی ہوتی تھی۔ ایک تو دہلی کلاتھ مل والے شاعروں کو اچھے ہوٹلوں میں ٹھہراتے تھے اور دوسرے کھانے وغیرہ کا خاص انتظام ہوتا تھا۔وہاں مشاعرے کی بھی دو الگ الگ نشستیں ہوتی تھیں ایک مزدوروں کے لئے اور دوسری خاص خاص لوگوں کیلئے۔ مشاعرہ بہت بڑے پنڈال میں ہوتا تھا۔

جو عورتیں مل والوں کی طرف سے ہوتی تھیں وہ اپنی جگہ۔لیکن اس کے علاوہ روی چوپڑا اور ساہنی صاحب بھی اپنے اپنے ہاں پاکستانی شاعروں اور اپنے دوست ہندوستانی شاعروں کو دعوت پر بلواتے تھے۔افسوس یہ ہے کہ پچھلی بار جب میں تین سال پہلے دہلی مشاعرے میں گیا تو یہ دونوں صاحبان فوت ہو چکے تھے۔ان لوگوں کے پاکستانی سفارتخانے کے افسروں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔یہ

1961ء سے پہلے کی بات ہے۔اس زمانے میں ایک دعوت سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹریوں کی طرف سے اور ایک دو دعوتیں سفارت خانے ہی کے دوسرے ایک دو افسروں کی طرف سے ہوتی تھیں۔ان دعوتوں میں گھریلو ماحول ہوتا تھا اور چھوٹی چھوٹی نشستیں ہوتی تھیں۔اسی طرح ہم لوگ مشاعرے کے بعد بھی وہاں ہفتہ عشرہ گزارتے تھے۔

دہلی میں اور اچھے لوگوں کے علاوہ خوشتر گرامی کی ذات بڑی دلچسپ تھی۔وہ رسالہ "بیسوی صدی" کے ایڈیٹر تھے۔یہ رسالہ شروع میں لاہور سے نکلا تھا لیکن پارٹیشن کے بعد یہ پرچہ اور خوشتر گرامی دونوں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ان کے سالک صاحب سے لے کر نیچے تک سبھی لوگوں سے تعلقات تھے اور ان کے دوستوں کی اکثریت لاہور ہی سے تھی جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ان کی خصوصیت یہ تھی کہ شراب سے نفرت کرتے تھے اور گوشت سے محبت کرتے تھے۔مچھلی اور مرغی ان کا من بھاتا کھانا تھا اور وہ اقبال کے اس شعر کو تحریف کر کے پڑھا کرتے تھے۔اصل شعر تھا :

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی

وہ کہا کرتے تھے :

مری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
تری دنیا فغانِ صبح گاہی

وہ کسی کی دعوت کرتے تھے تو رقعہ میں لکھتے تھے کہ امید ہے کہ آپ اس دعوت مرغ و ماہی میں

تشریف لائیں گے۔ وہ کثرت سے مرغ اور مچھلی پکایا کرتے تھے۔ میں نے ان کی دعوت تو بہت سی کھائی ہوئی تھیں۔ لیکن غلط فہمی کی بناپر انہوں نے جس دعوت کا اہتمام کر دیا وہ ایک اور ہی دعوت تھی۔

میرے ساتھ میرے سندھ کے ایک دوست فضل علی شاہ جاموٹ تشریف لے گئے۔ ان کی سندھ کی ایک بڑی فیملی ہے۔ انہیں فلم میکنگ اور اداکاری کا بہت شوق تھا۔ یہ ایس گل کے نام سے فلم انڈسٹری میں آئے۔ فلم "بیقرار" بنائی پھر "التجا" اور ایک دو دوسری فلمیں بھی بنائیں۔ میرے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی تھے اور کاروباری تعلقات بھی۔۔ ان کے ساتھ ایک بار طے پایا تھا کہ ہم دہلی جائیں گے اور وہاں کی سیر کریں گے۔ چنانچہ جب ہم دہلی گئے تو خوشتر صاحب سے ملنے کیلئے دہلی گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ جب ایک چیز کا ذکر آجائے تو وہ اس کا پورا شجرہ نسب بتا کر بات ختم کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر وہ پوچھتے کہ چائے پئیں گے۔ ہم کہتے پئیں گے۔ اب وہ چپڑاسی کو بلاتے اور کہتے کہ کرپارام ادھر آؤ۔ اسے کہتے کہ یہ مہمان لاہور سے آئے ہیں۔ پھر پوچھتے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں وہ کہتا کہ لاہور سے۔ پھر کہتے کہ لاہور میرا وطن ہے اور یہ پاؤڈر والی چائے نہیں پئیں گئے۔ اس لئے تم فلاں حلوائی کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ خوشتر صاحب کے مہمان لاہور سے آئے ہیں ان کیلئے چائے بنانی ہے۔ اور دودھ چاہیے جو پاؤڈر والا نہ ہو۔ جب چپڑاسی رخصت ہو اور دروازے تک پہنچا تو اسے دوبارہ آواز دی "کرپارام " میں نے کیا کہا تھا وہ پوری بات دہرائے گا پھر چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد کہنے لگے اس کو جس حلوائی کے پاس بھیجا ہے' آپ کو اس کے بارے میں بتاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ لوہاری دروازے کے اندر رام چند

حلوائی ہوتا تھا۔ وہ پارٹیشن کے بعد یہاں آگیا تھا اور اب مر گیا ہے۔ یہ اسی کا بیٹا ہے۔ ان کی دوکان بہت چلتی ہے کیونکہ یہ گوالوں سے دودھ نہیں لیتے بلکہ انہوں نے اپنی بھینسیں رکھی ہوئی ہیں اور جب آدمی دودھ دوہتا ہے تو یہ خود سر پر کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان کی چالیس بھینسیں ہیں جن میں سے اتنے من دودھ نکلتا ہے۔ اس نے دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرنا گناہ سمجھا ہوا ہے اور سرکاری آدمی لوگوں کے سامنے آکر ان کا دودھ ٹیسٹ کرتا ہے۔ پھر اس دودھ سے اس کی جو مٹھائیاں بنتی ہیں ان کا تو جواب نہیں۔

غرضیکہ ایک اتنی لمبی چوڑی داستان سنانے کے بعد کہنے لگے کہ یہ دودھ وہاں سے آئے گا۔ پھر دودھ کے آتے آتے جو مٹھائی منگوا رہے تھے اس کا شجرہ نسب مجھے سنا دیا۔ غرض جب تک چائے تیار ہو گی وہ چائے کے اجزاء اور چائے کے ساتھ پیش کی جانے والی اشیاء کے شجرہ نسب بیان کرتے رہیں گے۔

اس بار جب ان کے پاس گئے تو وہ ہمیں دعوت کا کہنا بھول گئے اور اپنے دل میں بات نہیں آسکتی تھی۔ اس لئے ہم ملاقات کے بعد ان کے پاس سے اُٹھ کر آ گئے۔ اگلے دن ہم اپنے پروگرام کے مطابق گھومے پھرے اور شام کو کسی دوست کے ہاں دعوت بھی کھائی۔ اس سے اگلے دن ہم ایک اور تقریب میں گئے تو کچھ دوستوں نے سخت شکایت کے لہجے میں کہا کہ آپ نے خوشتر صاحب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ انہوں نے کل رات آپ لوگوں کے لئے دعوت کا بندوبست کیا ہوا تھا لیکن آپ آئے ہی نہیں اور کہنے لگے کہ انہوں نے تو آپ کے اعزاز میں اتنے آدمی بھی بلا رکھے تھے۔

ہم اسی وقت خوشتر صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ ہمیں لوگوں میں کیوں بدنام کر رہے

ہیں۔ آپ نے کب ہماری دعوت کی تھی۔کہنے لگے کہ پرسوں جب آپ آئے تھے تو میں نے آپ سے کہا تھا۔ ہم نے کہا کہ جی آپ نے کب کہا تھا۔آپ تو مٹھائیوں کا شجرہ نسب اور دودھ کی ذات پات بتاتے رہے تھے۔کہنے لگے کہ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے آپ کو دعوت کا نہ کہا ہو۔ میں نے تو آتے ہی آپ سے یہ کہا تھا۔

خیر جب ٹھنڈے ہوئے تو لطیفوں پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ رات جب بہت دیر انتظار کے باوجود آپ لوگ نہیں آئے تو جن دس پندرہ دوسرے دوستوں کو میں نے بلوایا ہوا تھا۔انہیں کھانا کھلا کر رخصت کر دیا اور خود پھر بھی آپ لوگوں کا انتظار کرتا رہا۔اس دوران ہمارے ایک اور دوست آگئے۔میں ان کا نام یہاں نہیں بیان کروں گا کیونکہ وہ بہت معزز آدمی تھے۔تو کہنے لگے کہ ان دوست کو میں نے آپ لوگوں کے دعوت میں نہ آنے کا واقعہ سنایا۔وہ سن کر پریشان ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں نے قتیل صاحب اور ان کے دوست کا کھانا ابھی تک رکھا ہوا ہے مگر وہ نہیں آئے اور اب تو میں وہ کھانا کتوں کو ڈالنے والا تھا۔اب آپ آگئے ہیں تو آپ کھالیں۔

خوشتر صاحب کے علاوہ دہلی کی ایک اور عورت بھی مجھے ابھی تک یاد ہے۔کلیم عثمانی صاحب دہلی کے رہنے والے ہیں۔ان کے عزیز اب بھی وہاں آباد ہیں۔ایک بار ہم اس دہلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں وہاں گئے۔ویسے تو ہم موتی محل ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔دہلی کے کھانوں کی بات چلی تو انہوں نے کہا کہ میرے کچھ عزیز کل بھی اصرار کر رہے تھے کہ کیوں نہ ان کی دعوت قبول کر لی جائے۔میں ان دنوں ماہنامہ ’’شمع‘‘ والوں کی کوٹھی کے Diplomat Enclave

میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کوٹھی نئی نئی بنی ہوئی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ اسے دیکھنے کیلئے آتے تھے۔ ''شمع'' والوں نے مجھے ٹھہرا رکھا تھا اور باقی لوگ زیادہ تر موتی محل ہوٹل میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہم کلیم عثمانی صاحب کے ساتھ ان کے کسی عزیز کے ہاں کھانے کے لئے گئے تو دیکھا کہ سب کھانا ایک سے ایک بڑھ کر لذیذ تھا۔ ہر کھانے میں الگ طرح کی مرچیں اور مصالحے استعمال کئے گئے تھے۔ اگر ایک ڈش میں سبز مرچوں کا گوشت ہوتا تو دوسروں میں سرخ مرچ یا کالی مرچ کا۔ کھانے سبھی لذیذ تھے اس لئے میں کھاتا چلا گیا۔ اس زمانے میں میری خوراک بھی اچھی خاصی تھی لیکن خوراک سے بھی زیادہ کھا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب میں رات کے گیارہ بارہ بجے ''شمع'' والوں کے ہاں پہنچا تو وہ سوئے ہوئے تھے۔ میں سیدھا مہمان خانے والے کمرے میں چلا گیا اور سو گیا۔ تقریباً دو بجے رات میرے معدے میں زندگی کا شدید ترین درد اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی انتڑیوں میں بھی شدید جلن ہونے لگی۔ میں بے چین ہو گیا۔ سمجھ نہ آئی کہ کیا کروں۔ کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ کسی اور سے رابطہ ہی نہیں تھا۔ پھر مجھے بھی حجاب محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے اس پہر میں دوسرے کمروں کے دروازے کیوں کھٹکھٹاؤں۔ احتیاط میں نے پانی شروع کیا اور پانی پی پی کر وقت گزارا۔ اس سے کوئی افاقہ تو نہ ہوا لیکن وقت گزرتا رہا۔ جب پو پھٹی تو میں باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھا اور ڈرائیور سے کہا کہ اُردو بازار کی طرف لے چلو۔ وہاں میں نے ایک دودھ دہی والے کی دوکان پر ٹیکسی رکوائی اور آدھ

سیر دہی اور ایک پاؤ دودھ کی لسی بنوائی۔ دوکاندار میری طرف غور سے دیکھنے لگا کیونکہ وہاں آدھ سیر دہی کا شاید دستور نہیں ہوگا۔ یہ لسی وہاں سے پی کر میں واپس آیا۔ اتنی دیر میں میرا پیٹ بھی چل گیا۔ اسی اثناء میں یونس دہلوی بھی وہاں آئے۔ میرا رنگ پیلا دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا ہوا۔ میں نے سارا واقعہ سنایا تو پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے خبر رات ہی میں کیوں نہیں کی۔ میں اس معدے کے درد اور انتڑیوں کی جلد کا علاج تقریباً دو تین ماہ تک کرواتا رہا۔ تب کہیں جا کر صحت یابی ہوئی۔

نظام الدین اولیاء کا مزار

میں مزار پرست نہیں ہوں لیکن اس لحاظ سے میں مزاروں پر چلا بھی جاتا ہوں کہ میرا مقصد وہاں جانے کا وہ نہیں ہوتا جو بعض شرک میں مبتلا لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ لوگ مزار سے کچھ مانگنے جاتے ہیں۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ میرے ذہن میں تو مزار والے بزرگ کی وہ زندگی ہوتی ہے جو وہ اپنے وقت میں گزار چکا ہوتا ہے۔ جس میں انہوں نے لوگوں کی اصلاح خدمت خلق اور اشاعت دین کی کوشش کی ہوتی ہے۔ تو میں ان خدمات کی وجہ سے اس کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ہوں۔

اس بار جب میں دہلی گیا۔ یہ غالباً 1981ء کی بات ہے تو میں نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر اس خیال سے گیا کہ ان کے ساتھ ہی امیر خسرو کے مزار پر جاؤں گا۔ پھر اس کے ساتھ ہی غالب کا مزار اور غالب اکیڈمی کا دفتر بھی تھا۔ وہاں جا کر یہ سب چیزیں ایک ساتھ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر خواجہ حسن نظامی ثانی متولی ہیں۔ ان سے پہلے ہی ملاقات ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے فون کر کے انہیں کہا کہ ہم آ رہے ہیں۔

ہم وہاں پہنچے تو میری بیوی بہت خوش ہوئی کہ ہم اتنے بڑے بزرگ کے ہاں آئے ہیں۔ میں خود

بھی خوش تھا۔ میں خواجہ حسن نظامی ثانی کو ساتھ لے کر خاص طور پر امیر خسرو کے مزار کے اندر گیا اور وہاں جا کر بیٹھ کر میں نے لمبی دعا کی جو یہ تھی کہ یا اللہ جتنا بڑا شاعر، خلاق اور نباغ یہ شخص ہے جو اس قبر میں لیٹا ہوا ہے اور جتنا نام اس نے پایا ہے مجھے اس کا عشرِ عشیر دے دے۔ میں نے وہاں یہ دعا مانگی اور دعا کے بعد دل میں بڑا اطمینان لے کر اٹھا۔

اس کے بعد پاکستان میں آ کر میں نے امیر خسرو کی ایک فارسی نظم سے تاثر لے کر اُردو میں ایک نظم کہی۔ خدا جانے دعائیں قبول ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں لیکن اس دعا کے بعد دل کو بہت سکون ملا کہ میں نے اللہ سے جو مانگا ہے بڑا مناسب اور واجبی سا مانگا ہے۔ جس شخص کو خوبیوں میں سے میں نے ایک ریزہ مانگنے کی کوشش کی ہے مجھے یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اگر میری دعا قبول ہو چکی ہے تو زہے نصیب اور اگر قبول نہیں ہوئی تو اب بھی میری خدا سے دعا یہ ہے کہ وہ میری یہ دعا پوری کر دے۔

جج سنگھ

1950ء کے بعد میں، میری بیوی اور میرا بیٹا انڈیا گئے تو اندر جیت آرٹسٹ جواب امروز کے نام سے پہچانا جا رہا ہے، سے بھی ملے۔ اب امرتا پریتم سے اس کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں میاں بیوی بڑی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس زمانے میں ان دونوں کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی لیکن اکٹھے رہ رہے تھے۔ امرتا پریتم ان دنوں اپنی اس نظم سے بہت شہرت حاصل کر چکی تھیں کہ:

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتھے قبراں وچوں بول

میں جب وہاں گیا تو امرتا پریتم سے ملاقات کی خواہش بھی دل میں تھی۔ جب اندر جیت نے دعوت بھی دے دی تو ہم ان کے ہاں گئے۔ امرتا پریتم کو سب لوگ پیار سے ''امی'' کہتے تھے۔ میں نے

اپنی بیوی سے امرتا پریتم اور اندرجیت کا تعارف بطور میاں بیوی کروایا تھا۔ لیکن اندرجیت اسے جب امی کہہ کر پکارتے تو میری بیوی حیران ہو کر میری طرف دیکھتی۔ خیر وہ بولی کچھ نہیں۔ جب ہم دعوت سے واپس آئے تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ میاں بیوی ہیں لیکن خاوند بیوی کو امی کہہ رہا ہے۔ میں بڑا ہنسا اور اسے ساری بات سمجھائی۔ یہ امرتا پریتم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

دہلی میں دو بڑے آدمیوں سے بھی میری ملاقات ہو گئی اور ان کے ساتھ جو لطیفے ہوئے وہ بھی خوب ہیں۔ یہ دہلی کلاتھ ہی کا مشاعرہ تھا۔ ایک مشاعرے میں حضرت فراق گورکھپوری تشریف فرما تھے اور وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے سینئر تھے لیکن ان سے دستور جیسے بے تکلفانہ تعلقات بن گئے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق بھی ہونے لگے۔ یہ مذاق بڑی راز کے نوعیت کے بھی ہوئے جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے البتہ ایک لطیفے کا ذکر کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہوں گا کہ اتنا بڑا آدمی بے تکلفی میں یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ بڑا تو چھوٹوں سے بے تکلفی برت جائے لیکن جب کوئی چھوٹا زندہ دلی کی بات کرے تو وہ برا مان جائے۔ وہ قطعاً برا نہیں مانتے تھے۔

ہوایوں کے مشاعرے سے کچھ وقت پہلے ہم شاعر دہلی کلاتھ مل کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ فراق صاحب ہی جیسا ایک آدمی وہاں موجود تھا جو مل والوں کا چوکیدار یا دربان تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لٹھ لئے' بالے ڈالے کرسی پر بیٹھا وہی حرکت کر رہا تھا جو فراق صاحب کر رہے تھے۔ یہ وہی حرکت تھی جو ہر وہ آدمی کرتا ہے جس کے دانت نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کے دانت نہیں ہوتے وہ جب بات نہ کر رہے ہوں تو یوں منہ کو ہلاتے ہیں جیسے کوئی چیز کھا رہے ہوں۔ ادھر فراق صاحب یہ حرکت کر رہے تھے ادھر وہ بھیا وہی حرکت کر رہا تھا۔ میں نے آس پاس کے ایک دو شاعروں سے

کہا کہ میں ذرا فراق صاحب سے دل لگی کرتا ہوں۔ میں گیا اور کہا کہ فراق صاحب! مجھے اس وقت بہت غصہ آرہا ہے۔ کہنے لگے کس بات کا؟ میں نے کہا بس جانے دیجئے۔ آپ مجھے روکئے نہیں۔ کہنے لگے لیکن بات کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو انتہا ہو گئی ہے کیونکہ اگر کوئی ہمارے بزرگوں سے مذاق کرے تو ہم چپ نہیں رہ سکتے۔ کہنے لگے کہ کون مذاق کر رہا ہے اور کس سے مذاق کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ دیکھئے سامنے جو بھیا بیٹھا ہے وہ آپ کی نکل کر رہا ہے۔ انہوں نے پہلے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی ہوں کی۔ پھر ہنس کر مجھے کہنے لگے کہ بد معاشیوں سے باز آجاؤ۔ پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ اب تمہارا میری طرف ایک نمبر ہو گیا ہے۔ اسے چکا لیں گے۔

دوسرا لطیفہ حضرت یاس یگانہ چنگیزی سے متعلق ہے۔ ان سے جب میری ملاقات ہوئی تو پہلی ہی ملاقات میں کہنے لگے کہ یار میں نے ایسا قتیل پہلی بار دیکھا ہے جو مردہ نہیں ہے بلکہ باقاعدہ باتیں کر رہا ہے۔ یا پھر ایک ایسا مردہ ہے جو چل پھر بھی رہا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہے۔ میں نے کہا جی ٹھیک ہے میں نے بھی ایسا چنگیزی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جس کے ہاتھ میں نہ تو تلوار ہو اور نہ ہی تیر کمان حتیٰ کہ اس وقت تو آپ کے ہاتھ میں قلم بھی نہیں ہے۔ وہ میرا جواب سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ تم صوبہ سرحد سے ہو اور وہاں ہی ایسے زندہ دل لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ وہاں جا کر دیکھئے۔ آس پاس سے زندہ دلیاں آپ کو گھیر لیں گی۔ وہ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔

ایسے بزرگ اس دنیا میں اب کہاں۔ اب تو اپنے کسی ہمعصر سے بھی دل لگی کر لو تو وہ دشمنی پر اتر آتا ہے اور جب تک دس بارہ آدمیوں میں آپ کی برائی نہ کر لے اسے چین نہیں آتا۔

دہلی کے اور دوستوں میں ایک Typical دوست سے اس وقت علیک سلیک ہوئی جب میں نے

شروع شروع میں وہاں کے مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ان صاحب کا نام اوتار سنگھ ہے لیکن جج سنگھ کہلواتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے نوجوان تھے اور ادب سے شغف رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے انہیں بھارتی ٹیلی ویژن پر دیکھا وہ کچھ پروگراموں کی کمپیئرنگ بھی کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس سے پہلے جب مجھ سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ معاشی چکر میں مبتلا تھے۔ پھر انگلینڈ میں جاکر ملازمت بھی کرتے رہے۔ وہاں سے مالی حالت ٹھیک کر کے واپس انڈیا آگئے اور آکر گھریلو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں جب پچھلی مرتبہ گیا تو ان سے اور ان کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ان کی بیوی بہت اچھی ہیں۔بچے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہر بار جب میں مشاعرے میں جاتا تھا تو جو لوگ میرے ساتھی وہاں دن رات کے بنتے تھے ان میں جج سنگھ بھی شامل ہوتے تھے۔ بعد میں جب دونوں ملکوں میں جھگڑے ہوئے تو ہمارا انڈیا آنا جانا منقطع ہو گیا۔ آخر میں جب شملہ معاہدہ ہوا تو انڈیا ٹی وی نے کچھ لوگوں کو ٹیلی ویژن پر بلانے کا اہتمام کیا۔ان میں کچھ لوگ کچھ پاکستانی دوستوں کی یادیں تازہ کرنے کیلئے کچھ کلمات کہا کرتے تھے اور کچھ پیغامات بھی دیا کرتے تھے۔

ایک دن انارکلی کی طرف نکل گیا تو جدھر جاؤں لوگ مجھے روک کر کہتے تھے کہ قتیل صاحب رات امرتسر ٹیلی ویژن پر دیکھا کہ ایک سردار صاحب جن کا نام یاد نہیں وہ بازو پھیلا پھیلا کر کہتے تھے کہ لاہور میں میرا ایک یار ہے قتیل شفائی۔ جسے ملے اس سے کہے کہ مجھے خط لکھے اور میرا اسلام بھی دے۔ میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سے سردار صاحب ہیں۔اب یہ بات مجھے سات آٹھ آدمیوں نے بتائی تھی لیکن کوئی بھی نام نہیں بتاتا تھا۔ میرا ذہن سردار دوستوں میں نہ تو کنور مہندر سنگھ بیدی کی طرف گیا اور نہ ہی جتندر سنگھ کی طرف گیا کیونکہ وہ اس ٹائپ کے لوگ نہیں تھے اور

ویسے بھی ان سے خط و کتابت تھی۔ ان سے میرا رابطہ تھا لیکن اس وقت تک میں نہیں سوچ سکا کہ یہ جج سنگھ ہوں گے۔

اگلے ہفتے امرتسر ٹی وی والوں نے پھر جج سنگھ کا پیغام ٹیلی کاسٹ کیا شاید ناظرین کو جج سنگھ کے ایکشن کے ساتھ کہے گئے الفاظ بہت پسند آ گئے تھے۔ میں اتفاق سے اس روز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جج سنگھ کو ٹی وی پر دیکھ کر بہت خوشی اور حیرت ہوئی۔ وہ اتنی وارفتگی سے ہاتھ پھیلا کر کہہ رہا تھا کہ میرا یار قتیل شفائی لاہور میں ہے۔ میں جذباتی آدمی ہوں۔ خیالوں میں اس سے لپٹا اور کتنی دیر آبدیدہ رہا کہ انسان بہر حال انسان ہے۔ ملکوں میں کچھ ہوتا رہے' ذاتی تعلقات کی ایک سطح ہوتی ہے۔ ایک فنکارانہ سطح بھی ہوتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان یہ دونوں سطحیں تھیں۔ اس کے پیغام دینے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی فریاد کر رہا ہو۔ ادھر اس کے رد عمل میں میرے جذبات ایسے تھے کہ میں نے سوچا کہ سب ملکی جھگڑوں کے باوجود خدا کا شکر ہے کہ اس نے انسانوں کو زندہ رکھا ہے۔ اگر ہماری زندگی سے انسان ہی ختم ہو جائے تو پھر یہ دنیا ویرانے سے کم نہ ہو۔

کرشن لال نارنگ ساقی اب دہلی میں بہت عرصے سے مقیم ہیں۔ ان سے پہلے پہل امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں ان کا چھوٹا سا ہوٹل تھا اور اس ہوٹل سے پہلے یہ فیروز پور سے ایک چند ورق کا معمول سا پرچہ ''ساقی'' کے نام سے نکالتے تھے۔ اس لئے یہ ساقی ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اپنے پرچے کی وجہ سے ان کا نام ساقی ہو گیا اور اب تک وہ اپنے دوستوں میں اسی نام سے

پہچانے جاتے ہیں۔ کرشن لال نارنگ سمٹ کے اب کے ایل نارنگ ہو گیا اور یہ نام صرف کاروبار ہی میں کام آتا ہے۔ عام مجلسی زندگی میں وہ ساقی ہی کہلواتے ہیں۔

پارٹیشن کے بعد ہمارا انڈیا آنا جانا شروع ہوا۔ اس زمانے میں راجہ غضنفر علی صاحب دہلی میں ہمارے سفیر تھے۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے لوگوں کو قریب لانے کیلئے کرکٹ میچ شروع کروائے تھے۔ کبھی انڈیا کی ٹیم پاکستان آتی تھی اور کبھی پاکستان کی ٹیم انڈیا جاتی تھی۔ اس طرح ادھر کے ہزاروں لوگ ادھر اور ادھر کے ادھر آتے رہے۔ انہی آنے والوں میں ایک ساقی صاحب تھے۔ وہ جب پاکستان آئے تو ان سے دوستی کی کچھ بنیاد پڑی۔ پھر جب میں امرتسر میں گیا تو دوستی کچھ اور بڑھی۔

یہ سلسلہ آہستہ آہستہ بہت خلوص میں ڈھل گیا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے مابین جھگڑوں کی وجہ سے اٹھارہ سال تک ملاقات نہ ہوئی۔ جب دوبارہ آنا جانا شروع ہوا تو دہلی میں میری ساقی صاحب کے ساتھ تجدید ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ مالی طور پر بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ پیار سے ملے۔ پھر ان کی رہائش گاہ پر مجھے ٹھہرنے کا موقع بھی ملا۔ بیوی بچوں سے بھی قربت ہوئی اور اب دہلی میں میرے قریبی دوستوں میں ساقی صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ لوگ ہم دونوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

اگر پاکستان سے میرا کوئی دوست خط لے کر دہلی جائے تو وہ یوں اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جیسے میں آ گیا ہوں۔ اسی طرح ادھر سے کوئی آئے تو اس کی خدمت میرا فرض بنتا ہے۔ ہندوستان کے

دوستوں میں بالخصوص جونیئر لوگوں میں خواہ مسلمان ہی ہوں یہ مسئلہ بن گیا ہے کہ انہیں وہاں ہندی رسم الخط میں تعلیم دی جاتی ہے۔اُردو رسم الخط جاننے والے کچھ پرانے لوگ موجود ہیں جن میں سے ایک ساقی صاحب بھی ہیں۔ان سے جب خط و کتابت بھی ہوتی ہے تو اُردو میں ہوتی ہے کیونکہ ان کا واسطہ اُردو سے ٹوٹا نہیں۔اگرچہ کاروبار میں وہ دفتر میں ہندی اور انگریزی کا استعمال کرتے ہیں لیکن جہاں بھی کوئی اُردو جاننے والا ہوتا ہے' اس سے اُردو ہی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔وہ اُردو کو آگے بڑھانے کی بھی دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور ایسا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے جس میں اُردو زبان یا اُردو شاعر کی خدمت کر سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ ان کی بعض تجاوز ہم اُردو والوں کی طرف سے پوری نہ ہو سکیں ورنہ ان کا تو کہنا یہ تھا کہ اُردو کے مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب چھاپا جائے۔جس میں خصوصاً پاکستانی شعراء کا کلام ہو۔ساتھ ساتھ اسے ہندی سکرپٹ میں بھی پیش کیا جائے تاکہ اُردو شعراء کو ہندی پڑھنے والے بھی پڑھ سکیں۔اگر انہیں ان شاعروں کو مزید پڑھنا ہو تو وہ اُردو رسم الخط کی طرف بھی آئیں۔مجھے انہوں نے تجویز بھی دی تھی کہ ہم پاکستان میں عدم صاحب کے کلام سے شروع کرتے ہیں۔پہلے ہم ان کے کلام کا انتخاب اُردو میں چھاپیں گے اور جب اسے بیچ لیں گے تو اسی آمدنی سے کسی اور شاعر کا کلام چھاپیں گے۔

یہ تجویز میں نے ان کے بیٹے عابد کو دی تھی اور کوئی ایک سال تک انہیں یاد دہانیاں بھی کراتا رہا۔یہ انکم ٹیکس آفیسر تھے۔ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے انسپکٹر صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ وہ عدم صاحب کی کتابیں اکٹھی کر کے دے اور جونہی وہ یہ کتابیں اکٹھی کر کے دے گا تو وہ یہ سب کتابیں میرے سپرد

کر دیں گے۔ وہ شخص نہ تو آج تک وہ کتابیں اکٹھی کر سکا اور نہ ان میں سے انتخاب کر کے ان کا منتخب کلام ساقی صاحب کے حوالے کر سکا ہوں۔ عابد صاحب کے تو عدم صاحب والد تھے اور وہ نفع نقصان کا جانتے ہوں گے' اس میں میری بھی کوتاہی شامل ہے کہ میں کسی اور ذریعے سے ان کی کتابیں جمع کر کے انتخاب کر لیتا لیکن اھر بھی وہی بات ہے:

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

میرا تو اپنے معاملے میں بھی یہ حال ہے کہ بمبئ کی ایک خاتون ستی شوری نے جو وہاں کی ایک کاروباری خاتون ہیں' نے مجھے آفر دی تھی" اپنے پورے کلام کا ایک انتخاب کر کے آپ مجھے دیدیں۔ میں اسے ہندی میں ترجمہ کروا کے یہاں سے شائع کروں گی اور اس کی تقریب رونمائی بھی منعقد کروں گی اور اس طرح جو آمدن بھی ہو گی وہ آپ کو دے دوں گی۔ آپ کی اس سے یہ خدمت بھی ہو گی کہ اُردو نہ جاننے والے ہندی قارئین بھی آپ کے کلام سے آگاہ ہو جائیں گے"

لیکن یہ کام میں اپنے لئے نہیں کر سکا۔ ظاہر ہے جس طرح عدم صاحب کا کام مجھ سے نہیں ہوا اسی طرح میرا کام بھی کسی دوست سے کیسے ہوتا اور میرا تو معاملہ یہ ہے کہ روز کنواں کھودتا ہوں اور روز اپنے لئے پانی حاصل کر رہا ہوں۔ روزی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر اس سے الگ ہو جاؤں اور اپنا ہی کوئی فالتو کام اپنے ذمے لے لوں تو میرے لئے روزی کی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یہ کام بھی کسی فرصت کے وقت کیلئے چھوڑ رکھا ہے اور اس مصروف زندگی میں اور آج کل کے مشینی دور میں فرصت بھی کسے نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ تو وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں جائز طریقے سے اپنی روزی حاصل کرنا ہوتی ہے اور وہ خون پسینہ ایک کر کے اپنے گھر کو چلاتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو آسائش

کی زندگی دیتے ہیں جبکہ خود محنت کی بھٹی میں جلتے ہیں۔ مگر جو مزہ اس میں ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک انوکھی شان رکھتا ہے۔

آخر میں اب یہ کہتا چلوں کہ مجھ سے اپنے سلسلے میں اور عدم صاحب کے سلسلے میں جو کوتاہی ہو چکی ہیں ان کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے سلسلے میں ہونے والی کوتاہیوں کی تو یہ تلافی کر رہا ہوں کہ میں نے اپنے تمام مجموعے جمع کر کے اپنے دوستوں کے سپرد کر دیئے ہیں تاکہ وہ اس سے انتخاب کریں۔ ان دوستوں میں حضرت احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد اور ڈاکٹر خواجہ زکریا ہیں۔ یہ تینوں دوست انتخاب کا کام تقریباً مکمل کر چکے ہیں اور اس کے بعد میرا یہ پروگرام ہے کہ میں عدم صاحب کے کلام سے خود انتخاب کروں۔ میں وہ کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ میں اس فریضے سے بھی سبکدوش ہو سکوں جو کام ان کے ذمے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچتا ہوں کہ وہ کام میں کر جاؤں۔ اگر اب ہو سکا تو میں سمجھوں گا کہ میں بھی عدم صاحب کا بیٹا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عدم صاحب ایک ایسے بزرگ تھے کہ انہوں نے اپنی شفقتوں کے طفیل اپنے سے نیچے سب جونیئر افراد کو یہی مقام دے رکھا تھا۔ عدم صاحب کے سلسلے میں آگے چل کر کہوں گا کہ وہ کتنے 'دلچسپ' مشفق اور معصوم انسان تھے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے سلسلے میں بعض کہانیاں مبالغہ آرائی کی حد تک بڑھا کر سنائی جاتی ہیں۔

دو کمیونسٹ دوست

جن دنوں میری رہائش راولپنڈی میں تھی، حسن طاہر صاحب بھی اس زمانے میں راولپنڈی ہی

میں رہتے تھے۔انتہا پسند ہیں بلا کے‘ کسی میدان میں قدم رکھ لیں تو وہاں قدم قدم سفر نہیں کرتے بلکہ چھلانگ لگا کر منزل تک ایک ہی جست میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ایک زمانے میں جب وہ کمیونزم کی طرف مائل تھے اور پارٹی کا کام باقاعدہ کر رہے تھے تو ہمارے مکان راولپنڈی اور ہری پور دونوں جگہ ہی تھے۔ان دنوں میں ہری پور والے اپنے مکان کی بالائی منزل میں تھا جب مجھے پتا چلا کہ نیچے کوئی میرے دوست آئے ہیں جن کا نام حسن طاہر ہے۔ میں نے انہیں اوپر اپنے پاس ہی بلوا لیا۔

آتے ہی کہنے لگے ” دیکھئے قتیل صاحب ! چاہے آپ اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ میں خدا کو نہیں مانتا“

میں ہنس دیا اور میں نے کہا” طاہر صاحب ! اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہے۔یہ تو آپ جانیں کہ آپ کو خدا کو ماننا چاہیئے یا نہیں۔آپ اگر مانیں گے یا نہیں مانیں گے تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔مجھے آپ ان لوگوں میں شمار نہ کریں جو آپ کی رائے سے اختلاف کر کے آپ کو چھرا مار دیں گے۔جب تک آپ میرے پاس بیٹھے ہیں آپ میرے دوست ہیں۔اس لئے آرام سے بیٹھیں اور کھل کر بات کریں“

کہنے لگے ” نہیں میں اس لئے آپ سے یہ بات کر رہا ہوں کہ اگر آپ کو میرا خدا کو نہ ماننا گوارا ہو تو میں یہاں سے واپس چلا جاؤں“ میں نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور کہا” آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ حسن طاہر ہیں اور میں قتیل شفائی اور ہم دونوں آپس میں دوست ہیں“

ایک وہ زمانہ تھا اور ایک زمانہ اس کے بعد میں آیا۔یہ 1950 ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔میں

لاہور میں اپنے مصری شاہ گھر میں رہتا تھا۔ میں نے بیٹھک ہی میں ایک پلنگ بچھوایا ہوا تھا جس پر گول تکیہ رکھ کر میں رات کو دیر تک بیٹھا لکھا کرتا تھا۔ اس روز چونکہ گرمی زیادہ تھی میں نے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا البتہ اس کی چک گری ہوئی تھی۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے جب اچانک چک اٹھی اور دو اشخاص کچھ اس انداز سے کمرے میں داخل ہوئے جیسے ڈاکو داخل ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جبکہ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ دونوں کے سر کے بال اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ میں پہلی نظر میں تو پہچان نہ سکا لیکن غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ ایک حسن طاہر ہیں اور دوسرے مصور علی امام۔ دونوں دوستوں کو یوں اچانک سامنے پا کر بہت خوشی ہوئی۔

میں نے مذاق سے کہا" کیا آپ لوگ اس وقت سٹوڈیو سے آرہے ہیں" کہنے لگے" کون سا سٹوڈیو"

میں نے کہا" جہاں آپ میک اپ کر کے یہ داڑھیاں لگا کر آئے ہیں" سمجھ گئے اور میرے مذاق سے محظوظ ہوئے۔ بیٹھ گئے اور پھر انہوں نے بتایا کہ وہ حکومت کی نظر سے چھپے ہوئے ہیں اور انڈر گراؤنڈ ہیں۔ پھر کہا کہ ہم آج لاہور آئے ہیں اور آپ کے پاس رہائش اختیار کریں گے۔ میں نے کہا کہ بسم اللہ۔ شوق سے ٹھہریئے۔

یہاں میں پھر یہ بتاتا چلوں کہ میرا کمیونسٹ پارٹی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ لیکن میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا اور جتنی پروگریسو تحریکیں ہوتی تھیں ان میں میں عملی شکل میں بھی موجود ہوتا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی بھی ہوتی تھی۔ کمیونسٹوں سے لوگوں کو جو نفرت ہے اور کمیونزم کو

پوری طرح نہیں جانتے۔ان جیسا میرا رویہ نہیں رہا۔میرا نفرت کا رویہ تو دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں سے بھی نہیں رہا جن کا مذہب ہی میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی ہے اور وہ مذہب کو استعمال بھی کرتے ہیں۔میں سمجھتا کہ یہ ان کا طریق کار ہے۔شاید وہ بھی اسی منزل پر جا پہنچیں جہاں بائیں بازو والے پہنچنا چاہتے تھے۔ممکن ہے کہ مقصد سب کا نیک ہو۔اگر نیک نہ بھی ہو تو کبھی مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے۔میں بہر حال ہمیشہ بائیں طرف کے لوگوں سے ہمدردی رکھتا رہا ہوں۔

چنانچہ ان دونوں صاحبان کو میں نے بٹھایا۔پھر ان کے بارے میں غور سے سوچا۔اس وقت میرے پاس چار کمرے تھے اور بچے بھی چار ہی تھے۔ایک کمرے میں تو میں الگ سے اپنا ڈیرہ جما کر رہتا تھا اور اس میں بھی کسی کو مداخلت نہیں کرنے دیتا تھا۔ایک اس کے ساتھ والا کمرہ تھا جہاں میری بیوی اور بچے سب رہتے تھے۔انہی کمروں کے پیچھے دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو ہم سٹور کے طور پر استعمال کرتے تھے اور ایک کو مہمانوں کیلئے رکھا ہوا تھا۔میں نے اپنے بیوی بچوں کو پچھلے کمرے میں شفٹ کر دیا اور انہیں اپنے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرالیا جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔

یہ دن کے وقت وہیں رہتے تھے اور اگر کبھی دل چاہتا تو شام کے بعد میرے ساتھ گھوم لیتے تھے۔ علی امام جب تک جاگتے تھے۔بیٹھے واٹر پینٹنگز بناتے رہتے تھے۔حسن طاہر کوئی کتاب لے کر پڑھتے رہتے تھے اور میں حسب معمول مشق سخن کرتا رہتا تھا جو کہ میرا زندگی کا معمول رہا ہے۔ ان دنوں سی آئی ڈی میں ایک صاحب ہوتے تھے جن کا نام شوکت محمود تھا اور بلحاظ عہدہ سب انسپکٹر تھے۔یہ گوجرانوالہ کے تھے اور چونکہ میرا تعلق راولپنڈی سے تھا اس لئے اس حوالے سے میرے دوست

بن گئے تھے اور میرے پاس آتے رہتے تھے۔ان کے اصل مقاصد تو ظاہر ہے پیشہ ورانہ تھے لیکن ہوتے ہوتے ان سے کچھ دوستی بھی بن گئی تھی۔جب حسن طاہر اور علی امام میرے گھر آئے تو ان کے کوئی تیرھویں دن ان کا میرے گھر آنا ہوا۔میرے دل میں وہم پیدا ہوا کہ یہ کہیں کوئی گڑبڑ کرنے نہ آئے ہوں۔پھر جب وہ آئے تو کہنے لگے" قتیل صاحب! حسن طاہر اور علی امام لاہور میں آئے ہوئے ہیں"

میرا دل دھک سے رہ گیا لیکن میں نے سنبھلتے ہوئے کہا" اچھا تو وہ کہاں ہیں"

کہنے لگے" آپ سے مدد لینی ہے۔آپ کے ساتھ اتنے تعلقات بھی بن چکے ہیں اور یہ ایسا موقع ہے کہ میں سوچتا ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت بھی کر سکوں۔اگر آپ ان کی گرفتاری میں مدد کریں تو پیسوں کے علاوہ میں آپ کو ایک لائسنس والا پستول اور سند بھی دلوا سکتا ہوں"

میں نے کہا" جی چھوڑیئے! آپ لوگوں سے جھوٹے وعدے نہ کیا کیجئے"

کہنے لگے" لائیے ہاتھ۔یہ میرا مردوں والا وعدہ ہے" میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید انہیں پتا چل گیا ہے کہ یہ دونوں میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسی لئے یہ مجھے لالچ دے رہا ہے۔دراصل انہیں بالکل نہیں پتا تھا کہ یہ لوگ میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی وہ دونوں میرے گھر میں موجود تھے اور دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کان لگائے یہ ساری باتیں سن رہے تھے۔

میں نے کہا" اچھا جی آپ نے قول دیا ہے تو مجھے اب وہ تین دن کی مہلت دیں میں انہیں گرفتار کروا دوں گا"۔

کہنے لگے " یہ قومی کام ہے اس لئے ضرور کیجئے" خیر وہ چائے وغیرہ پی کر رخصت ہو گئے۔
بعد میں حسن طاہر اور علی امام میرے پاس آگئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سب انسپکٹر نے ہمیں دھوکہ دینے کیلئے یا کسی اور وجہ سے آج یہ ظاہر نہیں کیا کہ اسے معلوم ہے کہ یہ دونوں یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ کل ہی یہاں آ کر ان دونوں کو گرفتار کروا دے۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں آپ یہاں سے نکالئے اور کسی اور جگہ ہماری رہائش کا انتظام کیجئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔
میں اپنے ایک دوست قمر اجنالوی کے پاس گیا۔ یہ آج کل روزنامہ "مغربی پاکستان" کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ ان دنوں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کرشن نگر میں رہتے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ کوئی اور انتظام ہونے تک آپ ان دونوں کو اپنے گھر رکھیئے۔ کہنے لگے کہ بالکل بھیج دیں۔ چنانچہ میں ان دونوں کو لے کر کرشن نگر پہنچا اور ان کے گھر میں انہیں چھوڑا۔
اس کے تیسرے ہی دن قمر صاحب بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرے مکان کے آس پاس سی آئی ڈی کے آدمی گھومتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ اس لئے آپ ان دونوں کے لئے فوری طور پر کوئی انتظام کیجئے۔ میں نے شریف صاحب سے بات کی جو "انجم" رسالہ نکالتے تھے اور جن کا دفتر رائل پارک میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ انہیں لے آیئے۔ میں ان دونوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ وہاں رہنے کے بعد ان دونوں نے سوچا کہ لاہور میں چھپ کر رہنے سے کیا فائدہ ہے۔ کوئی کام کاج تو ہو نہیں رہا جبکہ انہیں تو کسانوں اور مزدوروں میں جا کر کام کرنا ہوتا تھا اور بقولِ ان کے وہ بہت سا مفید کام کر چکے تھے۔ تو اچانک انہوں نے راولپنڈی جانے کا فیصلہ کیا اور چپ چاپ

لاہور سے روانہ ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد پتا چلا کہ وہ ندی لئی کے کنارے بیٹھے کپڑے دھو رہے تھے کہ پولیس نے انہیں وہاں سے گرفتار کر لیا۔اس کے بعد وہ نظر بند بھی رہے۔ علی امام تو اس کے بعد جب حالات نارمل ہوئے تو خود بھی وہ نارمل ہوئے۔وہ کراچی میں چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے اپنے آرٹ کے فروغ کے لئے کام کیا اور اس وقت علی امام ہمارے ملک کے بڑے آرٹسٹوں میں سے ایک ہیں اور بڑی متوازن زندگی گزار رہے ہیں۔ان کی گھریلو زندگی ہی نہیں بلکہ فنی اور سوشل زندگی بھی بڑی خوبصورت ہے۔ حسن طاہر صاحب کو کچھ عرصہ بعد دیکھا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ رہے ہیں اور مذہب کی ذرا سی بھی بات کیجئے تو اس جوش و جذبے کے ساتھ مذہب کی حمایت شروع کر دیتے ہیں جیسے وہ کمیونزم کے حق میں بات کرتے تھے۔ جیسے کہ میں نے کہا کہ وہ ہر میدان میں انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں۔ نمازی بننے کے کچھ عرصہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار ہوئے۔وہ اپنی پوری سروس گزار کر اب ریٹائرمنٹ لے چلے ہیں اور علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ مگر اب وہ نہ تو انتہا پسند Leftist ہیں اور نہ ہی انتہا پسند Rightist ہیں۔اب ان کی زندگی میں بھی توازن پیدا ہو چکا ہے اور کہیں بھی کوئی اچھی چیز ہو تو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی روشن خیالی اپنی جگہ قائم ہے اور میری ان کے لئے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ روشن خیال رہیں اور انسانیت پرست رہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اسے جس طرح اقبال نے سمجھا اگر اس طرح کا مذہب ہو تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں اور سوشلزم یا کمیونزم اگر اس طرح کا ہو جس طرح حسرت موہانی نے اسے قبول کیا تو اس سے بہتر بھی کوئی چیز نہیں۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ پارٹیشن سے پہلے حسرت موہانی جب ساتواں حج کر کے لاہور ریلوے سٹیشن پر اترے تو انہوں نے اپنے طویل انٹرویو میں کہا تھا” سات حج کرنے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں جو آئندہ قائم ہونے والا معاشی نظام ہے وہ سوشلزم ہے“

ایک کمیونسٹ مولانا بھی تھے:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

وہ پانچ وقت کے نمازی تھے لیکن معاشی نظام سوشلزم کا چاہتے تھے۔ایسا سوشلزم میں بھی چاہتا ہوں اور ایسا مذہب میں بھی چاہتا ہوں جو کہ علامہ اقبال کا تھا اور جس میں ملائیت نہیں تھی۔ مسلم عقائد رکھنے کے سلسلے میں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے عمرہ بھی کیا ہے اور یہ سرکاری خرچ پر نہیں کیا بلکہ اپنے خرچ پر کیا ہے۔اس طرح میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ معاشی حد تک سوشلزم سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔دین اپنی جگہ ہے اور سیاسی و معاشی نظام اپنی جگہ ہے۔

اچھے دنوں کے دوست

میرا دوستی پر ایمان ہے، میں ہمیشہ دوستوں کے جھرمٹ میں رہا ہوں اور ابتدائی زندگی کے واقعات میں جیسے میں نے بتایا کہ اپنے باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ جو نقدی، املاک اور زیورات کی شکل میں تھا اس میں سے بیشتر حصہ تو کچھ خود غرض رشتہ داروں کے مشوروں کی نذر ہوا اور کچھ ان

دوستوں کی نذر ہوا جنہیں میں دوست سمجھتا تھا لیکن ایک اچھا مصرع جو احمد فراز نے دیا ہے:

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

میں ہاتھ ملانے والے دوستوں سے بہت امیدیں رکھتا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ میرے ان احسانوں کا عشر عشیر بدلہ بھی نہ چکا سکے جو میں نے ان سے کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد میں دوستی کے معاملے میں محتاط ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب جو میرے دوست بنیں گے ان سے مجھے وفا کی امید بھی رکھنی چاہیے اور باہمی دوستی کے سلوک کے بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس میں کامیاب بھی رہا ہوں اور مجھے ایسے ایسے دوست میسر آئے جن پر میں فخر کر سکتا ہوں لیکن بہت آگے جا کر جب کچھ تلخ تجربے حاصل ہوئے تو میں نے سمجھا کہ:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

کواکب تو کھلا دھوکا دیتے ہیں لیکن یہ دوست مخفی دھوکا دیتے ہیں جن کا انسان کو بہت صدمہ ہوتا ہے۔

ایک بار ایسا ہی ہوا کہ ہم سرِ شام مینار پاکستان پر گھوم رہے تھے۔ بجلی بند ہو گئی اور میں پتھر کے فرش پر چلتے چلتے ایک نشیبی حصے میں پاؤں پڑ جانے کی وجہ سے گر گیا اور میرا پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس زمانے میں میرے مالی حالات وقتی طور پر خراب تھے اور مجھ سے پہلے تنویر نقوی مفلوج ہو چکے تھے۔ وہ بڑے غیور آدمی تھے۔ مدد کی بات نہیں کرتے تھے اور یوں ہی کبھی کبھار پوچھا کرتے تھے کہ قتیل

صاحب! اگر میں ٹھیک نہ ہوا تو میرے مالی ذرائع کیا ہوں گے۔ میں Dictate کر کے لکھوا کر کسی پرچے سے منسلک ہو سکتا ہوں۔ غرض وہ اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔

اس حادثے کے بعد میرے ذہن میں بھی ایسی باتیں آنے لگیں۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ کے فضل سے میرے ہاں اولاد بھی ہے۔ لیکن میں اس حادثے کے بعد اس طرح اس لئے سوچ رہا تھا کہ میں نے زندگی میں اولاد کی طرف سے کبھی اس طرح مدد نہیں لی۔ میرے تین بیٹے ہیں۔ ان تینوں میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی میرے گھر کے اخراجات میں ایک پیسے کی بھی مدد شامل نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت بھی میرے ذہن میں ان کی مدد نہیں آ رہی تھی حالانکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ میرے بیٹے ہیں اور میرے کفیل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ذہن میں اس وقت بھی یہ نہیں آیا اور وسوسے دل میں آتے رہے کہ میں اب کیا کروں گا۔ لیکن قدرت مجھ پر ہمیشہ مہربان رہی ہے کہ جب بھی مصیبت آئی ہے تو اس نے اچانک کوئی سامان کر دیا ہے۔

اس حادثے کے بعد پہلے پندرہ دن کے دوران دوستوں کی اکثریت میری مزاج پرسی کے لئے آئی لیکن کچھ ایسے دوست بھی تھے جو پوچھنے نہیں آئے۔ جن دو چار اشخاص سے مجھے توقع تھی کہ وہ آئیں گے تو پوچھیں گے کہ کس حال میں ہو۔ آپ یقین جانیں کہ اس عرصہ میں کسی نے بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ گھر کے اخراجات یا دواؤں کے لئے کوئی تکلیف تو نہیں ہے حالانکہ میرا اتنا اثاثہ تھا کہ کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں ضرورت پڑنے پر بیوی کے زیورات یا اپنے ہری پور کے مکانات بیچ سکتا تھا۔ اس لئے ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن رسمی طور پر بھی بہت قریب کے دوستوں نے بھی مجھ سے نہیں پوچھا جس کا صدمہ آج تک مجھے ہے۔ اگر وہ کبھی جھوٹے منہ ہی پوچھ لیتے تو دوستوں پر

میرا ٹوٹا ہوا اعتماد بحال ہو جاتا۔

خیر! دیکھئے کہ قدرت میری کیسے مدد کرتی ہے۔اس حادثہ کے تقریباً پندرہ دن کے بعد ایک پروڈیوسر ' میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لے کر میرے گھر پر آئے اور مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ تو بیمار پڑے ہیں ہم تو اپنی فلم کے گانے لکھوانے آئے تھے۔میں نے اپنی زندہ دلی سے کہا کہ آپ کو کس نے کہا تھا کہ میں پاؤں سے گانے لکھا کرتا ہوں۔ٹوٹا تو میرا پاؤں ہے۔اگر ہاتھ کبھی ٹوٹ جائے تو بھی کوئی بات نہیں۔گانے ہاتھ سے بھی نہیں لکھے جاتے بلکہ ذہن سے لکھے جاتے ہیں۔

وہ میری بات سے بہت محفوظ ہوئے۔انہوں نے ایک ہزار روپیہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ یہ ایڈ ریس ہے باقی ادائیگی بعد میں ہو گی۔اب میں آپ کو کہانی سناتا ہوں اور آپ کو گانے لکھنا ہوں گے۔پس ان گانوں کا میوزک بنے گا۔بیماری کے دوران یہ مجھے ملنے والا پہلا معاوضہ تھا۔میں بہت خوش ہوا اور تیزی سے کام شروع کر دیا۔اس کے بعد ٹی وی والوں کو جب پتا چلا کہ میں زخمی حالت میں بھی گانے لکھ رہا ہوں تو وہ بھی آنا شروع ہو گئے۔اسی طرح ریڈیو والے بھی آتے رہے۔

اخبارات والے بھی یوں آتے رہے۔ہوتا یہ تھا کہ جب کسی سے کوئی کام نہیں ہو پاتا تھا یا کوئی وعدہ خلافی کرتا تھا تو مجھے گھر پر فون آتا تھا اور میں گھر پر بیٹھا ہی ان کا کام کر دیتا تھا۔فلم والے بھی اس کے بعد اسی طرح آئے اور یقین جانئے کہ اس دوران مجھے جو آمدنی ہوئی وہ عام حالات میں ہونے والی آمدن سے بھی کہیں زیادہ تھا اور مجھے مالی معاملے میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

اس سارے عرصے میں مالی مدد کا جو معاملہ ہے وہ یوں ہے کہ مجھے رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ایک بینک ڈرافٹ ملا۔مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ کس نے بھیجا ہے کیونکہ بھیجنے والے کا اس پر نام نہیں ہوتا ہے

۔میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ اسے واپس کر دوں اور اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ قبول کر کے بھیجنے والے کا شکریہ ادا کروں کیونکہ مجھے بھیجنے والے کا پتا ہی نہیں تھا۔ لیکن بعد میں مجھے کسی طرح پتا چل گیا کہ یہ ڈرافٹ مجھے ڈیرہ غازیخان سے میرے دوست شاعر محسن نقوی نے بھیجا تھا۔ میں آج تک اس کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ اس وقت اس شخص سے میرے تعلقات اتنے قریبی نہیں تھے اور انہوں نے بھی مجھے سینئر سمجھ کر ایک جونیئر کا فریضہ سمجھ کر مجھے یہ ڈرافٹ بھیجا تھا۔ لیکن میرے قریب کے دوستوں نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ جس کا مجھے آج بھی بہت دکھ ہے کیونکہ میں ان دوستوں سے بہت قربتیں محسوس کرتا تھا۔ بعض اوقات میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے کن لوگوں سے کیا توقع رکھی۔

اب کچھ ایسے دوستوں کا ذکر کرتا ہوں جو زندگی میں دوست بن کر آئے اور مجھ سے مالی مدد لی۔ کچھ نے تو کہا کہ ہماری مدد کرو۔ کچھ نے قرض لیا اور بالکل واپس نہ دیا لیکن میں اپنے دو دلچسپ مقروض آپ سے متعارف کروانا چاہتا ہوں۔

علامہ لطیف انور کا نام آپ کو یاد ہو گا۔ بہت بھلے آدمی تھے۔ وہ فن کے اساتذہ میں سے تھے اور بہت گٹھے ہوئے شعر کہا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی ہیں۔ میں اس زمانے میں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری تھا۔ دیکھا کہ ان کے بھائی صاحب کو ہتھکڑی لگی ہوئی ہے اور وہ پولیس کے ایک آدمی کے ساتھ گلڈ کے میرے دفتر میں آ گئے۔ میز کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگے " میں شراب پیئے ہوئے تھا کہ پکڑا گیا۔ آج مجسٹریٹ نے مجھے جرمانہ کر دیا ہے۔ جرمانہ زیادہ ہے جو میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مجسٹریٹ سے کہا تھا کہ قتیل شفائی میرے محسن ہیں۔ اگر آپ پولیس کے سپاہی میرے ساتھ

بھیج دیں تو میں ان سے پیسے لے کر آپ کو جرمانہ ادا کر سکتا ہوں۔ وہ مجسٹریٹ آپ کا معتقد نکل آیا تو اس نے یہ سپاہی ساتھ بھیجا ہے اس لئے میں آگیا ہوں۔ آپ میری مدد کر دیجئے ''

میں موصوف کے مزاج کو جانتا تھا لیکن میں اسے اس حالت میں دیکھ نہیں سکا اور میں نے اسے پیسے دے دیئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر یہ رقم مجھے واپس دے دے گا۔ یہ تین مہینے بڑھتے بڑھتے تین سال بن گئے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ میرا قرض لوٹا دو۔ میں کوئی اتنا رئیس آدمی بھی نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری اس وقت کی ضرورت اور مجبوری کے تحت تمہیں پیسے دے دیئے تھے۔ اس نے لاپروائی کے ساتھ کہا کہ میرے پاس اب تک پیسے تو کہیں سے بھی نہیں آئے۔ میں آپ کو ادائیگی کیسے کر دیتا۔ میں نے کہا کہ تمہارا تو نوے دن کا وعدہ تھا اور تم اپنے بیوی بچوں کو بھی تو آخر کہیں سے خرچہ دے رہے ہو۔ کہنے لگا کہ وہ خرچ بھی مشکل سے چل رہا ہے۔ البتہ ایک طریقے سے آپ کو پیسے ادا ہو سکتے ہیں۔ اس نے بے فکری اور بغیر کسی ندامت کے کہا کہ آپ یوں کریں کہ مجھے کوئی اچھی سی نوکری دلوا دیں۔ پھر میں پچاس روپے ماہانہ کی قسط کی شکل میں آپ کا قرض لوٹا دوں گا۔ میں نے اس کی بات سنی تو اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا کہ گرو تمہاری یہ تجویز بھی باکمال ہے۔ اس کے بعد میں اس کے پاس سے چلا آیا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ میرا قرض لوٹاتا۔ وہ ہفتے دس دن کے بعد میرے پاس چلا آتا اور کہتا کہ میری نوکری کا کوئی انتظام ہوا ہے یا نہیں:

کوئی بتلائے کہ میں بتلاؤں کیا

اسی طرح دوسرے قرض کا بھی ذکر سن لیجئے۔ ہماری فلم انڈسٹری کے ایک بہت بڑے ڈائریکٹر ایس ایم یوسف تھے۔ اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ میرے ان سے نغمہ نگار سے زیادہ ایک دوست کی حیثیت سے تعلقات تھے۔ وہ سمن آباد میں رہتے تھے۔ ہماری شامیں اکثر اکٹھی گزرتی تھیں یا تو وہ میرے گھر آجاتے تھے یا میں ان کے گھر جاتا تھا۔ دوستوں کی ہمراہی میں بھی ہم اکثر اکٹھے ہی بیٹھتے تھے۔

میں فلم کی تکنیک میں بھی ان سے گفتگو کر کے کچھ حاصل کیا کرتا تھا۔ ان پر ایک وہ وقت آیا کہ ان کی کچھ فلمیں ناکام ہوئیں۔ ہماری فلم اندسٹری میں تو یہ حال ہے کہ اگر کسی کی ایک فلم ناکام ہو جائے تو انڈسٹری زیادہ سے زیادہ یہ انتظار کرتی ہے کہ شاید اس کی اگلی فلم کامیاب ہو جائے۔ پھر تو وہ شخص جما رہے گا ورنہ اگر اس کے اور کوئی وسائل نہ ہوں تو اسے گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔

ایس ایم یوسف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ وہ مقبولیت اور ڈسٹری بیوشن کے اعتبار سے پچھلی صف میں چلے گئے۔ ان کا پہلا دور اچھا تھا اور اس دور میں انہوں نے نجانے مجھے مالی طور پر کتنا مضبوط سمجھ کر مجھ سے قرض لیا تھا اور میں نے قرض دے بھی دیا تھا۔ انہوں نے یہ قرض پھر واپس کر بھی دیا تھا۔ ان کا اب کا زمانہ مالی طور پر اچھا نہیں تھا۔

انہیں انڈیا جانا تھا تو انہوں نے کہا" قتیل صاحب! مجھے انڈیا میں کچھ روپیہ چاہئے انہیں معلوم تھا کہ وہاں میرے رشتے دار اور دوست بھی ہیں اور میں وہاں رقم کا بندوبست کر کے دے سکتا ہوں" مجھے کہنے لگے" آپ مجھے انڈیا میں کسی کے نام رقم کی ادائیگی کا خط دے دیجئے اور یہاں میرا

بیٹا آپ کو Post Dated چیک دے دیتا ہے۔ آدھی رقم آپ کو اگلے مہینے مل جائے گی اور آدھی اس سے اگلے مہینے۔ آپ ان چیکوں کے ذریعے رقم کیش کروالیں''

ایس ایم یوسف کے بیٹے اقبال یوسف ہیں۔ ان کی کچھ فلمیں ہٹ بھی گئیں اور انہوں نے نام بھی پایا۔ ان کی پہچان ایس ایم یوسف کے بیٹے ہونے کی وجہ سے بھی تھی۔ میرے ساتھ ان کا کبھی بطور نغمہ نگار کے بھی واسطہ نہیں پڑا کیونکہ ایس ایم یوسف تو ایک ثقہ قسم کے آدمی تھے جبکہ اقبال یوسف ایک کھلنڈرے قسم کے شخص تھے۔ ان کے ساتھ مزاج بھی نہیں ملتے تھے لیکن ایس ایم یوسف صاحب کا حکم تھا کہ میں ان کے چیک لے لوں اور ادائیگی ہو جائے گی۔

خود تو ایس ایم یوسف انڈیا چلے گئے اور انہیں میرے لئے چھوڑ گئے۔ میں نے اگلے ماہ جب پہلا ہی چیک بینک میں پیش کیا تو وہ Dishonour ہو گیا۔ میں نے انہیں بتایا تو اقبال یوسف صاحب کہنے لگے کہ وہ کسی ٹیکنکل وجہ سے پاس نہیں ہو رہا۔ میں آپ کو دوسرا چیک دیتا ہوں۔ دو چار دن بعد دیں گے تو پیسے مل جائیں گے۔ میں نے یہ دوسرا چیک دیا تو یہ بھی Dishonour ہو گیا۔ کرتے کرتے دوسرا مہینہ آگیا۔ اگلے ماہ دوسرا چیک دیا تو وہ بھی کیش نہ ہو سکا۔

اب میں نے دونوں چیک لے کر ان کا پیچھا کرنا شروع کیا تو یہ نوجوان آدمی تھے کہاں ہاتھ آتے تھے۔ میرے عزیز ہیں ریاض الرحمان ساغر۔ یہ منہ پھٹ قسم کے آدمی ہیں اور سچے ہیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے پڑے کیونکہ وہ بھی یوسف صاحب کے ملنے والوں میں سے تھے لیکن اقبال یوسف ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حالانکہ باپ کی عزت رکھنے میں بیٹوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایس ایم یوسف ایک غیور اور بااصول آدمی تھے۔ انہوں نے اچھی زندگی گزاری تھی لیکن بیٹے کے

ہاتھوں اس قرض کے سلسلے میں یوں بھی رسوا ہوئے کہ ایک بار ایورنیو سٹوڈیو میں فوارے کے پاس ریاض الرحمان ساغر نے ان سے تلخ کلامی کی اور لوگوں کو پتا چلا کہ باپ قرض لے کر گیا تھا اور بیٹے نے چیک دیئے تھے جو کیش نہیں ہو رہے اور یہ قرض ادا نہیں کرتے۔

ایس ایم یوسف جب انڈیا سے واپس آئے تو وہ مارے شرم کے میرا سامنا نہیں کر سکے۔ حالانکہ میں نے انہیں پیغام بھی بھیجا کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ چلو میرے پیسوں کو گولی ماریں۔ ہم دوست ہیں اور ملتے رہیں گے۔ میرے لئے زیادہ عزیز پیسے نہیں بلکہ آپ زیادہ متاع عزیز ہیں۔ اس لئے آپ یا تو خود میرے پاس تشریف لائیے اور یا پھر مجھے بلوا لیجئے۔ لیکن اس کے بعد وہ بالکل میرے سامنے نہیں آئے۔ پھر وہ کینیڈا چلے گئے۔ وہاں بہت سال رہے۔ اس کے بعد واپس آ کر بہت سال کراچی میں رہے۔ اس دوران لاہور میں آتے رہے اور بالآخر کراچی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ مرتے دم تک اپنے ایک نالائق بیٹے کی وجہ سے اپنے اندر کی ملامت سمیٹے رہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے بیٹے کو سیدھی راہ دکھائے۔ جو میرا خیال ہے کہ انہیں کبھی نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ گرتے گرتے بالکل گمنامی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔ اب اقبال یوسف کے نام سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں۔

تیسرا واقعہ قرض کا تو نہیں لیکن انسان ایک مفت کی جو ندامت اٹھاتا ہے اور وہ بھی بغیر کسی جرم کے تو اس کی ایک مثال سن لیجئے۔ اداکار محمد علی ہماری فلم انڈسٹری کے نیک نام شخص ہیں۔ اعلیٰ درجے کی اداکاری کی وجہ سے بھی ان کی پہچان ہے۔ سوشل آدمی ہیں اور ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مالی

طور پر بھی بہت اچھے ہیں۔ میں یہ اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب وہ بطور ہیرو ٹاپ پر تھے۔ انہوں نے ایک فلم شروع کی جس میں نثار بزمی میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھے اس فلم کے لئے نغمہ نگار چنا۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی کام شروع ہوتا ہے تو کام سے پہلے ہر شعبے کا آدمی ایڈوانس کا مستحق ہوتا ہے۔ محمد علی صاحب بھی جب کسی فلم کے لئے سائن کرتے تھے تو ایڈوانس پہلے لیتے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب اس قسم کے لوگ دوسروں کو سائن کرتے ہیں تو ایڈوانس دینا بھول جاتے ہیں یا پھر ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ کام شروع کروا دیتے ہیں اور چونکہ ان کے تعلقات بہت ہیں اس لئے کام شروع ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر مجھے ہمیشہ یہ بات کھٹکی ہے اور میں اس کا مخالف رہا ہوں۔

خیر میں نے بھی ان کی فلم کا کام شروع کر دیا۔ میں نے اس کے گانے لکھ کر دیئے جو ریکارڈ بھی ہو گئے۔ اس کے بعد پکچر رک گئی۔ گانے بزمی صاحب نے ریکارڈ کروائے تھے اور ظاہر ہے کہ میں معاوضے کا مستحق تو تھا۔ پہلے تو سوچتا رہا کہ محمد علی صاحب خود ہی پیسے بھیج دیں گے کیونکہ آدمی بڑے معقول تھے۔ مجھے یہ توقع تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ میرے پیسے مار لیں گے۔ لیکن ان کی طرف سے پیسے نہیں آئے۔

جب کوئی چھ ماہ گزر گئے تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں ہی انہیں کیوں نہ یاد دہانی کروا دوں۔ چنانچہ کسی فلم کے سیٹ پر میں ان سے ملا۔ میں نے ان سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ آپ کی طرف میرے دو گانوں کے پیسے بنتے ہیں بلکہ میں نے اور طرح سے انہیں کہا "علی صاحب! ان دنوں میں مالی طور پر زیادہ ہی ضرورت مند ہوں۔ اس لئے اگر آپ مجھے میری ادائیگی کر سکیں تو اس وقت میری مدد

بھی ہو جائے گی"

یہ الفاظ سن کر مجھے کہنے لگے " قتیل بھائی ! آج کل میرے بھی حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ انہیں کہتا کہ میں مدد نہیں مانگ رہا بلکہ میں تو اپنا قرض مانگ رہا ہوں" انہوں نے سمجھا ہو گا کہ شاید میں بھی ان سے اسی طرح مدد مانگ رہا ہوں جیسے فلم انڈسٹری میں دوسرے لوگ مانگتے ہیں۔ انہوں نے میرا لفظ مدد سن کے یہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا حالانکہ میں تو زندگی میں کبھی اپنا قرض بھی نہیں مانگتا چہ جائیکہ میں کسی سے مدد یا خیرات مانگتا۔ تو میں انتہائی نادم ہو کر اور اپنا سا منہ لے کر اپنے آپ کو ذلیل سمجھتا ہوا واپس چلا آیا اور آج تک میں نے انہیں کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ کی طرف میرے دوگانوں کے پیسے بچتے ہیں۔

نہ انہیں کبھی یہ یاد آیا کہ انہوں نے کسی شاعر سے دوگانے لکھوائے تھے جن کی ادائیگی انہوں نے نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن چونکہ معاملہ بہت چھوٹا ہے اس لئے وہ بھول گئے ہیں۔ ان کے اپنے کنٹریکٹ تو لاکھوں کے ہوا کرتے تھے اس لئے انہیں یاد رہ جاتے تھے یہ معاملہ چند ہزار کا تھا شاید اس لئے ان کے ذہن میں یہ معاملہ نہ ہو اور وہ بھول گئے ہوں۔ بہرحال کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔

محمد علی صاحب کے دوگانوں کے علاوہ میں نے فلم انڈسٹری میں اور اتنے لوگوں سے پیسے لینے ہیں کہ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ یہ ذکر بھی میں نے اس لئے کیا کہ خواہ مخواہ کی ندامت میرے ذمے آئی۔ یعنی مجھے جو قرض لینا تھا وہ مدد یا خیرات کے ذیل میں آگیا اور میں کئی دن تک ندامت محسوس کرتا رہا۔

اس کے بعد بھی محمد علی صاحب سے کئی محفلیں ہوئیں لیکن میں نے ان سے کبھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ بھی ہو گیا تھا۔

ایک چیز جب شرم اور ہچکچاہٹ میں لپٹ جائے تو میرا خیال ہے کہ پھر اس کا باہر آنا اتنا آسان نہیں رہتا۔ یہی حال کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

بڑے لوگوں کے سامنے کلام

جن بڑے لوگوں کے سامنے مجھے کلام پیش کرنے کا موقع ملا' ان میں پنڈت جواہر لعل نہرو' خواجہ ناظم الدین اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انڈیا اور پاکستان میں اکثر ادھر ادھر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور غالباً راجہ غضنفر علی کی مہربانی ہی سے یہ ہوتے تھے۔ وہ اکثر یہ کام کیا کرتے تھے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے۔

دہلی کے جس مشاعرے کا میں اب ذکر کر رہا ہوں اس میں پاکستان کے سبھی سرکردہ شعراء موجود تھے۔ جن میں صوفی تبسم ' سالک صاحب اور کراچی سے ظریف جبل پوری' سید محمد جعفری اور دیگر شعراء موجود تھے۔ پنڈت نہرو کی جانب سے پاکستانی شاعروں کے اعزاز میں چائے کا بندوبست کیا گیا تو اس میں یہ سب شعراء گئے۔ یہ چائے پارٹی پنڈت صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی تھی۔ انہیں اُردو سے لگاؤ تھا کیونکہ وہ الہ آباد کے رہنے والے تھے اور موتی لال نہرو کے زمانے ہی سے ان کے گھر میں اُردو کا چلن تھا۔ ہر چند اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی ہو چکی تھی لیکن وہ باقیات وہ صالحات ذہنوں میں سے تھے اور اس کے تحت پنڈت جی نے یہ اہتمام کیا تھا۔

وہاں سب لوگوں نے کلام سنایا۔ پنڈت جی بڑی سنجیدگی سے کلام سن رہے تھے اور جہاں ضروری ہوتا سر ہلا دیتے تھے۔ ان کا داد دینے کا انداز یہ تھا کہ ذرا زیر لب مسکرا دیتے یا ذرا سر ہلا دیتے۔ میں نے جو غزل سنائی اس کا مطلع تھا:

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
اپنی تو یہ حسرت ہے کسی طرح سحر ہو

پنڈت جی نے کچھ زیادہ سر ہلانے کی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ محفل ختم ہوئی تو چائے وغیرہ پی گئی۔ اس موقع پر پنڈت جی نے یونہی سرسری سا مجھ سے پوچھا " آپ نے وہ سحر والا جو شعر پڑھا تو کیا آپ کی وہ حسرت پوری ہو گئی"

میں اتنے بڑے آدمی کے سامنے کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس زمانے میں تو ہم سب فیض صاحب سے لے کر نیچے تک یہی کہہ رہے تھے:

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اب پنڈت جی کے سامنے تو یہ مصرع بھی دہرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرح ایک بڑے آدمی سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔

اس کے بعد دہلی کے مشاعرے میں گئے تو سالک صاحب اس میں خاص طور پر یہاں سے مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے قراقلی کھال ٹوپی لے کر گئے تھے۔ انہوں نے لکھ بھی رکھا تھا کہ میں نیاز حاصل کرنے آؤں گا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں وہاں وزیر تعلیم تھے۔ ظاہر ہے کہ سالک صاحب کے نام سے ان کا سیکرٹری واقف نہیں ہو گا۔ انہوں نے ایک آدھ بار ٹرائی کی تو فون پر ان کا رابطہ نہ

ہو سکا۔اس کے بعد ہم جوش صاحب کے ساتھ ملنے کے لئے گئے تو ان سے کہا کہ سالک صاحب کو مولانا الکلام آزاد سے ملنا ہے کچھ انتظام کیجئے۔جوش صاحب کہنے لگے کہ کیا اس میں کوئی دقت ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بولتے تھے۔

ہم نے کہا کہ دقت تو ہے۔انہوں نے فوراً فون اٹھایا اور مولانا آزاد کے سیکرٹری سے کہا کہ ہم جوش بول رہے ہیں۔مولانا سے ملوائیے۔ سیکرٹری نے ملوا دیا۔انہوں نے کہا کہ مولانا ہم آرہے ہیں۔ ہمارے ساتھ لاہور سے سالک صاحب اور کچھ دوسرے دوست بھی آپ کے پاس آرہے ہیں۔ انہوں نے پتا نہیں کیا جواب دیا لیکن جوش صاحب نے فون رکھا اور ہم سب سے کہا چلو۔ہم وہاں چلے گئے اور جا کر دیکھا کہ مولانا نے جو اور کام تھے سب چھوڑ دیئے تھے اور وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔مولانا جوش صاحب کا اتنا احترام کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ عادت دیکھی کہ وہ خود تو سگریٹ پی رہے تھے لیکن کسی اور کو سگریٹ آفر نہیں کر رہے تھے۔سنا ہے کہ ان کی یہی عادت تھی۔باتیں چلیں تو جوش صاحب نے کہا کہ یہ سب پاکستانی شعراء ہیں۔ مولانا کہنے لگے کہ ویسے تو میرے پاس زیادہ وقت تو نہیں ہوتا لیکن کلام سننے کو بھی بہت جی چاہتا ہے۔اگر آپ تکلف محسوس نہ کریں تو اپنے دو دو شعر سنا دیں۔ان کا مقصد ہماری عزت افزائی کرنا بھی تھا اور محفوظ ہونا بھی تھا۔چنانچہ ہم نے دو دو شعر سنائے۔جب سب نے دو دو چار چار شعر سنا دیئے تو اب جوش صاحب کا مرحلہ تھا۔مولانا جوش صاحب سے کہنے لگے کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔جوش صاحب کہنے لگے نہیں مولانا۔سالک صاحب نے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں آپ وہ سن لیجئے۔چنانچہ سالک صاحب نے دو باتیں کی ہوں گی تو جوش

صاحب شروع ہو گئے اور اس کے بعد ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے جوش صاحب ہی باتیں کرتے رہے اور مولانا چپ چاپ سنتے رہے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا تو سالک صاحب نے کہا کہ اب ہمیں چلنا چاہئے کیونکہ مولانا مصروف ہیں اور دوسرے لوگ بھی باہر بیٹھے مولانا کی فراغت کا انتظار کر رہے ہیں۔ جوش صاحب کہنے لگے ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا کہ مولانا تو وزیر تعلیم بھی ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ اس طرح جوش صاحب پہلے بھی ایک بار مولانا سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے فون نہیں کیا تھا بلکہ وہاں جا کر باہر سے رقعہ بھیج دیا تھا۔ کافی دیر ہو گئی اور جب اندر سے بلوایا نہ گیا تو انہوں نے ایک رقعے پر لکھ دیا تھا:

اب تو مشکل ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

جو ش صاحب یہ شعر لکھ کر اس وقت چھوڑ آئے تھے۔ یہ ایک دو سال پہلے کا واقعہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے اب یہ ملاقات کچھ جلدی ہو گئی۔ یہ اس پرچی کا فیض ہو گا جو جوش صاحب نے کبھی آزاد صاحب کے نام لکھی تھی۔

تیسرا بڑا نام خواجہ ناظم الدین کا آتا ہے۔ یہ یقیناً ایک بڑے آدمی تھے۔ جس زمانے میں وہ وزیر اعظم تھے تو انہوں نے بھی کراچی ہی میں اپنی رہائش گاہ پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ میری پوزیشن اس وقت یہ تھی کہ میں جونیئر زمیں سے تھا۔ نام تو میرا ابھر آیا تھا لیکن مجھ سے اونچے نظر آنے والے بڑے بڑے ہاتھی اور دیو موجود تھے۔ اس کے باوجود اس مشاعرے میں شرکت کر

لیناہی مجھ جیسے جونیئر کیلئے بڑی بات تھی۔

اس مشاعرے میں انڈیا سے جگر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ پاکستان کے سب صوبوں سے بھی بہت سے نامور شعراء آئے ہوئے تھے۔ تقریباً چالیس شعراءاس مشاعرے میں شریک تھے۔جب خواجہ صاحب سن رہے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ خواجہ صاحب میں شعری ذوق موجود ہے اور وہ مجھے بر محل داد دینے میں ماہر نظر آئے۔ پھر جتنے خلوص سے انہوں نے شاعروں کو خوش آمدید کیا تھا اور کھانے کے بعد جتنے خلوص سے الوداع کیا تھا۔اس سے ان کا بڑا پن نظر آیا تھا۔ اب تو وہ اور بھی بڑے نظر آرہے ہیں۔

ان کے بعد جو بھی آتا گیا اس کا قد چھوٹا ہی ہوتا گیا۔آج ہم دیکھتے ہیں تو ہر طرف ہمیں بونے ہی بونے نظر آتے ہیں اور ادب کے معاملے میں تو لوگ یہاں بونے بھی نہیں بلکہ چیونٹیوں سے ہیں۔آپ پہلے پاکستان کے ماضی کی طرف دھیان دیں تو جگہ جگہ ادبی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔خواجہ ناظم الدین جیسے لوگ حکومت میں بھی اور باہر بھی ملتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تو خاص طور پر ادب متاثر ہوا اور اب جب ہم نظر دوڑاتے ہیں اور اپنے ہی شہر لاہور میں دیکھتے ہیں جو کہ علم و ادب کا گڑھ تھا۔اس میں ادبی ویرانی ایسی نظر آتی ہے کہ کسی بھی محفل سے شعر کی آواز سنائی دے رہی۔وہ ہال جن میں ادبی کانفرنسیں اور شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں' اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک وقت تھا کہ اوپن ائیر تھیٹر میں بھی ایسے ایسے کل پاکستان اور ہندوپاک مشاعرے ہوئے جن کی گونج اب تک آتی ہے لیکن اب وہ ماضی کا حصہ ہیں۔حال میں ویرانی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔اس لئے کہ ایک مدت سے جو غیر جمہوری سرگرمیاں یہاں شروع ہوئی ہیں انہوں نے یہاں

علم وادب کے سوتے خشک کر دیئے ہیں اور ذاتی اغراض کی ایک جنگ اب شروع ہو چکی۔ ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں لگا ہے۔

اب پاکستان میں جمہوری اور غیر جمہوری ادوار کا حساب لگایا جائے تو نسبتاً غیر جمہوری ادوار کا عرصہ زیادہ ملے گا۔ غیر جمہوری زمانوں میں سب سے بڑا یہ نقصان ہوتا ہے کہ اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی اقدار کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ انسانیت مر جاتی ہے۔ فرقہ واریت ابھرتی ہے' طبقاتی جنگ زر گری شروع ہو جاتی ہے۔ طبقاتی جنگ جاتی ہے۔ طبقاتی جنگ ویسے تو بہت مفید چیز ہے اور اس میں نچلے طبقوں کو کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن طبقاتی جنگ زر گری میں علم وادب پستا چلا جاتا ہے اور مادر علم وادب کی کوکھ بانجھ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت صورتحال یہی ہے کہ مسلسل مارشل لاء اور غیر جماعتی سیاسی سرگرمیاں جن میں آپا دھاپی ہوتی ہے اور جس کے پاس چار پیسے زیادہ ہیں وہ آکر پردھان بن کر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ اس کا پس منظر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے پاس علم و ادب' سیاست یا کسی اور چیز کا کوئی پس منظر نہیں ہوتا۔ صرف پیسے لگا کر پیسے بٹورنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ یہ صورتحال جاری ہے اور اس کا جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔

اب ایک مدت کے بعد الیکشن ہونے والے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو سیاست کو خلاف اسلام قرار دلوانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے' جو جمہوریت کو خلاف اسلام قرار دے رہے تھے وہ آگے ہیں اور جمہوریت اور سیاسی سرگرمیوں کا نعرہ لگا کر اور جماعتی انتخابات میں شامل ہو کر آپ کو عوام کا خادم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ منافقین جب تک ختم نہیں ہوں گے یہاں شعر وشاعری' موسیقی اور مصوری اور رقص کا کوئی مستقبل نہیں۔

جس قوم کو بھی دیکھیں اس میں رقص موجود ہے۔ رقص ایک پاکیزہ اظہار خیال کا نام ہے جو جسم سے کیا جاتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ آپ اسے طوائف کے ساتھ ہی منسوب کریں۔ اگر آپ ہیرا منڈیوں میں جا کر اس کی سرپرستی کریں گے تو یقیناً یہ ایک بری چیز ہو گی لیکن اگر اسے فن کے طور پر قبول کریں گے تو یہی قوم کیلئے ایک صحت مند چیز ہو گی۔ لیکن یہ سوچنے کے لئے اور ذہنوں کی ضرورت ہے جو کھلے ذہن ہوں اس میں تنگ نظری اور تعصبات رکھنے والے گروہوں کی گنجائش نہیں کہ وہ آ کر اس کا احیاء کر سکیں۔

میرے خیال میں بالآخر یہی ہو گا کہ یہ لوگ اپنے تعصبات اور تنگ نظری کی وجہ سے اپنے مذہب کو بدنام کریں گے اور اپنے اعمال کو مذہب کی چادر میں لپیٹ کر ساتھ مذہب کو بھی لوگوں کی نظروں سے دور کریں گے۔ پھر وہ وقت آ جائے گا جو برا ہو گا۔ اب تو مجھے اس ملک میں کوئی لادین نظر نہیں آتا لیکن خدانخواستہ وہ وقت نہ آ جائے جب لوگ لادین ہو کر پھر ایسے برے رجحان کی طرف راغب ہو جائیں جو آرٹ کے ذیل میں نہیں آتا۔ جس طرح ان تنگ نظر لوگوں کا آرٹ کا نظریہ برا ہے اسی طرح ان بے دین لوگوں کا نظریہ بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سب شعری وادبی سرگرمیوں سے انکار کر دیتے ہیں اور ان کی سرگرمیاں بھی ان لوگوں سے کم نہیں ہوتیں۔ میرے خیال میں علم وادب، فنون لطیفہ اور شعر و شاعری کو سرپرستی ملنی چاہئے اور میں اس میں کھیلوں کو بھی شامل کرتا ہوں۔

یہ وہ ملک ہے جہاں لڑکیوں کو ہاکی کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا رہی اور انہیں یہ نہیں پتا کہ کھیل قوم

کی صحت کیلئے تو ٹھیک ہے ہی اس سے ذہنی وسعتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ کھیل بہت سی برائیوں سے بچاتی بھی ہے۔ صحت مند جسم صحت مند جسم ذہن پیدا کرتا ہے اور توجہ ایک اچھے کام پر لگی رہتی ہے۔ نسبتاً ایک ان پڑھ عورت جو بیکار ہو اور اس کا کوئی مشغلہ نہ ہو اور اوپر سے اس کے معاشی حالات بھی ویسے ہوں جیسے ہمارے ملکوں کے ہوتے ہیں تو ایسی عورت جب پھسلتی ہے تو گناہوں کے اندھے کنویں میں جا گرتی ہے اور پھر وہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کو جو صحت مند چیزیں درکار ہیں وہ نہ تو ہمیں مولوی دے سکتا ہے اور نہ ہی انتہا پسند لادین دے سکتا ہے۔ یہ چیزیں تو متوازن اور پاکیزہ ذہن کے لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ جن میں حسن لطافت اور حسن جمال ہو۔ صرف یہی لوگ احیاء کر سکتے ہیں ان چیزوں کا جن کی اس ملک کو اشد ضرورت ہے۔

اب انتخابات ہو رہے ہیں خدا کرے کہ یہ انتخاب' انتخابات کے اس سلسلے کا پیش خیمہ ہو جو کسی ملک کے لئے چھلنی کا کام دیتے ہیں۔ وقت مقررہ پر الیکشن ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آئندہ کے لئے کوئی اچھے افراد چن لیں اور پہلے ہمیں جن برے لوگوں سے رابطہ ہے ان سے ہم جان چھڑا لیں۔ اس ملک میں ابھی تک تو باقاعدہ الیکشن کی روایت بنی نہیں لیکن اگر بن گئی تو یہ ملک جتنا جوہر قابل رکھنے والا ملک ہے تو یہ بہت ترقی کرے گا۔ میں یہ بات اس لئے نہیں کہہ رہا کہ یہ میرا ملک ہے بلکہ واقعی اس میں بہت ذہین اور فطین لوگ موجود ہیں۔

اگر اس ملک میں جمہوریت کو پنپنے دیا جائے اور الیکشن کے ذریعے لوگ سامنے لائے جائیں تو پھر آپ

کو پتا چلے گا کہ یہ جوہر قابل کہاں کہاں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہم مرد تو ذہین ہیں ہی' ہماری عورتیں بھی اتنی ذہین' لائق' نیک اور پاکدامن ہیں کہ اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ جہاں تک میری نظر جاتی ہے بشرطیکہ ہم انہیں آگے بڑھنے کا پورا موقع دیں اور جمہوریت کو اپنائے رکھیں۔

مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے اور ان کے دعوے باطل نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم قائداعظم کے پاکستان کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور ہم قائداعظم کے اصولوں پر چلتے ہیں۔ قائداعظم کے اصول کیا تھے؟ انہوں نے یہ ملک مسلمانوں کے لئے بنایا تھا اور تلقین یہ کی تھی کہ اپنے آپ کو پاکستانی کہو۔ ہم اپنے آپ کو پاکستانی نہیں کہتے۔ جو یہ کہتا ہے کہ مسلمان بنو۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہاں جو ہندو' سکھ یا عیسائی ہیں کیا آپ انہیں بھی کہہ رہے ہیں کہ مسلمان بنو۔ اگر آپ پاکستانی بننے کے لئے کہیں گے تو اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں گے ورنہ آپ قائداعظم کے اصولوں پر عمل نہیں کر رہے۔ آپ اپنی اقلیتوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔

قائداعظم نے الیکشن کا جو طریقہ رکھا تھا وہ جماعتی الیکشن تھا۔ ان کی اپنی جماعت مسلم لیگ تھی جس کے مقابلے میں کئی سیاسی جماعتیں تھیں۔ قائداعظم نے جماعتی الیکشن لڑ کر اور جیت کر یہ ملک قائم کیا تھا۔ جو لوگ غیر جماعتی الیکشن کر کے آگے آتے ہیں قائداعظم کے پاکستان سے ان کا کیا تعلق ہے۔ یہ سارے دعوے بالکل باطل ہیں اس طرح ہمارے مرحوم ضیاء صاحب نے چار سال پہلے علماء کرام کو ساتھ ملا کر اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر فتووں کے ذریعے یہ ثابت کرانے کی کوشش کی کہ سیاست غیر اسلامی چیز ہے۔ اس کیلئے انہوں نے فتویٰ فروش مولویوں سے فتوے بھی لئے۔

جو شخص سیاست کو غیر اسلامی ثابت کرنا چاہتا ہے اور سیاستدان کو برا سمجھتا ہے تو اس کے نزدیک یا اس کے پیروکاروں کے نزدیک قائداعظم کی کیا حیثیت رہ گئی۔ کیونکہ قائداعظم تو سیاست کرتے تھے اور ہم سب میں سب سے بڑے سیاستدان وہی تھے۔ جو سیاست کو برا سمجھتا ہے وہ قائداعظم کو بھی برا سمجھتا ہے۔ جو سیاستدان کو برا سمجھتا ہے وہ بھی قائداعظم کو برا سمجھتا ہے۔ اگر ہم اس طرح سے قائداعظم کو برا سمجھتے ہیں تو ہم ان کے پیروکار کہاں سے ہوئے۔

یہ لوگ قائداعظم کا نام بیچ رہے ہیں۔ جو شخص بھی اٹھتا ہے وہ قائداعظم کا نام بیچتا ہے۔ قائداعظم کی روح پر کیا گزر رہی ہوگی یہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن میرے جیسا آدمی جس نے قیام پاکستان سے پہلے قیام پاکستان کے لئے کوشش کی تو اس کی روح بھی تڑپ اٹھتی ہے۔ اگر مجھ جیسے لوگوں کو اس سے اتنی تکلیف پہنچتی ہے تو یقیناً قائداعظم کی روح بھی اس قسم کے رویئے سے جنت میں تڑپ اٹھتی ہوگی۔

قیام پاکستان سے پہلے ریفرنڈم میں لوگوں نے کیسے کیسے مجاہدے کئے۔ آج کی نئی نسل کو یہ معلوم نہیں کہ یہ جدوجہد کیوں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تاریخ تو لمبی چوڑی ہے لیکن مختصراً یہ کہوں گا کہ اس مطالبے میں جو عوام شامل تھے ان میں برادران وطن کی مسلمانوں کے لئے نفرت بھی شامل تھی اور ایک ایسی تجارتی بالادستی بھی شامل تھی کہ جس کی بنیاد بھی نفرت ہی پر تھی۔ یہ ساری چیزیں دیکھ کر مسلمانوں نے جب ماضی میں مصالحانہ طور پر کچھ مطالبات کئے تھے تو وہ مطالبات کانگریس کے انتہا پسند لوگوں نے نہیں مانے تھے۔ تو پھر اس وقت کانگریس میں شامل مسلمان لوگوں نے اس سے نکل کر اپنی جدوجہد شروع کی۔ ان کی اس تحریک میں ایسی جان پڑ گئی اور اس کی صداقت ایسی

نظر آنے لگی تھی کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے کمیونسٹ پارٹی نے قیام پاکستان کی حمایت کی تھی۔ اس حمایت کے بعد بہت سے وہ لوگ جو ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ پاکستان کے حامی بن گئے تھے۔

میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں نے سب معاملات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے اور میں قیام پاکستان کا حامی بھی تھا۔ پھر میرا جھکاؤ لیفٹ کی طرف تھا اور جب ادھر سے بھی قیام پاکستان کی حمایت ہو گئی تو میں نے اس میں مزید دلچسپی لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز لکھنوی نے بھی ترانہ لکھا تھا:

راوی کی لہروں پر چمکا ایک ہلال ایک تارا

جوش ملیح آبادی اور دیگر کمیونسٹ شاعروں نے بھی قیام پاکستان کے حق میں اشعار کہے تھے۔ میں سرحدی ہونے کے ناتے سے وہاں پر سرگرم عمل تھا۔ وہاں پر جن دو ایک لوگوں نے تقریر کے انداز میں متاثر کیا ان میں مولانا شوکت علی جن کے ساتھ میں رہا' ان کے علاوہ مولانا حامد بدایونی اور نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر نے بہت متاثر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نیا نیا شاعر تھا اور جیسے جونیئر لوگ جلسوں میں بڑے بڑے رہنماؤں کی تقاریر سے پہلے نظمیں پڑھتے ہیں اسی طرح میں بھی ان رہنماؤں کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کے پاس بہادر یار جنگ کا خطاب تھا لیکن جب قائد اعظم نے خطاب واپس کرنے کو کہا تو انہوں نے خطاب واپس کر دیا تھا۔ ویسے قائد اعظم کی اپیل پر سب سے پہلے خطاب واپس کرنے کا سہرا میرے ہی علاقے کے ایک صاحب

خان بہادر جلال الدین تھے جو عرف عام میں خان بابا کہلواتے تھے اور جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہو۔ وہ تحریک پاکستان کی سر گرم شخصیت۔

بہر حال جن لوگوں نے قائد اعظم کی اپیل پر فوراً اپنے خطاب واپس کئے انہی میں سے ایک نواب بہادر یار جنگ تھے جو اب نواب بہادر خان کے نام سے کہلوائے جانے لگے۔ جب یہ ہری پور میں تشریف لائے تو ان کی تقریر ہوئی۔ میں نے بہت سے لوگوں کی تقاریر بھی سن رکھی تھی جو باقاعدہ ایکشن اور اداکاری کے ساتھ تقریریں کرتے تھے۔ درمیان میں نعرہ تکبیر بھی لگاتے تھے مگر ان کا انداز ان سب سے مختلف تھا۔

یہ تو بہتی ہوئی ایک پر سکون ندی کے بہاؤ کی طرح تقریر کرتے تھے۔ جب سٹیج پر کھڑے ہوتے تو شیر وانی کے اوپر والی دو جیبوں میں اپنے انگوٹھے پھنسا لیتے تھے اور جسم کو کوئی حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہ شیر وانی کے ساتھ تنگ موری کا پاجامہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ انہوں نے ہری پور میں ڈھائی گھنٹے تک تقریر کی جو میں نے سنی اور مجھے کوئی تھکان نہ ہوئی۔

ان کی تقریر میں نعرے بازی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی کیونکہ لوگ سوچتے تھے کہ اگر نعرہ لگا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور وہ مزا نہیں آئے گا۔ اس طرح ہوتا تھا جیسے وہ کوئی لکھی ہوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ ان کی تقریر میں ایسی روانی ہوتی تھی اور سناٹا ایسا ہوتا تھا کہ اگر سوئی گرے تو اس کی بھی

آواز آئے۔ پھر ان کی ساری تقریر ادبیانہ ہوتی تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ لوگوں کے سر سے ہی گزر جائے۔ لوگوں کو سمجھ بھی آتی تھی مگر اس میں انشا پردازی کے موتی پروئے ہوئے ہوتے تھے۔

جب تقریر ختم کرنے لگے تو کہنے لگے کہ اب جبکہ لیلائے شب کی زلفیں تا بہ سحر پہنچی ہیں اور میں آپ کی آنکھوں میں نیند کے ڈورے دیکھ رہا ہوں تو مناسب یہی ہے کہ میں آج بہ حسرت و یاس آپ سے رخصت ہو جاؤں اور ایک ایسی تمنا اور کسک لے کر آپ کے پاس سے دور جاؤں جو مجھے پھر کھینچ کر آپ کے پہلو میں لے آئے۔

اس قسم کے الفاظ انہوں نے کہے تھے۔ ڈھائی گھنٹے تک لوگ بالکل خاموشی سے بیٹھے رہے۔ لوگ اتنی دیر خاموشی کے ساتھ سماع میں بھی نہیں بیٹھتے مگر وہاں بیٹھے رہے اور کوئی بدبخت ہی ہو گا جو اس دوران اٹھ کر ادھر ادھر گیا ہو گا۔

اس کے علاوہ جس گراؤنڈ میں انہوں نے تقریر کی اسی گراؤنڈ میں میں نے پہلے مہاتما گاندھی کی تقریر بھی سنی تھی۔ بہادر یار جنگ کی زبان تو اُردو ہی تھی لیکن مہاتما گاندھی اُردو نہیں جانتے تھے۔ ان کا یہ تھا کہ بہت سی زبان میں بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔

ان کے پیش نظر بہت پسی ہوئی مخلوق ہوتی تھی۔ ان کا ادبیانہ لہجہ تو تھا نہیں لیکن وہ جو زبان جانتے تھے اور جس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے وہ بڑی دلنشین تھی۔ اگرچہ اس وقت ہمارے کچھ ادبیانہ ذہن رکھنے والے لوگ حرف گیری بھی کر رہے تھے کہ دیکھئے انہوں نے یہ کہہ دیا مگر سچ یہ ہے کہ ان کا انداز بڑا دلنشین تھا۔ میں نے بعد میں اپنے ان دوستوں سے کہا تھا کہ وہ کسی حلقہ ارباب

ذوق میں آکر کسی افسانے پر بحث نہیں کر رہے بلکہ ان کے سامنے تو وہ پبلک ہے جسے انہوں نے اپنا پیغام دینا ہے۔اس لئے آپ اس چیز کو دیکھیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔اگر آپ کو زبان دانی سے لطف اندوز ہونے کی ضرورت ہے تو اس کے محل اور بھی ہیں۔

اس زمانے میں کانگریس کی مخالفت میں پوری حکومت ہند اور کچھ اس کے خریدے ہوئے لوگ بھی تھے۔ایسا بھی ہوا کہ مہاتما گاندھی کی تقریر کے دوران ایک گوشے میں کھڑے ہوئے دس بارہ افراد نے جو حکومت کے خریدے ہوئے تھے شور مچایا۔یہ بالکل خاموش کھڑے رہے۔وہ ذرا دھیمے ہوئے تو یہ کہنے لگے کہ میں نے آپ کو بات کرنے کا موقع دیا؟ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو بات کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔اگر آپ نے کوئی اور بات کرنی ہے تو میں تھوڑی دیر کے لئے اور چپ رہ لیتا ہوں۔اتنی دیر میں لوگوں نے ان افراد کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا ہوا تھا۔اس کے بعد انہوں نے پھر تقریر شروع کی اور کہا کہ میں اختلاف رائے کو پسند کرتا ہوں لیکن یہ میرے بھائی جو چیخ رہے تھے وہ نامناسب ہے۔انہوں نے چیخنے کے الفاظ استعمال کئے تھے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس لفظ کے معنی بہت گہرے ہیں۔کیونکہ کتوں کے لئے بھی چیخنے ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔پھر چیخنا کا مطلب شور مچانا بھی ہے۔تو اپنے استاد شفا صاحب کو جب میں نے بعد میں بتایا کہ مہاتما گاندھی نے یہ لفظ استعمال کیا تھا اور یہ کہہ رہے تھے تو وہ کہنے لگے کہ وہ تو پھر بہت زبان دان ہیں کیونکہ اس کے بہت سے معنی نکلتے ہیں اور بالواسطہ پر لمبی تقریر کی کہ اختلاف رائے برداشت کرنا چاہئے مگر یہ افراد جن لوگوں کے بھیجے ہوئے تھے وہ اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے۔میں جو بات کہتا ہوں وہ سنتے نہیں ہیں بلکہ گڑبڑ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔پھر کہنے لگے کہ میں تو ان لوگوں کو بھی سننے

کے لئے تیار ہوں۔

غرض وہ اس طرح میٹھے میٹھے انداز میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرتے رہے اور مجھے ان کی تقریر میں بھی بہت مزا آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک بڑے آدمی تھے۔ ان کے خیالات سے اتفاق نہ کروں یا میرے دوسرے بھائی اختلاف کریں تو یہ اور بات ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے چند بڑے لوگوں میں سے مہاتما گاندھی ایک تھے۔ ان کی باتیں بڑی دلنشین تھیں۔

میں نے پنڈت نہرو کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ ان کا انداز تقریر اور تھا۔ ان کی زبان میں اُردو کی چاشنی تھی اور وہ بالکل عوامی تقریر نہیں کرتے تھے بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جب وہاں تقریر کرنے کیلئے آئے تو جہاز سے آئے تھے۔ اس جلسے میں اکثریت تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی تھی جیسے کہ مہاتما گاندھی کی تقریر میں بھی تھی۔ لیکن نہرو کی تقریر سننے کے لئے مسلمان بھی جاتے تھے اور اس موقع پر بھی بہت سے مسلمان گئے تھے۔ جب ہم نے بھی سنا تھا کہ پنڈت نہرو آرہے ہیں تو پنڈی میں ہمارے محلے میں سے بھی بہت سے لوگ ان کی تقریر سننے گئے تھے۔

چونکہ یہ بھی پتا تھا کہ وہ کانگریسی ہونے کے علاوہ سوشلسٹ بھی ہیں۔ اس لئے بھی ہمیں دلچسپی تھی ۔ ان کے بارے میں یہ داستانیں بھی سنی تھیں کہ وہ جب کانگریس میں شامل نہیں ہوئے تھے تو ان کے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے کیونکہ یہ بہت بڑے رئیس زادے تھے۔ مگر ہم نے انہیں دیکھا کہ کانگریس میں شمولیت کے بعد وہ اب سادہ کپڑے پہننے لگے تھے اور ایسے ہی سادہ کپڑوں میں تقریر کرنے کیلئے بھی آتے تھے۔

ان کی تقریر میں کچھ انگلش مدبرین اور کچھ دوسری کتابوں کے حوالے موجود تھے۔ پھر انہوں نے آزادی ہند اور انگریزوں کے مظالم کی بات کی۔ ان کا رویہ وہی تھا جو ایک حریت پسند آدمی کا ہو سکتا ہے۔ جو لوگوں کو انگریزوں سے نفرت دلانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی سب باتیں بہت موثر طریقے سے بیان کرتے رہے اور ایک عرصے تک ان کے فقرے ہمارے ذہنوں میں گونجتے رہے۔

ان تین آدمیوں سے ہٹ کر اگر میں نے بچپن میں ان سے بھی پہلے اگر کسی بڑے آدمی کی تقریر سنی تھی تو وہ قائداعظم ہی تھے۔ اسی راولپنڈی میں اسلامیہ ہائی سکول کی گراؤنڈ میں وہ ایک مختصر سے دورہ کے سلسلہ میں آئے تھے۔ یہ غالباً 1937ء کی بات ہے اور اس زمانے میں وہ نئے نئے اُبھرے تھے۔ جب وہ وہاں آئے تو لوگوں کو صحیح طور پر یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا نام محمد علی جناح ہے یا جائناح ہے۔ یہ سفید رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ دبلے پتلے تھے اور اس وقت ان کے سر پر سفید بالوں کی وہ لٹ نہیں تھی جو ان کی پہچان بنی۔ مگر ان کے بال بہت خوبصورت تھے اور ان پر سوٹ بہت سج رہا تھا۔

وہ وہاں آئے تو ان کا بہت گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ انہوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ ہمیں انگریزی زبان بالکل نہیں آتی تھی لیکن عجب بات ہے کہ ایسے لگ رہا تھا جیسے ان کی باتیں سمجھ آ رہی ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی ایک لفظ کہتا اور کوئی دوسرا اور ہم اندازے ہی سے ان کی بات سمجھتے رہے۔ بہرحال ان کی تقریر سب لوگوں نے انتہائی عقیدت سے سنی۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کی کار میں کچھ مشروبات رکھے اور وہ کچھ دن مری میں گزارنے کیلئے مری چلے گئے۔

میں نے سب سے پہلے جو کسی بڑے آدمی کے دیدار کئے وہ قائد اعظم ہی تھے۔ لیکن ان سب چیزوں سے ہٹ کر ہر شخص کا اپنا ایک رنگ اور آہنگ تھا۔ اگرچہ سب کی منزل ایک ہی تھی اور وہ انگریز سے نجات حاصل کرنا اور آزادی بھی تھی۔ مگر مسلم لیگ نے آکر ایک اور نعرہ اس لئے دے دیا کہ شاید یہ سب نہیں مل سکتے تھے اور آزادی کی جو نعمت سب کیلئے تھی اس میں مسلمانوں کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے علیحدہ راستہ نکالا۔ اس میں بھی بنیاد بہر حال ہندوستان سے انگریز کو نکالنا تھی۔

میں نے اسی زمانے میں سب کی تقریریں سنیں اور ذہن میں ان کو نقش کر لیا اور اب یہ یادیں میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اب جب میں کراچی جاتا ہوں تو قائد اعظم کے مزار پر حاضری دیتا ہوں۔ اسی طرح جب میں پہلی بار دہلی گیا تھا تو مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جا کر میں نے اپنا احترام پیش کیا تھا۔ میں مسلم لیگی تھا اور اب مسلم لیگی نہیں بھی ہوں لیکن میں بہر حال کانگریسی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ان سب لوگوں کا احترام کرتا جن کی وجہ سے ہم آج آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

میرے اساتذہ

اپنے وقت کے اساتذہ ادب جو تھے ان میں سے سب سے پہلے جس ہستی سے میری ملاقات ہوئی وہ علامہ سیماب اکبر آبادی تھے۔ ان سے ملاقات کا شرف 1945ء میں کوہاٹ میں حاصل ہوا۔ یہ وہاں اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں صوبہ سرحد کے علاوہ صوبہ

پنجاب سے بھی کافی افراد نے شرکت کی۔اس کانفرنس سے اردو کے مقاصد کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس موقع پر وہاں مشاعرہ بھی ہوا۔

اس مشاعرے میں مسلمان شعراء کے علاوہ ہندو اور سکھ شعراء کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اس مشاعرے کا انعقاد کروانے والے علامہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد رشید حضرت اخگر سرحدی تھے۔ان کے علاوہ عزیز اختر وارثی اور صوبہ سرحد کے دیگر جونیئر شعراء جو اب سینئر بن چکے ہیں بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔

علامہ سیماب بڑی شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے اساتذہ میں نے بہت کم دیکھے ہیں جو بڑی فراخدلی سے اپنے شاگردوں کی تربیت کرتے ہوں۔یہ بھی درست ہے کہ مولانا کی معاشی مجبوریاں اور ضرورتیں بھی تھیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے شاگرد بنائیں تاکہ ان کے مالی حالات میں کچھ کفالت ہو جائے۔ مثلاًان کی جو کتابیں چھپتی تھیں وہ فوری طور پر بک جاتی تھیں کیونکہ اگر صرف ان کے شاگرد ہی یہ کتابیں خریدنے لگتے تو ایڈیشن نکل جاتا۔اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاگرد سے وصول کرنے کا یہ معاوضہ بہت کم ہے کیونکہ ہم نے تو ایسے ایسے استاد دیکھے ہیں کہ اگر بدقسمتی سے کوئی شاگرد بن جائے تو اسے لوٹ کھاتے ہیں اور پھر اسے جو رموز فن بتاتا ہوں وہ بھی نہیں بناتے۔کیونکہ وہ خود بھی اپنے فن میں مکمل نہیں ہوتے لیکن مولانا اپنے فن میں مکمل ہی نہیں بلکہ اکمل تھے۔وہ فراخدلی سے اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اس سلسلے میں بڑی لمبی چوڑی داستانیں مشہور ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سوائے علامہ کی

فراخدلی کے اور کسی چیز پر اسے معمور نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب داستانیں بے بنیاد ہیں۔

علامہ نے میرا کچھ کلام مشاعرے میں سنا تھا۔ ظاہر ہے کہ مشاعرے میں سب کلام رواروی میں سنا جاتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک آدھ شعر بھی ذہن میں رہ جائے تو بہت ہے اور پھر میں تو اس زمانے میں بڑا جونیئر شاعر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت علامہ صاحب کو سوائے میرے اچھے ترنم کے اور کیا یاد رہنا تھا۔ لیکن جب میں مشاعرے کے بعد ان سے الگ ملا تو میں نے ان سے گزارش کی کہ میرا تھوڑا سا کلام الگ سے سنیں اور رائے دیں۔ چنانچہ انہوں نے جو سنا اس میں سے گیت کو زیادہ پسند کیا۔ اس زمانے میں گیت خالص ہندی میں لکھا جاتا تھا اور ہندی کے بھی رسمی الفاظ بالما ساجنا وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن میں اس زمانے میں بھی اُردو میں گیت لکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں صرف چند ایک لوگ ہی اُردو کی ترویج کا سلسلہ جاری وساری تھا اور ہر شخص ہی اُردو کی ترویج چاہتا تھا۔ چونکہ گیت ہندی صنف سخن ہے اور اس وقت بھی بہت کم لوگوں کو اس کا احساس تھا کہ اُردو میں بھی گیت لکھا جاسکتا ہے۔ تو میں نے جب علامہ کو اپنے اُردو گیت سنائے تو انہوں نے انہیں بہت پسند کیا اور میری گزارش پر انہوں نے رائے بھی لکھ کر دی۔ یہ رائے میرے گیتوں کے پہلے مجموعے ''ہریالی'' کے پہلے ایڈیشن میں چھپی بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بخل سے ہرگز کام نہیں لیتے تھے۔ کسی بھی شاعر کا کلام فراخدلی سے سنتے تھے۔ اور اگر اس میں کچھ ہے تو فراخدلی سے داد دیتے تھے اور اگر کوئی خامی ہے تو یوں شفقت سے بتا دیتے تھے جیسے وہ خامی کوئی خامی نہیں ہے بلکہ وہ ہر کسی سے سرزد ہو جانے والی چیز ہے۔

اتنے مانے ہوئے استاد سے جب مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا تو میرے مزاج میں بھی ابتدا ہی سے وہی چیز شامل ہوئی کہ کسی کی عیب جوئی بری چیز ہے اور اگر کسی کی خامی اسے بتانی ہے تو وہ اس طرح نہ بتائی جائے کہ وہ برا محسوس کرے اور حوصلہ افزائی اتنی کی جائے کہ اس شخص میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے جو ابتداء کر رہا ہے۔

غالباً میرے کسی بزرگ دوست نے کہا تھا کہ ایک آدمی ادب کے سفر پر نکلے تو یوں سمجھو کہ اسے ایک دن منزل پر پہنچنا ہے۔ وہ اگر دو سال میں پہنچنے والا ہے تو تمہاری رہنمائی سے اس کا فاصلہ مختصر ہو جائے گا۔ پہنچنا تو اسے ہے ہی لیکن اگر تم اس کی مدد کرو گے اور وہ جلدی منزل پر پہنچ جائے گا تو وہ تمہیں یاد رکھے گا۔ یہ چیز جو میں نے سیکھی اس کی ابتداء علامہ سیماب اکبر آبادی سے ہوئی۔

اس کے بعد کے لوگوں میں علامہ تاجور نجیب آبادی کا بھی یہی مزاج پایا اور بنیادی طور پر میرے جو اساتذہ تھے یعنی حضرت شفا اللہ جناب احمد ندیم قاسمی سب کا رویہ یہی تھا۔ یہ تربیت میرے کام آئی اور میرے مزاج کا حصہ بن گئی۔

ادب میں نہیں بلکہ کچھ دوسری چیزیں بھی سیکھنے کی ہوتی ہیں مثلاً پہننا' کھانا پینا' چلنا پھرنا اور بولنا چالنا۔ یہ سب چیزیں بھی سیکھی جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی چیز ہے کہ جو چیز جہاں سے بھی سیکھی ہو وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ میں نے زندگی میں کسٹرڈ نہیں کھایا ہوا تھا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی سے ان کے شاگرد اخگر سرحدی نے پوچھا کہ علامہ اقبال آج آپ میٹھے میں کیا کھائیں گے تو انہوں نے کہا کہ کسٹرڈ ہو سکے تو بہتر ہے کیونکہ میرا معدہ اسے قبول کرتا ہے۔ میں نے اس وقت پہلی بار کسٹرڈ کا نام سنا تھا۔ میں نے کہا نہیں کہ مجھے تو اس کا نام ہی نہیں آتا لیکن اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کیا چیز ہے۔ چنانچہ

کھانے کے آخر میں جب کسٹرڈ آیا تو پتا چلا کہ یہ کیا چیز ہے۔اس زمانے میں کسٹرڈ کی بھی ابتدائی شکل ہی تھی۔آج تو اس کی بھی کئی اقسام ہیں۔اس وقت یہ ایک سیدھی سادی فرنی قسم کی چیز تھی جس میں خوشبو اور رنگ ہوتے تھے۔میں نے کسٹرڈ کھایا اور اب جب بھی میرے سامنے کوئی متوجہ کرنے والا کسٹرڈ آتا ہے تو مجھے بے ساختہ سیماب اکبر آبادی اور اخگر سرحدی یاد آتے ہیں۔

اسی طرح ایک گھر میں مہمان تھا تو وہاں میں نے بنیان دھونے کے لئے دی تو خاتون نے فوراً غسل خانے میں جا کر دو چار ہاتھ مار کر بنیان دھو دی۔میں نے کہا کہ آپ نے تو یہ دھوئی ہی نہیں۔وہ کہنے لگیں کہ دیکھو بنیان میں میل تو ہوتی ہی نہیں صرف پسینہ ہوتا ہے۔اس لئے اگر آپ اسے صرف سادہ پانی میں کھنگال لیں تو وہ پسینہ نکل جاتا ہے۔میں نے اس خاتون کی بات پلے باندھ لی۔اب میں جہاں بھی جاتا ہوں تو ایک مدت سے میرا یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ میں اپنی بنیان اتار کر خود ہی اسے دھو کر سکھانے کے لئے ڈال دیتا ہوں۔ایسا کرتے ہوئے ہر بار وہ خاتون مجھے یاد آ جاتی ہے۔میں یہ بنیان اس نسخے سے دھوتا ہوں جس طرح اس خاتون نے بتایا تھا۔

اسی طرح اور چیزوں میں بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔جیسے کہ اگر میں قمیض پہنتے وقت دیکھوں کہ بٹن ٹوٹا ہوا ہے تو فوراً مجھے پھوپھی یاد آ جایا کرتی ہیں جو اپنے سے چھوٹوں کو تلقین کیا کرتی تھیں کہ جب کپڑے دھو لو اور استری کر لو تو دیکھو کہ کوئی بٹن ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے۔لیکن میرے گھر میں ایسا نہیں ہے۔کبھی دو چار مہینے کے بعد جب کوئی ٹوٹا ہوا بٹن ملے تو مجھے وہ یاد آ جاتی ہیں۔

شروع کی جتنی باتیں ہیں ان میں کسی شخص نے جو بھی رہنمائی کی تھی وہ مجھے یاد آجاتی ہے۔
جس طرح حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے صوت کے سلسلے میں مجھے بتایا تھا کہ اگر ردیف والا لفظ مطلع چھوڑ کر کسی اور شعر میں آجائے تو وہ صوت کو مجروح کرتا ہے۔ اس سے بچنا۔ میں تو بچ گیا اور اس کو پلے باندھ لیا۔ نادانستہ ایک دو ہزار اشعار کے بعد کسی شعر میں آجائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ میں اس بارے میں محتاط ہوں۔ لیکن جب کہیں اور یہ خامی دیکھتا ہوں تو مجھے حفیظ صاحب کی یہ بات یاد آجاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو چیز زندگی میں پہلی بار سیکھی ہو یا دیکھی ہو تو وہ بہت یاد آتی ہے۔ بعض اوقات ایسی چیزیں بھی دھوکا دے جاتی ہیں جنہیں حاصل کرتے وقت انتہائی خوشی ہوئی ہو۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران دو واقعات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ شاہی دواخانہ راولپنڈی کے مالک حکیم عبدالخالق بہت نامور طبیب اور سوشل آدمی تھے۔ انہوں نے عید میلادالنبی پر ایک انعامی مشاعرہ رکھا جس میں ایک گولڈ میڈل اور سلور میڈل پہلے اور دوسرے درجے کی نظموں کیلئے رکھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ شاعر بلاامتیاز مذہب وملت کے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے۔ ہم کبھی ہولی کے مشاعروں میں چلے جاتے تھے تو دیگر مذاہب کے شعراء عید میلادالنبی کے مشاروں میں چلے آتے تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں تو ہولی ہی کے ریفرنس سے ''ہوری'' ایک صنف سخن بھی کبھی بن کر رہ گئی تھی۔ شاید امیر خسرو نے اس سلسلے میں کام کیا تھا اور اودھ کے درباروں میں اس کا چلن تھا۔ اس میں رادھا اور کرشن اور گوپیاں ہی نہیں بلکہ آج کے جیتے جاگتے' کردار بھی شامل نظر آتے تھے۔ یہ استعارۃ یا علامت کے طور پر کرشن اور رادھا وغیرہ گوپیوں کا نام استعمال ہوتا تھا۔ گویا یہ ایک ایسی

صنف سخن تھی جسے مسلمان بھی لکھتے تھے اور وہ اس لئے لکھتے تھے کہ اس زمانہ کی یاد تازہ کی جائے جو اب گزر چکا ہے۔

اسی طرح نعتیہ مشاعروں میں ہندو اور سکھ شاعر شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک صنف سخن کے طور پر نعتیں کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس میں عقیدہ تو شامل ہونا مشکل ہے لیکن ایک صنف سخن سمجھ کر نعت بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مشاعرے میں ہندو اور سکھ شعراء بھی شریک ہوئے تھے۔ گرمکھ سنگھ مسافر بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے جو بعد میں انڈین پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ وہ بہت شفیق آدمی تھے اور بنیادی طور پر پنجابی کے شاعر تھے۔
اس مشاعرے میں اُردو نعت پر مجھے گولڈ میڈل مل گیا اور مگر گرمکھ سنگھ مسافر کو چاندی کا تمغہ ملا۔ میں اس انعام پر بہت خوش ہوا۔ شہرت بھی ہوئی اور تصویریں بھی چھپیں۔ لیکن اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ میری مالی حالت بہت خراب ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ چیز جسے جان سے بھی عزیز سمجھ کر سنبھال کر رکھنا چاہیئے اور جو انعام یا ایوارڈ میں ملی ہو اسے بھی بیچنا پڑا کیونکہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ بیچنے کا ملال بھی تھا کیونکہ میں نے اس گولڈ میڈل کو فریم کروا رکھا ہوا تھا۔ یہ گولڈ میڈل دو تولے سے زیادہ ہی نظر آرہا تھا اور میں نے اسے مخمل کے کپڑے پر لٹکا کر شیشے کے فریم میں رکھا ہوا تھا۔ مگر جب مالی حالت بہت خراب ہوئی تو میں نے سوچا کہ اسے بیچ کر ایک ماہ کی روزی کا بندوبست تو کریں پھر اللہ وارث ہے۔
میں ملول سا ہو کر سنار کی دوکان پر گیا اور اس سے کہا کہ اسے تول کر لے لو اور جتنے پیسے بنتے ہیں وہ

مجھے دے دو۔ اس نے اس میڈل کو کسوٹی پر گھس کر دیکھا تو کہنے لگا کہ اس میڈل کے اوپر تو پانی چڑھا ہوا ہے اور نیچے سے تو یہ گلٹ ہے۔ یہ تو خالص چاندی بھی نہیں ہے۔ اس واقعہ پر شرمندگی کے علاوہ بہت زیادہ دکھ بھی ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہ مہینہ تو یہ میڈل بیچ کر گزر جائے گا۔ جب سنار کے پاس گیا تھا تو صرف یہ ملال تھا کہ یہ میڈل بیچنے جا رہا ہوں اور جب وہاں سے لوٹا تو آنکھوں کے سامنے تنگدستی کا مہینہ بقایا تھا اور شرمندگی اس کے علاوہ تھی۔ چنانچہ واپس آیا اور میں نے غصے میں آ کر اس میڈل کو ایک گندے نالے میں پھینک دیا۔ میں نے اس زمانہ میں اس موضوع پر ایک نظم بھی کہی تھی۔ اب میرے پاس وہ نظم ریکارڈ میں نہیں ہے۔ اس میں میں نے کہا تھا کہ اس اعزاز اور انعام کا مجھے کیا فائدہ جو میری بھوک نہیں مٹا سکتا۔

سیماب صاحب کا میں نے اساتذہ میں ذکر کیا ہے۔ ان کے بعد اپنے وقت کے جن استاد سے میری ملاقات ہوئی وہ تلوک چند محروم تھے۔ یہ پنڈی میں رہتے تھے اور مزاج کے درویش اور علم سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ کلاسیکل شاعری میں بہت پختہ تھے۔ یہ بنیادی طور پر مدرس تھے اور بعد میں پروفیسر ہو گئے۔ ان کا پڑھنے کا انداز بالکل اس طرح کا تھا جیسے وہ کلاس میں کھڑے طلباء کو شعر ذہن نشین کروا رہے ہیں۔ وہ ایک مصرعے کو پہلے ٹکڑوں میں دہرا کر پھر پڑھتے تھے۔ غالباً ان کی یہ عادت کلاس روم ہی میں سے بنی تھی۔

مگر اس زمانے میں اس کے کچھ اشعار اور نظمیں بہت مشہور ہوئی تھیں۔ مثلاً:

نہ تڑپ فراق بت میں دل بے قرار سو جا

"دل بے قرار سو جا" والا ٹکڑا بعد میں کئی شاعروں سے ہوتے ہوتے منیر نیازی تک بھی آیا اور منیر

نیاری نے بھی لکھا کہ :

جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا

ایک آدھ فلم میں بھی اس کا چربہ آیا۔ بہرحال ان سے جب میں ملتا تھا تو روحانی طور پر ایک اطمینان ہوتا تھا۔ وہ حوصلہ افزائی کرتے تھے اور شعر و شاعری کے رموز بتاتے تھے۔ مجھ پر حیران ہوتے تھے اور مجھے عزیز کہہ کر کہتے تھے " عزیز! تمہاری شاعری میں ہندی کے الفاظ زیادہ کیسے آتے ہیں"

میں کہتا تھا" یہ کوئی شعوری کوشش نہیں ہے اور میں ان الفاظ کو ہندی سمجھ کر نہیں بلکہ اُردو سمجھ کر استعمال کرتا ہوں۔ صرف یہ ہے کہ میں سہل زبان کا قائل ہوں اور مفرد الفاظ کی شاعری کر کے مجھے مزہ آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ ہندی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُردو ہے"

وہ میرا جواب سن کر ہنستے تھے کہ میں تو ہندی لفظ بھی اگر استعمال کرنا ہوں تو استعمال نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ مزاج کا معاملہ ہے کیونکہ آپ نے فارسی اتنی پڑھی ہوئی ہے کہ وہی آپ کے ذہن میں رچی ہوئی ہے۔ پھر آپ منشی کہلواتے تھے۔ آپ تو انشا پردازی کے ماہر ہیں اور فارسی زبان کا آپ پر اثر ہے قبلہ میں فارسی کے بارے میں نابلد آدمی ہوں۔ میں نے کلاسوں میں جو تھوڑا بہت پڑھا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

تلوک چند اس زمانے میں پنڈی میں لال کڑتی کے علاقہ میں رہتے تھے۔ تب جنگ کا زمانہ ابھی گزرا ہی تھا اور چینی کی بڑی قلت تھی۔ راشننگ ہوتی تھی۔ آپ سن کر حیران ہو جائیں گے کہ

وہ ایک پیالی میں چھ چمچ چینی پیتے تھے۔انسان یقین نہیں کر سکتا کہ لیکن وہ واقعی ایسا ہی کرتے تھے اور ہر دن میں کئی بار چائے پیتے تھے۔اب چینی کی قلت ہوئی تو ان کے لئے مسئلہ بن گیا۔
میں اور میرے ساتھیوں احمد ظفر اور جمیل ملک نے ان کا مسئلہ کسی حد تک حل کر دیا۔ہم جب بھی ان کے پاس جاتے تھے کسی نہ کسی طرح دو چار سیر چینی جمع کر کے ان کے لئے لے جاتے تھے۔وہ اس چینی کو اس طرح قبول کرتے تھے جیسے وہ ان کے لئے کوہ قاف سے سوغات آئی ہو۔وہ ہمیں بہت دعائیں دیتے تھے۔

جگن ناتھ آزاد ان کے صاحبزادے ہیں۔عجب بات یہ کہ میرے چند ایک بہت قریبی دوستوں میں سے ایک جگن ناتھ آزاد ہیں۔ان کی عادت بھی بالکل والد پر ہے۔ وہ چھ چمچ چینی فی کپ تو نہیں پیتے لیکن اس زمانے میں بھی وہ تین کپ چمچ تو ضرور ایک پیالی میں پیتے ہیں۔کچھ لوگ تو اس زمانے میں چائے میں شکر پیتے ہی نہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ ایک چمچ لیتے ہیں۔یہ ان کی خاندانی عادت ہے۔مگر مزے کی بات یہ ہے کہ پھر بھی ان کے جسم میں شکر کی کمی ہے اور وہ اس لئے کہ وہ ذیابیطس کے مریض نہیں ہیں۔
اب علامہ تاجور نجیب آبادی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔میں نے ہری پور سے انہیں اپنا کلام بھیجا۔یہ ان دنوں" شاہکار" کے ایڈیٹر تھے جو اپنے وقت کا بہت خوبصورت پرچہ تھا۔
اس زمانہ میں بے چینی یہ ہوتی ہے کہ جونہی کلام پرچے کے دفتر میں پہنچے تو فوراً کتابت ہو کر چھپ کر باہر آجائے اور جتنے دن پرچہ لیٹ ہوتا جاتا ہے یہ بے چینی رہتی ہے کہ خدا جانے اس کلام کے

ساتھ کیا سلوک ہوا۔

میں اس بے چینی سے اپنے کلام کے چھپنے کا انتظام کر رہا تھا کہ مجھے مولانا کا خط آ گیا اور خط میں بھی ایسا کہ اس نے مجھے زمین سے اٹھا کر اوپر کہیں خلا میں کھڑا کر دیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کا کلام ملا اس کے خالق کی خوش قسمتی ہو نہ ہو اس علاقے کی خوش قسمتی ضرور ہے جس علاقے میں ایسے کلام کا خالق پیدا ہوا۔ انہوں نے اسی طرح کا ایک آدھ جملہ اور بھی لکھا تھا۔

میں اس خط کو میز پر اس طرح رکھتا تھا کہ جو بھی میرے پاس آئے تو اس کی اس پر نظر پڑے اور میں اسی بہانے اسے یہ خط پڑھوا دوں۔ جب باہر نکلتا تھا تو میں اس خط کو جیب میں ڈال کر نکلتا تھا اور میں نے یہ خط ساری دنیا کو پڑھوا دیا تھا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے بعد میرے پاس جو تحریری سند تھی وہ یہ تھی۔ اس خوشی کا یہ عالم تھا کہ دامن چھوٹا لگتا تھا اور خوشی اس میں سما نہیں پا رہی تھی۔ یوں ہی دل میں خیال آیا کہ لاہور چلتے ہیں سیر بھی کریں گے اور علامہ تاجور سے ملاقات بھی کریں گے۔ ان کا شکریہ بھی ادا کریں گے۔

چنانچہ میں لاہور گیا اور جب علامہ تاجور کے پاس پہنچا تو وہ اپنی داڑھی کے بال ترشوا رہے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا "کہاں سے آئے ہو"

میں نے کہا "ہری پور سے"۔

کہنے لگے " قتیل شفائی ہو ، بیٹھو" میں وہیں بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا مجھے اخبار دے کر کہنے لگے " تم یہ پڑھو میں غسل کر کے آتا ہوں اور پھر تم ناشتہ میرے ساتھ کرنا"

نہا کر آئے تو ناشتہ بھی آ گیا۔ ناشتے کے بعد کہنے لگے " تم نے جو کلام بھیجا تھا میں نے اس پر صاد کر

دیا ہے" یہ ان کا مخصوص لفظ تھا۔ یہ صحیح کی علامت تھی اور اس کا مطلب تھا کہ کلام صحیح ہے اور قابل اشاعت ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ آ گئی حالانکہ پہلی بار میں نے یہ لفظ سنا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ بہت بذلہ سنج' لطیفہ گو' جملہ باز اور سب سے بڑھ کر پارٹی باز آدمی تھے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ادبی معاملات میں تھے۔ دوسری طرف ان کے مخالفین میں ڈاکٹر تاثیر تھے (سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے والد)۔ اس دن انہوں نے کچھ باتیں بھی سنائیں اور کہنے لگے "بھائی میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ صرف یہ کیا کہ جب ان کا کلام اشاعت کیلئے میرے پاس آیا تو اس پر ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایم ڈی میں چھپا ہوا محمد دین سامنے کر دیا اور اپنی طرف سے ڈاکٹر کے ساتھ ہومیو لکھ دیا"" کہنے لگے " میں نے تو اپنے دل کی بھڑاس یوں نکال لی ہے کہ میں نے ان کے کلام پر ان کا نام ڈاکٹر محمد دین تاثیر (ہومیو) لکھ دیا ہے"

میں نے کہا" جی آپ اس کے علاوہ ان کے ساتھ کیا کرتے۔ آپ نے ایک اچھے بھلے پی ایچ ڈی آدمی کو ہومیو ڈاکٹر بنا دیا ہے اور پھر وہ ایم ڈی اس لئے لکھتے تھے کہ محمد دین بہت غیر شاعرانہ نام ہے۔ آپ نے اسے بھی بے نقاب کر دیا۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہ خوشتر گرامی بہت خوبصورت نام ہے اور اگر کوئی لکھ دے رام رکھا مل خوشتر گرامی تو وہ تو بے چارا مارا گیا" وہ میری بات سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے " پٹھانوں میں لطیفہ گوئی بھی ہوتی ہے"

میں نے کہا" حضرت آپ بھی تو پٹھان ہیں" پھر ہنس پڑے۔وہ بھی پٹھانوں میں سے تھے اوران پٹھانوں میں سے جو صوبہ سرحد سے نقل مکانی کرکے بہت مدت پہلے نجیب آباد وغیرہ گئے تھے۔میں نے کہا" اگر آپ اتنے عرصے کے بعد بھی زندہ دلی نہیں بھولے ہیں تو ہم تو ابھی وہاں موجود ہیں" اس طرح ان سے قربت ہوئی۔میں نے باتوں باتوں میں ان سے بھی بہت حاصل کیا۔ ان سے جو چیز حاصل کی وہ یہ تھی کہ وہ مجھے کہنے لگے" سب سے اہم چیز تو خیال ہے لیکن اگر خیال کے ساتھ الفاظ رواں دواں نہیں ہوں گے اور عنائیت سے خالی ہوں گے تو خیال مر کے رہ جائیں گے۔لیکن اگر خیال کمزور بھی ہے اور کھنکتے ہوئے اور خوبصورت الفاظ آپ دیں گے تو وہ چھوٹا خیال بھی قاری تک بڑا خیال ہو کر پہنچے گا"

وہاں پر بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب جو غالباً شباب کیرانوی تھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے" ان کے ہاں بہت غنائیت ہے" مجھے پہلی بار اس بات کا جس نے احساس دلایا تھا وہ مولانا تاجور تھے۔مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی اور اس کے بعد میں نے ان کی اس بات کو پلے باندھ لیا کہ لفظوں کا جامہ بہت خوبصورت ہونا چاہئے۔پھر خیال بڑا اور دلکش نظر آئے گا۔یہ چیز میں نے تاجور صاحب سے سیکھی۔

میں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابتداء میں شفا صاحب سے اصلاح لی اور بعد میں قاسمی صاحب سے اصلاح لی۔یہ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے کہ میں قاسمی صاحب سے ملا نہیں تھا۔جی چاہا کہ قاسمی صاحب سے ملاقات ہو۔اس زمانے میں وہ ضلع سرگودھا تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں رہتے تھے۔جو اک پہاڑی پر واقع ہے۔اس زمانہ میں خوشاب سے انگہ تک سواری کا کوئی انتظام نہیں

تھا، یہ سفر یا تو پیدل کرنا پڑتا تھا یا پھر گھوڑی ہوتی تھی۔اب تو سنا ہے کہ وہاں تک بس چلتی ہے۔
ہوا ایسا کہ میں لائل پور کے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کے لئے گیا۔لائل پور کے دو مشاعرے مشہور تھے ایک تو لائل پور کاٹن مل کا مشاعرہ تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء شریک ہوتے تھے۔دوسرا مشاعرہ مرحوم چوہدری منظور سیکرٹری میونسپل کمیٹی لائل پور اور خلیق قریشی مرحوم مالک مدیر اخبار ''عوام'' مل کر کرتے تھے۔یہ مشاعرہ بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔

پہلے مشاعرے میں تھوڑی سی جانبداری کی جاتی تھی اور اس میں ایک تو اُردو بولنے والے آتے تھے اور دوسرے ہندو۔کیونکہ مل کے مالک مرلی پرشاد تھے۔چنانچہ کچھ شعراء تو دہلی سے آجاتے تھے اور کچھ پنجاب میں بسنے والے اُردو بولنے والے شعراء آجاتے تھے۔اس میں جگن ناتھ آزاد اور دوسرے شعراء بھی ہوتے تھے۔اس مشاعرے میں تو ہمیں بلایا نہیں جاتا تھا۔
دوسرا مشاعرہ جو چوہدری منظور اور خلیق قریشی منعقد کرتے تھے۔اس میں میں نے شمولیت کی۔اس سے پہلے یہ ہوا کہ مجھے بھی لائل پور کاٹن مل کے مشاعرے میں بلوایا گیا تھا ۔نجانے یہ رسم کیسے ٹوٹی ۔اس زمانے میں مل والے ہر شاعر کو کپڑوں کی ایک پوٹلی بھی ساتھ دیا کرتے تھے۔جس میں گرم اور سرد کپڑوں کے علاوہ شلوار قمیض یا پتلون وغیرہ کا کپڑا بھی ہوتا تھا۔
اس مشاعرے میں شمولیت کے بعد میں سیدھا انگہ قاسمی صاحب کے پاس گیا۔میں نے انہیں پہلے اس بارے میں اطلاع دے رکھی تھی۔انہوں نے پہلے ہی سے ایک آدمی کو گھوڑی دے کر خوشاب بھیجا ہوا تھا۔میں نے گھوڑی کی سواری کبھی کی نہیں تھی۔میرا یہ حال تھا۔ گھوڑی پر وہ آدمی تھا جسے

قاسمی صاحب نے مجھے لینے کے لئے بھیجا تھا اور میں گھوڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا ہوا انگہ میں داخل ہوا۔

قاسمی صاحب نے مجھے پیدل آتے ہوئے دیکھا تو بہت ہنسے۔ میں نے کہا" اگر میں گھوڑی پر ہوتا اور گر جاتا تو آپ تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ اس لئے اب پہنچ تو گیا ہوں"

میں بچپن ہی سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ صبح نہانے کا عادی ہوں۔ اگر کبھی شدید بخار کی حالت میں نہ نہایا ہوں تو الگ بات ہے ورنہ میں ہمیشہ نہاتا ہوں۔ اب انگے میں یہ صورت تھی کہ وہاں تو پینے کا پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ عورتیں اتنی اونچائی سے نیچے ڈھلان پر جا کر کسی کنویں سے پانی بھر کے گھڑوں میں لاتی تھیں۔

میں نے صبح صبح جب قاسمی صاحب سے کہا کہ میں نہانا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگے کہ مجھے پہلے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ یہاں تو نماز بھی تیمم کر کے پڑھی جاتی ہے اور پینے کا پانی بھی بڑی مشکل سے آتا ہے ۔ خیر کچھ کرتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ یہ پینے والے گھڑے کے پانی سے گزارہ کر لیں۔ میں اس پانی سے اس طرح نہایا جیسے پٹرول سے ڈرائی کلیننگ کی جاتی ہے ۔ انہوں نے اس کے بعد کسی اور کو بھیج کر گھڑے میں پینے کے لئے پانی منگوایا اور وہ آدمی کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آیا۔

اس کے بعد شرم کے مارے میں بھی دو تین دن نہیں نہایا۔ وہاں کی علم و ادب کی داستانیں عجیب ہیں۔ قاسمی صاحب خود گریجویٹ ہیں۔ ان کے بھائی پیرزادہ محمد بخش بھی گریجویٹ ہیں۔ یہ گاؤں شہر سے بالکل الگ تھلگ ہے اور یہاں پینے کیلئے پانی تک نہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں میں پارٹیشن سے پہلے بھی کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں کوئی نہ کوئی گریجویٹ نہیں۔

میری علمی پسماندگی تھی۔ مجھے وہاں بہت شرم آئی۔ مجھے جب وہ کسی آدمی کا تعارف کرواتے اور کہتے کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور انہوں نے پچھلے سال گریجویشن کی ہے تو دماغ پاگل ہو جاتا۔ میں وہاں کچھ دن قیام پذیر رہا۔ بات یہ کرنی چاہتا تھا کہ قاسمی صاحب بھی اتنے دور دراز علاقے میں رہ کر گریجویشن کر گئے' ہر چند کہ ان کے تایا مال افسر تھے مگر ان کے والد فقیر منش تھے اور مجذوب اور پیر تھے۔ ان کے ساتھ معجزات بھی وابستہ تھے۔ مگر جب یہ دونوں بھائی پڑھ لکھ گئے تو انہوں نے پیری فقیری کے سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا اور یہ سلسلہ ان کے کزن کی طرف منتقل ہو گیا۔ آج کل وہی یہ گدی سنبھالے ہوئے ہیں اور اسی طرح ہیں جیسے کہ پیروں کی قسمت میں عزت بھی ہوتی ہے اور دولت بھی۔ سو ان کی قسمت میں بھی یہ سب ہے۔ لیکن ویسے تو ایک صاحب علم اور شاعر سے زیادہ امیر آدمی کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ دونوں بھائی ان سے زیادہ امیر ہیں اگرچہ ان کی دولت اور طرح کی ہے۔ انہیں تعلیم نے اس راستے پر ڈالا جو صحیح اخلاقی و اسلامی راستہ ہے۔

اس زمانے میں قاسمی صاحب سگریٹ پینے کے رسیا تھے اور میں نے دیکھا کہ اس گاؤں میں بھی ان کے پاس سٹیٹ ایکسپریس سگریٹ کا کاٹن موجود تھا۔ ادھر سے میں بھی ان کیلئے کچھ قیمتی سگریٹ کے پیکٹ لے کر گیا تھا کیونکہ اس وقت میں خود بھی سگریٹ پیتا تھا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ان کے پاس تو مجھ سے بھی بہتر برانڈ کے سگریٹ بلکہ سگریٹوں کے دادا موجود تھے۔ چنانچہ میں اپنے سگریٹ دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ یہ اس طرح ہے جیسے ایک دیہاتی کسی بادشاہ کا دوست بن گیا۔ بادشاہ شکار پر گیا اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ اسے بھوک لگی تو اس نے دیہاتی سے کھانا کھایا' بھوک لگی چنانچہ کھانا پسند آیا۔ اس نے دیہاتی کو انعام کے طور پر کوئی نشانی دی۔ دیہاتی کو پتا ہی نہیں تھا کہ

بادشاہ کے ٹھاٹھ کیا ہوتے ہیں۔ وہ اسی میں خوش تھا کہ ایک آدمی نے اس سے کھانا کھایا ہے اور اس کا دوست ہو گیا ہے۔ ایک دن اس کا جی چاہا کہ وہ جا کر اپنے اس دوست سے ملے۔ یہ دیہاتی جہاں رہتا تھا وہاں قاسمی صاحب کے گاؤں انگہ کی طرح پانی کی بڑی قلت تھی۔ تو اس دیہاتی نے سوچا کہ اپنے دوست اور بادشاہ کیلئے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس کیلئے پانی کا ایک گھڑا لے جاؤں۔

چنانچہ وہ گھڑا لے کر چلا گیا۔ بادشاہ کو جب اس دیہاتی کے آنے کی اطلاع دی گئی تو اس وقت بادشاہ جھیل میں کشتی میں سیر کر رہا تھا۔ بادشاہ کو وہ آدمی یاد آ گیا۔ اس نے اسے وہیں بلوالیا۔ اس نے دیکھا کہ اس دیہاتی نے سر پر پانی کا گھڑا رکھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو دیہاتی نے سوچا کہ میرے سر پر تو پانی کا ایک گھڑا ہے جبکہ یہ تو جھیل میں سیر کر رہا ہے تو اس کی زبان سے کوئی بات بھی نہ نکل سکی۔ اس دیہاتی کی کہانی آگے چلتی ہے اور خیر بادشاہ اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے پانی رکھ لیا اور گھڑا ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھر کر اس کو واپس دے دیا۔

یہی حال میرے ساتھ ہوا جب میں قاسمی صاحب کے ہاں گولڈ فلیک یا اس سے ملتے جلتے سگریٹ لے کر گیا تو آگے ان کے پاس سٹیٹ ایکسپریس سگریٹ کا کاٹن پایا۔ یہ تو اس وقت خوابوں کی دنیا کے سگریٹ ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی بڑی سبکی محسوس کی کیونکہ میں بھی وہاں یہی سوچ کر گیا تھا کہ ان کے گاؤں میں زیادہ سے زیادہ حقہ پیا جا رہا ہو گا اور اگر سگریٹ پیتے بھی ہیں تو ان کے پاس کوئی ایسے ویسے سگریٹ ہی ہوں گے لیکن وہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

میں نے قاسمی صاحب کو بتایا کہ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا تو وہ بہت ہنسے اور جب واپس آنے لگا تو انہوں نے مجھے ایک کارٹن سٹیٹ ایکسپریس کا دیا کہ یہ سگریٹ لاہور میں شاید کم ملتے ہیں۔

اساتذہ کے ساتھ میری ایک ساتھ سب سے زیادہ ملاقاتیں 1958ء میں دہلی کے چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے میں ہوئیں۔اس میں جوش، جگر، روش صدیقی، پنڈت ہری چند اختر، یاس یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری اور دیگر بڑے شعراء شامل تھے۔وہاں جگر صاحب کے نیاز بھی حاصل ہوئے۔ان کا پاکستان میں بہت آنا جانا رہا۔میں محسوس کرنے لگا کہ بعض لوگوں میں شکل صورت اور عادتوں میں افرادیت پیدا کرنے کیلیئے طریقے خود ساختہ ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے میں مولانا طاہر القادری کو جانتا تھا۔وہ بھی پہلے بالوں میں کنگھی کر کے ہاتھ سے بال اس طرح خراب کر دیتے تھے جیسے وارفتگی میں از خود ہو جاتا ہے۔میں نے جگر صاحب کو محسوس کیا کہ ان کا ازار بند لٹکا رہتا ہے اور جب میں نے نوٹ کیا تو پتلا چلا کہ یہ ان کی دانستہ عادت ہے۔بلکہ انہوں نے یہ ایک قسم کی اپنی پہچان بنا رکھی تھی۔اس زمانے میں مجھ میں شوخی زیادہ تھی۔مگر اس کے باوجود میں ہر بزرگ کا احترام بھی کرتا تھا۔اور وہ اب بھی کرتا ہوں۔مگر پھر بھی ذرا لطف لینے کیلیئے میں بعض اوقات شرارتیں بھی کر دیتا تھا۔چنانچہ لائل پور کے مشاعرے میں جس میں پنڈت ہری چند اختر، قاسمی صاحب اور مجید لاہوری وغیرہ شامل تھے میں نے کہا کہ آیئے ذرا جگر صاحب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔میں نے مجید صاحب سے کہا "آپ انہیں کسی طرح کہہ دیں کہ آپ کا ازار بند لٹک رہا ہے اور دیکھیئے پھر کیا ہوتا ہے"

"اس کے بعد کیا ہونا ہے۔آپ ان کا ازار بند ٹھیک کروا دیں گے تو میں شرطیہ کہتا ہوں کہ پندرہ منٹ کے بعد پھر ان کا ازار بند لٹک رہا ہو گا"

خیر مجید صاحب گئے۔ یہ کہنے لگے " اسلام علیکم جگر صاحب کیا حال ہے؟ خیریت ہے؟" اور پھر کہنے لگے " جگر صاحب آپ کا نالہ پابند نہیں ہے"

جگر صاحب کہنے لگے "معاف کیجئے گا" اور اپنا ازار بند اوپر اڑس لیا۔ پندرہ منٹ کے بعد دیکھا تو پھر ازار بند لٹک رہا تھا جس پر میں ان کے پاس گیا اور کہا "جگر صاحب آپ کا ازار بند لٹک رہا ہے"

کہنے لگے "معاف کیجئے گا" اور پھر ازار بند اڑس لیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دیکھا تو وہی صورت تھی۔ میں نے ہری چند اختر صاحب سے کہا کہ اب آپ ذرا کچھ کریں۔ وہ ان کے پاس گئے اور آداب بجا کر کہنے لگے " میں حیران ہوں کہ یہ ازار بند سوت کا ہے ' ریشم کا ہے' یا پلاسٹک کا ہے"

کہنے لگے "کیوں"

کہنے لگے " میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اسے اوپر کرتے ہیں اور یہ پھر باہر نکل آتا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو لائل پور میں سوتی ازار بند بہت اچھے ملتے ہیں۔ میں یہاں سے آپ کو وہ لا دوں"

کہنے لگے "جی ہاں جی ہاں" تھوڑی دیر بعد دیکھا تو پھر بھی ازار بند لٹک رہا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ازار بند کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا رکھا تھا۔ حالانکہ بڑے بے نیاز' بڑے شفیق اور بڑی محبت کرنیوالے آدمی تھے لیکن کبھی کبھی ان میں یہ عادت بھی ہوتی تھی کہ اپنی کوئی نئی چیز جب لکھ لیتے تو وہ سنانا چاہتے تھے۔ غالباً روش صدیقی نے یہ بات بتائی تھی کہ جگر صاحب کی یہ عادت ہے اور اب انہوں نے ایک فارسی کی نعت کہی اور یہ سنانے کیلئے بے چین ہیں۔ یہی ہوا ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے معیار کے مطابق کسی آدمی کو تلاش کر رہے ہیں جسے یہ نعت سنائیں۔ روش صاحب نے کہا" اگر آپ تماشا دیکھنا چاہتے ہوں تو جسے جگر صاحب سننے کو کہیں وہ ذرا ٹل جائے"

یہ مشاعرے اور کھانے کے دوران کے وقفے کی بات ہے۔ جگر صاحب قاسمی صاحب سے کہنے لگے " قاسمی صاحب ایک نعت ہو گئی تھی۔ فارسی کی اور میں وہ خاص طور پر آپ ہی کو سنانا چاہتا ہوں" قاسمی صاحب کہنے لگے "جی ہاں جی ہاں " اسی دوران میں نے قاسمی صاحب کو آواز دی تو وہ مجھے مخاطب کر کے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھ ماری تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ چلے آئے۔ جب باہر سے گھوم کر قاسمی صاحب واپس آ کر بیٹھے تو جگر صاحب نے سوچا کہ اب وہ اپنی نشست پر واپس آ گئے ہیں تو کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں نے عرض کیا تھا" فارسی کی ایک نعت ہوئی تھی جو میں خصوصی طور پر آپ کو سنانا چاہتا تھا"

ادھر سے مجید لاہوری آ گئے اور کہنے لگے " قاسمی صاحب ذرا بات سنئے"۔ قاسمی صاحب اٹھ کر ان کے ساتھ اندر چلے گئے۔ دوبارہ یہ ہوا تو جگر صاحب سنانے کے لئے تلملا رہے تھے۔اس کے بعد جب وہ سٹیج پر پہنچے تو پھر قاسمی صاحب سے کہنے لگے " میں نے عرض کیا تھا کہ ایک نعت کہی ہے لیکن آپ کو موقع نہیں مل رہا۔ تو اگر آپ سٹیج پر ہی سن لیجئے تو بھی ٹھیک ہے"

قاسمی صاحب کہنے لگے " جگر صاحب سٹیج پر سننے کا مزا نہیں آئے گا کیونکہ میں یکسوئی سے سن نہیں سکوں گا۔ بعد میں سن لوں گا ویسے تو آپ سے نعت سننا میرے لئے باعث سعادت ہے" جگر صاحب چپ ہو گئے اور کہنے لگے " اچھا ٹھیک ہے پھر مشاعرے کے بعد سن لیجئے گا"

جب مشاعرہ ختم ہوا تو سب شعراء اپنے کمروں میں جانے سے پہلے ایک بڑے کمرے میں چائے کیلئے آ گئے۔ میں قاسمی صاحب کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ جگر صاحب چلتے چلتے قاسمی صاحب کے

پاس آ گئے تو میں نے احتراماً اپنی نشست خالی کر دی۔ کہنے لگے " قاسمی صاحب اگر موقع ہو تو میں اب وہ نعت عرض کر دوں" اتنے میں پروگرام کے مطابق کسی اور نے قاسمی صاحب کو آواز دی تو وہ جگر صاحب سے یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ ذرا معاف فرمایئے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ اس طرح رات تک ان سے نعت نہیں سنی گئی۔

صبح جب ہم اٹھے تو ہمارے ایک شاعر دوست آئے اور کہنے لگے کہ دیکھئے گا اب تھوڑی دیر کے بعد جگر صاحب آئیں گے۔ وہ رات سو نہیں سکے ہوں گے۔ اس لئے اب ان سے یہ نعت سن لیجئے گا۔ وہی ہوا کہ ان صاحب کے بات کرتے ہوئے ہی جگر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم سب اٹھے اور قاسمی صاحب کہنے لگے " قبلہ انتہائی افسوس ہے۔ میں رات بھر اس خیال سے سو نہیں سکا کہ آپ نے اتنی اچھی نعت کہی ہو گی جو مجھے سننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس وقت اگر آپ کے پاس وہ نعت ہو تو ارشاد فرمایئے تاکہ ہم اس نعت ہی سے صبح کا آغاز کریں" یہ سن کر جگر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ فوراً شیر وانی کی جیب سے انہوں نے وہ نعت نکالی اور سنانی شروع کی۔ ہم سب نے جی بھر کے انہیں داد دی اور ان کی ساری کوفت دور ہوئی۔ جہاں تک میں اس نعت کو سمجھ سکا بہت خوبصورت تھی۔ سو ہم نے ان کی اس عادت کا خوب لطف اٹھایا۔

جگر صاحب کی ایک اور عادت تھی کہ فلاش بہت کھیلتے تھے۔ وہ رات رات بھر خود بھی جاگتے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی جگاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیسے لگاتے تھے۔ بچوں کی طرح کھیلتے تھے اور کھیل کے دوران نوعمر بچوں کی طرح ساتھ والوں کے ساتھ ہیر پھیر بھی کرتے تھے۔

یہ نہیں کہ یہ ہیر پھیر پیسوں کی وجہ سے کرتے تھے بلکہ مزا لیتے تھے۔ کبھی کسی کے چار آنے مار لیتے اور کبھی پتے تبدیل کر لیتے۔ پھر اس سارے کھیل کے دوران شعر کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی شعر کی بات کرتا تو وہ بڑی ملائمت سے ٹال دیتے۔

میں یہاں لاہور میں ایک بار ان کا تماشا دیکھنے کیلئے اس کھیل کے دوران موجود رہا۔ کیونکہ مجھے اس کے علاوہ جوئے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ میں تو جوئے پیرس میں رہنے کے باوجود اسے ناپسند کرتا تھا اور اس معاملے میں آپ مجھے چیچو کی ملیاں کا رہنے والا سمجھ لیجئے۔ میں جوئے کے بارے میں یہ بات اپنے والد صاحب کے حوالے سے کہہ رہا ہوں اور سچ بھی یہی ہے کہ مجھے تاش کے پتوں کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں۔ چنانچہ تاش کھیلنا اور اس دوران بچوں کی طرح ہیرا پھیری کرنا جگر صاحب کی تیسری عادت تھی۔

اس سلسلے میں یہ بتا دوں کہ ہم جب کہیں کسی مشاعرے میں جاتے تھے تو ہمارے مستقل تاش کھیلنے والوں میں جناب احمد ندیم قاسمی اور حبیب جالب ہمیشہ سر فہرست ہوتے تھے۔ اگر احمد فراز ہوتے تو وہ بھی شریک ہوتے تھے۔ پھر جب یہ لوگ تاش کھیلتے تو مجھے بھی کہتے کہ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھیلو۔ مگر میں نہیں کھیلتا تھا کیونکہ مجھے تاش کھیلنا آتا ہی نہیں تھا۔

ایک بار ہم ٹرین میں جا رہے تھے۔ ٹرین میں مجھے نیند بہت آتی ہے کیونکہ جب ٹرین کا پہیہ چلتا ہے تو اس کے شور کے Rhythm سے مجھے فوراً ہی نیند آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس روز بھی جب ہم ٹرین کے ذریعے سفر پر روانہ ہوئے تو گاڑی چلنے کے تھوڑی دیر کے بعد ہی میں اوپر برتھ پر چڑھ کر

سونے کیلئے لیٹ گیا مگر ان کا اصرار تھا کہ تم بھی نیچے آؤ اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلو۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے اصرار پر میں ان کے پاس بیٹھ کر کھیلتا رہا اور جب مجھے اپنی دانست میں پتا چلا کہ مجھے یہ کھیل آ گیا ہے تو میں ان کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا اور سو دو سو روپے ہار کر پھر اوپر جا کر سو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کھیل میں شوق ہی نہ ہو اس میں جیت کیا ہے۔ اس طرح میں ان سے تنگ آ گیا تھا۔

اس بار ہم کراچی جا رہے تھے اور جب ریل گاڑی کو چلے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی اور میں اوپر برتھ پر لیٹ چکا تھا۔ تو نیچے سے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ قتیل صاحب نیچے آیئے اور آ کر ہمارے ساتھ کھیلئے۔ میں نے اوپر ہی سے پچاس روپے کا نوٹ نیچے پھینکا اور کہا کہ آپ اسے آپس میں بانٹ لیں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آپ مجھے نیچے کیوں بلا رہے ہیں۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اناڑی آدمی ہے اور پیسے ہار جائے گا۔ تو سمجھ لیجئے کہ میں ہار گیا ہوں۔ وہ سب ہنسے اور پچاس روپے رکھ لئے۔ اس کے بعد میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اپنے مقابلے میں جب جگر صاحب کی طرف دھیان کرتا ہوں تو سمجھ نہیں آتی کہ اتنا وقت کس طرح نکال لیتے تھے اور یہ کھیل کھیلتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ تو ایک بہت بڑے شاعر اور مصروف آدمی تھے۔ میرے خیال میں یہ سب شوق کا معاملہ اور مجھے کبھی اس کا شوق نہیں رہا۔

روشن صدیقی اور اختر رضوانی

روشن صدیقی چھوٹے قد کے اور دبلے پتلے تھے۔ ان کے مجاز صاحب کے ساتھ کچھ لطیفے بھی مشہور ہیں۔ وہ نظمیں کہتے تھے تو ان کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔ وہ عام شاعری سے اٹھ کر سیاسی شعور کا

مظاہرہ کرتے تھے۔ان کی اپنے قد سے زیادہ گمبھیر آواز تھی اور جب مائیک پر پڑھ رہے ہوتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی چھ فٹ کا آدمی پڑھ رہا ہو۔ پھر وہ ترنم سے پڑھتے تھے جو خوبصورت تھا۔اس زمانے میں ان کی کئی چیزیں بہت مشہور بھی ہوئیں درمیان میں ان کی بیوی فوت ہو گئی تھیں۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ مجاز صاحب سے کہنے لگے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اب دوسری شادی کر ہی لوں لیکن عمر کا تقاضا ہے کہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہ کروں کیونکہ یہ غیر مناسب ہو گا۔بلکہ اگر کسی بیوہ سے شادی کر لوں تو بہتر ہو گا۔ مجاز صاحب بہت زندہ دل تھے کہنے لگے کہ آپ کسی بھی لڑکی سے شادی کر لیں وہ شادی کے بعد خود ہی بیوہ ہو جائے گی۔

اسی طرح انہی کے سامنے اُنہوں نے کہا کہ میری شاعری سے آپ لاکھ انکار کریں مگر ایک دن آپ مانیں گے کہ میری شاعری قد آور ہے۔ مجاز صاحب کہنے لگے کہ یار روشن تمہاری شاعری بھی قدر آور بن جائے گی پہلے خود تو قد آور بن جاؤ۔روشن صدیقی اس قسم کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے۔میں یہ پارٹیشن سے کچھ عرصہ کی بات کر رہا ہوں۔

روشن بات تو سوشلزم کی کرتے تھے لیکن خود پیر پرست تھے اور دربار گولڑہ سے ان کا تعلق تھا۔ گولڑہ کے علاوہ پیر شاہ نصیر الدین گیلانی کے دادا حضرت بابو جی اس وقت پیر ہوتے تھے۔ایک بار روش کراچی کے مشاعرے میں شرکت کیلئے آئے تو وہاں سے لاہور آئے اور خاص طور پر گولڑہ میں حاضری دینے کیلئے گئے۔ ہمارے ایک دوست ہیں عارف عبدالمتین لاہور میں ان کے ہاں ٹھہرے۔ ان سے ایک لطیفہ بھی منسوب ہے۔عارف صاحب کے ہاں تکلف ہے۔وہ جب باتیں بھی کرتے

تھے تو وہ گھڑی گھڑائی ہوتی ہیں مثلاً اگر آپ نے سونا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ ذرا چادر تو بچھا دیں تو یہ کہیں گے کہ قالین بچھا دوں۔ یعنی جو آپ نے مانگا ہے اس سے زیادہ کی بات کریں گے۔ اگر آپ نے ہاتھ کا پنکھا مانگا ہے تو کہیں گے کہ اگر آپ تھوڑا توقف کریں تو میں بجلی کا پنکھا لگوا دوں۔

لائل پور میں ہندو پاک مشاعرہ تھا۔ پنڈت ہری چند اختر صدارت کر رہے تھے۔ اس مشاعرے میں انڈیا سے جو شعراء آئے ہوئے تھے ان میں علامہ انور صابری بھی شریک تھے۔ شکل صورت ایسی تھی کہ کالے بھجنگ اور بہت موٹے تھے۔ یہ شلوار اور کرتا پہنتے تھے۔ پیری کا دم بھی بھرتے تھے اور مریدی کا بھی۔ جہاں ضرورت پڑتی تھی پیر بن جاتے تھے اور جہاں ضرورت پڑتی تھی مرید بن جاتے تھے۔ پہلے یہ بتا دوں کہ یہ بڑا تکلف کرتے تھے اور ان کے ذہن میں جو طبع زاد چیز آ جاتی تھی اسے خود بھی حقیقت سمجھ کر بیان کر جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے وزیر اعظم شاستری ایک مشاعرے میں صدارت کر رہے تھے۔ انہیں عادت تھی کہ سٹیج پر اشعار سے پہلے کچھ باتیں کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ واہ واہ کیا زمانہ تھا جب ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چل رہی تھی اور پورا ہندوستان بیدار اور جذباتی تھا تو ان دنوں میں اور صاحب صدر الٰہ آباد جیل میں بند تھے۔ پھر وزیر اعظم شاستری کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کیوں شاستری صاحب؟ اب شاستری صاحب نہ ہاں کر سکتے تھے اور نہ ہی نہ کر سکتے تھے۔ سو یہ اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔

اس طرح ایک بار پنڈت ہری چند اختر ایک مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ ایک نستعلیق قسم کے شاعر تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے یہ بات ان کی صدارت میں بھی دہرائی تھی اور کہنے لگے کہ واہ واہ کیا وقت تھا' تحریک چل رہی تھی تو میں اور صاحب صدر ہری چند اختر

کراچی جیل میں بند تھے۔ صاحب صدر نے کہا کہ ذرا ٹھہریئے صاحب! وہاں ہم دونوں تھے لیکن دونوں کے جرموں کی نوعیت الگ الگ تھی۔ اس سے حاضرین مشاعرہ نے بہت قہقہہ لگایا۔
چنانچہ جب یہ لائل پور کے مشاعرے میں سٹیج پر پڑھ رہے تھے تو کوئی فوٹو گرافر تصویر لینے کیلئے آیا تو کہنے لگے کہ نہیں صاحب ہم تصویر نہیں اتروائیں گے۔ ہٹایئے اپنا کیمرہ۔ اب تصویر تو اس نے لینی ہی تھی۔ یہ صرف نمایاں ہونے کیلئے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ پنڈت صاحب جو مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے کہنے لگے کہ علامہ صاحب تصویر لینے دیجئے۔ یہ اخبار میں چھاپنے کیلئے نہیں ہے بلکہ بچوں کو ڈرانے کے لئے ہے۔ اس پر وہاں بہت قہقہہ پڑا۔

اس مشاعرے میں کہنے لگے کہ طبیعت علیل ہے۔ کچھ پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ لیکن حاضر ہوئے ہیں تو پانچ شعر عرض کروں گا۔ پھر پنڈت جی نے کہا کہ مولانا پانچ شعر کہتے ہوئے ذرا اپنا جثہ تو دیکھئے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہاتھی مینگنیاں دینے لگا ہے۔ اس پر بھی وہاں بہت قہقہہ پڑا۔
اب علامہ صاحب حسب ضرورت پیر بھی بن جاتے تھے اور مرید بھی۔ یہ پیر تو وہاں بنتے تھے جہاں کسی سے کچھ لینا ہو اور مرید بھی وہاں بنتے تھے جہاں سے کچھ لینا ہو۔ پیری کی بات تو سیدھی ہے کہ کوئی شخص جتنا سیدھا سادہ ہوگا وہ پیر کی باتوں میں آجائے گا تو یہ یوپی اور دہلی وغیرہ کے بعض علاقوں میں پیر بھی بنے ہوئے تھے اور وہاں جاکر اپنے مریدوں سے نذر و نیاز لیا کرتے تھے۔ لیکن ہم نے انہیں ایک بار مرید بنتے ہوئے بھی دیکھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ پاکپتن کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی اور بمبئی کے ایک دوسرے شاعر بھی شرکت کر رہے تھے۔ یہ مجھے کہنے لگے " قتیل صاحب دیوان قطب جو یہاں کے متولی ہیں ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ ہم اس درگاہ کے مرید ہیں کیونکہ ہماری پیری کا شجرہ نسب ان سے ملتا ہے۔ اس لئے میرا ان کے پاس جانا باعث ثواب ہو گا"

بمبئی کا دوسرا شاعر جس کا نام اب مجھے یاد نہیں وہ میں اور علامہ انور صابری نے دیوان صاحب سے فون پر رابطہ کیا۔ آجائیے۔ چنانچہ ہم ان کے پاس تینوں ایک ساتھ پہنچے۔

میں اور انور صابری دیوان صاحب کے پاس اندر کمرے میں بیٹھے تھے جبکہ وہ بمبئی والا شاعر اس کے ساتھ دالان میں بیٹھا تھا۔ وہاں جا کر میں نے علامہ کی اداکاری دیکھی۔ یہ جاتے ہی دیوان صاحب کے سامنے ان کے قدموں میں سجدے میں گر گئے۔ دیوان صاحب نے کہا" علامہ صاحب اٹھیئے یہ کیا کر رہے ہیں"

یہ کہنے لگے " نہیں صاحب یہ تو ہمارا پیر خانہ ہے۔ مجھے یہاں سے مت اٹھایئے' مجھے جی بھر کے اپنا سر ان قدموں میں رکھ لینے دیجئے" خیر بڑی مشکل سے انہیں اٹھایا گیا۔ جب اٹھے تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کہہ رہے تھے کہ بڑی مدت کے بعد میری خواہش پوری ہوئی ہے اور آپ کی قدم بوسی سے میرا سینہ روشن ہو گیا ہے۔

خیر باتیں ہوتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ یہ بندہ آخر یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے۔ آخر یہ بات بھی کھل گئی۔ یہ اٹھنے سے پہلے دیوان صاحب سے کہنے لگے " حضرت آپ ہمارے والی درگاہ کو جانتے

ہیں"

انہوں نے کہا" مجھے تو معلوم نہیں" کہنے لگے" ہم تو آپ کے مریدوں میں سے ہیں اور وہاں بھی آپ ہی کا سلسلہ فیض چلا ہوا ہے۔ اس درگاہ کے متولی ہم لوگ ہیں۔ ہماری اس درگاہ پر ہر سال عرس کے سلسلہ میں جو قوال آیا کرتے تھے۔ وہ اب پاکستان آچکے ہیں اور اب جب انہیں پتا چلا ہے کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں تو وہ میرے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ آئیں گے تو اسی توقع پر آئیں گے کہ میں انہیں کچھ دوں گا۔ اب میں تو یہاں مشاعرے کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اب مجھے یہاں سے کیا ملے گا اور میں ان کی نذر کیا کروں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں "

انہوں نے اپنی جیب میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہنے لگے" آپ انہیں یہ نوٹ دے دیجیئے گا" میں دل ہی دل میں بہت ہنسا اور کہا" علامہ صاحب یہاں جو مرید بنے ہیں اور بے غرض نہیں تھا۔ انہیں مرید بننے کے پانچ سو روپے مل گئے ہیں"

اس موقع پر لطیفہ یہ ہوا کہ یہ بار بار دیوان صاحب سے کہتے تھے" حضور میں تو اس درگاہ کا کتا ہوں" اب وہ بمبئی کا شاعر علامہ صاحب کے بہت بے تکلف تھا وہ اصل میں امروہہ کا تھا اور امروہی کہلواتا تھا۔ جب انہوں نے اندر بہت دیر لگادی تو اس نے وہیں سے آواز دی" قتیل صاحب اب اس کتے کو باہر بھی نکالئے بہت دیر ہو رہی ہے" یہ بات علامہ نے بھی سن لی تھی مگر پی گئے اور کہنے لگے " اچھا حضور اجازت دیجیئے" اور پھر اسی طرح اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ یوں ہم وہاں سے چلے آئے۔

اس کے بعد جب شام کو ہمیں مشاعرے کے منتظمین کی طرف سے معاوضہ ملا تو پتا چلا کہ علامہ صاحب کو دیوان سے جو پانچ سو روپے ملے تھے وہ نوٹ کہیں کھو گیا ہے۔ ہم بہت حیران ہوئے اور پھر علامہ صاحب کہہ رہے تھے کہ بے شک قتیل صاحب سے پوچھ لیجئے ان کے سامنے میرے پاس پانچ سو روپیہ تھا۔ دیوان غلام قطب نے یہ نوٹ ہمیں نذر کیا تھا حالانکہ انہوں نے دیوان صاحب سے بھیک مانگی تھی۔ مگر اب یہاں کہہ رہے تھے کہ دیوان صاحب نے وہ نوٹ ہمیں نذر کیا تھا۔ اب مشاعرے کے منتظمین نے شرمندگی کے عالم میں معاوضے کے علاوہ جو کچھ اور بھی بن سکا وہ انہیں دیا۔

ان کے بارے میں ایک لطیفہ اور ہے۔ یہ محض لطیفے کی حد تک ہے اس میں حقیقت تو نہیں ہو گی۔ ایک بار کسی سے کہنے لگے کہ دھوبی کو بلواؤ ہم اپنی شلوار دھلوانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دھوبی آیا اور ان کی شلوار اٹھانی شروع کی۔ وہ شلوار اٹھاتا ہی چلا گیا۔ جب وہ کافی دیر تک شلوار اٹھاتا رہا اور وہ ختم نہ ہوئی تو اس نے ان کی شلوار نیچے گراتے ہوئے کہا" یا حضرت میں شلواریں دھوتا ہوں کوئی تنبو نہیں دھوتا'

ادیبوں اور شعراء کے لطائف جو کچھ ذہن میں رہ گئے ہیں، ان میں مولانا تاجور کے لطیفے بھی شامل ہیں۔ جو جس نے بھی گھڑے اس نے مولانا تاجور کو بھی سنائے تھے۔ مولانا بھی یہ لطیفے سن کر بہت ہنسے تھے اور پھر کہتے تھے کہ یار یہ لطیفہ کس نے گھڑا ہے۔ ذرا اس سے ملاؤ۔ مولانا بہت موٹے اور لحیم شحیم تھے۔ ان کا پیٹ بھی بہت نکلا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں ایک لطیفہ یہ تھا کہ ایک بار

انہیں چوک لکشمی سے لوہاری دروازے جانا تھا۔انہوں نے تانگے والے کو روکا۔اس زمانے میں یہاں سے وہاں تک ایک آنہ کرایہ ہوتا تھااور اگلی اور پچھلی نشست پر تین سواریاں بٹھائی جاتی تھیں۔ انہوں نے پوچھاکہ کتنے پیسے لوگے۔تواس نے کہاچھ آنے۔یہ کہنے لگے کہ ایک پھیرے کے کل تین آنے ہوتے ہیں تم کیوں چھ آنے مانگ رہے ہو۔اس نے کہاکہ جناب آپ کوتو دو پھیروں میں لے جاناپڑے گا۔

ان کے بارے میں دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار درزی کے ہاں شیروانی کاناپ دینے کیلئے گئے۔ درزی نے انچی ٹیپ لیااوراس کا سرا مولانا کی ناف پر رکھ کران سے کہاکہ مولانا آپ ذرا یہاں پر ہاتھ رکھئے اور میں دوسری طرف سے گھوم کر آتا ہوں۔

مولانا کے علاوہ شیر محمد اختر بھی بہت دلچسپ آدمی تھے۔وہ نوائے وقت والوں کے رسالے ''قندیل'' کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ان کے بارے میں بھی دو لطیفے ہیں۔ پہلا لطیفہ یوں ہے کہ انہوں نے حمید نظامی کوایک رقعہ لکھااور چونکہ ہکلے تھےاور بات بہت اٹک اٹک کر کرتے تھےاس لئے انہوں نے نظامی صاحب کورقعہ لکھااوراس میں لکھاکہ نظامی صاحب مجھے آپ سے دومنٹ کی بات کرنی ہے ازراہ کرم دس منٹ عنایت کئے جائیں۔دوسرا لطیفہ یہ تھاکہ وہ ایک بار جہاز میں بیٹھے تھے اور جہاز کا عملہ ہدایات جاری کررہا تھاکہ اگر حادثہ ہو توآپ یوں کریں۔آخری شکل یہ ہے کہ آپ لائف جیکٹ پہن کر دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر تین تک گن کر نیچے چلانگ لگادیں۔ان کی سمجھ میں بات نہ آئی تو انہوں نے اس آدمی کو بلایا جو ہدایات دے رہا تھااوراس سے ہکلا کرپوچھا کہ

کتنے تک گننا ہے۔اس نے کہا کہ آپ صرف ایک ہی گن کر چھلانگ لگادیں۔

یہ تو چھوٹے چھوٹے لطیفے ہوئے۔جیسا میں نے علامہ انور صابری کے کردار اور ان کی دلچسپ زندگی کے بارے میں عرض کیا ہے۔اسی طرح ایک اور کریکٹر تھے جن کا نام اختر رضوانی تھا۔آج کل کے لوگ بالکل نہیں جانتے لیکن قیام پاکستان سے پہلے ان کا ڈنکا بجتا تھا کیونکہ پورے ہندوستان میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں ان کی سواری نہ جاتی ہو۔ان کا نام ستیہ پال تھا اور وہ جالندھر سائیڈ کے رہنے والے تھے۔لمبے لمبے بال تھے جیسے ٹیگور کے بال تھے۔کلین شیو تھے اور عام طور پر گیروے کپڑے پہنتے تھے۔وہ زیادہ تر غزل اور رباعی کہتے تھے اور اپنے آپ کو رئیس الترنم بھی لکھتے تھے۔پھر شیدائے غم بھی اپنے آپ کو لکھتے تھے۔ان کی شکل وصورت بالکل درویشوں جیسی تھی۔ان کا کام یہ تھا کہ جس کے پاس بھی چلئے گئے ہیں ڈیرے جمادیئے۔کسی کے بارے میں جو لطیفہ تھا کہ جب وہ کسی کے ہاں مہمان ٹھہرا تو ایک مہینہ گزرنے کے بعد صاحب خانہ نے پوچھا کہ آپ پھر کب آئیں گے تو مہمان نے کہا کہ پھر بھی انشاء اللہ آؤں گا۔انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ پھر نہیں آئیں گے۔انہوں نے کہا کہ جی آپ کو یہ شبہ کیوں ہوتا ہے کہ میں پھر نہیں آؤں گا۔کہنے لگے کہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ اگر جائیں گے تو آئیں گے۔تو بالکل یہی حال اختر رضوانی کا بھی تھا۔

اختر رضوانی کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی کے ہاں مہمان بن کر جاتے تو اتنا لمبا قیام کرتے کہ جب یہ کبھی تھوڑی دیر کیلئے گھر سے باہر جاتے تو اہل خانہ تالہ لگا کر خود بھی کسی اور کے گھر چلے جاتے اور چار پانچ دن وہیں قیام کرتے۔تب کہیں اختر رضوانی جاتے تھے۔ان کی یہ خوبی تھی کہ

جس شہر میں بھی جانا ہوتا وہ اندازہ کر لیتے تھے کہ اس شہر میں آپ کے دوست کون کون سے ہیں۔ پھر آپ ان کے نام خط لکھا دیتے تھے کہ اختر رضوانی ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ آپ کے پاس آئیں گے ان کا خاص خیال رکھیئے گا۔ اس طرح یہ مختلف لوگوں کے ہاں مہمان بنے رہتے تھے۔ یہ سگریٹ بہت پیتے تھے اور انتہائی غلیظ آدمی تھے۔ جب یہ میرے ہاں گئے تو میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں نے اس زمانے میں خیالی شاعر کا جو تصور سنا تھا یہ بالکل ویسے ہی تھے۔ یہ مجھے بہت بہت بڑے شاعر نظر آئے اور میں نے ان کی تواضع کی۔ یہ میرے پاس اس طرح آئے کہ میں نے ہری پور کی تاریخ میں جب پہلا مشاعرہ منعقد کروایا تو اس میں نفیف خلیلی، قمر جلال آبادی اور انہیں بلوایا تھا۔ وہ دونوں شریف آدمی تو واپس اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن یہ میرے ہاں ہی ٹھہر گئے۔

میں نے اپنا فرض سمجھا کہ یہ شاعر ہیں اور ان کی خدمت کروں۔ پھر انہوں نے مجھے ایسے ایسے اشعار سنائے کہ میں دنگ رہ گیا۔ بہت اچھے اشعار تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ ان میں سے کچھ اشعار جوش کے تھے اور کچھ جگر صاحب کے۔ بہر حال جب یہ میرے پاس مہمان ٹھہرے تو میں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ میرے پاس اپنی یعنی شادی کی جو فر کی لحاف تھی وہ میں نے انہیں دی۔ اس کے علاوہ اپنا سجا سجایا کمرہ بھی انہیں دے دیا۔ یہ اتنے غلیظ کہ نہاتے نہیں تھے۔

ہم صبح کے وقت انہیں جگاتے اور کہتے تھے کہ اختر صاحب صبح ہو گئی ہے تو یہ بستر سے ہاتھ نکال کر کہتے تھے کہ سگریٹ۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی ملازم سے کوئی چیز مانگتا ہے۔ میں سگریٹ سلگا کر دیتا تھا۔ یہ سوئے سوئے بند آنکھوں سے سگریٹ پینے لگتے تھے۔ پھر سگریٹ پی کر آنکھیں کھولتے

تھے اور کہتے تھے کہ پانی۔ میں پانی لاتا تھا تو یہ اس میں ہاتھ ڈبو کر گیلے ہاتھ کو آنکھوں پر مل لیتے تھے اور آنکھوں کو تولئے سے صاف کر لیتے تھے۔ یہ ان کی کل صفائی ہوتی تھی۔

اس کے بعد بستر ہی پر ان کے لئے چائے آجاتی تھی۔ یہ چائے پیتے تھے اور پھر یہ کلام سنانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ پوری پوری چیزیں دوسروں کو سنا دیتے تھے۔ پھر یوں کرتے تھے کہ کسی طرح مشاعرے میں چلے جاتے۔ حافظہ بہت کمال کا تھا۔ شعر سن لیتے تو لکھے بغیر ہی یاد کر لیتے۔ اگر کسی مشاعرے میں سولہ غزلیں پڑھی گئی ہیں تو جو کسی کی غزل کا اچھا شعر ہوتا تھا اسے یاد کر لیتے تھے۔ اس طرح ان اچھے اشعار میں سے آٹھ دس اشعار کی اپنی غزلیں نکال لاتے تھے۔ انہیں اتنی مشق تھی کہ مقطع خود بھی شامل کر لیتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ طرحی مشاعرے کی سب غزلوں میں سے چنے ہوئے اشعار کی ان کی غزلیں بہت اچھی ہوں گی۔ اس طرح وہ شاعری کرتے تھے۔

ایک واقعہ اس طرح ہوا کہ شیخوپورہ سے احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں ایک شخص نے کسی اور شہر میں مقیم اپنے دوست سے کہا کہ میرے پاس احمد ندیم قاسمی صاحب آکر ٹھہرے ہوئے تھے انہیں کچھ سمجھایئے وہ شراب بہت پیتے ہیں۔ وہ شخص قاسمی صاحب کو جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ خدا خدا۔۔ قاسمی صاحب شراب نہیں پیتے۔ وہ کہنے لگا کہ میرے پاس تو وہ تین چار دن ٹھہر کر گئے ہیں اور جا بے جا مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ شراب لا کر دو۔ اس نے پوچھا کہ شکل کیا تھی۔ اس نے کہا کہ لمبے لمبے بال تھے اور کلین شیو تھے اور گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس

زمانے میں قاسمی صاحب کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہوتی تھیں۔اس نے کہا کہ قاسمی صاحب کا تو یہ حلیہ ہی نہیں ہے۔وہ تو سوٹ پہنتے تھے اور عینک لگاتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ جو حلیہ تم نے بتایا ہے وہ تو اختر رضوانی کا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہی ہوگا لیکن یہاں تو وہ احمد ندیم قاسمی بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی طرح وہ کسی اور جگہ اختر رضوانی کی بجائے اختر شیروانی بن جاتے تھے۔شادی تو کی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی بچے تھے۔آگے پیچھے بھی غالباً کوئی نہیں تھے۔اسی لئے اس طرح گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ایک بار یوں ہوا کہ اختر رضوانی نے میرے ہری پور کے پہلے مشاعرے میں جو رباعی پڑھی تھی اور جو بہت ہٹ ہوئی تھی وہ کسی نے مشاعرے کی کارروائی میں لکھ کر قمر جلال آبادی کے پرچے ''سٹار'' میں بھیج دی جو چھپ بھی گئی۔

تھوڑے دنوں بعد پشاور میں مشاعرہ ہوا تو اس میں لاہور سے اختر رضوانی اور قمر جلال آبادی شریک ہوئے تھے۔ہری پور سے میں گیا ہوا تھا۔ہم پشاور ریلوے سٹیشن پر ایک ساتھ اترے کیونکہ میں ٹیکسلا سے سوار ہوا تھا۔جب ہم پشاور اترے تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر اختر رضوانی کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے میرے استاد کی رباعی اپنے نام سے کیوں پڑھی کیونکہ یہ تو میرے استاد ضیاء جعفری کی رباعی تھی۔یہ کہنے لگے کہ میں نے تو یہ رباعی نہیں پڑھی تھی۔وہ شخص مجھے کہنے لگا کہ جی اس مشاعرے کی کارروائی آپ نے لکھی تھی۔میں نے کہا کہ ہاں میں نے لکھی تھی۔اختر صاحب کا تکیہ کلام تھا آپ کے خلوص کی قسم۔کہنے لگے کہ آپ کے خلوص کی قسم قتیل صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ استاد گرامی حضرت ضیاء کی رباعی پہلے عرض کرتا ہوں۔ پھر اپنا کلام سناؤں گا اور میں نے یہ رباعی ان کا نام لے کر پڑھی تھی۔ خیر اس طرح یہ جھگڑا ختم ہوا۔

آگے ہم گئے تورات کو مشاعرے میں قمر جلال آبادی نے کوئی چیز پڑھی تو کھسر پھسر شروع ہوگئی اور لوگ انہیں داد نہیں دے رہے تھے۔ بعد میں لوگوں نے کہا کہ یہ جو قمر جلال آبادی ہے یہ تو اختر رضوانی کی غزل پڑھ گیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ اس مشاعرے میں کوئی دو چار ماہ پہلے اختر رضوانی یہاں پر ایک اور مشاعرے میں آئے تھے اور قمر جلال آبادی کی یہی غزل اپنے نام سے پڑھ گئے تھے۔ اب قمر صاحب نے جب اپنی ہی غزل پڑھی تو لوگ انہیں چور سمجھے۔ جب ہمیں اس سارے واقعے کا علم ہوا تو ہم نے اختر صاحب سے کہا کہ اختر صاحب یہ آپ نے کیا کیا۔ تو کہنے لگے کہ آپ کے خلوص کی قسم میں نے تو قمر صاحب کا نام لے کر اپنے کلام سے پہلے ان کی غزل پڑھی تھی کیونکہ میں ہمیشہ اپنے کلام سے پہلے اپنے بزرگ دوستوں کا کلام پڑھتا ہوں اور اس طرح کبھی کبھی مغالطہ بھی ہو جاتا ہے۔

پارٹیشن ہوگئی تو بہت لطیفے ہوئے۔ کچھ دوستوں نے کہا کہ ہمیں پاکستان بننے کا نقصان بھی ہوئے لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے انڈیا سے ایک بدلہ لے لیا اور وہ یہ کہ ہم نے اختر رضوانی انڈیا کو دے دیا تاکہ اب وہ اسے بھگتیں۔

ایک بار جالندھر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ تھی۔ یہ 1950ء کے بعد کا واقعہ ہے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اختر رضوانی ابھی زندہ ہے۔ اس وقت اختر رضوانی خود کہنے لگے تھے اور رباعی بہت پختہ کہہ رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت نے ان کا کچھ وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں کے ایک دو مجسٹریٹوں کو بھی گانٹھ رکھا تھا جو انہیں کھلاتے رہتے تھے۔

جب میں وہاں گیا تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص جو دوسروں سے خود ہمیشہ کھاتا ہی رہتا ہے اس نے قتیل شفائی کے اعزاز میں دعوت کیسے کر دی۔ انہوں نے اس مشاعرے کی صدارت اس مجسٹریٹ سے کروائی۔ اس سے پیسے بھی خرچوائے اور سو پچاس آدمیوں کو بلوا کر میرے اعزاز میں دعوت دی۔ اس دعوت میں لوگ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کے پاس کیا گیدڑ سنگھی ہے۔ جو یہ شخص آپ کے اعزاز میں دعوت کر رہا ہے۔ ہر چند کہ اس نے اس دعوت پر کسی اور ہی سے پیسے خرچ کروائے ہیں لیکن پھر بھی یہ شخص کبھی کسی سے مروت نہیں کرتا ۔ مگر مجھے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اختر رضوانی نے خود ہی سب کو بتا دیا تھا کہ میں ان کے پاس جا کے رہتا تھا اور ہری پور میں ان کے ہاں اکثر قیام بھی کیا تھا۔

ان کا اور قاسمی صاحب کا ایک واقعہ ہے کہ قاسمی صاحب پنڈی کے امپیریل سینما میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یہ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے اور یہ آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ میں بھی اس مشاعرے میں شریک تھا اور اختر رضوانی بھی میرے پاس بیٹھے تھے۔ قاسمی صاحب کی باری چونکہ بعد میں آنی تھی۔ اس لئے جب اختر رضوانی کی باری آئی تو یہ گئے اور سٹیج پر جا کر قاسمی صاحب کے بیٹھے ہوئے ہی ان کے قطعے پڑھ کر واپس آ گئے۔ جب یہ واپس آئے تو میں نے کہا کہ اختر یار کچھ شرم کرو۔ یہ قطعے تو قاسمی صاحب کے ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ میں بھی قاسمی صاحب ہی کا ہوں۔ میں نے کب کہا کہ یہ قطع میرے ہیں۔

حافظ عنصر لدھیانوی قیام پاکستان کے بعد لدھیانہ سے ہجرت کر کے پشاور میں آ کر مقیم ہوئے۔ یہ ایک نابینا شاعر تھے اور اپنے نابینا ہونے کے مضامین انہوں نے اکثر مقطعوں میں باندھے تھے۔

آواز بھی اچھی تھی اور کلام بھی اچھا تھا۔ خاص طور پر جب ان کی بینائی کے حوالے سے کوئی شعر آتا تھا تو وہ متاثر کرتا تھا۔ انسان کے نفسیاتی معاملات عجیب ہوتے ہیں۔ وہ دیکھ تو سکتے نہیں تھے لیکن انہیں شوق تھا کہ جس مشاعرے میں خواتین ہوں وہاں یہ ضرور جاتے۔ اب اس بات کی سمجھ تو آتی ہے کہ ان کی آواز ان کے کان میں پڑتی ہوگی اور یہ لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہوں گے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ جس مشاعرے میں میں ہوتا تھا تو یہ مجھ سے کہتے تھے کہ یار قتیل! آج فوٹو ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور شاعر سے بھی اس طرح کہتے ہوں لیکن مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے۔ جب میں کہتا تھا کہ ہاں فوٹو بھی ہوگی تو کہتے تھے کہ منور سلطانہ اور بسمل صابری وغیرہ کو میرے آس پاس کھڑا کر کے تصویر اتروادیں۔ تو میں یوں ہی کرتا تھا۔ بعض اوقات تو میں لڑکیوں سے بھی کہہ دیتا تھا کہ حافظ صاحب آپ کے ساتھ تصویر اتروانا چاہتے ہیں تو وہ بھی لطف اندوز ہوتی تھیں اور ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہت جڑ کر تصویر بنواتی تھیں۔ حافظ صاحب فوٹو گرافر کو خاص طور پر تصویر اور رجسٹری کے پیسے اور اپنا ایڈریس دیتے تھے تاکہ وہ اس ایڈریس پر ان کی تصویر بھیج دے۔

اب حافظ صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر ان کے گھر میں ان کا البم دیکھا جائے تو بہت سی تصاویر بتاں ضرور ملیں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں سے حسینوں کے خطوط شاید نہیں مل سکیں گے۔ اللہ بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اب بھی وہ یاد آتے ہیں تو احباب مل کر ان کا ذکر کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حافظ صاحب کے ساتھ وہ تصویر اتروائی تھی اور سناؤ وہ اب کبھی خوابوں میں آئے۔

تو یوں ان کی باتیں یاد کر کے قہقہے لگا لیتے ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے صاحبزادے ان کا مجموعہ کلام اب چھپوا رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔

میں یہ بات کہنا بھول گیا کہ حافظ صاحب اندھا ہونے کے باوجود سکول چلاتے تھے اور خود بھی کلاس لیتے تھے۔ وہ ایک اچھے استاد کے فرائض انجام دیتے تھے اور تنخواہ بھی اچھی لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی معذوری کو مجبوری بننے نہیں دیا تھا۔

وہ جس میدان میں بھی جاتے تھے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ جب شادیوں کے میدان میں گئے تو موصوف نے وہاں بھی کامیابی کا مظاہرہ کیا اور تین شادیاں بھی کیں۔ جہاں اچھے خاصے بینا لوگ اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے تھے حافظ صاحب وہاں اپنے حقوق کا تحفظ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے بہت اچھا مکان الاٹ کروایا تھا اور خود آگے بڑھ کر یہ سارا کام کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مہاجر ہونے کے استحقاق پر جو دوسری مراعات لی ہیں اور ان کی تعداد خاصی تھی اور یہ سب کام وہ تن تنہا کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر ان کے ملنے والوں میں کوئی آفیسر ہوتا تو وہ اس کی مدد بھی لے لیا کرتے تھے۔ لیکن آفرین ان پر کہ انہوں نے مرتے دم تک ایک فعال شوہر، فعال عاشق، فعال باپ اور فعال مقدمہ باز کے طور پر زندگی گزاری۔

تائب رضوی

آج کل مشاعروں کی وہ کثرت نہیں ہے جو ماضی میں تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ ماضی کے مقابلے میں آج کل مشاعرے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر خالص ادبی مشاعرے تو تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اب

مشاعرہ یا تو قوم آزادی پر 14 اگست کو ہوتا ہے یا عید میلاد النبی ﷺ یا ماہ رمضان کے دوران نعتیہ مشاعرہ ہوتا ہے۔ یا پھر محرم الحرام میں مسالمے کے سلسلے میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ دوسرے خالص ادبی مشاعرے گزشتہ گیارہ سال کے مارشل لاء کی نذر ہو گئے کیونکہ اس دوران خاصی پابندیاں لگا دی گئیں اور ہر چیز کو اس اسلام کی کسوٹی پر تولا جانے لگا جو جنرل ضیاء کا اسلام تھا اور جنرل ضیاء کا اسلام یہ تھا کہ مولویوں کو انہوں نے فتوے بازی کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ یہ لوگ اگر چاندنی نکلی ہو تو اس کا تجزیہ بھی کر لیتے تھے کہ یہ چاندنی اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اسی طرح یہ رویہ مشاعروں کے سلسلے میں بھی رہا۔ اس کا آغاز تو یہاں سے ہوا کہ عورت کو دفتروں میں کام کاج نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا کام صرف چولہے میں آگ جھونکنا یا گھریلو کام ہے۔ اس لئے وہ جہاں جہاں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر سکتی ہے وہاں پابندی ہونی چاہئے کیونکہ یہ ان کے اسلام کے خلاف ہے۔

یہی صورت مشاعروں کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ جب ادبی مشاعرے ہوا کرتے تھے تو ان میں خواتین بھی آیا کرتی تھیں اور صحت مند ادبی میلانات بڑھ رہے تھے۔ ایک تہذیبی و ثقافتی سلسلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ہیروئن رائج نہیں تھی۔ یہ تو مارشل لاء کے دور کی برکت تھی کیونکہ جب زندگی میں دلچسپی کی کوئی چیز نہ رہ جائے تو لوگ اپنی توجہ دوسری چیزوں کی طرف کر لیتے ہیں اور ہوتے ہوتے خطرناک چیزوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ جب مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں تو لوگوں کے ذہن ان کی طرف لگے رہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں چیزوں سے ذہنی بالیدگی میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان بہت سے برے کاموں سے بچ جاتا ہے۔ اگر اوپن تھیٹر میں مشاعرہ ہے اور وہ رات دو بجے تک رہتا ہے تو وہ وہاں محو رہے گا۔ اسی طرح اگر میوزک

کانفرنس ہو رہی ہے تو وہ ہیرامنڈی جانے سے بچ جائے گا۔

خیر یہ الگ بحث ہے۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ اس زمانے میں شاعرات مشاعروں میں شامل ہوتی تھیں اور بڑے بھائی چارے کا ماحول تھا۔ لیکن بعض پہلوؤں سے دلچسپ رومانوی منظر بھی سامنے آ گئے تھے۔ میں نے ایک شاعر کو دیکھا۔ خدا مجھے معاف کرے ان کا حلیہ بیان کر رہا ہوں مگر اس نیت سے نہیں کہ ان کی تضحیک ہو۔ ان کا نام تائب رضوی تھا۔ وہ کبڑے تھے اور ان کے جسم میں کب بہت نمایاں تھا اور وہ کمان کی طرح تھے۔ قد چھوٹا تھا۔ ان کے بارے میں سننے میں آتا تھا کہ وہ ایک طرفہ طور پر خواتین پر فریفتہ ہو جایا کرتے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس زمانے کی بہت خوبصورت شاعرہ خورشید راٹھور ان کے سامنے آ گئیں۔ یہ شاعرہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کا جوانی کا سماں کوئی کیا بیان کرے۔ بالکل ایسے تھیں جیسے ہیر۔ اس طرح قد کاٹھ' نین نقش وغیرہ تھے۔ تو معلوم ہوا کہ تائب رضوی صاحب خورشید راٹھور پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ہنسی آئی کیونکہ خورشید راٹھور کی شہرت اپنے کالج کے زمانے سے ہی تھی کہ کوئی شخص ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک آدھ بار کسی لڑکے نے جسارت کی تو خورشید نے دیال سنگھ کالج میں جہاں یہ طالبہ تھی اس لڑکے کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ انہوں نے ایم اے وہیں سے کیا تھا۔ چنانچہ ان کی وہیں سے دھاک بندھی ہوئی تھی اور پھر یہ اپنے زمانے کی کشتی رانی کی چیمپئن تھیں۔

یہ تو خیر سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ خورشید کو معلوم ہو کہ تائب صاحب ان کا پیچھا کر رہے ہیں اور یہ اپنا ردعمل ظاہر نہ کریں۔ بعد میں اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی کہ انہیں تو اس بات کا پتا ہی نہیں تھا اور تائب صاحب یکطرفہ طور پر دل دیئے بیٹھے تھے۔ یہ سننے کے بعد حیرت ہوئی۔ خورشید کے گھر

میں کچھ شاعرات کا آنا جانا تھا۔اس کے علاوہ ان کے گھر میں کچھ شعراء کا بھی آنا جانا تھا مگر یہ دوستی ادبی دوستی تھی۔ایک فعہ میں ان کے ہاں جا رہا تھا اور میرے ساتھ حافظ لدھیانوی تھے جنہوں نے خورشید راٹھور کو اپنی منہ بولی بہن بنا رکھا تھا۔یہ واقعہ 1965ء کا ہے جبکہ اس سے پہلے سے ہم تائب صاحب کے بارے میں سنتے آ رہے تھے۔اس وقت جنگ ختم ہو چکی تھی۔

ہم جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ تائب صاحب پہلے سے وہاں گھوم رہے تھے اور خورشید راٹھور کا مکان ڈھونڈ رہے تھے۔ہم نے پوچھا تائب صاحب کیسے گھوم رہے ہیں۔کہنے لگے کہ خورشید راٹھور کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔میں نے کہا خیر ہے۔کہنے لگے کہ جنگ چھڑی تھی تو میں اب ان کی خیریت دریافت کرنے کیلئے آیا ہوں۔میں نے کہا کہ باہر سے دیکھ لیجئے۔اس محلے پر کوئی بم نہیں گرا اور اگر اس محلے پر کوئی بم نہیں گرا تو ظاہر ہے کہ وہ خیریت ہی سے ہوں گی۔کہنے لگے کہ پھر بھی پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے ۔خیر ہم سب ایک ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔

حکیم تائب رضوی کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ان کی بات تو یہ تھی کہ:

تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کریں

وہ سب کی نظر بچا کر خورشید کے چہرے کی طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے اور ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس چلے گئے جبکہ میں اور حافظ لدھیانوی وہیں بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں خورشید ہی نے کہا کہ کیا کریں۔بیچارے آ جاتے ہیں اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں انہیں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ہم نے کہا کہ کوئی بات نہیں' دیکھ لیتے ہیں اور دل کی تپش بجھا کر چلے جاتے ہیں۔ان کی بات وہی ہے:

زیر دیوار کھڑے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں

کہنے لگیں کہ مجھے تو بس یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ اپنی جگہ پر پختہ نہ ہو جائیں کیونکہ بال بچے دار آدمی ہیں۔یہ ان کے اپنے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔

بڑھتے بڑھتے بات یہاں تک بڑھی کہ لوگ حکیم صاحب سے مذاق سے پوچھ لیتے تھے کہ حکیم صاحب بمباری میں خورشید راٹھور محفوظ رہیں۔انہیں بالکل سمجھ نہیں آتی تھی کہ لوگ ان کے ساتھ مذاق کررہے ہیں اور وہ الٹا جواب دیتے تھے کہ اللہ کا فضل ہے۔وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔یہ سلسلہ چلتا رہا۔

ایک دن خورشید راٹھور نے خود ہمیں یہ لطیفہ سنایا کہ حکیم تائب رضوی خود میرے گھر میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں کسی اخبار میں چھپا ہوا ایک مضمون تھا اور کہنے لگے "خورشید میں ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ امریکہ میں ایسے آپریشن ہونے لگے ہیں کہ جسم خواہ کتنا ٹیڑھا ہو اور کب کتنا ہی بڑا کیوں نہ وہ لوگ آپریشن کرکے انسان کو بالکل سیدھا کر دیتے ہیں"

خورشید نے کہا" میں یہ بات سن کر ہکی بکی رہ گئی کہ یہ مجھے کیا خوشخبری سنا رہے ہیں لیکن ایک لمحے میں مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ مجھے تسلی دے رہے تھے کہ تم فکر نہ کرو میں ٹھیک ہو جاؤں گا "پھر اس کے پیچھے جو لمبی چوڑی ٹریجڈی تھی اس پر وہ بھی افسوس کرنے لگی۔

حافظ عنصر اور حکیم تائب کی داستانیں تقریباً ملتی جلتی ہیں۔

اختر شیرانی

قیام پاکستان سے کچھ سال پہلے جتنا نام اختر شیرانی نے کمایا اور جتنی مقبولیت ان کے کلام کے حصہ میں آئی وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ ان کا انداز جیسا کہ سب جانتے ہیں رومانوی تھا اور وہ اپنے کلام میں بھرپور رومانس سموتے تھے۔ لیکن ان کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے کلاسیکل شاعری اور روایتی شاعری کے برخلاف اپنا محبوب سبزۂ خط والا نہیں بلکہ براہ راست لمبی چوٹی والا اور نسوانی حسن والا بنایا۔ گویا انہوں نے نسوانیت پرستی کو شاعری میں فروغ دیا۔ شاعری میں جہاں سے یہ موڑ شروع ہوتا ہے وہیں سے اختر شیرانی کا نام بھی شروع ہوتا ہے۔ اور یہ نام اس پوری شاہراہ پر ایک خوبصورت سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکیم نیر واسطی کا کہنا تھا کہ یہ سب سلمیٰ اور عذرا کے کردار جو اختر شیرانی کی شاعری میں آئے یہ سب ان کا عربی شاعری کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن اختر شیرانی خود عربی پر عبور نہیں رکھتے تھے۔ بقول حکیم نیر واسطی مرحوم ان کے پاس قبل اسلام کے شاعروں کا بہت سا کلام موجود تھا اور اختر چونکہ ان کے دوست تھے اور اکثر ان کے ہاں قیام کرتے تھے تو انہیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح اختر شیرانی وہاں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ کردار عربی سے لے کر اُردو میں منتقل کئے۔ واقعہ جو بھی ہو بہر حال اس سے انکار نہیں کہ اُردو شاعری میں یہ خوبصورت موڑ دینے والا تنہا اختر شیرانی تھا۔

اس زمانے میں ان کی نظمیں بہت مقبول تھیں مثلاً

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر
یا پھر یہی کوچہ ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی
یا پھر او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن

چنانچہ ان کی یہ سب نظمیں عروج پر تھیں۔ میں اس زمانے میں بالکل مبتدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مرا قیام اس زمانے میں راولپنڈی میں تھا۔ وہاں مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ اختر شیرانی تشریف لائے ہیں۔ میرے دل میں ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا کیونکہ میں ابتداء میں جن چند شاعروں سے متاثر ہوا ان میں سے ایک اختر شیرانی بھی تھے۔ وہاں راولپنڈی میں بانسوں والے بازار کے پاس ایک محلے میں ایک مکان میں اختر شیرانی کے ایک دوست رہتے تھے جو پینے پلانے والے آدمی تھے۔ ان کے ہاں کچھ شاعروں اور کچھ موسیقاروں کی ایسی محفلیں چلتی تھیں۔ وہ بہت آزادی کا زمانہ تھا اور جگہ جگہ شراب کی دوکانیں کھلی ہوتی تھیں اور ریستورانوں میں کھلے عام مری بروری کی بیئر پیش کی جاتی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ شام ان صاحب کے ہاں ایک محفل جمے گی جس میں شعر و شاعری بھی ہو گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ بھی پتہ چلا کہ اختر شیرانی کے ہمراہ سلمیٰ بھی ہوں گی۔ اور معلوم ہوا کہ انہوں نے سلمیٰ سے شادی کر لی ہے۔

ہمارے لیے یہ اور بھی کشش کی بات تھی۔ اگلی شام ہم بھی وہاں پہنچے اور معلوم ہوا کہ کسی دوست نے یونہی مذاق کیا تھا۔

ہم لوگ ان لوگوں میں سے تھے کہ جس رسالے میں ان کی نظم دیکھتے تھے وہ خرید لیتے تھے۔ اس

دوران پارٹیشن ہو گیا۔ میں پارٹیشن سے کوئی چھ ماہ پہلے لاہور شفٹ ہو گیا تھا اور وہاں پارٹیشن کے بعد میری اختر شیرانی سے ملاقات ہوئی وہ اسی طرح رنگے ہوئے تھے۔ میں ان کا معتقد تھا اور خود بھی پیتا تھا۔ لیکن میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میں ایسا پینے والا نہیں تھا کہ اگر نہ ملے تو بے چین ہو جاؤں۔ ویسے ایک دو پیگ پی لیتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسا شاعر مل جائے تو اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

چنانچہ میں نے اختر شیرانی کو اپنے ہاں بلایا اور اس دن بڑے اہتمام سے سکاچ کی بوتل خریدی جو کہ کافی مہنگی تھی۔ وہ آئے اور سکاچ دیکھ کر کہنے لگے کہ صاحب یہ کیا ہے یہ تو ہمیں راس ہی نہیں آتی۔ ہمارے لئے تو آپ ایک دیسی بوتل لے آیئے چنانچہ میں وہ بھی لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس کا ڈھکنا نہیں کھولا اور نہ ہی سوڈے میں یہ ڈالی بلکہ قریب ہی پڑی ہوئی ایک ہتھوڑا نما قسم کی چیز اٹھائی اور بوتل کے سرے پر ماری۔ بوتل کا سرا ٹوٹ کر شیشہ ادھر ادھر بکھر گیا اور انہوں نے اسی طرح گلاس میں انڈیل کر NEAT ہی پینا شروع کر دی۔ میں تو انہیں اس طرح پیتے دیکھ کر ڈر گیا۔ لیکن وہ پیتے رہے۔ اور پی کر چلے گئے۔ پھر ان سے ملاقات حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں ہوئی۔

ایک بار پھر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں پنجاب کے تمام سرکردہ شعراء شریک تھے۔ اس زمانے میں ساحر لدھیانوی بھی اپنی ماں اور نانی کے ساتھ لاہور ہی میں مقیم تھے۔ شورش کاشمیری بھی اس مشاعرے میں پیش پیش تھے۔ ساحر نے بھی شرکت کی۔ اختر شیرانی آئے تو بہت زیادہ پیئے ہوئے تھے تو پبلک میں سے بہت سے لوگوں نے اس وقت احتجاج کیا۔ جب وہ اس حالت میں کلام سنانے

کے لئے سٹیج پر آئے۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں سنیں گے۔ اختر شیرانی آگے بڑھے۔ اتنے میں شورش کاشمیری سٹیج پر آ گئے وہ تقریر کے بادشاہ تھے اور جیسا بھی مجمع ہوتا اسے اپنے پیچھے لگا لیتے تھے۔ انہوں نے مائیک پر آ کر اختر شیرانی کے حق میں کچھ شاعرانہ جواز پیش کر کے پبلک کے جوش کو کچھ ٹھنڈا کیا اور اختر شیرانی سے دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی تو وہ بے دلی سے کچھ پڑھ کر سٹیج سے اترے اور مشاعرے سے چلے گئے۔

اس کے بعد اختر شیرانی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مجھے کرید ہوئی کہ دیکھیں یہ جس سلمیٰ کو پنڈی لے کر آ رہے تھے اس میں سے اب کتنے بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ جن دنوں میں "اداکار" کا ایڈیٹر تھا، شریف نیّر جو ہمارے بڑے مشہور ڈائریکٹر ہیں وہ کچھ عرصے کے لیے اس زمانے میں "اداکار" کے منیجر مقرر ہوئے تھے۔ دفتر "اداکار" میں نیّر صاحب نے ان کی شراب کی دعوت کی۔ وہاں اختر شیرانی آئے تو میں نے بات چھیڑ دی کہ سنا تھا کہ سلمیٰ سے آپ کی شادی کچھ عرصہ پہلے ہو گئی تھی۔ کہنے لگے کہ کون سلمیٰ؟ میں نے کہا کہ جس کا ذکر آپ شاعری میں کرتے ہیں بلکہ اس میں تو عذرا بھی ہے۔ انہوں نے قہقہہ لگایا اور پھر کہنے لگے کہ بھائی یہ سب علامتیں ہیں۔ نہ اصل نام سلمیٰ ہے اور نہ عذرا ہے۔ اور نہ ہی کسی سلمیٰ یا عذرا سے میری شادی ہوئی ہے۔ میری ایک گھریلو بیوی ہے۔ اس میں سے اولاد بھی ہے۔ بس اس کو عذرا اور سلمیٰ سمجھو۔ پھر کہنے لگے کہ ویسے تو سب کی زندگی میں لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی نے ہنس کر بات کر لی ہو گی۔ اس کا نام سلمیٰ ہو گا۔ اور کبھی کسی اور نے ہنس کر بات کر لی ہو گی تو اس کا نام عذرا ہو گا اور وہیں سے میں نے یہ علامتیں بنا لیں۔

حکیم نیّر واسطی صاحب نے تو باقاعدہ ایک کتاب لکھی تھی اور اس میں اس طرح کے دعوے کئے

تھے جیسے سلمیٰ نام کی کوئی لڑکی واقعی موجود تھی۔اوراس رومانس میں وہ بھی رازدار تھے۔اب نیّر صاحب بھی ثقہ آدمی ہیں۔میری ان سے بھی نیاز مندی ہے۔ نیّر صاحب کے تو ہمارے ساتھ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ہماری بیویوں کا بھی ملنا جلنا تھا۔اب انہوں نے جو کتاب لکھی اس میں انہوں نے جو دعوے کئے وہ اپنی جگہ تھے۔ادھر اختر شیرانی نے جو مجھے کہا وہ اپنی جگہ ہے۔اب نہ تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب نے یہ دعوے کئے ہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اختر شیرانی نے کہا کہ یہ تو سب فرضی نام ہیں۔ مگر اختر شیرانی تو اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے اس لئے ان سے میں کیا کہتا۔ البتہ میں نے نیّر صاحب سے کبھی نہیں کہا کہ کیا صورت ہے۔

اختر شیرانی کتنے بڑے باپ کے بیٹھے تھے۔ان کے والد حافظ محمود شیرانی ایک سکالراور عالم وفاضل تھے۔وہ دونوں ایک ہی مکان میں فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے لیکن لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ جتنی بار بھی دستک ہوتی تھی وہ بیٹے ہی کے لیے ہوتی تھی اور اکثریت کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اس مکان میں اس نامور بیٹے کا فاضل باپ بھی رہتا ہے۔چونکہ حافظ محمود شیرانی کی تخلیقی فیلڈ عالمانہ تھی اور نثر میں تھی۔ان کے پڑھنے والے بہت کم تھے۔اختر شیرانی چونکہ شاعر تھے اس لیے ان کے پڑھنے والے لاکھوں تھے۔پھر جتنے بھی معتقد آتے تھے ان میں سے ننانوے فیصد اختر شیرانی کے ہوتے تھے جبکہ صرف ایک فیصد حافظ محمود شیرانی کے ہوتے تھے۔

انہیں بیٹے پر فخر بھی تھا لیکن بیٹے کی بے راہروی انہیں بہت کھلتی بھی تھی۔ اختر شیرانی گھر سے غافل ہو چکے تھے اور کام کاج بھی کوئی نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں شاعروں کی آمدن بھی کوئی نہیں

ہوتی تھی پھر جہاں کلام چھپتا تھا وہاں سے بھی کچھ نہیں ملتا تھا کیونکہ رسالے والے تو کلام چھاپ کر الٹا شاعر پر احسان کرتے تھے۔

احسان کا ذکر آیا تو مجھے روزنامہ '' احسان'' یاد آگیا۔ روزنامہ ''احسان، مسلم پرچوں میں ایک معروف پرچہ تھا جس کے مالک چودھری نور الٰہی تھے۔ وہ اپنے فن صحافت اور پبلشنگ میں بہت ماہر تھے۔ ان کا پرچہ چلتا تھا لیکن تنخواہوں کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ایک تو اس زمانے میں مسلم پرچے ہندو پرچوں کے مقابلے میں کم چھپتے تھے دوسرے اشتہار والے مسلم پرچوں کی سرپرستی نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی ادارہ مالی مشکلات میں ہو تو اس کے کارکن بھی مشکل میں ہوتے ہیں۔ انہیں تنخواہیں بھی کم اور اقساط میں ملتی تھیں۔ زمیندار'' اور دوسرے پرچوں کا بھی یہی حال تھا۔

ملک نور الٰہی کے بیٹے انگلینڈ سے بیرسٹری کر کے واپس آئے۔ ان کا نام ملک مقبول الٰہی تھا اور وہ میرے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں اس زمانے میں مصری شاہ میں رہتا تھا۔ اور جب میکلوڈ روڈ پر ''اداکار'' کے پرچے میں آتا تھا تو آدھے راستے میں ''احسان'' کا دفتر پڑتا تھا۔ پھر جب سے مقبول صاحب ولایت سے واپس آئے تھے تو انہوں نے پرچے میں اپنے نئے نئے اصول رائج کئے تھے۔ ان میں یہ بھی جذبہ جاگا کہ ان کے ادبی ایڈیشن میں لکھنے والوں کو معاوضہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ دیکھ کر آئے تھے کہ انگلینڈ میں ایسا ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے والد سے مشورہ کئے بغیر ہی کچھ لوگوں سے کہا کہ آپ ہمارے پرچے کے لئے لکھئے آپ کو معاوضہ دیا جائے گا۔ انہوں نے اس زمانے میں مجھ سے بھی ایک نظم لی اور جب آٹھ دس دن کے بعد میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں ''احسان'' کے

پرچے میں چلا گیا۔ دس روپے معاوضہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ معاوضہ لے لوں۔

میں مقبول صاحب کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے میرے لیے چائے منگوائی۔ ان کے دفتر میں کیبن بنے ہوئے تھے اور مقبول صاحب کا کیبن الگ تھا۔ جس کیبن میں میں مقبول صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ والے کیبن میں ملک نور الٰہی بیٹھے تھے۔ میں بیٹھا تھا تو مقبول صاحب کہنے لگے کہ قتیل صاحب اچھا ہوا آپ آ گئے اب آپ اپنا معاوضہ بھی لیتے جائیے اور پھر کہنے لگے کہ میں حاضر ہوتا ہوں۔

اس کے بعد مجھے ساتھ والے کیبن سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ وہ اپنے والد سے کہہ رہے تھے کہ آپ مجھے ایک دس روپے دے دیں۔ والد نے پوچھا کیا کرنے ہیں۔ انہوں نے کہا قتیل شفائی صاحب کو دینے ہیں۔ والد نے پوچھا کس سلسلے میں دینے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی ایک نظم چھپی تھی اس کا معاوضہ دینا ہے۔ والد نے حیرت سے کہا کہ نظم چھپنے کا معاوضہ؟ اور پھر کہنے لگے کہ ایک تو ہم ان کی مشہوری کریں اور دوسرے انہیں معاوضہ دیں۔ یہ بات سن کر میرے تو سر میں پانی پڑ گیا اور اس کے بعد مقبول صاحب کی آواز بھی آنی بند ہو گئی۔ وہ شرم کے مارے اپنے کیبن میں بہت دیر تک واپس نہیں آئے بلکہ کسی اور کیبن جا کر انہوں نے سرگوشیوں کے انداز میں کسی اور سے دس روپے قرض لیے اور میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ معذرت چاہتا ہوں میں ذرا لیٹ ہو گیا اور پھر انہوں نے دس روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ رہا آپ کا معاوضہ۔ میں نے کہا مقبول صاحب یہ رہنے دیجئے۔ یہاں پر جو دستور چل رہا ہے وہی چلنے دیجئے۔ میں آپ کے جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن میں یہ دس روپے نہیں لوں گا۔ آپ کے والد صاحب کو بعد میں

پتہ چل گیا کہ آپ نے کسی اور سے پیسے لے کر مجھے دیئے ہیں تو ممکن ہے کہ باپ بیٹے میں معاملہ دنگا فساد تک پہنچے ۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ یہاں کے دستور ہی الٹے ہیں۔ میں جو سیکھ کر آیا ہوں اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ادبی پرچوں میں معاوضے کا سلسلہ تو خال خال ہی کبھی رہا ہوگا۔ یا تو معاوضہ وہ کمرشل پرچے دیتے تھے جو کثیر الاشاعت ہوتے تھے اور ان میں چٹخارے دار مواد زیادہ ہوتا تھا۔ اور یا پھر سرکاری پرچے معاوضہ دیتے تھے جیسے یونینسٹ پارٹی کا پرچہ پنچایت تھا۔ مثلاً ''مست قلندر'' اور حسن پرست'' پرچے بھی معاوضے دیتے تھے۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ جب بعد میں قیام پاکستان کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے معاوضہ دینے کی رسم روزنامہ ''امروز '' سے شروع ہوئی۔ یہ پرچہ میاں افتخار الدین صاحب نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے ادارے سے شائع کیا تھا۔ اس ادارے سے شائع ہونے والے دوسرے پرچوں ''پاکستان ٹائمز'' اور ''لیل ونہار'' وغیرہ میں بھی وہ اپنے لکھنے والوں کو برابر معاوضہ دیا کرتے تھے۔ امروز کے ادبی ایڈیشن کا نام ''قسمت علمی وادبی '' تھا۔ اسے چراغ حسن حسرت مرتب کرتے تھے اور شروع کے پرچے کے ایڈیٹر بھی وہی تھے۔ بعد میں اس کے ایڈیٹر بدلتے بھی رہے لیکن جو معاوضہ دینے کی رسم چلی تھی وہ باقی رہی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس صفحے کا معیار اتنا اونچا تھا کہ لوگ اس میں چھپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس میں نظم کا معاوضہ دس روپے تھا جبکہ نثر کا معاوضہ سات روپے فی کالم تھا۔ اور اس زمانے میں یہ کافی پیسے سمجھے جاتے تھے۔

چراغ حسن حسرت صاحب کے بعد احمد ندیم قاسمی صاحب کا زمانہ آیا اور اس کے بعد پھر آخر کار طفیل احمد خان کا زمانہ آیا۔ جب وہ اس کے ایڈیٹر ہوئے تو ہمارے دوست تھے۔ اس زمانے میں چیف ایڈیٹر

کی تنخواہ تقریباً چھ سو روپے اور سب ایڈیٹر کی تنخواہ تقریباً دو سو روپے ہوتی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ تنخواہ ہوتی تھی۔اس کے علاوہ چونکہ طفیل احمد خان کی فیملی کراچی میں تھی اور انہیں وہاں بھی پیسے بھیجنے پڑتے تھے اور یہاں بھی اپنے اخراجات کرنے ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی زیادہ کھلے ہاتھ کے آدمی نہیں تھے۔اگر ہمیں کبھی چائے پلا دیتے تھے تو اگلی بار ہمیں ان کو چائے پلانی پڑتی تھی۔ ہم شام کو ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھتے تھے۔

انہوں نے ہر ہفتے کوئی نہ کوئی چیز چھپنے کی چھوٹ دے رکھی تھی اس لیے اگر ایک ماہ میں چار چیزیں چھپ جاتیں تو چالیس روپے مل جاتے۔ میں یہ پیسے زیادہ تر چائے پیسٹری پر خرچ کر بیٹھتا تھا۔اب چار نظمیں کیسے کہی جائیں کیونکہ ان چار نظموں کے علاوہ ادبی پرچوں کو بھی چیزیں بھیجنی ہوتی تھیں۔ پھر آمد کا سلسلہ بھی تو ایسا نہیں تھا کہ ادھر سے کاغذ ڈالا اور ادھر سے نظم نکل آئی۔ کبھی نظم نہیں بھی ہوتی تھی۔

میں نے کچھ ایسا کیا کہ پرانی نظمیں اور پرانا کلام جو بہت پہلے چھپ چکا ہو وہ بھی دو چار بار وہاں چھپوایا۔ایک بار خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مظفر آباد سے کسی صاحب نے طفیل احمد خان کو لکھا کہ قتیل شفائی نے میری غزل چرا لی ہے۔ وہ غزل کچھ یوں تھی:

فلک سے رات کو جب چاندنی برسائی جاتی ہے
مرے سینے میں تیرے دل کی دھڑکن پائی جاتی ہے

اس نے اپنے خط کے ساتھ تین سال پہلے کی ایک کٹنگ بھی بھیج دی جس سے ظاہر تھا کہ یہ غزل اس سے پہلے مظفر آباد کے کسی پرچے میں چھپ چکی ہے۔ طفیل احمد خان تھوڑے سے بدحواس بھی

تھے۔ یہ شکایت نامہ دیکھ کر پریشان ہو گئے اور مجھے کہنے لگے کہ دیکھئے یہ کیا ہو گیا ہے۔اس سے ہمارے پرچے کی بدنامی ہوئی ہے۔میں نے کہا کہ یار اب سچ بلوانا ہے تو بات یہ ہے کہ یہ غزل کوئی آٹھ سال پرانی ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ رسالے میں چھپ چکی ہے بلکہ ایک فلم کیلئے اس کی ریکارڈنگ بھی ہو چکی ہے۔اگرچہ یہ فلم مکمل نہیں ہو سکی تھی اس غزل کا ریکارڈ اب بھی میرے پاس پڑا ہے۔میں تمہیں وہ رسالہ اور ریکارڈ دے دوں گا۔اس سالے نے یہ غزل میری غزل کے چھپنے کے پانچ سال بعد کہیں اپنے نام سے چھپوالی ور اب اس نے یہ خط بھیج دیا ہے۔میرے خیال میں وہ یا تو بیوقوف آدمی ہے اور یا پھر اسے کوئی شرارت سوجھی ہے۔

طفیل احمد خان تو میرے بے تکلف دوست تھے۔لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر یہی واقعہ کسی اختلاف رکھنے والے آدمی تک پہنچتا تو ایک بار زندگی میں ہمیں بھی اپنی غزل چوری کرنے کا مزا آجاتا۔

تو وہ معاوضہ جو ''امروز'' نے شروع کیا تھا اس کے بعد لکھنے والوں کو بھی احساس ہوا کہ اپنی محنت کا حق لینا چاہئے۔اور اخبارات ورسائل کی اشاعت کیلئے خرچ آنے والی ہر چیز کا معاوضہ ادا کر دیتے ہیں اور صرف ہماری لکھی ہوئی اس چیز کا معاوضہ ادا نہیں کرتے جس سے اخبار کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ بعض اداروں کی طرف سے تو پانچ پانچ سو روپے بھی معاوضہ ملتا ہے۔پچھلے دنوں ''اخبار جہاں'' کا بیس سالہ نمبر چھپا تو اس میں چھپنے والی میری چند رباعیوں کے انہوں نے پانچ سو روپے ادا کئے۔یہ تو خیر بیس سالہ نمبر تھا۔اگر یہ نمبر نہ بھی ہوتا تو بھی معاوضے کی ان کی طرف سے ادائیگی کم از کم دو سو روپے ضرور ہوتی۔

لکھنے والوں کو معاوضے کی ادائیگی کا سارا کریڈٹ میاں افتخار الدین کے ان پرچوں کو جاتا ہے جو اپنے

زمانے کے بہت پروگریسو پرچے تھے۔خاص طور پر ''امروز'' کو جس میں لکھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔بد قسمتی سے آج ہی'' امروز'' کالاشہ نظر آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ پرچہ کتنی بلندی سے کتنی پستی میں آ گرا ہے۔

ڈیلی اخباروں کا ذکر آیا ہے تو مجھے یاد آگیا کہ قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے روزنامہ ''شہباز'' نکلا۔ یہ سرکاری اخبار تھا اور اس پر کاغذ قیمتی صرف ہوتا تھا۔اس کا ادارہ تحریر بھی بہت جاندار تھا۔نہ صرف مسلم بلکہ تمام پرچوں میں اس کی ضخامت سب سے زیادہ تھی اور قیمت دوسروں پرچوں کے برابر یعنی ایک آنہ تھی۔جبکہ ہاکروں کو پچیس فیصد کمیشن ملتی تھی۔

میں اس زمانے میں ہری پور میں تھا اور میرے مالی حالات کچھ بگڑتے جا رہے تھے۔ کچھ تو مکانوں کا کرایہ آجاتا تھا اور کچھ نظموں میں قیمتاً لکھ کر بیچا کرتا تھا۔اس سے آمدن ہوتی تھی۔اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی سروس بھی کی تھی جس سے کچھ پیسے آتے تھے مگر ان چیزوں کے باوجود اخراجات زیادہ تھے کیونکہ گھریلو اخراجات کے علاوہ میرا بہت سا خرچ مشاعروں پر آنے جانے میں ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے آمدنی کی مختلف تدابیر سوچنی شروع کیں۔

مجھے آمدنی کی ایک عجیب ترکیب روزنامہ ''شہباز'' کو دیکھ کر سوجھی۔میں نے یہ پرچہ دیکھا تو اس کی ضخامت بہت تھی۔میں نے اسے تلوا کر دیکھا تو اس کی ردی ایک آنے کی تھی۔میں نے اس پرچے کی ایجنسی کے لیے کوشش کی تو وہ مل گئی۔ادارے نے مجھ سے جتنی زر ضمانت مانگی وہ میں نے بھیج دی۔پہلے میں نے بیس پرچے منگوائے۔اس کے بعد تقریباً ایک ہفتہ گزرا تو میں نے انہیں لکھا

کہ ہری پور میں یہ پرچہ بہت پاپولر ہوا ہے اس لیے اس کی تعداد ایک سو کر دیجئے۔ انہوں نے پرچے میں میرا خط بھی چھاپا اور ہری پور میں ایک سو پرچہ بھی بھیجنا شروع کر دیا۔ میں اس سو پرچے کا یوں کرتا تھا کہ اس سے جو پانچ دس پرچے بکنے والے ہوتے تھے انہیں بیچ دیا کرتا تھا اور یہ پرچے میرا ایک دوست پر تھوی چند کوہلی جو اخباروں کا ایجنٹ تھا وہ بیچ دیا کرتا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اسے اعتماد میں لے کر ہی کیا تھا۔ اس کے سٹال سے جو پانچ دس پرچے بک جاتے اور باقی جو پرچے بچتے انہیں میں ردی میں فروخت کر دیتا تھا۔ کیونکہ سٹال پر بھی وہ پرچہ ایک آنے کا بکتا تھا اور ردی میں بھی وہ ایک آنہ فی پرچہ ہی بکتا تھا۔ اس طرح مجھے ردی بیچ کر کوئی ڈیڑھ روپیہ روزانہ کے حساب سے بچت ہو جاتی تھی۔ اگر اس طرح ہونے والی ماہانہ آمدن کا حساب کیا جائے تو مجھے ایک کلرک کی آمدن سے اڑھائی گنا زیادہ آمدن گھر بیٹھے ہوئے ہی ہو رہی تھی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ کوئی آدمی سروے کے لیے ہری پور آیا تو اسے پتہ چلا کہ حضرت قتیل شفائی ان کے پرچے سے ہاتھ کر رہے ہیں ورنہ پرچہ سو تو کیا دس کی تعداد میں بھی نہیں بک رہا تھا۔ تو انہوں نے پرچہ بند کر دیا جس سے میری آمدن کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔

ہیر پھیر کے سلسلے

کمانے کے ڈھنگ بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں جیسے میں نے روزنامہ ''شہباز'' سے ناجائز آمدنی اپنے لیے مناسب سمجھی۔ کچھ لوگ اور طرح کی بد دیانتی بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک معزز شخص نے میرے ساتھ روا رکھی۔ میں ہری پور میں اپنے گھر کی بالائی منزل میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ گھنٹی ہوئی۔ نیچے گیا تو ایک انتہائی سفید پوش آدمی جو آنکھوں سے اندھا تھا وہاں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنی داستان

سنائی کہ میں پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں ایک حادثے میں میری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں اور اب میں بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ مگر سر پر بیٹیوں کا بوجھ ہے۔ سنا ہے کہ آپ اللہ والے ہیں اور میری مدد کریں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے والد صاحب فوت ہو چکے تھے اور گھر میں کافی پیسہ موجود تھا۔ اس نے اپنی داستان کچھ اس دردناک انداز سے سنائی کہ میں والدہ کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے پچاس روپے دے دیجئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے بات بتائی تو وہ بھی بہت متاثر ہوئیں۔ اور مجھے انہوں نے پچاس روپے دے دیئے۔

اس زمانے میں جب فقیر کو ایک پیسہ دیا جاتا تھا، اور اگر کوئی اس سے بہت متاثر بھی ہوتا تو ایک روپیہ دے دیتا لیکن میں نے اس خضر صورت آدمی کو پچاس روپے دے دیئے۔ وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اس واقعہ کے چھ مہینے بعد میں راولپنڈی والے مکان میں تھا کہ دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو وہی بزرگ کھڑا تھا اور اس نے بالکل وہی داستان مجھے سنائی۔ میرا جی چاہا کہ اس شخص کو داڑھی سے پکڑوں اور پٹائی کروں یا پھر جوتا اٹھا کر خود اپنے سر میں ماروں کیونکہ دھوکا تو میں نے کھایا ہے۔ مجھے چاہیے کہ پچاس روپے جو آج کے کم از کم دوہزار روپے ہوں گے، دینے سے پہلے اسے پرکھ لیا ہوتا۔ میں یوں بھی کر سکتا تھا کہ اس سے کہتا کہ آپ اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے اور میں منی آرڈر کر دوں گا۔ بہر حال میں نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بوڑھے آدمی سے صرف یہی کہا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاسکتا اور پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ ہری پور میں بھی میرے پاس آیا تھا اور یہی داستان سنائی تھی۔ پہلے تو چونکا لیکن پھر کہنے لگا کہ بیٹے دیکھو نا پانچ بیٹیوں کا معاملہ تھا۔ دو کی تو میں نے شادی کر دی ہے لیکن ابھی تین بیٹیاں باقی ہیں۔ میں نے کہا اس وقت آپ کہہ رہے تھے کہ

آپ کی بیٹیاں ایبٹ آباد میں ہیں، اب آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی بیٹیاں گوجرانوالہ میں ہیں۔ کہنے لگے کہ جی میری دونوں جگہ ہی رشتہ داریاں ہیں، کبھی وہاں چھوڑ آتا ہوں اور کبھی وہاں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں بیٹھیں میں پولیس کو بلا لاؤں۔ اگر آپ کی بات سچ ہوئی تو یقین کریں کہ میں آپ کی کم از کم ایک بیٹی کی شادی کا پورا خرچ اٹھالوں گا ورنہ آپ جیل چلے جائیں گے۔ پہلے تو وہ شخص بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ بے شک تصدیق کر لیں۔ لیکن جب میں نے ایک دوست کو کہا کہ تم جا کر پولیس کو بلا لاؤ، تو اس کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد تک بھی یہ بزرگ بڑے حوصلے سے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میرے پاؤں پکڑ لیے اور کہنے لگا کہ میں سچا تو ہوں مگر پولیس سے بہت ڈرتا ہوں۔ خدا کیلئے مجھے جانے دیجئے۔ ویسے بھی اگر میرے عزیزوں کو پتہ چل گیا۔ تو میری بیٹیوں کی شادیاں متاثر ہوں گی۔ میں نے کہا کہ تم بڑے ملعون آدمی ہو۔ اب بھی سچ نہیں بول رہے ہو جب پولیس والے ایک تھپڑ ماریں گے تو تم خود ہی سچ بول دو گے لیکن پھر بھی میں تمہاری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور خدا کیلئے اب اس کام سے باز آجاؤ۔ کیوں اپنی قبر بھاری کر رہے ہو۔ اس طرح وہ شخص وہاں سے چلا گیا اور میں نے سوچا کہ میں نے تو پھر بھی اخبار کی ناجائز کمائی ردی بیچ کر ہی کمائی تھی مگر یہ شخص تو خدا کا نام بیچتا ہے اور بیٹیوں کی مظلومیت کا مفروضہ بھی گھڑتا ہے۔ اللہ مجھ پر بھی رحم کرے اور اس پر بھی رحم کرے۔

ہیر پھیر کے سلسلے تو عجیب طرح سے ہوتے ہیں۔ اب ان چیکوں کا معاملہ لے لیجئے جو کوئی شخص جان چھڑانے کے لیے بعد کی تاریخ کے دے دیتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسے POST DATED چیک عام طور پر ڈس آنر ہو جاتے ہیں۔ 1950ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ ایک

پروڈیوسر جعفر شاہ صاحب نے فلم ''بھروسہ'' بنائی جس کا ایک گیت مجھ سے لیا۔ یہ ایک ایسی ماں کی اپنے بچے کے لیے لوری تھی جس کا بچہ حقیقی شوہر سے نہیں تھا۔ دوسرے معنوں میں وہ حرامی بچے کی ماں تھی۔ یہ لوری والا گیت اس زمانے میں بہت مشہور ہوا۔ اس کا ایک مصرح تھا:

سو جا میری جوانی کی بھول

انہوں نے مجھے دو سو روپے کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک دے دیا۔ اس زمانے میں اچھے گیت نگار کا معاوضہ دو سو روپے ہوتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد میں مقررہ تاریخ کو بینک گیا تو یہ چیک ڈس آنر ہو گیا۔ میں نے ان سے جا کر کہا کہ آپ کا چیک تو ڈس آنر ہو گیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ اصل میں مجھے جو چیک ملا تھا اور جو میں نے جمع کروایا تھا وہ ڈس آنر ہو گیا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ ایک دوسرا چیک جمع کروایا ہے۔ آپ دس دن کے بعد جا کر بینک سے پیسے لے لیں۔ جب میں پھر بینک گیا تو چیک دوبارہ ڈس آنر ہو گیا۔ بینک کا کلرک میرے اشعار پڑھنے والا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ قتیل صاحب آپ کب تک اس چیک کے ساتھ یوں ہی چکر لگاتے رہیں گے۔ اس شخص کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جسے پیسے دینے ہوتے ہیں اسے چیک دے کر مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے اتنے پیسے جمع کروا دیتا ہے اور پیسے بھی اس وقت جمع کرواتا ہے جب بینک بند ہونے والا ہوتا ہے۔ پھر کہنے لگا کہ اب یہ جس دن آ کر پیسے جمع کروائے گا تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔ چنانچہ ایک دن دو بجے کے بعد مجھے فون آیا کہ اس نے آج پانچ سو روپیہ جمع کروایا ہے۔ اس کلرک نے مجھے کہا کہ آپ صبح بینک کھلتے ہی یہاں پہنچ جائیں۔ چیک کیش ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح کیا اور چیک کیش کروا کے دو سو روپے وصول کر لیے۔ پیسے لینے کے بعد میں بینک کے اندر ہی بیٹھ کر اب پانچ سو روپے والے چیک والے آدمی کا انتظار کرنے لگا

۔میں نے دیکھا کہ جب وہ آیا تو اس کا چیک ڈس آنر ہو گیا کیونکہ اس کے اکاؤنٹ میں صرف تین سو روپے تھے۔

ایک اور پروڈیوسر صاحب نے ایک بار مجھے ایک ہزار روپے کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک دیا تو وہ ڈس آنر ہو گیا۔ میں نے بینک کے کیش کلرک کو اعتماد میں لے کر پوچھا کہ بات کیا ہے۔اس نے کہا کہ ان کے اکاؤنٹ میں اس وقت بھی ساڑھے آٹھ سو روپے ہیں مگر آپ کا چیک ایک ہزار روپے کا ہے۔ میں نے وہیں سے ایک آدمی سے ڈیڑھ سو روپے لے کر اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروائے اور جب پتہ چل گیا کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ ان کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہو گیا ہے تو اسی دن دوپہر کے قریب میں نے وہ چیک پھر پیش کر دیا۔ اب وہ چیک کیش ہو گیا۔ گویا میں نے ساڑھے آٹھ سو روپے تو لے لیے لیکن ڈیڑھ سو روپے کی قربانی دے کر ہی لیے۔ وصولیاں کبھی اس طرح بھی کرنی پڑ جاتی ہیں۔

عام لوگوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ شاعر کے لیے شراب ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن میں آپ کو حقیقت بتانا چاہتا ہوں کہ شراب اور شاعری کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب شراب کا چلن کم ہو گیا ہے اور پاکستان میں یہ اس طرح اب نہیں پی جاتی جس طرح پارٹیشن سے پہلے پی جاتی تھی۔ پہلے شاعروں میں اکثر شراب پی جاتی تھی اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ شراب پی کر شعر لکھتے تھے یا شاعری کے لیے یہ ضروری تھی بلکہ دراصل جن محفلوں میں شعر و شاعری ہوا کرتی تھی عام طور پر وہ محفلیں رؤسا کی ہوتی تھیں اور ان میں فیشن کے طور پر بھی شراب پی جاتی تھی۔ چنانچہ شاعر جہاں بھی جاتے تھے ان کی شراب سے تواضع ہوتی تھی۔اس کے بعد شاعری کی

محفلیں ہوتی تھی۔

داستانوں میں ہم نے پڑھا اور سنا تھا کہ مرزا غالب خوب پیتے تھے اور:

قرض کی پیتے تھے مے اور دل میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس کے پیچھے کچھ داستانیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ایک اور داستان بھی سنی تھی کہ وہ ایک بار مسجد میں نماز پڑھنے گئے اور سلام پھیرا تو پیچھے کافی دوران کے شاگرد کھڑے تھے۔ شاگرد نے دور ہی سے شراب کی بوتل دکھائی۔ مرزا اس وقت فرض نماز پڑھ چکے تھے لیکن ابھی سنت نماز بقایا تھی مگر وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر باہر چلے آئے اور کسی نے اس دوران ان سے پوچھا کہ نماز آدھی کیوں چھوڑ دی تو کہنے لگے کہ جب فرض پڑھتے ہی اللہ تعالیٰ نے دعا پوری کر دی ہے تو سنت پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ان کے بارے میں اس طرح کی داستانیں مشہور تھیں۔

عصر حاضر کے شاعروں میں جگر مراد آبادی کی شراب نوشی کی داستانیں عروج پر تھیں انہیں لوگوں نے وارفتگی کے عالم میں دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ پینے کے باوجود وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور مشاعروں پر چھا جاتے ہیں۔

پھر مجاز لکھنوی کی شراب نوشی کے قصے اور لطیفے بھی سن رکھے تھے۔ جوش صاحب سے ان کا ایک لطیفہ مشہور تھا۔جوش صاحب کی عادت تھی کہ وہ بالکل روزہ داروں کی طرح مے نوشی کا اہتمام کرتے تھے اور شام کو دیکھتے تھے کہ سورج کس وقت غروب ہوا۔ چنانچہ یہ بھی افطاری کرنے والے

کی طرح سورج غروب ہوتے ہی جام اٹھاتے تھے اور پینی شروع کر دیتے تھے۔اس سلسلے میں ان کا شعر بھی ہے کہ

جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے

پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

وہ اس کے ساتھ یہ اہتمام کرتے تھے کہ گھڑی سامنے رکھ کر پون گھنٹے میں ایک پیگ ختم کیا کرتے تھے۔

اسرار الحق مجاز بہت فقرہ باز تھے انہوں نے جوش صاحب سے کہا کہ جوش صاحب! آپ تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں لیکن ہم گھڑا سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔لطیفے کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن گھڑا سامنے رکھ کر پینے والوں کے ساتھ جو کچھ شراب نے کیا وہ عبرت ناک ہے۔بہر حال مجاز، جوش، فراق، گور کھپوری غرضیکہ جتنے نامور شعراء تھے سبھی پیتے تھے اور نئ نسل میں جنہیں شاعری سے شغف ہوتا تھا اور جن میں شاعری کے جراثیم ہوتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جتنے بھی بڑے شاعر ہیں یہ سب شراب پی کر بڑے بنے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر اور شعور دو بہت قریب کی چیزیں ہیں۔اور ایک ہی قبیلے کی چیزیں ہیں اور جب تک شعور بیدار نہ رہے شعر نہیں ہوتا۔اور شراب کے بارے میں تو یہ ہے کہ اگر تھوڑی زیادہ پی لی جائے تو پینے والا شخص سوچ کے قابل نہیں رہتا۔اور اگر کوٹے کے مطابق بھی پی لے تو بھی یہ تو ہو سکتا ہے کہ پینے والے کی زندہ دلی یا لطیفہ گوئی بڑھ جائے یا وہ جملہ بازی زیادہ کرنے لگے یا غم بھول کر ہنسی خوشی کی باتیں کرے۔لیکن شعر کہنا پینے کے بعد آسان نہیں ہوتا۔

میں یہ بات اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں خود پیتا رہا ہوں اور یقین جانئے کہ میں نے شراب نوشی کے عالم میں کبھی ایک شعر نہیں کہا۔ اگر کبھی کہنے کو بیٹھا ہوں تو اس وقت تو یوں لگا جیسے میں نے کاغذ پر آسمان کے تارے توڑ کر رکھ دیئے ہیں لیکن جب صبح اٹھ کر دیکھا تو وہ اشعار اتنے پھیکے ہوتے تھے کہ میں حیران ہوتا کہ رات کو تو اتنے اچھے نظر آ رہے تھے مگر اب یہ زیادہ اچھے نظر نہیں آ رہے ۔ مجھے بالآخر اس بات کی سمجھ آ گئی کہ پیئے ہوئے آدمی کو ایک معمولی سا چہرہ نظر آئے تو شراب اسے خوبصورت بنا کر پیش کرتی ہے اور ایک چیز کے حسن کو یوں ہی بڑھا دیتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو آپ کو ستارہ نظر آ رہا ہو در حقیقت وہ ایک کنکر ہو اور پھر اپنے شعر پڑھ کے اس وقت لگتا ہے کہ میں غالب سے آگے نکل گیا ہوں۔ اگر شراب پی کر شعر کہے جائیں تو نتیجہ یہی رہتا ہے۔ میں نے اختر شیرانی سے پوچھا تھا کہ آپ شعر کس وقت کہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یوں تو ہر وقت کہہ سکتا ہوں لیکن صبح جب میں جاگتا ہوں تو زیادہ تر اس وقت کام کے شعر ہو جاتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو بہت پینے والے تھے۔ وہ شاعر تو نہیں لیکن ایک بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کا تو عالم یہی تھا کہ صبح اٹھ کر شیو کر کے تیار ہو کر اچھا لباس پہنتے۔ ناشتہ کر کے لکھنے کے لیے بیٹھ جاتے۔ جتنا بھی ادبی کام ہوتا تھا وہ صبح آٹھ اور دس بجے کے درمیان کر لیتے اور اس کے بعد پینا شروع کر دیتے تھے اور نجانے کب تک پیتے چلے جاتے تھے۔ اس دوران وہ صرف ایک ہی کام کر سکتے تھے کہ اگر کسی فلم کمپنی نے کہانی پر بحث رکھی ہوتی یا مکالمے لکھنے ہوتے تو وہ کام کر لیتے تھے۔ لیکن ان کا سارا تخلیقی کام صبح اس وقت ہوتا تھا جب رات کا نشہ دور ہو چکا ہوتا تھا اور ابھی پینی شروع نہیں کی ہوتی تھی۔ انہی چند گھنٹوں کے دوران وہ تخلیقی کام کرتے تھے۔

ان کے علاوہ بھی اچھے خاصے پینے والے لوگوں سے بھی میں نے پوچھا تو ان کی کیفیت بھی میرے ہی جیسی تھی اور وہ بھی پی کر نہیں لکھ سکتے تھے۔ البتہ سگریٹ ایک ایسی چیز ہے کہ یہ لکھنے پڑھنے والوں پر سوار ہو جاتی ہے۔ سگریٹ یا حقہ پینا بھی ہمیں ایک روایت سے ملا ہے۔ شروع میں سنتے تھے کہ جب مولانا ظفر علی خان شعر کہتے ہیں تو ادھر حقے کا ایک کش لگاتے ہیں تو ادھر ایک شعر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو لکھوا دیتے ہیں۔ اور جتنے کش لگاتے ہیں اتنے شعر ہو جاتے ہیں۔

میں نے بہت بچپن میں سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ میرے جتنے دوست تھے سب سگریٹ پیتے تھے۔ لیکن جب پتہ چلا کہ اندر شعر کہنے کے کچھ جراثیم ہیں اور جب شعر کہنے لگا تو سن کر رکھا تھا کہ ظفر علی خان حقہ پی کر شعر کہتے ہیں تو حقہ تو ساتھ نہیں رکھا لیکن سگریٹ ساتھ رکھ لیے اور وہ ایسی عادت بنی کہ میں برابر پچاس تک سگریٹ پی کر شعر کہتا رہا اور میں لکھتے وقت Chain Smoker ہو جاتا تھا۔ اور رات کو دیر تک کام کرتا تھا۔ لیکن اگر کبھی رات کو گیارہ بجے کے قریب سگریٹ ختم ہو جاتے اور باہر جا کر کہیں سے سگریٹ نہ ملتے تو فکر اور تخلیق کا سلسلہ وہیں ختم ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شعر میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سگریٹ کہہ رہی ہے۔

چونکہ میں نے بہت بچپن میں سگریٹ نوشی شروع کی تھی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اعصاب خراب ہو گئے۔ ہاتھوں میں رعشہ جوانی ہی میں آ گیا۔ اب کم ہو گیا ہے پہلے زیادہ تھا۔ میں نے جب رعشے کا علاج بھی کروایا تو پتہ چل گیا تھا کہ یہ رعشہ نکوٹین کی وجہ سے ہے۔ سوچتا تھا کہ سگریٹ

ترک کرنے کا مطلب ہے شاعری ترک کرنا اور میرا تو گزر بسر ہی اس سے ہوتا تھا پھر بھی میں نے حوصلہ کر کے چار مہینے باقاعدہ سگریٹ ترک کئے رکھے۔اور اس عرصے میں ایک شعر بھی نہیں کہہ پایا جس کے بعد میں نے مجبوراً دوبارہ سگریٹ شروع کر دیئے۔

1986ء میں سینے میں گھٹن کا احساس ہوا۔گھٹن اس قدر بڑھی کہ اس سے آگے ایک قدم نہ اٹھا سکا۔وہیں پر بیٹھ گیا۔اس وقت میں اپنی بیٹی کے گھر سے اپنے گھر آرہا تھا اور دونوں گھروں کے درمیان چار پانچ فرلانگ کا فاصلہ ہے۔سانس بحال ہوئی تو پھر چلنا شروع کیا لیکن اسی طرح پھر گھٹن ہوئی اور پھر بیٹھنا پڑ گیا۔میں اس طرح بمشکل گھر پہنچا اور گھر آکر اپنے ایک دوست ڈاکٹر جہانگیر عالم کو فون کیا اور کہا کہ میں نے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔انہوں نے بلا لیا اور میں چلا گیا۔

انہوں نے میری کیفیت سن کر اور طبّی معائنہ کر کے کہا کہ یہ تو مجھے انجوائنا نظر آتا ہے۔پھر کہنے لگے کہ میں آپ کو خط لکھ دیتا ہوں۔آپ ڈاکٹر زبیر کے پاس جائیں وہ صحیح بتائیں گے۔میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے بھی معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ تو انجوائنا ہے۔انہوں نے کچھ ادویات لکھ کر دیں اور ریسٹ کرنے کا مشورہ دیا۔اور پندرہ دن کے بعد دوبارہ آنے کے لیے کہا۔انہوں نے کچھ پرہیز بھی بتائے لیکن سگریٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔شاید وہ سمجھتے ہوں کہ یہ سگریٹ نہیں چھوڑ سکے گا۔

اس دن میں نے فیصلہ کیا کہ اب سگریٹ چھوڑ دینے چاہئیں۔لیکن پھر خیال آتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کیا ہوگا اور بغیر لکھنے پڑھنے کے زندہ کیسے رہوں گا۔غرضیکہ ایک طرف مجھے موت پکارتی تھی اور دوسری طرف زندگی۔آخر میں نے زندگی کے حق میں فیصلہ کیا اور کسی نہ کسی طرح سگریٹ چھوڑ

دیئے۔

لکھنا پڑھنا تو کیا تھا۔ میں نے پندرہ دن تک پورا ریسٹ لیا۔ اس کے بعد جب لکھنے بیٹھا تو لکھا نہ جائے۔ میں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ شاعری چھوڑ دوں گا۔ اور پیسہ بدل کر کسی اور طریقے سے روٹی کما لوں گا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں کوشش کرتا رہا۔ آخر کوئی ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ذہن ساتھ دینے لگا اور میں سگریٹ کے بغیر بھی لکھنے پڑھنے لگا۔

مجھے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا حوصلہ اس لیے بھی ہوا کہ مجھ سے چھ ماہ پہلے احمد ندیم قاسمی صاحب بھی سگریٹ چھوڑ چکے تھے حالانکہ وہ بہت پرانے سگریٹ پینے والے تھے۔ اس کے بعد جو رعشہ کبھی ختم نہیں ہوا تھا وہ بڑی حد تک کم ہو گیا۔ اب میرے ہاتھ بالکل نہیں کانپتے۔ زبان کا ذائقہ جو سگریٹ نوشی کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا وہ بھی ٹھیک ہو گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ضمیر پر جو بوجھ تھا کہ روزانہ بیس روپے کے سگریٹ پی جاتا ہوں اور اتنا خرچ تو ہنڈیا پکانے پر نہیں آتا۔ چنانچہ ضمیر کے اس بوجھ سے بھی نجات مل گئی اور اب میں ایک نارمل آدمی کی طرح شاعری کر رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ شراب کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں لیکن سگریٹ کا کچھ تعلق ہے۔ جو آدمی سگریٹ یا حقہ پی کر شعر کہنے کا عادی ہو جائے تو اس کے لیے تمباکو نوشی بہت لازم ہو جاتی ہے اور اسے اس سے نجات بہت مشکل ملتی ہے۔

تخلیق کاروں پر شراب نے بہت برے اثرات کئے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جو لوگ بڑی احتیاط سے شراب پیتے ہیں وہ چالیس اور پنتالیس سال کی عمر کے دوران اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور اگر

اس عمر سے آگے بڑھ جائیں تو پھر وہ طبعی موت مرتے ہیں، ورنہ بیالیس اور چوالیس سال کے درمیان مرنے والوں کی لمبی فہرست ہے۔ان میں مجاز لکھنوی بھی شامل ہیں جو اس عمر میں شراب کے ہاتھوں فوت ہو گئے۔ گانے والوں میں کے ایل سہگل اسی عمر میں چلے گئے۔ میوزک ڈائریکٹروں میں شام سندر اسی عمر کے دوران وفات پا گئے۔اختر شیرانی نے بھی اسی عمر میں وفات پائی۔ شاد امرتسر بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن یہ ایک لمبی فہرست ہے۔

جو پینے والے اس عمر سے آگے بڑھ گئے ان میں سید عبدالحمید عدم، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے شامل ہیں۔ یہ فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ان میں جوش صاحب کچھ قاعدے سے پیتے تھے۔ان تینوں شعراء نے بڑی لمبی عمر پائی۔ لیکن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے اعتدالی سے پینے والے لوگ بیالیس اور چوالیس سال کی عمر کے دوران اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں اور اللہ کو کیا بلکہ شراب کو پیارے ہو جاتے ہیں۔

شراب کے ذکر کے سلسلے میں ہم غور کریں تو مارشل لاء کے دوران ضیاء صاحب کے سلسلے کے اسلام میں شراب نوشی کے خلاف بہت زور دیا گیا اور اس کی ممانعت پر بھی زور دیا گیا۔اگر شراب کی پاکستان میں بندش ہوئی تو وہ ذوالفقار علی بھٹو کے حکم سے ہوئی۔جب ان کا زوال آچکا تھا تو انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کیلئے جو دو چار قدم اٹھائے تھے اور جن میں ان کا مسلک شامل نہیں تھا ،ان میں سے ایک شراب پر پابندی بھی تھی۔ لیکن ہم اس چکر میں پڑے بغیر کہ انہوں نے شراب بندی کیوں کی۔ یہ مان لیتے ہیں کہ مکمل شراب بندی بھٹو صاحب نے کی۔اس پر بظاہر بہت عمل ہوتا

رہا لیکن چند روز پہلے میں نے " نوائے وقت " کا ایک نوٹ پڑھا جس میں لکھا تھا کہ ہمارے ملک میں جو شراب بنتی ہے اور جو غیر ممالک سے غیر قانونی طور پر سمگل ہو کر آتی ہے اس کے علاوہ ہماری حکومت نے دو کروڑ روپے کی شراب درآمد کی ہے۔ میں یہ پڑھ کر حیرت میں نہیں ڈوبا کیونکہ میں دورانِ پردہ باتیں جانتا ہوں کہ اس ملک میں شراب اسی طرح پی جا رہی ہے اور یہ شراب کون مہیا کرتا ہے یہ بھی سب جانتے ہیں۔ چھوٹے موٹے آدمی جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا وہ ضرور پکڑے جاتے ہیں لیکن استطاعت رکھنے والا حلقہ اسی طرح پیتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے یہ میرے بتانے کی بات نہیں۔

وہ لوگ جو شراب سے ڈر گئے تو وہ اب ہیروئن کی طرف چلے گئے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جو یقینی طور پر انسان کو قتل کر کے رکھ دیتی ہے۔۔۔ ہیروئن اور شراب سے بڑھ کر جس چیز کے خلاف مہم چلانی چاہیئے وہ تمباکو نوشی ہے۔ ہیروئن تو اکثر بھٹکے ہوئے لوگ پیتے ہیں اور یہ بہت مہنگی چیز ہے۔ اس طرح شراب بھی ایک مہنگی چیز ہے اور اس کا عام طور پر شام کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن سگریٹ تو لوگ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات سونے تک پیتے رہتے ہیں اور یہ وہ ہلکا زہر ہے جو آہستہ آہستہ پورے جسم میں سرایت کرتا رہتا ہے۔ یہ زہر کبھی تپ دق پر منتج ہوتا ہے تو کبھی کینسر پر۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو سگریٹ نوشی اعصاب کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور بینائی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

میں نے کبھی کسی مسجد میں کسی مولوی کو سگریٹ کے خلاف تقریر کرتے نہیں دیکھا بلکہ صوبہ سرحد میں تو کچھ مولوی حضرات منہ میں نسوار رکھ کر تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر میں عالم دین ہوتا مگر مولوی نہیں تو یہ برحق ہے کہ قرآن مجید میں شراب کی شدید ممانعت کا ذکر آیا ہے مگر میں

اپنے کام کا آغاز سگریٹ نوشی کے خلاف بات سے کرتا کیونکہ اس کے حلقہ اثر میں زیادہ لوگ ہیں اور پھر تمباکو جتنی قاتل چیز ہے شراب نوشی اتنی مہلک نہیں۔اور پھر ہیروئن کو میں تمباکو نوشی کے بعد دوسرے نمبر پر رکھتا اور شراب کے خلاف ان دونوں کے بعد ہی بات کرتا۔

آج پاکستان میں جس رفتار سے ہیروئن اور سگریٹ نوشی بڑھ رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ آئندہ دس پندرہ برس میں ہمارا ہیروئن بنانے والا طبقہ ہیروئن سمگل کرتے ہوئے اپنے ملک کی کثیر آبادی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔اللہ تعالیٰ اس ملک کو اس برے وقت سے بچائے۔ جس چیز کو کچھ جرائم پیشہ افراد نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ کہیں اس قوم کیلئے ذریعہ موت نہ بن جائے۔ہمارے شاعروں میں کچھ مثالیں موجود ہیں۔ساغر صدیقی مرحوم چرس سے شروع ہوئے تھے اور مشاعروں میں سے کچھ آمدن بھی تھی جس سے چرس خرید لیتے تھے لیکن یہ چرس بڑھتے بڑھتے مارفیا پر منتج ہوئی۔اور ہر وقت ان کے ہاتھ میں سرنج رہنے لگی۔وہ مارفیا کا ٹیکہ لگواتے رہتے تھے ادھر ان پر ازخود رفتگی کا دورہ شروع ہو گیا اور مشاعروں سے بھی غیر حاضر رہنے لگے۔فلم میں بھی گیت نگاری میں ان کی بڑی اچھی شہرت تھی مگر ادھر بھی نہیں گئے اور آخر یہ ہوا کہ انہوں نے تکیہ پکڑ لیا۔کالے کپڑے پہن لیے اور مارفیا تک پہنچے۔اس وقت چونکہ ہیروئن نہیں تھی اس لیے وہ مارفیا تک پہنچے۔اگر آج وہ ہوتے تو ہیروئن تک پہنچتے مگر ہمارے مذہبی حلقوں میں اس وقت بھی مارفیا کا کوئی ذکر نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔

شراب سے مراد شراب ہی نہیں بلکہ ہر وہ نشے والی چیز جو انسان کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے وہ بھی شراب ہے اور جس طرح ہم شراب کو حرام سمجھتے ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم باقی چیزوں کو بھی اسی طرح

حرام سمجھیں۔ مارفیا، چرس، ہیروئن اور سگریٹ سب ایک جیسی ہی چیزیں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سگریٹ بے ہوش نہیں کرتا لیکن اس کے پورے مضر اثرات کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسرے نشوں سے کم نہیں ہے۔

اب صاحب منبر کو چاہئے کہ ان چیزوں سے بھی وہی سلوک کریں جو وہ شراب سے کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جس چیز کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے اور جو اس زمانے میں موجود نہیں تھی اسے یہ مضر چیزوں سے خارج کر دیں۔ یقیناً یہ بھی سب شراب ہی کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ بلکہ شراب سے بھی زیادہ مضر چیزیں ہیں۔

ساحر لدھیانوی ایک ایسا نام ہے جو از سر تا پا کشش ہی کشش ہے۔ ادب سے لے کر فلم تک جتنی شہرت، نام اور مرتبہ ساحر نے حاصل کیا وہ قابل رشک ہے۔ ساحر کے بارے میں لوگ اور تو بہت جانتے ہیں لیکن کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور وہ محض افواہوں کی حد تک ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ مضامین ایسے چھپے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر مردانہ اوصاف سے محروم تھا۔ بظاہر اس کی زندگی یوں ہی سمجھ لیجئے کیونکہ مرتے دم تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی جبکہ فوت ہوتے وقت اس کی عمر تقریباً پینسٹھ برس تھی۔ چنانچہ اس کے بارے میں ایسے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ پھر اس کے دوستوں نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بھی اس کی تصدیق کرتا تھا۔ لیکن میں اس کے آگے کی کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں کیونکہ ساحر میرا بہت عزیز،

قریبی اور بے تکلف دوست تھا اور مجھ سے وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتا تھا جو اوروں سے نہیں کہتا تھا۔ اور مجھے اس پر فخر ہے۔

جس وقت ساحر ممبئی چھوڑ کر اور لدھیانہ کے مہاجرین کیمپ سے اپنی والدہ اور نانی کو لے کر لاہور پہنچا تھا تو اس وقت اس سے میری قربت شروع ہوئی تھی ورنہ پہلے ایک دو خطوں کے تبادلے کے سوا ہمارے تعلقات نہیں تھے۔ یہاں آنے کے بعد شروع شروع میں ساحر کیمونسٹ پارٹی کے دفتر کی بالکل بالائی منزل پر ایک برساتی نما کمرے میں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرا تھا۔ یہ وہی بلڈنگ ہے جس میں بعد میں روزنامہ ''کوہستان'' کا دفتر بھی قائم ہوا تھا۔ یہ 1947ء کے آخر کی بات ہے۔ جب وہ یہاں آکر ٹھہرا تو اس کی ماں کے پاس کچھ زیورات اور نقدی تھی۔

اسے بہت سی توقعات تھیں کہ پاکستان میں آکر ساحر کا نام بہت آگے بڑھے گا۔ نام کی حد تک فیض صاحب اور قاسمی صاحب کو چھوڑ کر نوجوانوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی شہرت اور مقبولیت کو پہنچے۔ وہ کچھ عرصہ اس سٹور نما کمرے میں اپنے گھر والوں کے ساتھ مقیم رہا۔ اس کے بعد اسے ایبٹ روڈ ایک مکان کا حصہ الاٹ ہوا جس میں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ روزگار کی کوشش کرنے لگا۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ایک بزرگ جو رواداری کے لیے بڑے مشہور تھے وہ اپنی ذات کے حوالے سے اس کیلئے مضر بھی ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں پاکستان ٹائمز اور امروز دو پرچے پروگریسو پیپرز کی جانب سے نکلے جن کے مالک میاں افتخار الدین تھے۔ ان حالات میں جہاں بہت

سے دوسرے افراد کو روزگار کے مواقع میسر آئے وہاں خیال تھا کہ ساحر کو بھی کوئی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن اخبار کے چیف ایڈیٹر چراغ حسن حسرت تھے۔ وہ بڑے مشفق آدمی تھے اور ان کے دل میں ساحر کے بارے میں ایک گانٹھ پڑی ہوئی تھی۔

حسرت کی ایک غزل اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ جو یہ تھی

عارض ور خسار کی باتیں کریں

آؤ حسن یار کی باتیں کریں

سہل الممتنع میں یہ ایک بہت اچھی غزل تھی۔ ساحر کی عادت تھی کہ وہ جس کو پسند کرتا تھا اسی زمین میں اپنے انداز کی بات کر جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس زمین میں یہ غزل کہی

اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اس نے انگریز کے خلاف اپنی اس غزل میں باتیں کی تھیں۔ میرے خیال میں یہ اس آدمی کو TRIBUTE ہوتا ہے جس کی زمین میں غزل کہی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر Parody کہی جائے تو بھی وہ سمجھتا ہے کہ میری غزل مقبول ہے جو اس زمین میں غزل کہی جا رہی ہے اور وہ خوش ہوتا ہے۔ لیکن چراغ حسن حسرت کے دل میں ساحر کی اس جرأت کے بعد ایک گانٹھ پڑی ہوئی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ساحر نے ان کی غزل کو بگاڑا ہے۔ چنانچہ جب ساحر کا نام آیا تو انہوں نے اسے ملازمت دینے سے انکار کر دیا جس پر وہ بہت دلبرداشتہ ہوا کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی جگہ ملازمت کے سلسلے میں ناکامیاں ہو چکی تھیں۔ اسے اس سے پہلے ایک سہ ماہی پرچے ''سویرا'' میں ملازمت ملی تھی لیکن اس کے پیسوں سے تو اس کا جیب خرچ بھی نہیں چلتا تھا۔ پھر ان دنوں جو

مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی اس کے اخراجات کے لئے ناکافی تھے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد اسے بہت صدمہ ہوا اور اسی دوران اس کے ماموں نے انڈیا میں اسے واپس بلوا لیا جس کے بعد اس نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی لاہور میں جب ساحر پہلے رہتا تھا تو امرتا پریتم بھی یہیں رہتی تھیں۔ امرتا پریتم نہایت خوبصورت لڑکی کے طور پر اس زمانے میں مشہور تھی اور ان کے یکطرفہ طور پر چاہنے والے بہت سے تھے۔ وہ بڑے گھر کی بھی تھیں اور پڑھی لکھی بھی تھیں پھر ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ بھی تھیں۔ چنانچہ ان کے بہت سے چاہنے والے پیدا ہو گئے۔ اور ساحر بھی ان میں سے ایک تھے لیکن اس کی خوبی یہ تھی کہ امرتا پریتم بھی اسے چاہتی تھی اور اس کے انتظار میں رہتی تھی۔

امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی کے بارے میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ان کے مراسم عام حدود سے آگے پہنچ چکے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔ اس بارے میں آگے چل کر لوگوں کو اور شبہات اس لیے پیدا ہوئے کہ امرتا پریتم کے ایک بیٹے کی شکل ساحر پر ہے۔ امرتا پریتم نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے کہ ''ممی مجھے لڑکے پوچھتے ہیں کہ کیا تم ساحر انکل کے بیٹے ہو۔ کیونکہ تمہاری شکل ان پر ہے۔'' تو میں اسے کہتی ہوں کہ اگر تم ساحر انکل کے بیٹے ہوتے تو میں تمہیں سچ کہہ دیتی۔ تم ساحر کے بیٹے نہیں ہو۔ میرے ساتھ یہ ہوا کہ ساحر میرے تصورات پر چھایا ہوا تھا اور ہر وقت میرے تصور میں اس کی تصویر رہتی تھی اس لیے تمہاری شکل ان پر ہے۔'' جی چاہتا ہے کہ ان کی اس بات کو مانا جائے لیکن یہ بڑی غیر سائنسی بات ہے۔

امرتا پریتم کی بات اپنی جگہ۔ لیکن سائنس اس چیز کی نفی کرتی ہے کہ اگر کوئی تصورات پر چھایا ہو تو

بچے کی شکل اس پر ہو گی۔ میں یہ بات ان لوگوں کے حوالے سے کہہ رہا ہوں ہمارے اس طرح کی بات کی نفی کرتے ہیں۔ ایک بہت پڑھے لکھے ہندو نے مجھ سے کہا کہ ہمارے ہر ایک گھر میں کرشن جی مہاراج کی تصویر لگی ہوتی ہے اور تصویر بھی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ کرشن جی مہاراج کی تصوراتی تصویر بناتے بناتے ایک ایسا شاہکار بن چکا ہے کہ دنیا میں ایسا خوبصورت مرد کہیں بھی نہیں ہے۔اور کرشن جی عورتوں کے تصورات پر چھائے بھی رہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ان کا عقیدہ شامل ہوتا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بچے کی تصویر وہ بنتی ہے جو ذہن پر چھایا رہے تو ہندو گھروں میں نوے فیصد بچوں کی شکل کرشن جی مہاراج پر ہونی چاہیے۔

یہ ایک پڑھے لکھے ہندو کا کہنا ہے۔اب ایک طرف امرتا کا بیان ہے جو کہ بڑی دلیر خاتون ہیں اور ان کی بات ماننے کو جی چاہتا ہے۔ دوسری طرف یہ سائنسی بات ہے جسے بھی رد نہیں کیا جا سکتا لیکن میں یہ تمہیں اس لئے باندھ رہا ہوں کہ میں ساحر کے بارے میں اس بات کی تردید کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مردانہ اوصاف سے محروم تھا۔

ایک تو امرتا پریتم کے بیٹے کی شکل ساحر کے بارے میں اس بات کو شبے میں ڈالتی ہے دوسرا ساحر کے بارے میں میرا یہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ دسمبر 1947ء میں ساحر ایبٹ روڈ پر رہتے تھے جبکہ میں رائل پارک میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ چندر کانتا رہتی تھیں جن کا نام میرے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ ساحر ایبٹ روڈ پر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے دونوں کے مکانوں میں فاصلہ بمشکل آدھے فرلانگ کا تھا۔ اس زمانے میں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور لوگ اکثر پیتے تھے اور ایک دوسرے کے ہاں اکثر پروگرام بنتا تھا۔

ایک دن ساحر میرے ہاں آئے اور یہاں پینے کا پروگرام بنا۔ ساحر نے دو پیگ لیے اور کہنے لگے " اگر میں اس سے زیادہ پیوں تو مجھے نیند آجاتی ہے۔ اس لیے میں اور نہیں پیوں گا" میرا ابھی یہی معاملہ تھا میں تو اور لوگوں کا ساتھ دیتا تھا۔ اس دن میں نے ساحر سے کہا" ایک پیگ اور پی لو اگر نیند آئی بھی تو ساتھ ہی تو تمہارا گھر ہے چلے جانا "کہنے لگا" مجھ سے نہیں اٹھا جاتا" میں نے کہا" یہ بھی تو تمہارا گھر ہے اس لیے یہاں سو جانا"۔ کہنے لگا اچھا اور پھر اس نے ایک پیگ اور لیا۔ واقعی وہ پیگ پینے کے بعد وہ اونگھنے لگا۔ اور کہنے لگا" مجھے پاجامہ دو کیونکہ میں کپڑے بدل کر سونا چاہتا ہوں" اس نے کھانا بھی نہیں کھایا بلکہ صرف پینے کے دوران ہی کچھ Snacks لیے۔ اور سو گیا۔

صبح میں اٹھا تو دیکھا کہ ساحر نہیں ہے۔ ساحر اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ہاں سو چکا تھا اور سوتے ہوئے میں کئی بار مردانگی کے عام آثار اس میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جو معاشقہ بھی کیا وہ کبھی وصال تک نہیں پہنچا۔ انہی دنوں اس کا یہاں ایک مسلمان لڑکی سے معاشقہ ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہ راتیں بھی گھومتا تھا۔ اور ان کی خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور ایک امیر گھرانے سے تھی لیکن جب دونوں کی قربت ہونے لگی تو ساحر وہاں سے بھاگ گیا۔ میرے ذہن میں ساحر کے یہ سب واقعات تھے اور ساتھ ہی ذہن میں اس کے بارے میں شہور یہ افواہیں بھی تھیں کہ وہ مردانہ اوصاف سے محروم ہے۔

چنانچہ اس روز جب میں صبح اٹھا اور دیکھا کہ وہ نہیں ہے تو میں نے کپڑے ڈھونڈے جو وہ رات کو پہن کر سویا تھا۔اس کے اپنے کپڑے بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ کچھ دیر بعد جھاڑو دینے والی لڑکی آئی تو اس نے صفائی کے دوران کہا کہ چارپائی کے نیچے پاجامہ پڑا ہے۔میں نے وہ اٹھایا تو دیکھا کہ وہ خراب ہوا تھا۔گویا خواب کی کیفیت میں جو مرد کو ہوتا ہے وہ ہوا تھا۔اس کے بعد میں نے حکیم نیئر واسطی سے پوچھا کہ ”کیا نامرد آدمیوں کو احتلام ہوتا ہے“ انہوں نے کہا کہ نہیں ہوتا۔میں نے کہا ”ساحر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نامرد ہے لیکن میرے گھر میں رات یہ واقعہ ہوا ہے“ تو وہ کہنے لگے کہ پھر وہ نامرد نہیں ہے بلکہ ٹھیک ہے۔

جب ساحر ممبئی چلا گیا تو پتہ چلا کہ وہاں ایک نئی گلوکارہ سدھا ملہوترا سے اس کے مراسم کافی بڑھے لیکن پتہ چلا کہ آخر میں یہ معاملہ ٹوٹ گیا۔اس کے بعد ساحر کا لتا سے سلسلہ مشہور ہوا اور پھر پتہ چلا کہ وہ معاملہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس دوران برابر اس کی ہجر و وصال کی نظمیں بھی ہو رہی ہیں اور ساتھ یہ بھی کہ

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس نے یہ شعر اس طرح کہا جیسے درمیان میں سماج آگیا تھا۔حالانکہ کوئی سماج درمیان میں نہیں آیا تھا بلکہ یہ خود ہی بھاگ جاتے تھے۔

ساحر لدھیانوی ممبئی جب جاتا تو سدھاہی کے گھر ٹھہرتا تھا۔ وہاں میں نے اس سے کہا " چند لوگ ایسے ہیں جن سے میرا انداز مخاطب "تو" ہے۔ میں انہیں تو کہتا ہوں اور وہ بھی مجھے تو کہتے ہیں۔ ورنہ میں اپنے سے چھوٹے کو بھی آپ کہہ کر بلاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ تمہاری زندگی میں تو کوئی عورت آئی ہی نہیں ہے"

کہنے لگا" بھائی چھوڑو اس بات کو، میری زندگی میں کوئی لڑکی آئی تھی" اس کا تکیہ کلام بیر (بھائی) تھا، اور مجھے بھی اکثر بیر کہہ کر بلاتا تھا اور میرے ساتھ پنجابی ہی میں بات کرتا تھا۔

میں نے کہا" اگر کوئی تمہاری زندگی میں بھی آئی ہے تو اس طرز زندگی کو چھوڑو۔ کیونکہ تمہاری ماں مجھ سے کہتی ہے کہ اسے کہو شادی کرے۔ اور تم معاشقے کر کے بھاگ جاتے ہو"

وہ کہنے لگا" میں یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ میرے مراسم کس کے ساتھ رہے ہیں کیونکہ یہ بہت بُری بات ہے۔ آپ کا ذہن بھی اسی طرف جائے گا" لیکن اس نے اپنی زبان سے اس کا نام نہیں لیا۔

کہنے لگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور واقعہ بھی ہو گیا تھا لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔

میں نے کہا" یہ میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک ہو۔ مگر دوسری بات بتاؤ۔"

کہنے لگا" اب میں جب بھی کسی عورت کے بارے میں سوچتا ہوں کہ میں ایک مرد کی حیثیت سے اسے ہاتھ لگاؤں گا تو مجھے لگتا ہے کہ میں پگھل کر گر جاؤں گا۔ مجھ میں حوصلہ ہی نہیں ہے۔ مجھے پسینے آجاتے ہیں اور میں بے ہوش ہو جاتا ہوں"

میں نے کہا" اس کا علاج کروانا تھا"

کہنے لگا" علاج بھی کرواتا رہا ہوں"

میں نے کہا" نفسیاتی علاج کروانا تھا"

کہنے لگا" اس میں میں بہت بدنام ہو جاؤں گا"

میں نے کہا" اس طرح بھی تو بدنام ہو رہے ہو کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نامرد ہو"

کہنے لگا" کہنے دو۔اب تو بہت سی زندگی گزر گئی ہے اور جو اور ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی"

تو اصل ساحر یہ ہے۔وہ ذہنی نامردی کا شکار تھا۔اور نفسیاتی طور پر نامرد تھا۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک تھا اور میں نے اس کی جو پچھلی باتیں بتائی ہیں۔انہیں ذہن میں رکھیں۔

شوقیہ جھوٹ بولنے والے

ابراہیم جلیس بھی میرے ان بے تکلف دوستوں میں سے تھے جن سے نہ میرا کچھ چھپا ہوا تھا اور نہ ان کا کچھ چھپا ہوا تھا۔زوال حیدر آباد کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تھے تو جن دوستوں سے ملنے کی انہوں نے خود خواہش کی تھی ان میں سے ایک میں بھی تھا۔انہوں نے آتے ہی میری اس نظم کا حوالہ دیا جو میں نے مہاتما گاندھی پر کہی تھی اور جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھی اور اخبارات و رسائل میں بھی چھپی تھی۔ انہوں نے میری اس نظم کی بہت تعریف کی۔پھر یہاں وہ چونکہ اکیلے تھے اور ہوٹل میں رہتے تھے اس لیے میری طرف آتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں میرے جتنے بھی غیر شادی شدہ یا اکیلے دوست تھے ان کی میرے گھر پر محفل جمتی تھی اور ہفتے میں ایک بار میرے ہاں ان سب کیلئے کھانا ہوتا تھا۔ابراہیم جلیس اس میں پیش پیش ہوتے تھے۔بعض لوگ شوقیہ جھوٹ بولنے والے ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں میں ابراہیم جلیس کا کوئی

جواب نہیں تھااور بے تکان شوقیہ جھوٹ بولتے تھے اور جب انہیں ٹوک دیا جاتا تو کہتے اچھا میں نے یہ کہا تھا۔اس طرح ایک بار انہوں نے کہا کہ میرے والد نے حیدر آباد سے خط لکھا ہے کہ تم واپس آجاؤ اور میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دوں گا اور باقی بیٹوں کو عاق کر دوں گا۔ تو میں نے کہا کہ آپ کب واپس جا رہے ہیں تو کہنے لگے کہ جانا کسے ہے:

کون جائے ذوق اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اور قہقہہ لگایا۔ کوئی غم کی بات ہوتی یا خوشی کی وہ قہقہہ لگاتے تھے۔ ہم نے کہا کہ نہیں آپ چلے جایئے نجانے آپ کے والد کو کیا تکلیف ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا آپ کہتے ہیں تو چلے جاتا ہوں کیونکہ آپ میرے ساتھ بہت مخلص ہیں۔ جب اس بات کو ڈیڑھ دو ماہ گزر گئے تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ حیدر آباد کب جا رہے ہیں تو کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ نے ذکر کیا تھا کہ والد نے کوئی خط بھیجا ہے جس میں جائیداد کا کوئی ذکر کیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے آپ سے یہی کہا تھا کہ والد نے خط میں لکھا ہے کہ تم لاہور ہی میں بیٹھے رہو۔ وہاں ٹھیک ہے اور یہاں جائیداد سنبھالنے والے تمہارے بھائی بڑے لائق ہیں۔ میں نے کہا آپ نے کہا تھا کہ والد نے لکھا ہے تم آجاؤ باقیوں کو عاق کر دوں گا۔ اور تمہیں مختار عام بنا دوں گا۔ قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ میں نے یہ کہا تھا تو پھر یہی بات ہو گی اور کتابت کی غلطی ہو گی، آپ اسے ٹھیک کر لیجئے۔ لیکن تازہ خبر یہی ہے جو آپ کو اب بتا رہا ہوں۔ اس قسم کی باتیں وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔

ایک دن بہت اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں گیا تو کہنے لگے کہ گھر سے یہ خط آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ بیوی قریب المرگ ہے اور اس کے ساتھ ہی زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے کہا کہ بیوی قریب

المرگ ہے اور آپ قہقہہ لگا رہے ہیں ذرا خط تو دکھایئے۔ میں نے خط اٹھا کر پڑھا تو اس میں بیوی کی بیماری یا قریب المرگ ہونے کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ان کے اس طرح جھوٹ بولنے کی وجہ کوئی بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انہوں نے کچھ عادتیں لطیفے کے طور پر راسخ کر رکھی تھی اور ان کا سوائے اس کے اور کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ جب یہاں سے کراچی چلے گئے تو ایک بار کوئی دوست وہاں گئے۔ کہنے لگے کہ کب آئے آپ؟ اس نے جواب دیا کہ کل آیا ہوں۔ پھر پوچھا کہ کب جانا ہے۔ وہ کہتا منگل کو تو کہنے لگے کہ اوہ ہو۔ بدھ کو تو میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح پھر قہقہہ لگانے لگے۔ دو چار بار میرے ساتھ بھی یہ واقعہ ہو چکا تھا۔

ایک بار میں اور احمد ندیم قاسمی صاحب ایک ساتھ وہاں گئے تو میں نے راستے ہی میں قاسمی صاحب کو بتا دیا تھا کہ ابراہیم جلیس اس طرح دعوت کی بات کریں گے اور آپ دیکھئے کہ آج میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انہوں نے اسی طرح قہقہہ لگا کر باتیں شروع کیں اور پھر کہنے لگے کہ جانا کب ہے۔ میں نے کہا قاسمی صاحب آپ ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو ہمیشہ گلہ ہوتا ہے کہ جس دن آپ دعوت کرنا چاہتے ہیں ہم اس سے ایک ایک دن پہلے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اس بار فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ جس دن آپ دعوت کریں گے تو اس سے اگلے دن ہی ہم جائیں گے۔ قہقہہ مار کے کہنے لگے کہ وہ ظالم مار دیا۔ میں نے کہا کہ آپ بتائیں کہ کس دن آپ دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے تو آپ دعوت کے بارے میں سنجیدہ ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ سنجیدہ نہیں ہو گئے بلکہ اس بار لاہور ہی سے سنجیدہ ہو کر آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ چلو آج ہی

کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں یقین نہیں۔ اس وقت انہوں نے ایک سو روپے کا چیک کاٹ کر دیا۔ اس زمانے کے لحاظ سے ایک سو روپیہ بہت تھا۔ میں نے کہا کہ اب چلئے "نگار" کے دفتر میں الیاس رشیدی کے پاس چلتے ہیں جہاں آپ ملازمت کرتے ہیں اور وہاں سے یہ چیک کیش کرواتے ہیں۔ کیا پتہ کہ شام کو کھانے کے پیسے تو ہم دے دیں اور اگلے دن یہ چیک ڈس آنر ہو جائے۔ تو قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ آپ واقعی یقین نہیں کرتے۔ میں نے کہا ہم واقعی یقین نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم "نگار" کے دفتر گئے اور الیاس رشیدی سے ان کے چیک کے بدلے میں ایک سو روپیہ وصول کیا۔ اور اسے بھی رات کے کھانے میں اپنے ساتھ شریک کیا۔ ایک دو دوسرے دوستوں کو بھی اس کھانے میں شریک کیا اور سب کو ان کا یہ واقعہ سنایا۔ سب کہنے لگے کہ جلیس صاحب آپ کو پہلے ایسا کوئی آدمی نہیں ملا ہو گا۔ اس لیے اب آپ اپنے اس مذاق کو بدل دیجئے۔ کیونکہ لوگوں کو آپ کی اس عادت کا پتہ چل چکا ہے۔ چنانچہ جلیس صاحب بعض باتیں محض مذاق کے طور پر کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کی ایک سنجیدہ زندگی بھی شروع ہوئی۔ جب پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو انہوں نے "عوامی عدالت" کے نام سے ایک پرچہ چلایا۔ لیکن بھٹو صاحب کے زوال کے بعد اس پرچے پر جو بیتی اور ان کے اپنے اوپر جو تشدد ہوا اس کے نتیجے میں یہ دل کے مریض ہو گئے۔ ان کے ہونٹوں پر قہقہے تو بدستور ہوتے تھے لیکن یہ بجھے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کے بعد ایک دن پتہ چلا کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔

ہمارے شوقیہ جھوٹ بولنے والے دوستوں میں ظہور نظر کا بھی جواب نہیں تھا۔ وہ بھی جب بہاولپور سے لاہور آتے تھے تو تازہ بتازہ جھوٹ اپنے ساتھ لے کر آتے تھے اور اس وثوق سے بات سناتے تھے کہ آدمی کو یقین آجاتا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک یہ جھوٹ سنایا کہ یار لاہور کے دوست بھی بڑے یہ وہ ہیں۔ سلام مچھلی شہری یہاں آیا تھا اور کسی نے اسے لفٹ ہی نہیں کروائی اور وہ یہاں سے سیدھا بہاولپور میرے پاس چلا آیا اور وہاں پورا ایک مہینہ میرے پاس رہ کر اب وہ واپس گیا ہے لیکن لاہور کے سب دوستوں کے ساتھ بہت ناراض واپس گیا ہے۔ اور میں اسے اب ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر آیا ہوں۔ وہاں سے وہ کراچی جائے گا اور کراچی سے بحری جہاز کے ذریعے آگے جائے گا۔ سب نے پوچھا کہ کب آیا تھا یہاں تو بالکل نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ چھوڑو یار ایک تو سب لوگوں نے اس کی بے عزتی کی اور دوسرا یہ کہتے ہو کہ یہاں تو بالکل نہیں آیا تھا۔ پھر اس کی باتیں سنانے لگے کہ بہاولپور میں اس کے قیام کے دوران ہم نے اس کے اعزاز میں متعدد دعوتیں کیں۔ تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا۔ خبریں تو کافی چھپی تھیں۔ سب دوستوں نے حیرت کا اظہار کیا پھر مجھے کہنے لگے کہ وہ کہتا تھا کہ قتیل سے تو میں زندگی بھر بات نہیں کروں گا۔ میں اس کے بارے میں بڑی آس لے کر آیا تھا کیونکہ سنا تھا کہ وہ بڑی محبت کرنے والا آدمی ہے۔ لیکن اس نے تو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ ظہور نظر صاحب کیوں جھوٹ بولتے ہیں یہاں تو ہم نے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی۔ کہنے لگے کہ یار ایک تو تم لوگ اخبار بھی نہیں پڑھتے ہو۔ اس کے بارے میں سب خبریں باقاعدہ چھپتی رہی ہیں اور میرے پاس بہاولپور میں سب اخبارات کے تراشے پڑے ہیں اور جب واپس جاؤں گا تو آپ لوگوں کو یہ تراشے بھیجوں گا۔ پھر کہنے لگے کہ وہ

بہاولپور کے شہزادگان سے تو بہت خوش گیا ہے کیونکہ انہوں نے خوب دعوتیں کی تھیں اور تحائف بھی دیئے لیکن لاہور والوں سے خوش نہیں تھا اور اب جب ہم لاہور آئے تو میں نے کہا کہ یہاں بھی کچھ دن دوستوں کے پاس رکتے ہیں تو وہ کہنے لگا کہ میں لاہور والوں پر لعنتیں بھیجتا ہوں۔ چنانچہ میں اسے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ پھر کہنے لگے کہ انہوں نے وہاں آ کر مجھے یہ یہ نظمیں سنائیں اور میں نے یہ یہ اصلاح دی۔ ہم بہت سٹپٹائے۔ لیکن جب تصدیق کی تو پتہ چلا کہ ظہور نظر صاحب سب جھوٹ کہہ رہے تھے اور وہ تو یہاں آئے ہی نہیں۔

ظہور نظر کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ نقلیں بہت اچھی اتارتے تھے اور شاعروں، مولویوں اور لیڈروں کی نقلیں ہو بہو اتارتے تھے۔ کبھی عطاء اللہ شاہ بخاری کی نقل اتارتے تو کبھی ظہیر کاشمیری کی اور کبھی بہاولپور کے کسی امام مسجد کی۔ ان کی نقلیں الفاظ میں تو ادا نہیں ہو سکتیں لیکن یہ سچ ہے کہ جس کی نقل اتارتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہو بہو وہ آدمی ہمارے سامنے موجود ہے۔ مولویوں کی نقلیں اتارنے میں انہیں خاص مہارت تھی اور آخر کار انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ گیا۔ شاعر تو زندہ دل آدمی تھے سب برداشت کر لیتے تھے لیکن مولویوں کی نقلیں انہیں مہنگی پڑیں۔
عطاء اللہ شاہ بخاری بھی مولوی تھے اور ایک بڑے آدمی تھے جو خود اپنے ساتھ بھی مذاق کر لیتے تھے انہوں نے ایک بار ظہور نظر کو سامنے بٹھا کر خود ان سے اپنی نقل سنی۔ لیکن مولوی یہ بات کہاں برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کی نقل اُتارے چنانچہ انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور وہ یوں کہ ان کی فیملی کے بہت سے لوگ احمدی ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب احمدیوں کی اتنی مخالفت نہیں تھی

جتنی آج ہے۔ اب ظہور نظر ایک سیدھے سادے پروگریسو آدمی ہیں، بلکہ پروگریسو سے بھی آگے کی چیز ہیں اور پورے لیفٹسٹ ہیں۔ یہ نہ تو سنی ہیں نہ شیعہ، نہ احمدی نہ کچھ اور۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ وہ کم از کم احمدی نہیں تھے۔ لیکن ان کے بارے میں مولویوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ شخص مولویوں کی اس لیے تضحیک کرتا ہے کیونکہ یہ احمدی ہے۔ بہاولپور کی ادبی سرگرمیاں انہی کی وجہ سے ہوتی تھیں۔ وہاں ایک مشاعرہ ہوا اور ظہور نظر پڑھنے کیلئے اٹھے تو درمیان سے گڑبڑ کی کچھ آوازیں آئیں۔ یہ بہت دلیر آدمی تھے لیکن اس وقت چپ ہو گئے۔ مگر جوں جوں یہ کلام پڑھتے رہے توں توں آوازیں آتی رہیں۔ آخر انہوں نے کلام روک کر کہا کہ کیا بات ہے اور تم لوگ بک بک کیوں کر رہے ہو۔ اور جن لوگوں کے تم ایجنٹ ہو ان کی بھی ایسی تیسی اور تمہاری بھی ایسی تیسی۔ پھر کہا کہ مجھے جو ہونے کا تم کہتے ہو ان کی بھی ایسی تیسی۔ میں وہ نہیں ہوں۔ اس طرح انہوں نے اپنے بارے میں احمدی ہونے کی تردید کر دی، لیکن مولویوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور جب وہ فوت ہوئے تو مولویوں نے دو دن تک ان کا جنازہ نہیں پڑھنے دیا۔ حالانکہ وہ بہت شگفتہ دل تھے۔

میرے ابتدائی یا کچے گیتوں کا پہلا مجموعہ ”ہریالی“ بہاولپور ہی سے چھپا تھا۔ وہاں عباسیہ اکیڈمی کے نام سے ایک پبلشنگ ادارہ تھا جس کی طرف سے حیات ترین ”ستلج“ رسالہ بھی نکالتے تھے۔ وہ میرے بہت پیارے دوست تھے۔ ان سے مراسم بہت بڑھ گئے۔ 1950ء کے لگ بھگ وہاں کے رئیس الرؤسا حسن محمود صاحب سیاست میں اترے تو انہوں نے حیات ترین سے رابطہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے ادیبوں شاعروں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ چنانچہ پہلے تو انہیں اخبار نکالنے کیلئے سرمایہ دیا۔ چنانچہ وہ لاہور آئے اور رائل پارک میں اخبار کا دفتر بنایا۔

انہوں نے بہت سارو پیہ حیات ترین کے سپرد کیااور کہاکہ لاہور کے اخبار والوں سے رابطہ کر کے کہو کہ وہ پریس کو میرے حق میں کر دیں اور میرے مخالف کے بیانات ذرا کم شائع کریں۔ یہ میری زندگی کا پہلااور آخری تجربہ تھاکہ پریس والوں کو رشوت کیسے دی جاتی ہے۔ حیات ترین کالاہور میں سب سے اچھا دوست میں ہی تھااور میرے تعلقات سب سے تھے۔ تو مجھے انہوں نے کہاکہ یہ کام میرے سپرد ہوا ہے اور میں یہاں پر اجنبی ہوں۔ اس لیے آپ میری معاونت کریں۔ اور ساتھ یہ بھی کہاکہ یہ کام ہے بھی جائز جیساکہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس کا کام جائز ہے۔ اور کہاکہ دوسرا فریق بہت کمینہ ہے جبکہ حسن محمود بہت شریف آدمی ہے۔ چونکہ مخالف فریق بااثر ہے اور جھوٹے الزامات لگاتا ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ وہ ذرا ٹھنڈا رہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ اور اس نے مجھے اس طرح اس بارے میں بریف کیاکہ میرے منہ میں بھی اس کے الفاظ ہی آگئے اور پھر مجھے کہنے لگاکہ یہ پیسے آپ رکھئے اور جو کسی کی چائے پانی کی خدمت کرنی ہو وہ بھی آپ ہی کیجئے۔ میں نے کہاٹھیک ہے۔ چنانچہ سب پرچوں میں میرے جتنے بھی جاننے والے تھے اور جو لگو بھی اس معاملے میں مددگار ہو سکتے تھے میں نے جاکر ان سب کو ان گنہگار ہاتھوں سے پیسے دیئے اور ساتھ وہ سب کچھ بھی کیاجو مجھے کہاگیا تھا۔ اور تاکید کی کہ ان کے خلاف جو بیانات ہیں وہ شائع نہ کریں کیونکہ ان کا مخالف فریق بہت کمینہ ہے اور یہ آپ کا ہدیہ ہے۔

آج بھی ان صحافیوں میں سے بہت سے لوگ زندہ ہیں۔ البتہ کچھ مر چکے ہیں۔ ایک مرحوم صحافی جو لیڈر بھی تھے میں ان کے پاس بہت ڈرتے ڈرتے گیااور کہاکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ تو بہت مجاہد آدمی ہیں آپ سے تو گفتگو کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے لیکن ایک حق کی بات لے کر آپ کے پاس آیاہوں

کیونکہ آپ حق کے علمبردار ہیں اور پھر انہیں حسن محمود کے بارے میں ساری بات اسی طرح کہی اور کہا کہ ان کا مخالف بڑا کمینہ آدمی ہے اور انہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے آپ ذرا مہربانی کیجئے۔ پھر کہا کہ آپ کے پرچے کی حالت آج کل بہت کمزور ہے اس لیے آپ ان کی طرف سے یہ پانچ ہزار روپے کا ہدیہ قبول کیجئے۔ اسے کچھ اور نہ سمجھئے بلکہ یہ آپ کے پرچے کی مدد کیلئے ہے۔ پانچ ہزار روپیہ اس زمانے میں بہت تھا جب میں نے سب صحافیوں کو پیسے پہنچادیئے تو مجھے بھی حق المحنت کے طور پر بہت پیسے ملے۔ گویا اگر میں نے یہ حرام کام کیا تھا تو اس میں رزق حرام مجھے بھی ملا تھا۔ آج بھی جب میں اس واقعہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہنستا ہوں کہ میں نے یہ رقم اسی طرح لی تھی جیسے واقعی حق المحنت ہو اور کام بھی اس طرح کیا تھا جیسے واقعی میں کوئی جائز کام کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے دوست حیات ترین نے مجھے Convince کر لیا تھا کہ بات حقیقتاً یہی ہے۔ لیکن بعد کے آنے والے واقعات سے پتہ چلا کہ جو انہوں نے کہا وہ سراسر ایک داستان تھی۔ جیسے دوسرا تھا ویسے ہی یہ تھے اور دونوں فریق اپنی مقصد براری کیلئے روپیہ خرچ کر رہے تھے اور ایک فریق کے فنڈ میں سے پیسہ میرے ہاتھ سے پریس میں تقسیم کیا گیا جس میں سے مجھے بھی میرا حصہ ملا۔ اللہ مجھے بخشے اور ان لوگوں کو بھی بخشے جن لوگوں نے یہ روپیہ کھایا تھا۔

یہ بھی ان دنوں کی بات ہے جب لائل پور کاٹن مل والوں کی جانب سے دہلی اور لائل پور میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں کاٹن مل والوں کا انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ انہی دنوں ہمارے ایک شاعر دوست احمد ریاض تھے جو تپ دق کے مرض میں فوت ہو گئے تھے۔ بہت خوش گو شاعر تھے۔ ان کے بعد ان کے بیوی بچوں کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں تھا۔ اس لیے وہاں پر ان کے بیوی بچوں

کی امداد کیلئے احمد ریاض بینیفٹ مشاعرہ منعقد ہوا۔

نجانے کس نے شرارت کی تھی کہ جس روز لائل پور میں لائل پور کاٹن مل والوں کا مذکورہ بالا مشاعرہ ہونے والا تھا اسی دن احمد ریاض بینیفٹ مشاعرے کی بھی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ ہمیں پتہ چلا تو ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم پہلے ایک طرف پڑھ لیں گے اور پھر دوسری طرف پڑھ لیں گے۔ لیکن ہمارے شاعروں کا کردار بحیثیت مجموعی درست نہیں ہے اور ہم لوگ بہت بے حس آدمی ہیں۔اس مشاعرے کا جب شاعروں سے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں پہلے کاٹن مل والوں سے پوچھنا پڑے گا۔جب مل والوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو اس کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ آپ تو ہمارے مشاعرے کے لیے آئے ہیں۔اب اپنے مؤقف پر وہ قائم رہے جو وہ مشاعرہ چھوڑ سکتا ہو۔وہ اچھے خاصے پیسے دیتے تھے جبکہ احمد ریاض کے امدادی مشاعرے میں مفت پڑھنا پڑتا تھا۔

میں نے ایک ترقی پسند شاعر سے کہا جو بہت زیادہ ترقی پسندی کا دعویٰ بھی کرتے تھے تو انہوں نے الٹا مجھے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھئے ہمارا تو کاٹن مل والوں سے معاہدہ ہے اور ہم ان کے مشاعرے کے اوقات کے دوران اور کہیں نہیں جا سکتے۔ اس لیے آپ احمد ریاض کے امدادی مشاعرے والوں سے کہئے کہ وہ کل کا دن رکھ لیں تو ہم آجائیں گے۔میں نے کہا کہ مجھے اس بات کا پتہ ہے اور میرا بھی مل والوں سے معاہدہ ہے لیکن ایک درمیانی راستہ نکل سکتا ہے کہ ہم وہاں جا کر پہلے پڑھ آئیں پھر یہاں آجائیں گے۔اور پھر اگر ہم مل کر مل والوں سے کہیں گے تو وہ ہماری بات مان بھی سکتے ہیں۔وہ کہنے لگے کہ صاحب میں تو سمجھتا ہوں کہ انہیں یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔میں نے کہا کہ نہ کہیں۔

ایک دوسرے آدمی بھی وہاں تھے جو اچھی طبیعت کے تھے یہ ساحر صدیقی تھے۔اس سے میں نے کہا کہ تم تو میرا ساتھ دو۔ کچھ نہیں ہو گا۔اس نے کہا کہ پھر یہاں نہیں پڑھوائیں گے۔اس لیے میں نہیں جاتا۔ میں نے دو تین اور شاعروں سے بھی کہا لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا اور جس نے میرا ساتھ دیا وہ جمیل ملک تھے جو راولپنڈی سے تعلق رکھتے تھے اور میرے بھائیوں جیسے دوست ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ مل والوں سے بات کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے روی چوپڑا اور ساہنی جو کہ مل والوں کی طرف سے مشاعرہ کا انتظام کرتے تھے سے کہا کہ ہمارے ایک شاعر بھائی کا معاملہ ہے اس لیے آپ ہمیں اس مشاعرے میں جانے کی بھی اجازت دے دیجئے۔ ہم وہاں پڑھ کر ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور آپ کا مشاعرہ متاثر نہیں ہو گا۔اور اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو میں تو آپ کا بائیکاٹ کرنے کیلئے تیار ہوں۔

وہ میرے مزاج سے واقف تھے۔اس زمانے میں میں جو کہتا تھا وہ کر گزرتا تھا اور اپنے ساتھی بھی پیدا کر لیتا تھا۔اس کے علاوہ وہ کچھ دوست بھی تھے۔اس لیے کہنے لگے کہ آپ دونوں چپکے سے چلے جائیں اور وہاں مشاعرہ پڑھ کر آجائیں۔ لیکن باقی لوگوں کو نہ چھیڑیئے۔ میں باقیوں کو ٹٹول چکا تھا اور ان میں سے کوئی بھی وہاں جانے کیلئے تیار نہیں تھا خاص طور پر ساحر صدیقی۔ ہم نے نہ صرف وہاں جا کر مشاعرہ پڑھا بلکہ اپنے پلے سے بھی کچھ پیسے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے کیلئے دیئے۔اور واپس آگئے۔ ہم نے مل والوں کا مشاعرہ بھی آکر پڑھا۔ یہاں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ مری میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے بہت سے شاعر گئے جن میں سے ایک ساحر صدیقی بھی تھے۔راستے میں بات چلی تو میں نے ساحر صدیقی سے کہا کہ میں اپنی شاعر

برادری کو جانتا ہوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے لیکن میں نے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے کیلئے تم سے بڑی آس لے کر بات کی تھی۔ مگر تم نے انکار کر دیا اور خدا جانے کب کس پر یہ وقت آجائے اور امداد کی ضرورت آجائے۔ اس لیے اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب انسان کو خود بھی اس کی ضرورت پڑ جائے۔ تو وہ چپ ہو گیا اور کچھ ندامت محسوس کی۔

مری پہنچے تو وہاں مصطفی زیدی صاحب اس کے منتظم تھے جو کہ ڈپٹی کمشنر بھی تھے۔ وہ جب انڈیا سے اپنے وطن سے آئے تھے تو ان کا نام تیغ الہ آبادی تھا اور یہ جوش صاحب کے شاگرد تھے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے لاہور میں ان کا ہمارے ساتھ بھی ملنا جلنا تھا۔ وہ سینئر شاعر ہونے کی وجہ سے ہماری بہت عزت کرتے تھے اور ان کے پاس ایک کیمرہ ہوتا تھا۔ انہوں نے سب کی تصویریں لے کر ایک البم بھی بنایا ہوا تھا۔ ایک دن میکلوڈ روڈ پر مجھے ملے تو بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ ادھر ادھر کی کچھ باتیں کیں اور پھر مجھے کہنے لگے کہ آیئے میرے ساتھ پکچر دیکھئے۔ ٹکٹ بھی انہوں نے لیے اور ہم نے پکچر دیکھی۔ انٹرول میں میں نے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ تو کہنے لگے کہ میں اسسٹنٹ کمشنر کی ٹریننگ لے رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ کہنے لگے کہ میں نے سی ایس پی کا امتحان دیا تھا اور اس میں کامیابی پر یہ تقرری ہوئی۔ میں نے انہیں دعائیں دیں۔ اس کے بعد بھی وہ ملتے رہے اور ہمیشہ بڑے ادب سے ملتے تھے۔ اس کے بعد ان کی شادی ایک غیر ملک خاتون ہیرا سے ہو گئی۔ بہت اچھی خاتون تھی۔ اس نے شادی کے بعد اُردو بھی سیکھی۔ وہ اتنی ذہین عورت تھی کہ

اس نے یہاں کا کلچر بھی سیکھا اور یہاں کا لباس بھی پہنا۔ جب بھی ہم ان کے گھر جاتے تھے تو یوں نظر آتا تھا جیسے کہ وہ اپنوں ہی میں سے ہے۔

اس کے بعد مری میں مصطفی زیدی صاحب نے ایک مشاعرہ کروایا جس میں شرکت کیلئے میں ساحر صدیقی اور دوسرے شعراء گئے ہوئے تھے۔ توقع یہ تھی کہ جب مری جائیں گے تو مصطفی زیدی اس خلوص سے ملے گا۔ لیکن جب وہاں جا کر ملے تو پروٹوکول ان کے اور ہمارے درمیان آ گیا۔ پھر ان کے پاس وہاں پر ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی جبکہ یہ صرف میاں بیوی ہی تھے۔ اگر یہ چاہتے تو سب شاعروں کو اپنے ساتھ ٹھہرا سکتے تھے کیونکہ ان کی کوٹھی میں کئی بیڈ روم تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے شاعروں کو جس کوٹھی میں ٹھہرایا جو بڑی غیر آباد تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ اسے بھوتوں والی کوٹھی کہا جاتا ہے۔ وہاں غسل خانوں میں پانی تک نہیں تھا اور اخبارات وہاں ٹائلٹ پیپر کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ پھر سونے کیلئے بھی عجیب قسم کی چارپائیاں تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ مصطفی زیدی صاحب نے خود نہیں کیا تھا بلکہ جن لوگوں سے انہوں نے کہا ہوگا انہی کا انتظام تھا۔ مگر اس سے ان کی عدم دلچسپی ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن تھی تو بدسلوکی۔

یہی حال کھانے کا بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے جن لوگوں سے کھانے کا کہا ہوا تھا انہوں نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور شاعروں کو جو کھانا کھلایا گیا وہ اتنا باسی تھا کہ مشاعرے کی رات ہی ساحر صدیقی کو FOOD POISONING ہو گئی۔ وہ مری سے لاہور کیلئے روانہ ہوا اور راستے میں پنڈی جا کر ہی اس مرض کی وجہ سے فوت ہو گیا۔

عبرت کا مقام یہ ہے کہ ساحر صدیقی نے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اب ہمیں ان کیلئے امداد کا بندوبست کرنا پڑا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم وہاں پر رؤسا سے ان کی مدد کیلئے چندہ لے رہے تھے تو سامنے سے میاں بشیر الدین آ رہے تھے۔ ان سے کہا کہ یہ واقعہ ہو گیا ہے۔ آپ بھی اس میں کچھ مدد کریں تو انہوں نے پہلے تو تقریر کی کہ یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ کیونکہ شاعر کا تو بہت بلند مقام ہوتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میری نظر میں تو یہ طریقہ بھیک کے ذیل میں آتا ہے۔ اور جو شاعر مر گیا ہے۔ اس کیلئے بھیک مت مانگئے۔ میں نے کہا کہ پھر کیا کریں۔ کہنے لگے کہ قرض لیجئے اور اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ پچاس روپے میری طرف سے قرض رکھئے۔ میں نے کہا اس قرض کی واپسی کا مطالبہ آپ مرنے والے سے کریں گے ہم سے۔ کہنے لگے کہ مجھے بہر حال یہ طریقہ پسند نہیں ہے اور پچاس روپے کا نوٹ چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم نوٹ نہ رکھ سکے اور نہ لوٹا سکے۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ یار چپ کر کے رکھ لو۔ غرضیکہ۔ ساحر صدیقی اپنے ایک ساتھی شاعر کی وفات کے بعد ان کے امدادی مشاعرے میں نہیں گئے تھے۔ اور ان کی وفات سے چند گھنٹے قبل میں ان کے ساتھ یہی باتیں کر رہا تھا کہ وہ خود بھی فوت ہو گئے۔ اور اب ساحر کی امداد کیلئے ہمیں یہ سب چندہ اکٹھا کرنا پڑ رہا تھا۔ اگر انسان محسوس کرے تو جگہ جگہ عبرت کے مقام موجود ہیں۔

مری کے مشاعرے کے بعد ہماری ملاقات مصطفی زیدی سے جہلم کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ ان دنوں جہلم کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس مشاعرے میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش اور دوسرے سینئر شعراء کے علاوہ نوجوانوں میں سے ہم لوگ جو پاکستان کی کریم تھے

شریک ہوئے۔اس بار وہاں پر مشاعرے میں قیام وبعام کا مناسب انتظام تھا کیونکہ وہاں کچھ باذوق لوگ بھی موجود تھے۔ مصطفی زیدی وہاں موجود نہیں تھے۔اچانک پتہ چلا کہ ڈی سی صاحب تشریف لارہے ہیں آپ لوگ اس ہال میں موجود رہیں۔چنانچہ ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ ہم تو مصطفی زیدی کا انتظار کررہے تھے لیکن جب دیکھا تو وہ ڈی سی صاحب نکلے۔اور وہ ایک بیورو کریٹ کے مخصوص انداز میں سرہلا کر خیریت دریافت کرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچے۔سب نے محسوس کیا کہ انہوں نے ٹھیک طرح سلام نہیں لیا۔

اس سے پہلے مری میں جب ساحر صدیقی غلط خوراک کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا تو اس وقت سے سب لوگ ان سے جلے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے غلط جگہ ٹھہرایا تھا اور کھانا بھی ٹھیک نہیں دیا تھا اور جب ساحر صدیقی فوت ہو گیا تو سب شاعروں نے اس کی وفات پر زیدی کے بارے میں مل کر ایک نظم کہی تھی جس میں سب نے چندے میں شعر کہے تھے۔جواب بھی اظہار ناراضگی کے طور پر ریکارڈ پر موجود ہے۔

چنانچہ جب یہاں جہلم میں بھی انہوں نے ایسا ہی سلوک کیا تو اکثر شعراء ان سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ اس سے راہ ورسم اب نہیں رکھنا۔یہ شاعر تو رہا نہیں بلکہ یہ تو اب سیدھا افسر بن گیا ہے۔ آگے معاملہ بڑھا تو ملتان میں میرے ایک دوست کی گراموفون کمپنی کی ایجنسی ہے۔میں اس کے پاس بیٹھا تھا تو دیکھا کہ اس کے اندر جھانکتے ہوئے مصطفی زیدی آ گئے۔میں نے بھی دیکھا تو کہنے لگے کہ ارے قتیل بھائی آپ کہاں ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کہاں۔میں نے انہیں اندر بلایا تو کہنے لگے کہ میں لیہ میں ڈپٹی کمشنر ہوں۔مجھے اس کا پہلے سے پتہ تھا لیکن ذہن میں تلخی تھی۔ پھر کہنے

لگے کہ یہاں کیا کر رہے ہیں چلئے میرے ساتھ۔ چل کر کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سے ہم بہت کھانا کھا چکے اور پہلے بھی ایک بار مری میں آپ سے کھانا کھایا تھااور اس وقت وہاں ایک شخص ساحر صدیقی بھی موجود تھااور اس کے ساتھ جو ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ان باتوں کو چھوڑیئے۔ مجھے احساس ہے کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن چل کر اب کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھائیں۔ میں نے انہیں اپنے اس دوست حبیب فاضلوی سے ملوایا جو آج کل نوائے وقت میں بہت چھوٹا سا کام کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اچھا اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو یہیں کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے ساتھ وہیں کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد میں نے کہا کہ آپ کو ہو کیا گیا تھا۔ کہنے لگے کہ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ اگر آپ میری جگہ ہوں اور آپ کو بھی شاعر سے ڈی سی بنا دیا جائے تو آپ بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔ لیکن بہر حال میں مری اور جہلم والے واقعات سے شرمندہ ہوں۔ اب آپ مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں یہاں لیہ میں مشاعرہ کروا رہا ہوں جس میں جوش صاحب کو اور باقی سب شعراء کو بھی بلوا رہا ہوں اور آپ بھی ضرور آیئے۔ میں نے کہا کہ اس مشاعرے میں اب کوئی نہیں آئے گا۔ جوش صاحب البتہ آجائیں گے کیونکہ وہ آپ کے استاد ہیں۔ اس بات چیت سے انہیں حالات کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے جا کر فرداً فرداً سب سے معافی مانگی اور خدا کا شکر ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے اندر چھپا ہوا شاعر پھر سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد لیہ میں جب مشاعرہ ہوا تو اس میں انہوں نے

واقعی چھوٹے بھائیوں کی طرح سلوک کیا اور سب شاعروں کی خوب تواضع کی۔ یوں ان کے اندر چھپا ہوا ایک صاف ستھرا انسان اور ایک مخلص دوست ہمیں پھر سے مل گیا۔

لیہ کے اس مشاعرے میں جاتے ہوئے راستے میں ایک لطیفہ ہوا۔ ظہیر کاشمیری اور مذاق میں حبیب جالب پر سوار تھے۔ یہ مذاق جاری تھا کہ راستے میں ایک نہر آئی۔ شام کا وقت تھا سب نے کہا کہ چلو اس نہر پر تھوڑی دیر رک کر ریسٹ کرتے ہیں۔ جالب نے کہا" دوستو بات سنو! اور ظہیر صاحب آپ بھی سنئے" پھر کہنے لگے " سب لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا کریں کہ میری تمنا پوری ہو" سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ یا خدا اس کی تمنا پوری کر ی۔ پھر سب نے پوچھا کہ تمہاری تمنا کیا ہے۔ تو جالب کہنے لگے کہ میری تمنا یہ ہے کہ زندگی میں ایسے کئی دن آئیں۔ اسی طرح شام کا سہانا وقت ہو، دریا کا خوبصورت کنارہ ہو سبزہ زار ہو، پھول کھلے ہوں، پرندے چہچہا رہے ہوں اور ہم سب دوست بیٹھے ہوں لیکن یہ ظہیر کاشمیری موجود نہ ہو۔ ان کے اس مذاق پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن ظہیر کاشمیری کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ ہر چند کہ وہ بہت زندہ دل آدمی ہیں لیکن لمحاتی طور پر ان کی کیفیت ذرا مختلف ہو گئی۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد قہقہوں میں شامل ہو گئے۔ اور یوں جالب صاحب نے ظہیر کاشمیری سے بہت سے مذاقوں کا بدلہ ایک ہی مذاق میں لے لیا۔

شاعر سربراہ ادارہ

میں پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میری ادبی تربیت امام باڑے میں ہوئی ہے اور مذہبی تربیت مسجد اہل حدیث میں۔ میرا بچپن زیادہ تر ہمارے گھر کے قریب واقع مسجد میں گزرا ہے۔ وہاں پر جو مسئلے

بیان ہوتے ہیں مجھ پر ان کا اثر یہ تھا کہ میں ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تھا خواہ یہ ظلم اپنے اوپر ہو یا کسی اور کے اوپر۔ اسی طرح امام باڑے میں بھی حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور کربلا کے واقعات اور یزید کے ظلم و ستم کے واقعات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ بھی یہی تھا کہ ظلم خواہ کسی پر ہو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو بڑے واقعات ہیں ان کا میرے چھوٹے سے ذہن پر اثر یوں ہوا کہ اگر کوئی زور آور لڑکا کسی کمزور لڑکے کو مار رہا ہو تو میرا اس کمزور لڑکے سے تعلق ہو نہ ہو میں اس کی طرف سے بول پڑتا تھا اور اس طاقتور لڑکے سے جنگ مول لے لیتا تھا۔

آگے چل کر جب مجھے رائٹرز گلڈ کی سیکرٹری شپ ملی تو اس زمانے میں مجھے ادیبوں کی مدد کرنے کا موقع ملا۔ جب کہیں کسی ادیب کے ساتھ زیادتی ہوتی تو میں بول اٹھتا۔ ریڈیو پاکستان سے ایک فرمائشی پروگرام اس وقت بھی چلتا تھا جب میں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری نہیں تھا۔ اس پروگرام میں درجنوں فرمائش کرنے والے کے نام نشر کئے جاتے تھے اور اس کے بعد گلوکار اور موسیقار کا نام بتا کر نغمہ سنا دیا جاتا تھا لیکن شاعر کا نام نہیں آتا تھا کہ یہ گیت کس کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے اس سلوک کی وجہ سے مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ پورے گانے کی بنیاد جس چیز پر ہے وہ شاعری ہے۔ کیونکہ پہلے شاعر نے گیت لکھا تو پھر اس کی دھن بنی، اسے گایا گیا اور سامعین نے اس کی فرمائش کی لیکن شاعر کا نام ہی نہیں دیا جا رہا۔

اس سلسلے میں پہلے تو میں مقامی طور پر جھگڑا کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد میں سنٹر سے بھی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران دو تین ڈائریکٹر جنرل بھی تبدیل ہوئے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ ان دنوں ریڈیو کا ہیڈ آفس کراچی میں ہوتا تھا۔ میں دو بار پہلے بھی اپنے خرچ پر اسی مسئلے کیلئے کراچی جا

چکا تھا۔جب میں تیسری بار وہاں گیا تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر رشید صاحب تھے انہی نے میرے خط کے جواب میں مجھے وہاں بلوایا تھا۔میں وہاں گیا تو انہوں نے اپنے متعلقہ اہلکاران کو بلوا کران کے ساتھ میری میٹنگ کروائی اوران سے پوچھا کہ قتیل صاحب کو یہ بتائیں کہ فرمائشی فلمی گانے کے ساتھ شاعر کا نام کیوں نہیں آتا۔وہ کہنے لگے کہ وقت کا مسئلہ ہے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔مجھے بے حد غصہ آیا۔اس زمانے میں میں غصے سے آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔چنانچہ میں نے برا بھلا کہہ کر کہا کہ آپ فرمائش کرنے والوں کے تو پچیس نام سنا دیتے ہیں جن کا اس نغمے کی تخلیق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن جو شخص اس نغمے کی تخلیق کرتا ہے اس کا ایک نام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ وقت کم ہوتا ہے۔اگر آپ فرمائش کرنے والوں میں سے صرف ایک نام کم کر لیں تو شاعر کا نام آجاتا ہے۔بلکہ میں نے یہاں تک کہا کہ وقت کم ہونے کی دلیل دیتے ہوئے آپ مجھے بڑے احمق انسان نظر آرہے ہیں اور آپ کو ایسی دلیل دیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ڈائریکٹر جنرل میرا نکتہ سمجھ گئے تھے۔انہوں نے مجھے ٹھنڈا کیا اور پھر خود ان پر گرم ہو گئے۔اور کہنے لگے کہ قتیل صاحب اس مسئلہ کیلئے پچھلے دو تین سال سے جدوجہد کر رہے ہیں اور کیا آپ لوگوں نے اس چھوٹی سی بات کیلئے اس معاملے کو لٹکا رکھا تھا۔انہوں نے اسی دن تمام ریڈیو سٹیشنوں کو پالیسی کے طور پر خط لکھا کہ آئندہ نغمے کے ساتھ شاعر کا نام ضرور دیا کریں۔چنانچہ اس کے بعد فلمی فرمائش کے ساتھ شاعر کا نام بھی آنے لگا۔

یہ خبر شمع دہلی میں شائع ہوئی جو اس وقت پاکستان کو بھی کوریج دیتا تھا۔ساحر لدھیانوی بھی انڈیا میں اس مسئلہ کے لیے کوشاں تھے کیونکہ وہاں بھی یہ زیادتی ہو رہی تھی۔ساحر لدھیانوی نے ''شمع''

میں یہ خبر پڑھی تو انہوں نے وہاں بھی اس خبر کا حوالہ دے کر جنگ لڑی اور بالآخر انڈیا میں بھی فلمی گانوں کی فرمائش کے ساتھ شاعر کا نام آنا شروع ہو گیا۔ اور پھر "شمع" نے اسی حوالے سے اپنا اداریہ بھی لکھا تھا۔ اس وقت شمع میں اداریہ بھی آتا تھا۔

وہ مسئلہ تو ہم نے اس وقت حل کروا دیا تھا لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ جو حرام کی تنخواہیں کھاتے ہیں اب بھی شاعر کا نام چھوڑ جاتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ نقصان ہوتا ہے کہ ریڈیو کی اپنی وضع کردہ پالیسی کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دوسرا شاید ریڈیو والوں کو پتہ نہیں ہے کہ وہ کاپی رائٹ ایکٹ کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر ان پر مقدمہ کر دے تو وہ مواخذے کے لائق ہیں کیونکہ اس ایکٹ کے تحت مصنف کے نام کا حوالہ دیئے بغیر اس کی کوئی بھی چیز استعمال نہیں کی جاسکتی۔ تیسرا نقصان یہ ہے کہ نام نہ لینے کی وجہ سے وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ رائلٹی رجسٹر میں بھی شاعر کے نام کا اندراج ہونا ہوتا ہے اور اگر اس رجسٹر میں اس کا نام درج نہیں ہوگا تو وہ اپنی رائلٹی سے بھی محروم ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے لیکن میں اب اس سلسلے میں تھک چکا ہوں چونکہ میں نے اپنی برادری کے لیے ساری زندگی جو جدوجہد کی ہے اس میں دیکھا کہ جب میں نے شاعر کا نام دلوانے والا معرکہ سر کیا تو مجھے تو ایک بھی مبارکباد نہیں آئی تھی۔ اور جب میں نے ان جھگڑوں سے بھی کئی بار ریڈیو کا بائیکاٹ کیا یا ریڈیو نے میرے نغموں پر پابندی لگائی تو کہیں سے بھی کوئی میری ہمدردی کیلئے آگے نہیں بڑھا۔ اگر زیادہ سے زیادہ کسی نے کہا تو یہ کہ اگر ملاقات ہوئی تو زبانی طور پر واہ واہ کر دی اور کہا کہ آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اب بھی ایسی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں لیکن اب میں اگر زیادہ سے زیادہ کچھ کرتا ہوں تو خود بائیکاٹ کر دیتا ہوں۔

برادری کے لئے لڑنے کی میری عادت ایسی ہے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی ساتھ ان کا نام نہیں آتا تھا جبکہ پروڈیوسر کا نام ضرور آتا تھا۔ اس کے علاوہ گلوکار کا نام بھی آجاتا تھا جو خود سکرین پر نظر بھی آرہا ہوتا تھا لیکن شاعر کا نام نہیں دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد بار اس وقت کے مینجنگ ڈائریکٹر ضیاء جالندھری سے بات کی جو اتفاق سے شاعر بھی تھے۔

میرا تو تجربہ یہ ہے کہ جس ادارے کا سربراہ شاعر ہوگا اور وہ اندرونی طور پر یہ محسوس کر رہا ہو کہ اسے جتنی شہرت ملنی چاہئے وہ نہیں ملی تو وہ انتقام پر اتر آئے گا اور اس کا بدلہ دوسرے شاعروں سے لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت ضیاء جالندھری شاعروں سے بدلہ تو لے ہی رہے تھے کیوں نہ ان کے گیتوں کے ساتھ ان کے نام نہیں دیتے تھے لیکن انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا کہ ٹیلیفون پر یہ حکم صادر کر دیا کہ میرے گیتوں پر بین ہے۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں نے پریس کانفرنس کر کے ان کی باتوں کا جواب دیا۔ جس کے بعد انہوں نے پابندی اٹھادی۔ میں نے دلیل کے طور پر پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ شاعروں کے ساتھ زیادتی یوں ہو رہی ہے کہ اگر کسی اور کا نغمہ ہو تو اس کے ساتھ شاعر کا نام نہیں آتا لیکن جب حضرت ضیاء جالندھری اہتمام کے ساتھ اپنا نغمہ ٹیلی کاسٹ کرواتے ہیں تو نغمہ شروع ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ان کا نام دیا جاتا ہے۔ میری اس پریس کانفرنس کے بعد مجھ سے پابندی تو اٹھ گئی لیکن ان ضیاء صاحب کی کچھ ایسی سنی گئی کہ تقریباً اسی افراد نے ایک معذرت نامے پر دستخط کئے جس میں مارشل لاء حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ سندھ میں تشدد بند کرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہو جائیں۔

ادھر اس معذرت نامے کا چھپنا تھا ادھر ضیاء صاحب کو موقع ملا اور انہوں نے مجھے اور باقی لوگوں کو

ٹیلیویژن پر بین کر دیا۔اور میرے سلسلے میں تو انہوں نے خاص طور پر کہہ دیا کہ جب تک میں ٹی وی پر ہوں قتیل شفائی نہیں آسکتا۔انہوں نے میرے خلاف یہ سب کچھ ذاتی سطح پر لے کر اسے انا کا مسئلہ بنالیااور یہ نہیں سوچا کہ یہ ایک جائز بات ہے اور اسے مان لینا چاہیے۔کیونکہ وہ بھی ماشاءاللہ شاعر تھے اور میں اسی لیے کہتا ہوں کہ خدا کسی شاعر کو کسی محکمے کا سربراہ نہ بنائے

عمرہ کی سعادت

مکہ اور مدینہ دو ایسی سرزمینیں ہیں کہ جب تک وہاں سے بلاوا نہ آئے کوئی وہاں پہنچ نہیں سکتا اور جب بلاوا آجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔یہ ایک عام مسلمان کا ایمان ہے۔یہ سنا تھا لیکن کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ہوا یوں کہ ناروے میں ایک مشاعرہ تھا۔پروگرام یوں بنا تھا کہ ناروے سے واپسی پر میں کچھ دن کیلئے انگلینڈ میں ٹھہروں گا جہاں میرا بیٹا اور بیٹی مقیم ہیں جہاں سے میرا ضمیر جعفری صاحب کے ساتھ کچھ ایسے ملکوں کی سیر پر جانے کا پروگرام بنا تھا جو ہم نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ میں اور ضمیر جعفری صاحب ناروے کے مشاعرے سے فارغ ہو کر انگلینڈ پہنچے۔ضمیر جعفری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آئندہ پروگرام پر قائم ہو۔اس وقت تک میں ان سے پوری طرح متفق تھا اس لیے پھر ہاں کر دی۔

لیکن رات کچھ ایسا ہوا کہ مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آرہی تھی اور پھر وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نیند کیوں نہیں آرہی۔ایسے موقعوں پر جب کہ شعر کی آمد ہونے والی ہو تو مجھ پر یہ کیفیت رہتی ہے۔اس لیے میں نے سوچا کہ شاید کچھ اشعار صفحہ قرطاس پر آنا چاہتے ہیں۔چنانچہ میں نے لائٹ

جلائی اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ مگر کوئی شعر وارد نہ ہوا۔اور وہ رات بے چینی میں کٹی۔ وہ تین گھنٹے کیلئے بمشکل سو سکا مگر پھر بھی تھکاوٹ دور نہ ہوئی۔جب میں جا گا تو صبح ذہن میں یہ بات تھی کہ مجھے عمرہ کرنے کیلئے سعودی عرب جانا چاہئے۔

خواب تو مجھے کوئی نہیں آیا اور نہ میں خوابوں کا قائل ہوں۔ البتہ اپنے اندر سے یہ آواز آرہی تھی کہ عمرے کے لیے جانا چاہیے۔ناشتہ کر چکا تو ضمیر جعفری صاحب کا ٹیلیفون آیا اور انہوں نے پوچھا کہ پہلے کہاں جایا جائے۔ میں نے کہا کہ جعفری صاحب میرا پروگرام بدل گیا ہے۔کہنے لگے کہاں جانا ہے۔میں نے کہا کہ میں تو عمرہ کرنے کیلئے جارہا ہوں۔وہ کہنے لگے کہ اس سے اچھی کیا بات ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم پہلے پروگرام کے مطابق کچھ ممالک کی سیر کر آئیں پھر آپ عمرہ کیلئے چلے جایئے گا۔میں نے کہا کہ نہیں جی اس پھیرے میں تو یہی ایک کام ہوگا۔اور میں لندن سے اب وہیں جاؤں گا۔چنانچہ انہوں نے بخوشی اجازت دیدی اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔

جمیل الدین عالی بھی ان دنوں وہیں پر تھے اور ہمارے ساتھ ہی ناروے سے واپس آئے تھے۔ان کے بینکوں کا سلسلہ کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا اس لیے میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میں ٹیلیفون کر دیتا ہوں اور مکہ معظمہ میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔پھر وہاں آپ کے کئی جاننے والے بھی مل جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بات کی۔

اس کے بعد میں لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں گیا اور وہاں اپنے دوستوں سے کہا کہ مجھے سعودی عرب کے ویزا کی ضرورت ہے۔انہوں نے اسی وقت بیٹھے بیٹھے ویزا بنا دیا اور یوں ایک رات پہلے کی کیفیت نے اپنا راستہ نکالا اور منزل کا رخ بتا دیا۔ چنانچہ میں گلاسگو جہاں پر میرے بچے ہیں

وہاں سے ہو کر جہاز کے ذریعے سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ جدہ میں قیام ہوا اور وہاں پر میں نے نیشنل بینک والوں کے مہمان خانے میں قیام کیا۔ وہیں پر مجھے احرام بھی مہیا کر دیا گیا جو میں نے باندھ لیا۔ اوراس کے بعد عمرہ کیلئے روانہ ہو گیا۔ اس میں تقریباً سبھی مناسک حج والے ہیں صرف یہ ہے کہ میدان عرفات وغیرہ کا طواف نہیں کیا جاتا۔

میں نے وہاں خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس زمانے میں وہاں انتشار نہیں تھا کیونکہ حج کے زمانے میں جتنا رش ہوتا ہے اس کے بعد عمرے کے دوران انتشار نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے عمرہ کیا اور جو جو فرض ضروری تھا وہ پوری دلجمعی سے ادا کیا اور میرے سینے میں ایک روشنی بھر گئی۔ میں نے اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کی جس کی قوت ایمانی کہا جا سکتا ہے۔ لطف اس بات کا آتا رہا کہ وہ اب زمزم جس کے چند قطرے ہم تبرکاً لے کر پورے پورے مٹکوں میں ڈالتے ہیں اور اسے بڑی احتیاط اور ادب سے استعمال کرتے ہیں وہاں اس کی افراط دیکھی۔ جس مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے اس میں جتنا پانی تھا وہ زمزم کا تھا اور وہاں آب زمزم ہی سے غسل بھی کیا۔ اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے جسموں میں جتنی غلاظتیں ہوتی ہیں وہ آب زمزم سے بھی دھل سکی ہیں یا نہیں۔ لیکن وافر پانی سے میں نہایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد دوسرے دن فلائنگ کوچ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں بھی نیشنل بینک والوں نے میرا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہاں پہنچا تو عربی لباس میں ملبوس ایک شخص کو اپنا منتظر پایا۔ میں تھوڑا سا گھبرایا کہ ان لوگوں نے ایک عرب کو میرے استقبال کے لیے بھیج دیا ہے۔ سوچا کہ چلو جو تھوڑی بہت انگریزی آتی ہے اسی سے اس سے بات کر لوں گا۔ اس شخص نے خالص عربی انداز میں

مجھے اہلا وسہلا مرحبا کہا۔جب میں نے اس سے انگریزی میں بات کرنی چاہی تو اس نے خالص اُردو زبان میں کہا کہ آپ کا سفر ٹھیک گزرا۔میں نے سکھ کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ "زبان من عربی و من عربی نمی دانم" والا معاملہ نہیں بنا۔اس نے وہاں سے مجھے ساتھ لیا اور مجھے ایک ایسے گھر میں لے گیا جس کا اندر کا نقشہ مانوس سا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ گھر پشاور کے رہنے والے ایک صاحب سیٹھی کا ہے۔مزید گفتگو سے پتہ چلا کہ میرے دوست یوسف شاد جو پشاور کے رہنے والے ہیں یہ ان کے کزن ہیں۔اور جب انہوں نے میرا سنا تو مہمان خانے کی بجائے میرے قیام کا بندوبست اپنے گھر میں کیا۔یوں میں مدینہ منورہ میں اپنے ہی ایک دوسرے گھر میں قیام پذیر ہوا۔

یہ گھر مسجد نبوی ﷺ سے بہت قریب تھا۔میں نے اس کے بعد کی نماز مسجد نبوی ﷺ میں جاکر ادا کی۔مسجد نبوی ﷺ ہی میں روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔اس طرح میں وہاں پر جو ایک دو دن قیام پذیر رہا اپنی سب نمازیں جاکر مسجد نبوی ﷺ ہی میں ادا کیں۔اس دوران وہاں جمعۃ الوداع بھی آیا۔وہ بھی میں نے مسجد نبوی ﷺ ہی میں گزارا اور عبادت کی۔

میں نے وہاں یہ بات دیکھی کہ وہاں آنے والے مختلف لوگوں کے مسلک مختلف تھے۔اور سب مختلف انداز سے نماز پڑھ رہے تھے۔کسی نے ہاتھ چھوڑے ہوئے تھے اور کسی نے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔کوئی اونچی آواز سے آمین کہتا اور کوئی نیچی آواز سے۔اس کے باوجود جب جماعت کے بعد لوگ آمین کہتے تو اس میں ایک ایسی موسیقیت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اونچی آواز سے آمین کہوں۔پہلی مرتبہ جب میں نے نماز ادا کی تھی تو میں نے بھی منہ ہی میں آمین کہا تھا لیکن دوسری بار میں بھی اونچی آواز سے آمین کہنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔وہ آمین ٹیون کا ایک

خوبصورت ٹکڑا بن گیا تھا۔

وہاں پر میں یہ سوچتا رہا کہ اگر دنیا بھر کے یہاں آئے ہوئے مسلمان ایک ہی امام کے پیچھے اپنے اپنے طریقے سے نماز پڑھ سکتے ہیں تو اپنے ممالک میں جا کر ان پر کیا مصیبت آپڑتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی اپنی چار اینٹ کی مسجد علیحدہ علیحدہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔اور لڑائی مار کٹائی اور دنگا فساد بعض اوقات طریق نماز یا یارسول اللہ ﷺ کہنے پر ہی ہو جاتا ہے۔ جبکہ مسجد نبوی ﷺ میں کس قدر امن وامان اور اتحادِ اسلامی یا اتحادِ انسانی کی کیفیت ہوتی ہے۔

وہاں پر اتنی نورانی اور پر سکون فضا تھی کہ جی چاہتا تھا کہ نماز ختم نہ ہو لیکن وہاں نماز طویل نہیں تھی۔اذان سے پہلے ہمارے ہاں جو صلوتیں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی وہاں پر نہیں تھیں اور آج کی مصروف دنیا کو سامنے رکھ کر یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اس حوالے سے سارے انتظامات کر رکھے تھے اور ان کی عبادات میں کوئی چیز غیر ضروری نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ آپ کی نماز میں تھک کر کھڑے کھڑے ٹانگیں ہی کانپنے لگیں۔ایسا لگتا تھا کہ ایسے ہی ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ جمعۃ الوداع تھا لیکن اس کے باوجود جمعہ کی نماز اور دیگر چیزیں صرف آدھ گھنٹے میں ختم ہو گئی تھیں۔

اس سے جب میں یہاں کی مساجد کا موازنہ کرتا ہوں اور بالخصوص اپنے محلے کی مسجد کا موازنہ کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں جمعہ کے روز بارہ بجے دوپہر سے ہی بچوں کے ہاتھ میں مسجد کا سپیکر دے دیا جاتا ہے جو غلط سلط نعتیں پڑھتے رہتے ہیں۔اور لاؤڈ سپیکر کی آواز پوری چھوڑی ہوتی ہے۔انہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ قریب وجوار میں کوئی مریض بھی ہو سکتا ہے۔ یا پھر کوئی بچہ سویا ہو سکتا ہے یا کسی کو ذہنی کام کرنا یا امتحان دینا ہو سکتا ہے۔ لیکن انہیں کسی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔

یہ لاؤڈ سپیکر کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔اس کے بعد جب مولوی صاحب کے ہاتھ میں سپیکر آتا ہے تو انہیں یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ ان کے سامنے لاؤڈ سپیکر ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کم آواز کو بلند کرنے والا آلہ ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے خود اونچی بولنا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا استعمال کر کے تقریر کرتے ہیں اور وہاں غوغے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔اور بارہ بجے دوپہر سے شروع کیا ہوا ان کا شغل اڑھائی بجے کہیں جا کر ختم ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ اللہ کا ذکر بھی لاؤڈ سپیکر پر شروع کرتے ہیں جو تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہتا ہے۔گویا تین گھنٹے اسی معاملے میں یہ لے لیتے ہیں جبکہ مسجد نبوی ﷺ میں آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیا جاتا۔

خانہ کعبہ میں طواف کرتے ہوئے بھی میرے اندر ایک کیفیت تھی مگر وہ خدا تعالیٰ کی عظمتوں اور بلندیوں کی کیفیت تھی۔ مگر یہاں جب کوئی مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ پر آتا ہے تو ضرور روتا ہے۔میں نے اپنے سمیت یہاں آنے والا کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو یہاں آکر آبدیدہ نہ ہوا ہو۔ یہ آنسو یقیناً خوشی کے ہوتے ہیں لیکن ان کے پس منظر میں وہ مناظر ہوتے ہیں جو تاریخ میں درج ہیں اور قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں یہ کہا تھا یا یہاں یہ ارشاد فرمایا تھا۔ دوسرے لفظوں میں تمام تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔اور محسوس ہوتا ہے کہ اس عظیم قائد نے کتنی جاہل قوم کو ایک لڑی میں پرو کر کتنا مشکل کام سرانجام دیا۔یہ اتنا بڑا کام ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص یہ کام انجام دے ہی نہیں سکتا تھا۔

مہذب قوموں میں ریفارمر کا آجانا ایک اچھی بات ہے۔ لیکن باقی مصلحین کو جو قومیں ملیں وہ مہذب تھیں اوران کے لیے بڑی سہولتیں تھیں۔ مگر رسول اکرم ﷺ کو جو ملک، قوم اور آب و ہوا ملی وہ بہت اور طرح کی تھیں۔ وہ انتہائی ابتری والی تھیں۔ ان حالات کو بدلنے کیلئے صرف رسول اکرم ﷺ کی ضرورت تھی۔ ان کے علاوہ کوئی ان حالات کو ٹھیک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں جب ہم ان واقعات کو سوچتے ہیں تو کم از کم میرے چھوٹے سے ذہن میں تو یہی بات آتی ہے کہ جو کارنامہ محمد ﷺ عربی نے اس سرزمین پر کردکھایا اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اب تو معاملات بدل گئے ہیں۔ نہ کوئی نیا مذہب آنا ہے اور نہ ہی کوئی پیغمبر آنا ہے لیکن آج کے دور میں اگر کوئی سیاسی اصلاحات بھی کرنا چاہے تو اسے بہت پُر خار راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور کسی بگڑے ہوئے معاشرے کو ٹھیک کرنے کے لیے اسے اتنی اذیتیں سہنی پڑتی ہیں کہ وہ یا تو ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور یا پھر پھانسی پر چڑھادیا جاتا ہے۔ جو کام پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں میں آج نہیں ہو سکتا وہ کام اس ذات برتر نے اس زمانے میں کردکھایا جب علم کی روشنی کم تھی اور لوگوں کے ذہنوں پر وحشت سوار تھی اور لہو ولعب اور فسق وفجور تھا۔

رسول خدا ﷺ نے ایک چھوٹے سے شہر سے اپنی تحریک شروع کی اور ان کا پیغام بڑھتے بڑھتے ساری دنیا میں پھیلا۔ اسلام تو عام آدمی کا مذہب ہے۔ یہ چھوٹے لوگوں سے شروع ہو کر بڑے لوگوں تک پہنچا اور اس نے مملکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اور بادشاہوں کو اپنے قدموں میں جھکایا اور فقیری کا درس دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ عرصے بعد لوگ اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کو بلا کر ملوکیت کی طرف چلے گئے۔ اس سے سب خرابیاں پیدا ہوئیں جن کے نتیجے میں ہم

لوگ آج تک پس رہے ہیں۔ آج اسلام مختلف فرقوں میں بٹا ہوا ہے اور ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اسلام کے مطابق نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرکز جس پر ہمیں رسول اکرم ﷺ لائے تھے ہم اس پر نہیں رہے۔

کہنا مقصود یہ ہے کہ جس وقت آدمی مسجد نبوی ﷺ پر جاتا ہے یا روضہ رسول ﷺ کا دیدار کرتا ہے تو اس وقت اگر اسے تاریخ کا تھوڑا سا بھی شعور ہو تو وہ ضرور بہت ہی متاثر ہوتا ہے۔ میں نے وہاں پر دیکھا کہ لوگ دنیا کے مختلف علاقوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ایک آدمی کو میں نے خاص طور پر دیکھا اور اس نے بھی مجھے بغور دیکھا۔ وہ صاحب شاید مجھے پہچان نہ سکے ہوں بلکہ صرف اتنا ہی اندازہ کیا ہو کہ میں پاکستانی ہوں لیکن میں انہیں پہچان گیا یہ غلام مصطفی جتوئی تھے۔ جتنی بار میں وہاں نماز ادا کرنے کے لیے گیا یہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور بڑی رقت سے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے۔ پہلی مرتبہ تو میں ان سے نہیں ملا لیکن جب دوسری نماز کیلئے گیا تو ان سے ملا۔ جب میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ مجھے جانتے تھے کیونکہ انہیں علم و ادب سے بھی کچھ شغف تھا۔ پھر جس زمانے میں میری ایک کتاب کا بروشر چھپا تھا وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے اور بروشر میں ان کا پیغام بھی چھپا تھا۔

جتوئی صاحب نماز کے بعد مجھے اپنے ہمراہ اس ہوٹل میں لے گئے جس میں انہوں نے قیام کیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے نیچے لابی میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور پھر لمبی چوڑی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد بھی ہم سنتے رہے کہ یہ ہر سال میں ایک دو بار حاضری دینے کیلئے وہاں ضرور جاتے ہیں۔

وہاں ایک حساس انسان اور شاعر پر جو گزرتی ہے۔ اس کا ایک رد عمل بھی ہونا چاہیے۔ لیکن میں اس

کوشش کے باوجود کہ وہاں کے تاثرات شعروں میں قلمبند کروں آج تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب بھی اس حوالے سے نعت خوانی کی کوشش کی ہے تو میں ناکام رہا ہوں۔ میں نے شعر لکھ لکھ کر پھاڑے ہیں۔ میں اس حوالے سے اس پائے کی کوئی ایسی نظم یا نعت نہیں کہہ پایا جسے میں سمجھوں کہ روضۂ رسول ﷺ کا ردعمل اس میں موجود ہے۔ میں اس بارے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کھلے بندوں کرتا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ بعض شعراء جب وہاں سے واپس آتے ہیں تو اپنی کسی نظم کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہ نظم روضہ رسول ﷺ پر جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کہی گئی۔ وہ نظم بھی عام سی ہوتی ہے اور ایسی نظمیں کہی بھی جا سکتی ہیں۔ ایسی نظمیں نہ صرف یہ کہ وہاں جا کر کہی جا سکتی ہیں بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس مقام کی حاضری کے بعد جو کچھ کہنا چاہیے اس بارے میں میرے تصور میں بات نہیں آتی کہ کیا کہنا چاہیے۔ اور وہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ کسی روز میں ایسے چند اشعار کہنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جن میں وہ کیفیت ضرور آئے گی جو اس وقت مجھ پر طاری تھی۔ اللہ مجھے اس کی توفیق دے۔

کلام سنانے کے رسیا

پرائمری تک میری تعلیم راولپنڈی میں ہوئی تھی بلکہ میں چوتھی جماعت بھی وہاں نہیں کر پایا تھا کہ مجھے ہری پور میں داخلہ لینا پڑا۔ ہم لوگ وہاں یعنی پنڈی میں محلہ امام باڑہ میں رہتے تھے اور میرا سکول اسلامیہ پرائمری سکول بنی مائی بھیرو کے قریب تھا۔ جب میں اپنے گھر سے گزر کر دوستوں کے ساتھ سکول جاتا تھا تو راستے میں ایک گھر کی دیوار پر ایک نیم پلیٹ لگی ملتی تھی جس پر لکھا ہوتا تھا عبدالعزیز فطرت۔ ہم لڑکے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ عبدالعزیز تو کئی لوگوں کا نام ہے

لیکن یہ فطرت کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے سے سمجھدار لڑکوں سے پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ فطرت ان کا تخلص ہے اور تخلص شاعروں کا ہوا کرتا ہے تو اپنے نام کے ساتھ یہ لکھتے ہیں اور اشعار میں جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں بھی اپنے نام کی بجائے اپنا تخلص استعمال کرتے ہیں گویا سب سے پہلے شاعر اور تخلص سے جو آگاہی ہوئی وہ عبدالعزیز فطرت کے نام سے ہوئی۔اس کے بعد جب ہوش سنبھالا اور خود شعر کہنے کے قابل ہوا تو عبدالعزیز فطرت کی نظمیں غزلیں ادھر ادھر رسالوں میں پڑھنے کو ملیں۔اور یوں محسوس ہوا کہ عبدالعزیز فطرت میرے بہت قریب ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور جب تھوڑا سا نام میرا بنا اور مجھے ہری پور سے جب پہلی بار راولپنڈی کے مشاعرے میں بلوایا گیا تو میرا پہلا مشاعرہ گارڈن کالج کا تھا۔اس میں مجھے بلانے والے شوکت واسطی تھے جو اس وقت وہاں سٹوڈنٹ تھے۔ یہ واقعہ میں الگ سے بھی بیان کر چکا ہوں۔ خیر! اسی مشاعرے میں میری ملاقات بہت سے سینئر شعراء سے بھی ہوئی۔اور ان میں سے جن لوگوں کے ساتھ دوستی پیدا ہوئی ان میں عبدالعزیز فطرت اور جگن ناتھ آزاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔فطرت صاحب کے دم قدم سے پنڈی کی ادبی بہاریں اور رونقیں تھیں۔انہیں ادبی سرگرمیوں سے گہرا تعلق تھا۔چھوٹی نشستیں تو ان کے گھر پر ہوتی رہتی تھیں اور جب بھی باہر سے کوئی شاعر آتا تو وہ کچھ شعراء کو بلا کر اپنے گھر میں ایسی نشستیں کرتے رہتے تھے۔اس کے علاوہ درمیانے درجے کے مشاعرے وہ علاقائی حد تک کر لیتے تھے اور کبھی کبھی بڑے درجے کے مشاعرے آل انڈیا حد تک بھی کروا لیتے تھے۔ان مشاعروں کے انتظامات کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔چنانچہ جب تک ان کی زندگی رہی انہوں نے اپنے آپ کو اُردو ادب کی خدمت کے لے وقف کئے رکھا۔ اچھے شاعر ہونے

کے ساتھ ساتھ وہ بہت زندہ دل، لطیفہ گو اور جملہ باز آدمی بھی تھے۔ مقامی طور پر جیسے کہ ادبی سیاسیات ہوتی ہیں ان میں اپنے آپ کو کافی حد تک ملوث کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات تو الزامات بھی اپنے اوپر لینا قبول کر لیتے تھے۔ وہ دراصل پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور ایک عرصہ وہ ڈاک کے سپروائزر بھی رہے۔ اس عرصہ میں ان پر یہ الزام بھی لگا کہ وہ اپنے مخالفین کے خطوط نکال کر پڑھ لیتے ہیں۔ خدا جانے یہ الزام غلط تھا یا درست۔ ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ مخالفین کی ادبی سرگرمیوں میں رخنے پیدا کر دیتے ہیں اور اگر دیکھیں کہ کوئی پروگرام ان کے پروگرام سے ٹکراتا ہے تو اس کے سد باب کے لیے بھی پہلے ہی سے بندوبست کر لیتے ہیں واللہ علم بالصواب۔ لیکن اس سے یہ بات ضرور ظاہر ہوئی کہ وہ ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کتنے سنجیدہ تھے۔ اس میں کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا بھی مقصود نہیں تھا صرف یہ تھا کہ جو کریڈٹ فطرت صاحب کو ملنا چاہیے تھا وہ کسی اور کو نہیں لینے دیتے تھے۔ ان کی ساری باتوں کا مقصد یہی ہوا کرتا تھا۔

ان کے حریفوں میں ایک اور بزرگ دوست اور شاعر انجم رضوانی تھے جو اب بھی بقید حیات ہیں اور بہت پختہ شعر کہتے ہیں۔ دونوں میں ایک چیز قدر مشترک تھی کہ دونوں خوب نپے تلے شعر کہتے تھے اور قوافی کے سلسلے میں شائیگان قافیوں کی طرف کبھی نہیں گئے بلکہ بالکل ایک آواز کے قافیے لاتے تھے۔ جیسے کہ سہارا قافیہ نظارا یا کنارا ہی لاتے تھے تاکہ صوت مجروح نہ ہو۔ دونوں کے کچھ شاگرد اور دوست بھی تھے۔

اس زمانے میں ہمارے دوست فطرت ہی تھے۔ ہمارے دوستوں میں جمیل ملک کے استاد حضرت انجم رضوانی تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دوستوں کی طرف تھوڑا جھکاؤ اور پاسداری تو ہوتی ہے۔ چنانچہ

ہم لوگوں کا جھکاؤ فطرت صاحب کی طرف تھا۔ انجم رضوانی اس سے وہ لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ ہم لوگ بھی ایک دوبار ان کے ساتھ پکنک پر گئے۔ یہ زمانہ خالص گھی کا تھا۔ لیکن اس زمانے میں انجم صاحب بناسپتی گھی استعمال کرتے تھے اور گھر میں تیر مارکہ بناسپتی کا پورا ایک کنستر لاکر رکھ دیتے تھے جس سے ہر چیز پکتی تھی۔

ہمارے دوست احمد ظفر بہت ہی شگفتہ مزاج تھے اور بعض اوقات ایسا جملہ فٹ کرتے تھے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ انجم صاحب چونکہ کمزور آدمی ہیں اور کمان میں تیر رکھ کر نہیں چلا سکتے جبکہ چاہتے بھی ہیں کہ عبدالعزیز فطرت کے سینے میں تیر پیوست کیا جائے تو اصلی تیر کی بجائے وہ تیر مارکہ بناسپتی کھا کر ایسا شعر کہتے ہیں جو جاکر فطرت صاحب کے سینے میں پیوست ہو جائے۔

اب عبدالعزیز فطرت صاحب کو زندہ دلی کا اندازہ کیجئے۔ کہا گیا کہ یہ جو چکور ہوتا ہے یہ کیا ہوتا ہے۔ مسلمان کہتے تھے کہ یہ کہتا ہے سبحان تیری قدرت۔ اور ہندو کہتے تھے کہ یہ کہتا ہے رام نام دشرت۔ عبدالعزیز فطرت کہنے لگے کہ یہ دونوں فریق غلط کہتے ہیں اور اصل میں چکور کہتا ہے "عبدالعزیز فطرت"۔

فطرت فیملی میں پہلے تو ان کے برادر نسبتی شعر کہتے تھے جن کا نام ایوب محسن تھا۔ وہ اچھے شاعر تھے اور ان کی فن پر بڑی دسترس تھی۔ لیکن وہ ٹرانسپورٹ میں جاکر ایسے کاروباری بنے کہ شعر پر ان کی توجہ بہت کم ہو گئی اور وہ اضافی وقت کاروبار کی طرف دیتے گئے چنانچہ وہ اب بہت خوشحال لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات مجھے ہمیشہ کھٹکی کہ فطرت صاحب کے مرنے کے بعد ان کا

مجموعہ کلام بہت جلدی آنا چاہیے تھا مگر ایوب محسن صاحب نے ان کا مجموعہ چھاپنے میں بڑی کوتاہی کی کیونکہ لوگ تو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ بالآخر فطرت صاحب کا مجموعہ چھپا اور اس وقت چھپا جب اس کا بہت کم فائدہ مرحوم کی شہرت کو ہوا۔ کیونکہ ان کی وفات اور اس کی اشاعت میں اٹھارہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔

فطرت صاحب کے ایک بیٹے کا نام نسیم سحر ہے۔ وہ بہت زرخیز طبیعت رکھتے ہیں۔ یہ ایک مدت سے سروس کے سلسلے میں سعودی عرب میں ہیں لیکن وہاں بھی فطرت صاحب کے مزاج کے مطابق وہ شعر و ادب کی جوت جلائے ہوئے ہیں۔ خود بھی شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ وہ وہاں کی ادبی سرگرمیاں لکھ کر پاکستان اور ہندوستان کے پرچوں میں چھپواتے بھی ہیں۔

فطرت صاحب ہی نے راولپنڈی میں ایک مشاعرہ کروایا تھا جسے ہم آل انڈیا مشاعرہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں پنجاب اور سرحد کے بیشتر شعراء شریک ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیوم نظر اور یوسف ظفر کا نام ایک ساتھ آتا تھا۔ جیسے دونوں جڑواں بھائی ہوں۔ ان کے نام لازم و ملزوم تھے اور مشاعروں میں بھی جب وہ جاتے تھے تو ایک ساتھ ہی جاتے تھے۔ قیوم نظر صاحب نے ہیئت کے بہت خوبصورت تجربے کئے ہوئے تھے اور یوسف ظفر صاحب نظموں کے علاوہ خوبصورت غزلیں کہہ رہے تھے۔

خرابی یوسف ظفر صاحب میں یہ تھی کہ وہ نروس بریک ڈاؤن کے شکار تھے اور جب مطلع کہنے پر انہیں داد نہیں ملتی تھی تو وہ باقاعدہ بے ہوش ہو کر نیچے گرپڑتے تھے۔ان کے سنبھالنے کا دوستوں کو پہلے اہتمام کرنا پڑتا تھا اور دوست مل کر انہیں مطلع پر پہلے خوب داد دیتے تھے جس کے بعد وہ آگے چل نکلتے تھے اور قیوم نظر صاحب کا تھوڑا سا زور تو ہیئت کے لیے تجربوں پر ہوتا تھا اور تھوڑا زور دوسری جدتوں پر ہوتا تھا اس لیے وہ داد لے ہی جایا کرتے تھے۔ نجی محفلوں میں تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ پیروڈی اور جملہ بازی خوب کرتے تھے اور محفل کی جان بن جاتے تھے۔

یہیں سے میرے دونوں حضرات سے تعلقات بنے۔ یوسف ظفر صاحب کا تو بعد میں زندگی کا رویہ بدلا اور وہ زندہ دلی سے سنجیدگی کی طرف بھاگ نکلے اور حج کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اٹھتے بیٹھتے صرف حج کے آس پاس کی باتیں کرتے تھے۔انہوں نے داڑھی بھی بڑھائی تھی اور کچھ معجزاتی سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن قیوم نظر صاحب اب بھی بہت خوش باش ہیں۔خدا انہیں زندگی دے۔اب ذرا کمزور سے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہی بہت زندہ دل اور جملہ باز رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے دو جوان بیٹے ان کے سامنے لقمہ اجل بنے۔خدا ہی جانے کہ انہوں نے غم کے اتنے طوفان اپنے اندر کس طرح چھپائے اور اوپر سے ہنستے رہے۔

حب ان کا بیٹا سلمان سمن آباد لاہور میں حادثے کا شکار ہوا تو ان کی طرف گیا۔وہ ہنس کر کہنے لگے "یار قتیل میں تو ڈھیٹ ہو گیا۔دیکھ لو بیٹے مر رہے ہیں اور میں زندہ ہوں۔اور ڈھیٹ ہو گیا ہوں" یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ رو نہیں رہے تھے لیکن میں ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میرا ایک مصرع ہے۔

جو پلکوں پر نہیں آتا وہ آنسو دل پہ گرتا ہے

میرا خیال ہے کہ آنسوؤں کی ایک ایک برسات ان کے دل پر گر رہی تھی لیکن ان کے چہرے کی وضع داری وہی تھی۔

پیروڈی کہنے میں قیوم نظر کو جو کمال حاصل تھا اس کی ایک مثال سنئے۔ٹی وی کا ایک مشاعرہ تھا ہم سب وہاں گئے تو شاعروں کو رائلٹی کے سلسلے میں ضیاء جالندھری کا رویہ زیر بحث تھا اور لوگ ان کے بارے میں عجیب عجیب ریمارکس دے رہے تھے۔ قیوم نظر نے کہا۔

خوش آگئی ہے ضیا کو جالندھری میری

وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

انہوں نے علامہ اقبال کے ایک شعر کی پیروڈی کی تھی جس میں ضیاء صاحب کو لے آئے تھے۔یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔وہ بھی جالندھر کے تھے اور یہ بھی جالندھر کے تھے۔اس پس منظر میں ان کی اس پیروڈی نے جو لطف دیا وہ آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

قیوم نظر اب کراچی میں ہیں اور سنا ہے کہ بہت مضمحل ہو چکے ہیں اور جسم میں رعشہ بھی آچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ پتھر کے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسان تھے اور دو جواں سال بیٹوں کی ناگہانی موت کے جو دو بھونچال ان کے اندر آئے انہوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔اب وہ کہاں تک ان زلزلوں کا مقابلہ کرتے۔ان کے اندر جو دراڑیں پڑ چکی تھیں ان سے ان کے جسم نے بھی متاثر تو ہونا ہی تھا۔ روح کے زخم تو چھپائے جا سکتے ہیں لیکن جسم پر ہونے والے صدمات کے اثرات کو نہیں چھپایا جا سکتا۔

مجھے قیوم نظر صاحب سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ان کی یہ حالت سننے کے باوجود میں سمجھتا

ہوں کہ ان کی زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا ہو گا اور اگر اب بھی میں ان سے ملنے وہاں جاؤں تو شاید آج بھی وہ اسی طرح کوئی جملہ یا لطیفہ سنائیں اور ان کے چہرے پر اسی طرح کوئی مسکراہٹ ہو۔
جس زمانے میں قیوم نظر اور یوسف ظفر کا نام گونج رہا تھا اس زمانے میں ان کے ایک تیسرے ساتھی عبدالمجید بھٹی تھے جو ان کے سینئر تھے اور جن کی عزت بھی کی جاتی تھی۔ ان سے میری ملاقات بھی فطرت صاحب کے مشاعروں میں ہئی اور ان سے ایک تعلق خاطر قائم ہو گیا۔ میں نے بھٹی صاحب سے جو کچھ سیکھا وہ محنت، لگن اور جنون تھا۔

بھٹی صاحب بھی میری طرح زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہوں نے تمام زندگی بڑی وضعداری سے گزاری۔ قلم کی کمائی کے علاوہ ان کا پیٹ پالنے کا اور کوئی وسیلہ نہیں تھا لیکن کیا مجال کہ ان کے اخراجات کے معیار پر کبھی کوئی آنچ آئے یا کسی نے بھٹی صاحب کو دستِ سوال تو درکنار قرض مانگتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ وہ ٹی ہاؤس میں آئیں، کافی ہاؤس یا عرب ہوٹل میں ہوں ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ بل خود ادا کریں۔ ان کے گھر کوئی چلا جاتا تو کھانے یا چائے میں سے جس چیز کا بھی وقت ہوتا اس سے تواضع کرتے تھے اور انہوں نے اسی طرح تمام زندگی گزار دی۔
میرے ساتھ ان کے مراسم ایک جونیئر کے سے تھے۔ چونکہ وہ سینئر تھے اس لیے انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ اکثر معاملات میں مجھے مشورے دیں۔ میرا ذہن ان سے تھوڑا نیا تھا اور وہ کچھ پرانے رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ لیکن وہ ایسے پیچھے بھی نہیں تھے۔ جب کبھی تجربات کا شوق اٹھتا تھا تو تجربے بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسا تجربہ بھی کیا جو برسوں لوگوں کے موضوع بحث رہا۔ یہ ان کی ایک

نظم تھی جو انہوں نے سب سے پہلے مجھے سنائی۔اور کہنے لگے کہ میں نے اس میں بڑا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے جو نظم سنائی،اس کا عنوان تھا" برہن" اور چھن چھن کے الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ بلکہ وہ نظم کچھ یوں تھی۔

چھن چھن

چھن چھن چھن

چھن

چھن چھن چھن چھن

چھن

چھن۔۔۔ چھن۔۔۔ چھن

کہنے لگے کہ کیسی ہے یہ نظم۔میں نے کہاکہ بزرگو! یہ تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسی ہے۔اب آپ جو مطلب مجھے اس کا بتا رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے تو آپ نے مطلب سمجھا دیا مگر کیا آپ ہر پڑھنے والے کو بھی اس طرح مطلب سمجھائیں گے۔میں نے کہاکہ آپ اسے جانے دیجئے ۔کہنے لگے کہ نہیں نہیں۔

میں نے پھر انہیں ایک لطیفہ سنایا کہ ایک ڈرائنگ ماسٹر نے اپنے شاگرد سے کہاکہ تصویر بناؤ کہ گائے چراگاہ میں چر رہی ہے۔وہ پانچ منٹ میں تصویر بنا کر لے آیا۔تصویر کو ٹیچر کے سامنے رکھا تو یہ ایک سادہ کاغذ تھا۔اس نے کہاکہ یہ کیا ہے۔تو شاگرد نے کہاکہ تصویر ہے۔ٹیچر نے کہا کہ گھاس کہاں

ہے تو شاگرد نے کہا کہ وہ تو گھاس کھا کر چلی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ یہ بالکل اسی قسم کی نظم ہے اس لیے آپ اسے نہ چھپوایئے۔ مگر انہوں نے کہا کہ یہ طوفانی نظم ہے میں تو چھپواؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظم چھپوائی۔ نظم کا چھپنا تھا کہ جہاں جہاں ادیبوں کے ٹولے ہوتے تھے وہاں اس پر بحث چلتی رہی اور اس کی بہت پیروڈی ہوئی۔ حتیٰ کہ عبدالمجید سالک جیسے ثقہ بزرگ نے بھی اس کی پیروڈی کی اور اپنے کالم میں اس کا ذکر کیا۔اس کے بعد چراغ حسن حسرت جیسے بزرگ نے بھی اس کا خاصا نوٹس لیا۔ غرض یہ نظم کئی سال تک زیر بحث رہی لیکن بھٹی صاحب کا خیال تھا کہ اس نظم کی کامیابی کی یہ دلیل ہے کہ کئی سال تک لوگ اس پر بحث کرتے رہے۔

ایک اور بھی بھٹی صاحب کی خصوصیت تھی۔انہیں کلام سنانے کی عادت تھی۔وہ جب تک اپنی لکھی ہوئی کوئی نئی چیز سنا نہیں لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ اکثر دوستوں کو معلوم تھا کہ ان کی یہ عادت ہے۔لہٰذا دوست گریز کرتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں اپنا تجربہ بیان کرلوں۔ وہ اسلامیہ کالج کے سامنے ریلوے روڈ پر ایک چوبارے میں رہتے تھے۔میں ان سے ملنے کیلئے گیا تو وہ حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور میرے لیے چائے منگوائی۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے کچھ افسانے لکھنے شروع کئے ہیں۔ذرا سنو تو سہی۔میں مؤدب ہو کر بیٹھ گیا اور کہا کہ میں اس پر رائے تو نہیں دے سکوں گا۔کہنے لگے کہ نہیں آپ قاری تو ہیں اور میں قاری کی حیثیت سے آپ سے اس پر رائے لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے دو افسانے سنائے۔اس میں کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا کیونکہ خاصے طویل افسانے تھے۔اب مجھے واپس بھی جانا تھا۔افسانے ختم ہوئے تو میں نے اجازت چاہی۔کہنے لگے کہ نہیں آپ کھانا کھا کر جاؤ۔کیونکہ تم نے یہاں بہت وقت صرف کیا ہے۔جب

تک گھر پہنچو گے تو کھانے کا وقت گزر جائے گا۔ چنانچہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں جانے کیلئے اٹھا تو کہنے لگے کہ ذرا بیٹھو۔ کچھ تازہ کلام ہے وہ سن لو۔ میں نے ان کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن ان کی سنانے کی عادت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ انہوں نے کچھ چیزیں سنائیں کہ اچانک اندر سے آواز آئی۔ یہ اندر گئے تو میں باہر سے چپکے سے کھسک کر وہاں سے بھاگ آیا۔ میں نے ان کے بارے میں جو سنا تھا اس کا اب یقین آنے لگا۔ اس لیے میں واقعی ایک طرح سے بھاگ کر ہی وہاں سے آیا کیونکہ مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر میں وہاں بیٹھا رہا تو شام کا کھانا بھی وہیں کھانا پڑے گا۔

بھٹی صاحب کے سنانے کے سلسلے میں ایک اور لطیفہ بھی مشہور ہوا۔ یہاں میں ان سے معذرت چاہوں گا کیونکہ وہ بہت خوبیوں کے مالک تھے باقی اس طرح کی عادتیں تو سب میں ہی ہو سکتی ہیں۔ ہوا یوں کہ بھٹی صاحب صبح صبح ایک دن جناب احمد ندیم قاسمی کے ہاں پہنچ گئے۔ قاسمی صاحب اس وقت نسبت روڈ پر رہتے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں نے ایک ناول لکھا ہے اس کا ایک آدھ باب آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ رائے لے سکوں۔ انہوں نے ایک باب سنایا اور پھر دوسرے پر پہنچ گئے اور وہاں سے پھر تیسرے باب پر پہنچ گئے۔ اب دونوں بزرگ سگریٹ پی رہے ہیں۔ ایک بزرگ سنا رہا ہے اور دوسرا سن رہا ہے۔ کہ اتنے میں سعادت حسن منٹو وہاں آ گئے۔ یہ منٹو صاحب کی وارفتگی کا زمانہ تھا اور وہ کبھی کبھی ان دوستوں کے پاس چلے جاتے تھے جہاں انہیں لینے دینے میں عار نہ ہو۔ قاسمی صاحب کے پاس جب وہ پہنچے تو بھٹی صاحب اپنا ناول سنا رہے تھے۔ انہوں نے بھٹی صاحب پر تو توجہ نہ دی لیکن قاسمی صاحب سے کہا کہ مجھے کچھ پیسے دے دیجئے۔ قاسمی صاحب اندر گئے اور منٹو صاحب کو پیسے لا دیئے۔ جب منٹو صاحب جانے لگے تو بھٹی صاحب نے کہا

کہ منٹو صاحب ذرا ایک منٹ بات سنئے میں قاسمی صاحب کو اپنے ناول کے کچھ باب سنا چکا ہوں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑی دیر آپ بھی بیٹھئے اور ایک باب سن لیجئے کیونکہ آپ کی رائے میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

منٹو صاحب نے انہیں دھتکار دیا اور کہا کہ قاسمی تو بیوقوف ہے اور تم نے مجھے بھی بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ سننے میں آتا ہے کہ اس کے باوجود بھٹی صاحب نے بازو سے پکڑ کر منٹو صاحب کو بٹھا لیا اور کہا کہ نہیں صاحب میں تو آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا چاہے آپ کچھ بھی کہتے رہیں۔ میں آپ کو کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور سنا کر بھیجوں گا۔ آخر کار منٹو بیچارے کو بیٹھنا پڑ گیا اور بھٹی صاحب نے انہیں سنا کر ہی وہاں سے جانے دیا۔ سنانے کے ایک اور مریض ہمارے دوست حافظ لدھیانوی بھی تھے۔

میں مصری شاہ میں رہتا تھا اور سائیکل اس زمانے میں میری سواری تھی۔ اس زمانے میں اکثر خوشحال لوگوں کے پاس سائیکل ہی ہوا کرتی تھی یا پھر وہ پیدل یا تانگے پر سفر کرتے تھے۔ میں جب مصری شاہ سے نکلتا تھا تو ریلوے سٹیشن کے قریب ریوالی سینما سے گزر کر ''اداکار'' کے دفتر جاتا تھا جس کا میں ایڈیٹر تھا۔ حافظ صاحب ریوالی سینما کے ارد گرد کہیں رہتے تھے۔ انہیں میرے آنے جانے کا وقت معلوم تھا۔ اکثر میں دیکھتا تو یہ انگریزی سوٹ پہنے وہاں کھڑے ہوتے۔ خاصے خوش پوش تھے۔ جب میں وہاں سے گزرتا تو میری سائیکل روک کر کہتے کہ یار قتیل سناؤ کچھ کہا ہے۔ میں نے اگر کچھ کہا بھی ہوتا تو سناتا نہیں تھا کیونکہ مجھے سنانے کی بالکل عادت نہیں ہے۔ چنانچہ معذرت کر لیتا لیکن یہ کہتے کہ اچھا پھر مجھ سے سنو۔ یہ کوئی نہ کوئی تازہ چیز سنا دیتے تھے۔

ویسے تو شعر سننے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس طرح شعر سننا بڑا بے موقع سا تھا۔اور پھر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سننا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ جب کئی بار ایسے ہوا تو میں نے سوچا کہ کس طرح جان چھڑائی جائے۔حافظ صاحب دوست بھی ہیں اور چاہتا تھا کہ وہ ناراض بھی نہ ہوں لیکن اس کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔چنانچہ ایک دن پلاننگ کے تحت میں نے پہلے سے کہی ہوئی دس غزلیں جیب میں رکھیں۔حافظ صاحب نے اسی طرح اس دن مجھے روکا اور پوچھا کہ کوئی تازہ کلام کہا ہے۔میں نے کہا سنئے۔میں نے ایک غزل سنائی تو انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ شاید میں ختم کر چکا ہوں۔ لیکن میں نے دوسری غزل شروع کر دی۔اور سناتے سناتے میں نے دس کی دس غزلیں سنا دیں۔اس کے بعد میں نے ایک غزل حافظ صاحب کی بھی سن لی۔ لیکن جس طرح انہوں نے دس غزلیں مجھ سے سنیں وہ ان کے چہرے سے نظر آ رہا تھا۔ان کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر پھاڑ دیتے اور صرف اپنی غزل سناتے مگر انہیں سننی پڑیں۔اس کے بعد میں نے مستقل طور پر اپنی جیب میں غزلیں رکھنی شروع کر دیں۔کچھ دن تو وہ نظر نہیں آئے لیکن ایک دن پھر کھڑے نظر آئے اور کہنے لگے کہ کوئی تازہ کلام ہی سناتے جاؤ۔میں نے کہا کہ ضرور سنئے اور اس کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذوں کا ایک پلندہ نکال لیا۔وہ اتنے سارے کاغذات دیکھ کر ایسے گھبرائے کہ کہنے لگے کہ ذرا ٹھہرو میں گھر میں ایک ضروری بات کہہ کر ابھی آتا ہوں اور اس کے بعد ایسے گئے کہ پھر اس کے بعد اس راستے پر آ کر کبھی کھڑے نہیں ہوئے۔اس طرح میرا راستہ صاف ہو گیا۔

شعر سنانے کے ایک اور رسیا مرزا خورشید جاہ تھے۔آپ کا دعویٰ تھا کہ آپ مغلیہ خاندان کے آخری چشم وچراغ ہیں۔ان کے رہن سہن اور عادات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔یہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور جب دعوتیں کرتے تھے تو وہی مغلوں والے ٹھاٹھ ہوتے تھے اور بیس پچیس کھانے اور چھ سات سویٹ ڈش پکی ہوتی تھیں۔ سنانے کا مرض انہیں بھی تھا۔

مجھ سے ان کے مراسم کچھ ایسے ہو گئے تھے جن کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ میرے قتیل سے خصوصی مراسم ہیں۔اس کے کچھ فائدے بھی تھے کہ وہ اکثر دعوتوں میں مجھے بلاتے تھے لیکن کچھ نقصانات بھی تھے اور وہ یہ کہ وہ اکثر رات کو بارہ ایک بجے مجھے فون کر کے کہتے تھے کہ لیجئے میرا تازہ کلام سنئے اور یہ کلام ان کی اپنی زبان میں نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی ایک عزیزہ تھیں جو خوش الحان تھیں وہ ان کی آواز میں اپنا کلام ریکارڈ کروالیتے تھے اور پھر ٹیپ چلا کر فون کے ذریعے اپنا کلام سنواتے تھے اور ایک دوسرا ریسوراپنے کان سے لگا کر میری داد سنتے تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ ٹیپ ریکارڈ مجھے پورا ایک ایک گھنٹہ سننا پڑتا اور داد بھی دینی پڑتی۔

خدا انہیں بخشے۔اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔اتنی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کا یہ پہلو کمزور تھا۔ وہ دوستوں کی قوت سماعت کو آزماتے تھے۔یہ بات شعر سنانے والے مریضوں میں ہی پائی جاتی ہے ۔ان کا دیا ہوا ایک پاؤنڈ جسے وہ اشرفی کہتے تھے بہت دیر تک میرے پاس رہا لیکن آخر کار وہ چوری ہو گیا۔انہوں نے ایک پرائیویٹ نشست میں میری شاعری کی تعریف کر کے کہا تھا کہ میں ان کی تعریف میں یہ اشرفی پیش کرتا ہوں۔

خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی

1947ء میں جب میں لاہور آیا تو میرا تعارف ایک خاتون چندر کانتا سے ہوا تھا جو فلم میں قسمت آزمانے آئی تھیں۔ان سے گہرے مراسم ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر لوگ ریسٹورنٹ یا بار میں شام گزارتے تھے۔ان دنوں مال روڈ پر سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ ہوتا تھا جس میں کچھ ریزرو قسم کے لوگ آکر Couples کی شکل میں بیٹھتے تھے۔ میرا بھی وہاں آنے جانے کا اتفاق رہتا تھا۔

وہاں میں نے دیکھا کہ خواجہ احمد عباس کبھی گیتا بالی کے ساتھ نظر آتے تھے اور کبھی ایک کرسچن لڑکی کے ساتھ جو اس وقت کے مشہور مزاحیہ اداکار مجنوں کی بہن تھی۔اس خاتون کا نام اب مجھے یاد نہیں۔یہ اکثر ان دو کے ساتھ پائے جاتے تھے۔پھر دیکھا کہ گیتا بالی تو غائب ہو گئی اور وہ کرسچن خاتون ہی صرف ان کے ساتھ دکھائی دینے لگی۔

خواجہ احمد عباس اصل میں تو سارا کاروبار حیات ممبئی میں کرتے تھے لیکن ایک پروگریسو فلم کی تکمیل کے لیے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔فلم کا نام "آج اور کل" تھا۔یہ فلم لاہور میں بن رہی تھی اور خواجہ صاحب کی ٹیم میں اس وقت کے پڑھے لکھے لوگ موجود تھے۔مثلاً میوزک ڈائریکٹر خورشید انور تھے اور اپنے زمانے میں ان سے پڑھا لکھا ہوا میوزک ڈائریکٹر اور کوئی نہیں تھا۔ یہ لوگ "آج اور کل" بنا رہے تھے۔

سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ ہی میں میرا اور خواجہ صاحب کا تعارف ہوا اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چائے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔اس کے بعد بھی ان سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی لیکن یہ

ملاقات رسمی حد تک محدود رہی۔مارچ 1947ء میں جب ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو اس سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور شہر میں افراتفری پھیل گئی۔اس سے خاص طور پر پروڈکشن بہت متاثر ہوئی۔خیالستان پروڈکشن جس میں میں کام کرتا تھا اس کا کام بھی رک گیا۔اور خواجہ صاحب کی پکچر بھی رک گئی۔اس دوران لوگوں کا ریستورانوں میں جانا بھی بند ہو گیا۔کیونکہ فسادات کا اندیشہ بھی ہوتا تھا اور سرِ شام کرفیو بھی لگ جاتا تھا۔پھر لاہور میں خواجہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔لیکن جب میں ممبئی گیا تو میرے اعزاز میں منعقد ایک دعوت میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔1960ء کی بات ہے لیکن اس بار بھی خواجہ صاحب سے ملاقات محض سرسری رہی البتہ انہیں میرے ساتھ لاہور میں ہونے والی مختصر سی کچھ ملاقاتیں یاد تھیں۔اس کے بعد میں اٹھارہ سال کے وقفہ کے بعد جب 1978ء میں انڈیا گیا تو ان سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔

میں ان سے ملنے کیلئے خود ان کے گھر پر گیا۔دیکھا کہ گھر میں کوئی خاتون نہیں تھی۔ان کے ایک معتمد اور اسسٹنٹ وحید انور جو خود گانے بھی لکھتے ہیں اور افسانوں کے کچھ مجموعے بھی مرتب کر چکے ہیں،ان کے ساتھ ہوتے تھے۔اتنا معلوم تھا کہ خواجہ صاحب جب دوسروں کے لیے کہانی لکھتے ہیں تو وہ کمرشل لحاظ سے بہت ہٹ ہوتی ہے لیکن جب اپنے لیے کوئی کہانی لکھتے ہیں تو فلم اپنا خرچ بھی پورا نہیں کرتی۔

دراصل خواجہ صاحب ایک پیدائشی تخلیق کار تھے اور ان میں یہ لگن تھی کہ لوگوں کو ایسی فلمیں دی جائیں جو سنگ میل ثابت ہوں اور منزل کی نشاندہی کریں اور لوگ انہیں رہنما بنا کر آگے بڑھیں

چنانچہ انہوں نے زندگی میں جو کمایا اسی دھن میں لٹادیا ورنہ انہوں نے راجکپور کی جتنی فلمیں لکھیں جن میں فلم ''آوارہ'' بھی شامل ہے وہ سب کی سب ہٹ گئیں۔ مگر ان کی اپنی کوئی بھی فلم نہ چل سکی۔

نتیجہ یہ کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکلنے والے ایک پرچے میں اُردو صفحہ زندگی بھر لکھتے رہے اور اپنا خرچ چلاتے رہے۔ اس سے ہونے والی آمدن معمولی تھی۔ یا پھر وہ افسانے لکھتے تھے جن سے بھی کچھ معاوضہ مل جاتا تھا۔ فلم کی آمدن کا حساب تو یہ تھا کہ کنویں کی مٹی کنویں کی نذر ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں جب میں ان سے ملا تو ان کے معاشی حالات ایسے ہی تھے۔ پتہ چلا کہ مجنوں کی کرسچن بہن سے انہوں نے چوری چھپے شادی کرلی تھی اور اس سے ان کی ایک بچی بھی ہوئی جو ممبئی میں اس وقت بھی رہتی تھی مگر ان سے الگ رہتی تھی کیونکہ خواجہ صاحب کی یہ بیوی فوت ہو چکی تھی۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھٹنوں میں تکلیف ہوتی تھی اس کے باوجود جہاں بھی میری دعوت ہوتی اس میں وہ اہتمام سے پہنچتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ممبئی میں اپنے پہنچنے سے جتنی میری عزت افزائی خواجہ صاحب نے کی وہ میرے لیے بہت تھی کیونکہ میں تو ان کے شاگردوں جیسا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت سینئر ہی نہیں بلکہ ہمہ صفت اور ہمہ پہلو تھے۔ وہ ڈرامہ، فلم، ادب اور کالم نگاری میں ہر جگہ ہی بہت آگے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ان کے ساتھ جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے کچھ تصویروں کی شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ لاہور کی

باتیں بھی ہوتی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ میں پھر لاہور آؤں گا۔ عجب بات ہے کہ جو ایک بار لاہور میں آگیا پھر ہمیشہ لاہور کو یاد کرتا رہا اور یہاں آنے کا سوچتا رہا۔ جو لوگ یہاں پر بچپن یا جوانی گزار چکے تھے وہ تو چاہتے ہی تھے کہ یہاں آکر اپنا گھر بار دیکھیں۔ لیکن دوسرے لوگ بھی جنہوں نے لاہور میں ایک دو سال گزارے ہوتے تھے وہ بھی یہاں دوبارہ آنے کی تمنا رکھتے تھے۔

یہ قدرتی بات ہے شاید اس طرح پاکستان میں رہنے ولے وہ ہندوستانی جن کا وطن ہندوستان ہے وہ بھی اپنے وطن یا شہر کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتے ہوں۔ میں نے 1984ء میں خواجہ صاحب سے پروگرام بھی بنایا تھا کہ میں ان کے لیے یہاں لاہور میں ایک خاص تقریب کا اہتمام کروں گا اور انہیں بلواؤں گا۔ یہ تقریب ادیبوں اور فلم والوں کی طرف سے مشترکہ ہوگی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کی طبیعت روز بروز خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ''فن اور شخصیت'' کے ایڈیٹر صابر دت سے وہاں یہ بھی طے پایا تھا کہ خواجہ صاحب کے بارے میں ایک نمبر بھی نکلے گا لیکن ان کی موت سے یہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

خواجہ صاحب نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ وہ جس مکان میں رہتے ہیں اسے ٹرسٹ بنا دیا جائے اور اس کے ایک کمرے میں ان کا سارا کام رکھا جائے تاکہ وہ ادیبوں اور فلم والوں کے کام آسکے۔ لیکن وہاں پر ہوتا یہ ہے کہ بالعموم مکانات پگڑی پر ہوتے ہیں جبکہ مالک مکان کوئی اور ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کے پاس جو مکان تھا وہ دس لاکھ روپے کی پگڑی کا تھا۔ مگر ان کے کچھ رشتہ داران آئے جو اپنی وراثت کا ثبوت ظاہر کر کے بالا بالا ہی اس مکان کی پگڑی کا چار لاکھ روپے میں سودا کر کے چلے گئے۔ اب اس مکان کا مقدمہ چل رہا ہے۔

غرض خواجہ صاحب کا ٹرسٹ بنانے کا منصوبہ بھی رہ گیا اور ان کا نمبر بھی نہ نکل سکا۔ زمانہ یہی ہے کہ سب آنکھوں دیکھی باتیں ہوتی ہیں۔ جب تک کوئی سامنے ہوتا ہے تو اس کا لحاظ بھی ہوتا ہے اور جب آنکھیں بند ہو گئیں اور پیچھے نرینہ اولاد یا ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جن سے لوگوں کو کام نہ پڑے تو کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ اب ان کی وہ بیٹی جو مجنوں کی بہن سے تھی وہ جو شروع سے الگ رہ رہی تھی اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ اس معاملے میں داخل ہو گئی ہے۔ اور ان کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ یہ بہت لائق بیٹی ہے اور خواجہ صاحب کی اس میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خواجہ صاحب کی خواہشیں ان کے مرنے کے بعد پوری ہو جائیں

ایک دوسری شخصیت جسے فلم اور ادب دونوں کی شخصیت کہا جا سکتا ہے وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ لاہور سے ترک وطن کر کے ممبئی گئے تھے اور جب یہاں تھے تو وہ افسانہ نگاری میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے اور ان کا مجموعہ ''دانہ و دام'' کے نام سے چھپ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز پوسٹل کلرک کی حیثیت سے کیا تھا۔ اسی پیشے میں رہ کر انہوں نے شروع میں جو افسانے لکھے ان میں ان کے پیشے کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

اس زمانے میں ان کا ایک افسانہ میں نے بھی پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک میاں بیوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ پوری فیملی ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ میاں بیوی کو اپنی باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک دن ان کی سالی، بچہ اور ایک دوسرا آدمی جو گھر میں رہتے تھے وہاں موجود نہیں تھے تو ان میاں بیوی کو موقع ملا اور اس کی تشبیہ انہوں نے اس طرح دی کہ لکھا کہ اس

بابو نے اپنی بیوی کو بوسہ یوں لیا جیسے پوسٹل کلرک نے لفافے پر مہر لگادی ہو۔ان کی یہ تشبیہ حقیقت کے بہت قریب تھی اس لیے اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔

جب تک بیدی صاحب لاہور میں تھے توان سے میری ملاقات نہ ہوئی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جب لاہور شفٹ ہوا تھا تو وہ یہاں سے ترک وطن کر کے انڈیا جا چکے تھے۔بعد میں جب میں 1950ء کے لگ بھگ انڈیا گیا تو دہلی میں ایفروایشین کانفرنس ہو رہی تھی۔میں ممبئی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا اور مجھے وہاں سے واپس دہلی آکر اس کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔اتفاق سے ٹرین میں میری اور بیدی صاحب کی ریزرویشن ایک ہی ڈبے میں ہوئی۔یہ ہمارا پہلا ساتھ تھا۔

میں نے اس سے پہلے ان کے بارے میں داستانیں سن رکھی تھیں۔لیکن ایک قول ہے کہ کسی کی دوستی کا معیار پر کھنا ہو تو یا تو اس کے ساتھ جیل میں رہے یا اس کے ساتھ سفر کیجئے۔یہ ہمارا پہلا سفر تھا میں نے دیکھا کہ وہ بہت متوازن آدمی ہیں،دوسرے کا ذرا ذرا کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔اور خوش گفتار،بذلہ سنج،فقرہ باز اور ہنس مکھ ہیں۔اگر کوئی غم کی بات بھی کرنی ہے تو شگفتہ انداز میں کریں گے لیکن جذباتی بات جب بھی آتی تھی تو باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں لمحاتی طور پر آنسو آجاتے تھے۔وہ آنسو پونچھ کر پھر بات کو آگے بڑھا دیتے تھے۔آنکھوں میں آنسو آجانے والی ان کی کیفیت شروع سے تھی۔

ممبئی سے دہلی تک کا سفر تقریباً چھتیس گھنٹے کا تھا۔اس دوران ہم کھانے کیلئے ڈائننگ کار میں چلے

جاتے تھے۔اس خرچ سمیت سفر کے دوران کا تمام خرچ انہوں نے برداشت کیا۔اور افسانہ تو اچھا لکھتے ہی تھے لیکن افسانے پر گفتگو کمال کی کرتے تھے۔میں نے ڈائیلاگ نگاری کے بارے میں باکمال امروہی صاحب کی باتیں سنی تھیں یا پھر افسانے پر بیدی صاحب سے باتیں سنی تھیں۔انہوں نے افسانے کی تکنیک کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ افسانہ کیا ہے۔اور اچھے اور عام افسانے میں فرق کیا ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود کیسے افسانے لکھ رہے ہیں۔اس میں کوئی بڑائی کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے کمزور اور کامیاب دونوں طرح کے افسانوں کا حوالہ دیتے تھے۔اس طرح سے ان کے ساتھ میری بے تکلفی ہوئی۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ نکلا تو اٹھارہ سال تک میرا انڈیا جانا نہ ہوا۔1971ء کی جنگ میں بیدی صاحب نے ادھر سے بنگلہ دیش کے حق میں بات کی۔ ہمیں اس زمانے میں یہاں یہ باور کروادیا گیا تھا کہ بنگلہ دیش نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔بلکہ یہ صرف ایک پروپیگنڈا ہے۔ ہمیں تو اپنوں کی بات پر ہی یقین کرنا تھا۔

ادھر ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے '' کے نام سے ادیبوں کیلئے ایک پروگرام شروع ہوا۔میں نے اس میں جو مضمون پڑھا وہ بیدی صاحب کے نام تھا۔میں نے انہیں کہا تھا کہ آپ تو بہت شریف اور بھلے آدمی ہیں آپ بھی حکومت کی باتوں میں آکر بنگلہ دیش کی حقیقت کہہ رہے ہیں اور اپیلیں کررہے ہیں کہ مفاہمت سے کام لیا جائے اور لڑائی لڑنے کی بجائے مطالبات تسلیم کرلیے جائیں میں نے آخر میں کہا تھا کہ بیدی صاحب! جب یہ جنگ ختم ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ بنگلہ دیش سوائے کاغذ کے ایک نقشے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔میں نے جو مضمون ان کے نام لکھ کر براڈکاسٹ کروایا

وہ اس دعوے کی وجہ سے تھا جو ہمارے درمیان تعلق خاطر تھا۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ جنگ ختم ہوئی تو ہمارا وہ حصہ واقعی بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ اور بیدی صاحب کی باتیں سچی نکلیں۔

پتہ نہیں بیدی صاحب نے میری تقریر سنی یا نہیں سنی کیونکہ میں نے بھی ان کی تقریر براہ راست نہیں سنی تھی بلکہ مجھے ان کی تقریر کا سکرپٹ مہیا کیا گیا تھا۔ اور ریڈیو والوں نے کہا تھا کہ آپ اس کا جواب دیں۔ یہ تو خیر جنگوں میں ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے ملک کی حمایت کرتا ہے۔ مجھے جب کہا گیا کہ ساحر اچھا مسلمان ہے کہ جنگ کے زمانے میں اس نے پاکستان کے خلاف نظم کہی ہے تو میں نے کہا کہ اگر اس نے ایک نظم کہہ دی ہے۔ تو کیا ہوا میں نے پاکستان میں بیٹھ کر ہندوستان کے خلاف چار نظمیں کہی ہیں۔ دراصل نہ میں نے ہندوستان کے خلاف نظم کہی نہ ساحر نے پاکستان کے خلاف۔ بلکہ ہوا یوں کہ ہم دونوں نے اپنے اپنے ملکوں کے حق میں نظم کہی اور تمام شاعروں نے اس طرح نظمیں کہیں کیونکہ جنگوں میں ہم سب اجتماعی طور پر اپنے اپنے ملکوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بالکل فطری بات ہے اور ایسا کرنا بھی چاہیے۔ لیکن جب صلح ہو جاتی ہے تو افراد کی دوستیاں اسی طرح چلتی ہیں۔ بلکہ افراد کی دوستیاں تو اس زمانے میں بھی متاثر نہیں ہوتیں بلکہ اسی طرح ہی چلتی رہتی ہیں۔

جب شملہ معاہدہ ہو چکا تھا تو اس کے بعد مجھے یہاں پتہ چلا کہ بیدی صاحب کو فالج ہو گیا ہے۔ اور ساحر بھی بیمار ہے اور اس کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ساحر تو خیر میرا جان و جگر تھا اور ہم دونوں ہمراز تھے۔ لیکن بیدی صاحب سے بھی ٹرین کے اس سفر میں میں بہت متاثر ہو چکا تھا اور انہوں نے میرا دل موہ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے انڈیا جانے کیلئے یہاں N.O.C. کی درخواست دی اور اس میں

لکھا کہ مجھے ساحر اور بیدی صاحب کی عیادت کیلئے انڈیا جانے کی اجازت دی جائے۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر خونی رشتہ ہے تو صرف تب ہی وہاں جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ اس کے جواب میں میں نے حکومت سے اپنی خط و کتابت میں کہا کہ خونی رشتے سے آگے ایک روح کا رشتہ بھی ہوتا ہے۔ میں نے مزید لکھا کہ خونی رشتہ تو بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن روح کا رشتہ تو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرا ان دونوں سے روح کا رشتہ ہے۔ اب آپ بتایئے کہ خون کا رشتہ بڑا ہے یا روح کا رشتہ بڑا ہے۔ اگر روح کا رشتہ بڑا ہے تو مجھے این۔او۔سی دیا جائے۔ بالآخر مجھے این۔او۔سی دے دیا گیا۔ آگے کوئی سمجھدار آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوئی کلرک نہیں تھا۔

جب میں ممبئی پہنچا تو ساحر اپنے ماموں کے پاس الٰہ آباد گئے ہوئے تھے اور انہیں سات آٹھ دن گزر چکے تھے۔ جب بیدی صاحب کی طرف گیا تو وہ بھی اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ میں ان کے ہاں رقعہ لکھ کر چھوڑ آیا اور اس میں اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر بھی لکھ آیا۔ سارا دن گھومنے کے بعد جب میں شام کو وہاں پہنچا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا تو مجھے واپسی پر ایک رقعہ ملا۔ یہ کانپتے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا اور اس میں تحریر تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ میرے گھر آئے تو میں موجود نہیں تھا۔ اور اب میں آیا ہوں تو آپ موجود نہیں ہیں۔ جس وقت آئیں مجھے فون کریں میں دوبارہ آؤں گا۔ پھر پتہ چلا کہ وہ فالج کی حالت میں آئے تھے۔

میں ان کا رقعہ پڑھ کر رو پڑا۔ خلوص کی یہ حد دیکھئے کہ وہ کس حالت میں مجھ سے ملنے کیلئے آئے۔ میں پھر اسی وقت ان کی طرف چلا گیا۔ ملے تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس ملاقات سے پہلے لاہور میں عصمت چغتائی آئی تھیں۔ جب بھی کوئی یہاں آتا تھا تو میں اس سے کرشن چندر، بیدی

،خواجہ صاحب اور دوسروں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ وہ بڑی کریکٹر کی عورت ہیں۔ان کے بارے میں کبھی کوئی گری ہوئی بات نہیں سنی بلکہ وہ ایک حد تک مرد عورت ہیں لیکن بہت منہ پھٹ ہیں۔ اور بات بڑی کھلی کرتی ہیں۔ جیسے وہ اپنے افسانوں میں بات کرتی رہیں اسی طرح نجی زندگی میں بھی بات کرتی ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ بیدی صاحب کا کیا حال ہے تو انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ سالے کو فالج ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں؟ تو کہنے لگیں کہ ایک جوان لڑکی ہے۔اس کے ساتھ معاشقہ کر رکھا ہے اور کشتے کھاتا رہتا ہے۔اس لیے فالج ہو جائے گا۔یہی ہوا اور کچھ عرصے بعد خبر آگئی تھی کہ انہیں فالج ہو گیا ہے۔دراصل وہ گھریلو طور پر غیر مطمئن آدمی تھے۔بیوی سے نہیں بنی تھی اور زندگی میں جب کوئی خلا آتا ہے تو اسے پر کرنے کیلئے آدمی حیلے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ ایک عذر لنگ ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنا رومانی خلا پر کرے۔اور یہ کسی عمر میں بھی اچھا نہیں لگتا البتہ جوانی میں پھر اس کا تھوڑا بہت جواز ہوتا ہے

جب بڑھاپے میں آکر آدمی کسی عشق معاشقے کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو بیدی صاحب کا ہوا۔جب ہم سکندر ارسطو کی کہانی پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ارسطو سکندر کو عورت کے بارے میں سمجھاتے سمجھاتے خود عورت کا اتنا گرویدہ ہو گیا کہ عورت نے اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بڑھاپے میں سواری کی۔اس ارسطو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔اور ان کی ایک فیچر "آنکھیں دیکھی" بنی بنائی رہ گئی اور وہ لڑکی جوان کی داشتہ تھی وہ اس فلم کی ہیروئن تھی۔ فلم میں معروف اداکاران

ہوں تو فلم بکتی ہے۔اب یہ ہیروئن نئی تھی پھر رائٹر یعنی بیدی صاحب خود ڈائریکٹر تھے۔ہر چند کہ جن کا نام نہ ہونے کی وجہ سے بھی فلم پڑی رہی۔ان کا کچھ سرمایہ تو فلم میں ہی لگ گیا۔ پھر اس کے بعد ان کی بیوی بھی فوت ہو گئی اور عجیب بات ہے کہ اس کی وفات کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ بیوی جس کے ساتھ ان کی ساری عمر نہیں بنی وہ ان کے لیے بہت قیمتی سرمایہ تھی۔اس بیوی کے نہ ہونے سے اب وہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے لٹ گئے ہوں۔ان کی طبیعت میں رقت پہلے سے تھی اور ان کی آبدیدہ ہو جانے کی عادت بھی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد یہ عادت تیز ہو گئی اور جب میں ان کے گھر گیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کہتے " میں نے اس کے ساتھ بہت برا کیا اب میں خود برا بھگتوں گا"

انہیں سگریٹ پینے کی عادت تھی۔خود چونکہ سلگا نہیں سکتے تھے اس لئے بیٹا سگریٹ سلگا کر دیتا تھا۔ بہو چائے وغیرہ لاتی تھی اور جب بیوی کا ذکر آتا تھا تو رو پڑتے تھے۔اس طرح ان کی زندگی کا انجام ہوا۔کیا بتایا جائے وہ اتنے بڑے افسانہ نویس تو تھے ہی گفتگو کے ماہر اور فراخدلی بھی تھے۔ان کا ایک بیٹا نریندر بیدی تھا جو بہت کامیاب فلم ڈائریکٹر تھا۔افسانے کے سلسلے میں وہ بیدی صاحب سے اختلاف رکھتا تھا حالانکہ بہت فرمانبردار تھا اور جب شوٹنگ نہ ہوتی تو بیدی صاحب کے ساتھ محفلوں میں جایا کرتا تھا۔کم از کم میرے اعزاز میں جو محفلیں منعقد ہوئیں ان میں نریندر ساتھ تھا۔فرمانبردار بہت تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ بیدی صاحب بہت اونچائیوں میں اڑتے ہیں جبکہ مجھے زمین پر چلتے پھرتے لوگوں کے لیے فلم بنانی ہے۔اس لیے مجھے اپنے والد کا افسانہ یا کہانی سوٹ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ وہ ان

سے مکالمے بھی نہیں لکھواتا تھا جبکہ بیدی صاحب کے ڈائیلاگ ''داغ'' فلم میں آنے کے بعد فلم کی تاریخ میں ایک انقلاب لائے تھے۔ پھر ''غالب'' فلم جو نستعلیق اُردو میں لکھی جانی تھی اس کے ڈائیلاگ ایک سکھ یعنی بیدی صاحب نے لکھ کر دادلی۔ لیکن بیٹا اس چیز سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ ایک دن بیدی صاحب مجھے کہنے لگے کہ یار قتیل سنو۔ دیکھو میرا یہ بیٹا نافرمان بھی لیکن یہ تمہارا بڑا معتقد ہے اور مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ قتیل صاحب سے کہو کہ یہ کچھ عرصے کیلئے ممبئی آکر میری ایک دو فلموں کے گانے لکھ دیں۔ تمہارے پاکستانی فلموں کے جو گانے آتے ہیں یہ ان کے حوالے دیتا ہوں اور کہتا ہے کہ گانے یہ ہوتے ہیں جو قتیل صاحب لکھتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ اس کیلئے کچھ کرو۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ دونوں باپ اور بیٹا فوت ہو گئے۔ اور مجھے بہت صدمہ ہوا راجندر سنگھ بیدی صاحب کے انتقال پر تو ایک تعلق خاطر کی وجہ سے صدمہ ہوا لیکن ان کے بیٹے کے انتقال پر اس لیے صدمہ بھی ہوا کہ ایک خود غرضی بھی شامل تھی کہ ایک اچھے ہندوستانی ڈائریکٹر کی فلم میں میرے گانے آتے تو انہیں کچھ میدان ملتا۔ مگر یوں میں باپ اور بیٹا دونوں ہی سے محروم ہو گیا۔

نیکی کر دریا میں ڈال

مجھے اپنے والد سے جو اچھی عادتیں اور اچھے اصول ملے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان لوگوں کی مدد کرو جو مستحق ہیں اور اس مدد کا ڈھنڈورا پیٹنے سے اجتناب کرو۔ تھوڑے تھوڑے پیسے بھکاریوں کو دینے سے گریز کرو تاکہ بھکاریوں کی تعداد نہ بڑھے اور ضرورت مندوں میں بالکل چپ چاپ اپنا عطیہ پہنچا دو۔ تاکہ انہیں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ چنانچہ میرے گھر کے سامنے کسی نے وہ

دیگیں پکتی نہیں دیکھیں جو بعض لوگ محلے کو دکھانے کیلئے یا اپنی طرف سے نیکی کا کام سمجھ کر پکاتے ہیں اور پھر محلے میں بانٹ دیتے ہیں یا دروازے کے آگے کھڑے ہو کر بہت سی ریزگاری لے کر فقیروں کو بلا کر ان میں ایک ایک دو دو آنہ کر کے بانٹ دیتے ہیں۔ یا پھر کسی مزار پر جا کر بیٹھے ہوئے بھکاریوں کی فوج میں کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ میں ایسی کوئی چیز نہیں کرتا اور اپنے گھر والوں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ طریقہ غلط ہے۔

میرے والد اپنی آمدن کا ایک حصہ ایسے ضرورت مندوں میں بانٹا کرتے تھے جو سفید پوش ہوتے تھے اور کسی سے کہنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ کسی کا بچہ پڑھ رہا ہے تو اسے میرے والد فیس یا کتابیں دے دیتے تھے۔ مجھے کچھ بیوائیں معلوم ہیں جن کی وہ مدد کیا کرتے تھے۔ یہ اچھی عادت اور اچھا اصول میں نے اپنے والد سے لیا اور اب میرا طریقہ کار یہ ہے کہ ہر چند کہ میری آمدن زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی بھی عادت ڈال لی جائے تو اسے پورا کرنے میں زیادہ دقعت نہیں ہوتی۔ اگر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو پھر کچھ عرصے کے بعد اس سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ چیز روٹین میں آجاتی ہے اور آپ بغیر کوئی دقعت محسوس کئے وہ فریضہ ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔

میں ایک مدت سے ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں جو ضرورت مند ہوں۔ اگر وہ میرے غریب رشتہ داروں میں سے ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ورنہ محلے میں یا جاننے والوں میں سے ہوں۔ ایسی صورت میں میں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو بھی یہاں اس راستے پر لگا رکھا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کی ضرورت دیکھتے ہیں تو ان کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب مفلوج ہیں اور مکان سے باہر

نکلو، میں یوں کرتا ہوں کہ اس آدمی کو میں دو سو روپیہ اپنے پلے سے اور سو سو روپیہ اپنے بچوں سے لے کر پانچ سو روپے کرائے کیلئے دے دیتا ہوں۔ اسی طرح ہری پور میں اور سکندر پور میں جو میرے اور میری بیوی کے وطن ہیں وہاں ایک غریب خاتون میری رشتہ دار تھیں۔ اس کے گھر میں بجلی نہیں تھی اور سارا خرچ ہزار بارہ سو کا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے اور کچھ اپنی بیٹی سے لیے، اور اس کے گھر میں بجلی لگوا دی۔ یہ صورت اب تک جاری ہے۔ بعض اوقات میں اپنے متمول دوستوں کو بھی اس طرح کے نیکی کے کاموں میں شامل کر لیتا ہوں۔

ایسے دوستوں میں ایک نمایاں نام ”نیرنگ خیال“ کے ایڈیٹر سلطان رشک کا ہے۔ زکوۃ کے مہینے میں جب میں نے کسی کی مدد کرنی ہوتی ہے تو میں اپنے ساتھ سلطان رشک کی رقم بھی ملا کر دے دیتا ہوں۔ پچھلے سال ہمارے ایک محلے دار کے مکان کی چھت گری اور اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی تو پانچ سو روپے میں نے اور پانچ سو روپے سلطان رشک نے ڈالے اور ایک ایک سو روپیہ میرے بچوں نے دیا۔ اس طرح ہم نے کچھ رقم اکٹھی کر کے ان کو دیدی۔ میرا خیال ہے کہ ہٹے کٹے مشٹنڈوں کو روپیہ دو روپے دے دینے سے یا اپنے گھر کے باہر دیگیں کھڑکانے سے کہ نمائش ہو اور لوگ سمجھیں کہ سخی آدمی ہے یہ کام بہتر ہے۔ دیگیں پکانے سے چاولوں کی بھی بے حرمتی ہے کیونکہ ہر کسی کے گھر میں کھانا پکا ہوتا ہے اور یہ غریبوں تک بھی نہیں جاتے لیکن انہیں نمائش درکار ہوتی ہے اور محلے کے ہر گھر میں پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے گھر میں دیگ پکی تھی۔ اسی طرح گھر کے سامنے ریزگاری لے کر کھڑے ہو جانا اور آوازیں دے کر وہ ریزگاری تقسیم کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ اس کی کوئی افادی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ تو

معاشرے کوایک طرح سے بھکاری بنانے والا کھیل ہے۔میں کبھی ایسا کرنا گوارا نہیں کرتااور دعا کرتاہوں کہ خدا مجھے زیادہ دے تاکہ میں ضرورت مندوں کی زیادہ خدمت کر سکوں۔

اس طرح غریب لوگوں کی مدد کرنے والوں میں ایک اور نام بھی میرے ساتھ آتاہے جو کہ خورشید راٹھور کاہے۔میں تو قسطوں میں لوگوں کی مدد کرتا رہتاہوں۔لیکن انہوں نے میری باتوں سے متاثر ہو کریااپنے دل میں پہلے سے موجود نیکی کے جذبے کے تحت مسجد میں طالب علموں کے لیے ایک کمرہ بنانے کے لیے تیس ہزار کی رقم یکمشت ادا کر دی۔وہ خود بھی ملازم ہیں اور کوئی امیر خاتون نہیں ہیں۔لیکن وہ ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہیں۔وہ بھی اسی اصول پر کاربند ہیں کہ دروازے پر آنے والے بھکاریوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور چپکے سے ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔ان کا کام بھی میرے جیساہے۔جب انہیں پتہ چلتاہے کہ فلاں لڑکی کی شادی ہے تو وہ مجھ سے،میرے بیٹے بیٹیوں سے،اور اپنے جاننے والوں سے کچھ رقم اکٹھی کر کے اور کچھ اپنے پاس سے ڈال کر اس لڑکی کی مدد کر دیتی ہیں۔خدا سب کو توفیق دے کہ ہم غریبوں کی بجا طور پر مدد کریں تاکہ معاشرے میں احتیاج کی صورت نہ رہے۔

یہ تو میں نے ان بھکاریوں کی بات کی جو معاشرے میں گھومتے پھرتے ہیں۔اور جن بعض لوگوں کا پیشہ پشت در پشت چلا آرہاہے۔لیکن کچھ بھکاری شاعروں اور ادیبوں میں بھی نظر آتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا بڑا احسان ہے کہ وہ شعر کہتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ نے انہیں شعر کہنے اور لوگوں سے اس کا ٹیکس لینے پر مامور کر دیاہے ۔

ایسے شاعر عام طور پر غیر ذمہ دار نکمے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ہر چند کہ ان کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں

ہے لیکن چونکہ وہ شاعر ہوتے ہیں اس لیے فوراً نظر میں آجاتے ہیں۔اس لیے اس طرح کے ایک فیصد شاعر بھی ساٹھ فیصد نظر آتے ہیں۔یہ لوگ شادی شدہ ہوتے ہیں اور ہر سال بچہ بھی پیدا کرتے ہیں لیکن بچوں کے لیے روزی پیدا نہیں کرتے اور کسی نہ کسی بہانے سے لوگوں پر بوجھ بنتے ہیں۔بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسے شاعر کو دیکھ کر دور ہی سے کوئی شریف آدمی چھپ جاتا ہے۔یا پھر جب یہ کسی کے گھر پر جا کر دستک دیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ آدمی دوبارہ دروازے پر آگیا ہے جو پانچ بار پہلے بھی مدد لے چکا ہے۔چنانچہ اندر سے جواب دیا جاتا ہے کہ صاحب خانہ گھر پر نہیں ہیں۔خدا ایسی صورت سے دشمنوں کو بھی محفوظ رکھے چہ جائیکہ شاعر ایسا کام کرے۔شاعر لفظ شعور سے مشتق ہے اور شاعر عام آدمی سے زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کی عزت عام آدمیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔عزت نفس کا خیال شاعروں میں عام آدمی سے زیادہ ہوتا ہے۔بہر حال ایسے شاعر بہت کم تعداد میں ہیں جبکہ زیادہ تر شعراء خود کماتے ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں اور کبھی جھک کر بات نہیں کرتے۔

اس طرح کچھ اور بھکاری بھی ہیں جو حکومت وقت کی کاسہ لیسی کرتے ہیں۔رئیسوں سے مراسم رکھ کر ان سے کچھ حاصل کرتے ہیں اور جو چڑھتا سورج نظر آتا ہے اسے سلام کر کے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور بڑی مراعات حاصل کرتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ مہذب بھیک کی یہ بھی ایک شکل ہے۔اس طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ سچ کہنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور حاکم وقت کو لکھنے پڑھنے والوں کی صحیح رائے نہیں ملتی۔اس کے قریب جو لوگ جاتے ہیں وہ خوشامدی ہوتے ہیں جو صرف وہ رائے

دیتے ہیں جس کی حاکم وقت کی خواہش ہو۔اس طرح حاکم وقت کو پبلک کی رائے سے آگاہی نہیں ہوتی اور وہ گمراہ ہو کر سوچتا ہے کہ اس کی تمام پالیسیاں ٹھیک ہیں۔

یہ اکثر حکومتوں میں ہوا ہے۔ بہت سے حاکمان وقت یا چھوٹے درجے کے افسران اس طرح گمراہ ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لوگوں میں پاپولر نہیں رہتے، ان کی پالیسیاں ناکام ہو جاتی ہیں اور وہ بدنام ہو جاتے ہیں۔اور ایک ان کی حکومت کا تختہ الٹ جاتا ہے۔اور اس کے بعد وہ لوگ جو ان کی خوشامد کرتے تھے انہیں آپ اچانک دیکھتے ہیں کہ وہ نئے آنے والے حاکم کی چاپلوسی اور خوشامد کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں۔یہ ایک مسلسل بھیک کی شکل ان بھکاریوں میں جاری رہتی ہے۔خدا ایسے بھکاریوں سے بھی معاشرے کو محفوظ رکھے اور شاعروں سے ایسے لوگوں کو نجات دلائے جو شاعری جیسے مقدس پیشے کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل کرتے ہیں۔اور اس شعور کو رسوا کرتے ہیں جس سے شاعر کو مالا مال ہونا چاہیے۔

شراب کا ذکر بہت پہلے سے لٹریچر میں موجود ہے بلکہ تاریخ عالم میں موجود ہے۔لیکن شاعروں کے حوالے سے شراب کا پینا ایک لازم وملزوم قرار دیا جاتا رہا ہے اور یہ بہت حد تک ٹھیک بھی ہے۔زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت تک جبکہ شراب پر پابندیاں عائد نہیں ہوئیں تھیں، ہمیں شاعروں کی محفل میں کثرت سے دور جام چلتا نظر آتا ہے۔

اُردو شاعروں میں ہمیں ایک خوش ظرف اور شگفتہ مزاج بادہ نوش نظر آتا ہے۔شرابی لفظ میں اس لیے استعمال نہیں کر رہا کہ اس میں بڑی تضحیک کا پہلو ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر پینے والے کو ہم

شرابی نہیں کہہ سکتے اس لیے میں غالب کو بادہ خوار کہتا ہوں۔انہوں نے خود بھی اپنے لیے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب سے ہمیں شراب کی یہ ایک روایت ملتی ہے لیکن، جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، شراب کا شعر کی تخلیق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ الگ بات ہے کہ شاعروں کی محفل میں کسی طرح شراب در آئی اور شراب کی روایت بن گئی۔ غالب کے خطوط پڑھئے،ان کی عام زندگی دیکھئے یا ان کی شاعری کا مطالعہ کیجئے شراب کا ذکر اور اس کے اثرات ملیں گے۔

مے سے غرض ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

غالب اس کی وجوہ کچھ بھی بتاتے رہے ہوں۔میں اس وقت آپ کو اپنے ملنے والے ان دوستوں،ان بزرگوں اور ان ثقہ لوگوں کی شراب نوشی کے کچھ واقعات سنانا چاہتا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن میں شریک رہا۔کچھ قیام پاکستان سے پہلے کے واقعات ہیں اور کچھ بعد کے ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے بزرگوں میں جس شاعر کی شراب نوشی کا سب سے زیادہ چرچا تھا وہ جگر مراد آبادی تھے۔میں نے انہیں اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا لیکن ان کی داستانیں سنتا رہا اور جب ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو وہ ترک بادہ کر چکے تھے اور ایک سیدھے سادے شہری کی حیثیت

سے مجھے نظر آئے۔ان میں اب شراب کی بجائے ایک اور چیز نے جگہ لے لی تھی اور وہ تاش تھی۔وہ تمام رات اسی میں گزارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے جو رات وہ نشے میں یا پینے پلانے میں گزارتے تھے،انہوں نے اس کا بدل ڈھونڈ لیا تھا۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔ پھر مجاز لکھنؤی بھی اس کے لیے بہت مشہور تھے۔ ادھر جو لوگ تھے ان میں الطاف مشہدی، مجید لاہوری، حاجی لق لق اور عبدالحمید عدم وغیرہ اس سلسلے میں بہت مشہور تھے۔ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے چھوٹے چھوٹے واقعات بتاتا ہوں۔

یہ واقعہ پارٹیشن سے پہلے کا ہے کہ پنڈی میں ایک مشاعرہ ہوا۔اس میں حاجی لق لق بھی شریک تھے۔ حاجی لق لق ادب کے کوئی باقاعدہ نامور شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق صحافت سے تھا اور ان کی مزاحیہ شاعری نچلے طبقے میں بہت مقبول تھی۔یہ ''زمیندار'' میں کام کرتے تھے جہاں مولانا ظفر علی جیسے جید آدمی صرف حقے پر گزارا کرتے تھے وہاں ان کے ساتھیوں میں حاجی لق لق اتنی پیتے تھے کہ شراب بھی دہائی دے کر کہتی تھی کہ مجھے حاجی لق لق سے بچاؤ۔انہیں میں نے وہاں ایسی حالت میں دیکھا کہ واقعی مجھے شراب پر رحم آنے لگا کہ یہ کس آدمی کے پلے پڑ گئی ہے۔یہ پینے کے بعد سٹیج پر بیٹھ کر جو شاعر آتا تھا اس پر فقرے کستے تھے۔پینے کے بعد ان کی یہ عادت نمایاں ہو جاتی تھی ویسے بذلہ سنج آدمی تھے اور شگفتہ باتیں کرتے تھے لیکن پینے کے بعد یہ ہوتا تھا۔جب لوگ منع کرتے تھے تو چپ ہو جاتے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کا پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔اس عادت کا میں نے حال پارٹیشن کے بعد سرگودھا کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔

یہ مشاعرہ الطاف مشہدی نے منعقد کیا تھا۔اس میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء شریک ہوئے۔

حاجی لق لق پیئے ہوئے تھے اور الطاف مشہدی صاحب نے بھی پی رکھی تھی۔ جگر صاحب پڑھنے کیلئے آئے اور وہ اس وقت صوفی تھے اور پینی چھوڑ چکے تھے۔ حاجی لق لق پہلے بھی جملے بازی کر رہے تھے لیکن جب انہوں نے جگر صاحب پر جملے بازی کی تو الطاف مشہدی نے کہا کہ حاجی چھوڑ بھی۔ کیا بک بک لگائی ہوئی ہے۔ اور تو حاجی لق لق نہیں بلکہ حاجی بک بک ہے۔ اسی لیے میں تجھے بلاتا نہیں تھا۔ الطاف مشہدی اور حاجی لق لق آپس میں بے تکلف دوست تھے۔ حاجی لق لق بالکل خاموش ہو گئے۔ لیکن جونہی الطاف مشہدی نے کسی دوسری طرف منہ کیا تو حاجی لق لق نے پھر اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے بعد الطاف صاحب پلٹے۔ وہ دیو ہیکل آدمی تھے اور ویسے بھی جب آدمی پیئے ہوئے ہو تو کچھ فالتو قوت شراب کی بھی ہوتی ہے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ انہوں نے حاجی لق لق کو دونوں بازوؤں سے اٹھایا اور انہیں اس طرح پکڑ لیا جیسے کوئی مردہ بانہوں پر رکھا ہوتا ہے۔ وہ سٹیج سے اترے اور پنڈال کے باہر جا کر انہیں پھینک آئے۔ یہ ایک غیر ذمہ دار آدمی کی فضول عادت کا نتیجہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

راجہ حسن اختر علامہ اقبال کے پرستاروں اور ہم جلیسوں میں سے تھے۔ وہ بہت معزز اور معتبر آدمی تھے۔ اور کسی زمانے میں ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ معاشرے میں ان کا بہت مقام تھا۔ ان کے بیٹے بھی اچھے عہدے پر تھے۔ کیانی فیملی تھی۔ ان کے بیٹھے محمود اختر کیانی تھے۔ یہ شاعر تھے اور ہمارے دوستوں میں سے تھے اور انہیں پینے کی لت تھی۔ ان کی یہ عادت تھی کہ جب پی لیتے تھے تو اس حوالے سے علامہ اقبال کا ذکر کرتے تھے کہ وہ ان کے والد کے دوست تھے۔ وہ پینے کے بعد علامہ اقبال کو تایا کہا کرتے تھے۔ اگر کوئی بات ہو جائے اور خواہ وہ ادبی سطح پر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس میں

علامہ اقبال کی مخالفت کا کوئی پہلو نکلے تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ان کی صرف یہی عادت تھی۔ویسے وہ پینے کے بعد بالکل نارمل ہوتے تھے۔موٹر سائیکل چلاتے تھے،اور اگر کبھی زیادہ پی ہوتی اور واپس گھر جاتے وقت کہیں بنچ پڑا ہوا دیکھتے تو گھر جانے کی بجائے وہیں سو جاتے تھے۔صبح جب آنکھ کھلتی تو گھر بھی چلے جاتے تھے۔لیکن پینے کے بعد علامہ اقبال کو تایا کہنا اور ان کی مخالفت کرنے والے آدمی سے جھگڑا کرنے کی ان کی عادت پختہ تھی اور اکثر لوگوں کو ان کی اس عادت کے بارے میں پتہ بھی تھا چنانچہ بعض اوقات دوست انہیں چھیڑنے کے لیے ذرا علامہ اقبال پر تنقید بھی کر لیتے تھے۔

شاد امرتسری ہمارے دوست تھے۔وہ دل محمد روڈ پر رہتے تھے اور شام کو ان کے ہاں لوگ جاتے تھے اور پینے پلانے والے اپنا اپنا ساز و سامان اٹھا کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔وہاں محمود اختر کیانی کے علاوہ جو لوگ آتے تھے ان میں حبیب جالب،عدم صاحب اور مرحوم نصیر انور وغیرہ شامل تھے۔یہ جس دن کی بات کر رہا ہوں اس دن وہاں عدم صاحب محمود اختر کیانی اور پانچ چھ دوسرے افراد موجود تھے۔میں بھی وہیں تھا۔عدم صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ محمود اختر کیانی اقبال کے ذکر سے بھڑک اٹھتے ہیں۔انہیں اس بات کا پس منظر بھی معلوم نہیں تھا۔وہ بہت معصوم آدمی تھے اور معصومیت ہی میں انہوں نے اقبال کے کسی شعر پر تنقید کر دی۔فوراً ہی محمود اختر نے کہا" دیکھئے عدم صاحب میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔آپ میرے تائے کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتے"

وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے " میں نے تمہارے تایا کے بارے میں کب بات کی ہے "
محمود کہنے لگے " آپ نے علامہ اقبال کی بات کی ہے "
عدم صاحب کہنے لگے " اچھا تو وہ تمہارے تایا کب سے ہو گئے "
۔ محمود اختر لگے " آپ کو پتہ نہیں کہ وہ میرے والد کے بھائی اور دوست تھے "
عدم صاحب کہنے لگے " چلو ہم یہ بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن شاعر پبلک کا آدمی ہوتا ہے اور جہاں ہم ننانوے فیصد اسے پسند کرتے ہیں وہاں ایک فیصد اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں "
محمود اختر کہنے لگے۔ میرے سامنے آپ ایک فیصد چھوڑ اعشاریہ ایک فیصد بھی ان پر تنقید نہیں کر سکتے۔

عدم صاحب کہنے لگے " یار چھوڑو ان باتوں کو میں تم سے بڑا شاعر ہوں "
محمود اختر کہنے لگے " اگر یہ بات ہے تو آپ مجھ سے بڑے شاعر بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ اقبال کو نہیں مانتے تو آپ بھی مجھ سے بڑے شاعر نہیں ہیں " ان کی تکرار جاری تھی کہ درمیان میں تجمل حسین دل بولا اور کہنے لگا " یار چھوڑو عدم صاحب تنقید کر سکتے ہیں کیونکہ علامہ اقبال بھی بڑے شاعر تھے اور عدم صاحب بھی بڑے شاعر ہیں "
اب محمود اختر کیانی اٹھے اور زور سے تجمل حسین دل کو ایک لات ماری اور وہ دروازے سے باہر گرا۔ ایک اور آدمی انہیں بچانے کیلئے آگے بڑھا تو اسے بھی ایک لات ماری اور وہ بھی دور جا کے گرا۔ عدم صاحب اٹھے اور کہنے لگے " لو بھئی اب شیر بھی آ گیا ہے "
یہ ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ اس نے عدم صاحب کو بھی ایک لات ماری اور وہ بھی دروازے سے

باہر گرے۔اب کوئی آگے نہیں بڑھ رہا تھا کہ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔جو آگے جائے گا اسے مار پڑے گی۔ میں وہاں سے اٹھا نہیں اور میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا'' محمود اختر یہ سارے لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور علامہ کی شان میں جو گستاخی کرے گا اس کی یہی حالت ہو گی۔لیکن اگر یہ پاگل ہو گئے ہیں تو کیوں پاگل بنتے ہو'' جب میں نے اس کی تعریف کی اور دوسروں کی برائی کی تو وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور کہنے لگا'' دیکھئے قتیل صاحب! آپ نے ٹھیک بات کی ہے۔اب کوئی مائی کا لال ہے جو میرے تایا کے خلاف بات کرے''

میں نے کہا'' انہیں کافی سزا مل گئی ہے۔اس لیے اب تم بیٹھ جاؤ۔''وہ وہاں بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے وہیں سو گیا۔میں نے شاد سے کہا کہ اسے صوفے پر تکیہ رکھ کر لٹاؤ اور صبح ہو گی تو موٹر سائیکل پر بھیج دینا۔ نریش کمار شاد پہلے لاہور ہی میں رہتے تے۔ان کا اصل وطن کوٹ رادھا کشن تھا۔لیکن پارٹیشن سے پہلے لاہور ہی میں تھے اور یہیں سے انہوں نے شاعری شروع کی اور رسالہ ''بیسوی صدی'' جو اس وقت لاہور سے نکلتا تھا میں انہوں نے کلرک کے طور پر کام کیا لیکن ان میں اس زمانے میں بھی چمک تھی۔ ان کے والد کا نام درد نکودری تھا اور اس زمانے میں ان کا نام بھی شاد نکودری تھا۔ان کا نام نریش کمار شاد بعد میں بنا۔بیٹا شاد نکودری تھا اور باپ درد نکودری تھا۔ان کے والد کا اصل نام نرو یارام تھا اور پختہ شاعر تھے عروضی قسم کے۔

پارٹیشن کے بعد دونوں باپ بیٹا انڈیا چلے گئے اور ایک مشاعرہ سنیدور میں ہوا۔ انہوں نے وہاں مجھے اپنے باپ سے ملوایا۔ان کی یہ عادت تھی کہ جب پی لیتے تھے تو ان کے اندر سے ایک دیو باہر نکل آتا تھا

جوان لوگوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا جنہیں یہ حقارت سے دیکھنا چاہتے تھے لیکن جن لوگوں کی یہ عزت کرتے تھے ان کی پینے کے بعد بھی ضرورت سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ شاد کو قطعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی بیٹے کو باپ کے نام سے پہچانے۔ دونوں باپ بیٹا بیٹھے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کو ڈال کر دے رہے تھے۔

شاد صاحب مجھے کہنے لگے '' قتیل صاحب آیئے میں آپ کو اپنے والد سے متعارف کرواتا ہوں۔ یہ میرے والد ہیں درد نکودری۔ آپ نے ان کا نام سنا ہو گا۔''

میں نے کہا'' بالکل سنا ہوا ہے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں اور اپنے علاقے میں بہت مشہور ہیں''

باپ بولا'' قتیل صاحب میں جیسا بھی شاعر ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک اچھا شاعر پیدا کیا ہے۔ میرا بیٹا آپ کے سامنے ہے''

شاد کہنے لگے'' دیکھو قبلہ والد صاحب ! آپ اس کا کریڈٹ نہ لیجئے۔ آپ اپنی شاعری کی بات کیجئے۔ مجھے آپ نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا۔ میں پیدا ہو گیا تھا اور شاید آپ ہی نے پیدا کیا ہے لیکن شاعر میں خود بنا ہوں۔ یہ کریڈٹ آپ نہ لیجئے''

باپ نے کہا'' تو بہت بد تمیز ہو گیا ہے۔ باپ سے اس طرح بات کی جاتی ہے''

اس نے کہا'' آپ بیٹے کے کمائے ہوئے نام میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں '' چنانچہ اس بات پر لڑائی ہو گئی۔ باپ نے بیٹے کو تھپڑ مار دیا اور بیٹے نے باپ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں چھڑایا اور یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جب ایک شرابی کی انا ایک غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا ہاتھ باپ پر بھی اٹھتا ہے۔ یہ ہاتھ ایک شرابی کا نہیں تھا بلکہ ایک شاعر کی انا کا ہاتھ تھا جو غلط راستے پر چل نکلی

تھی۔اب درد نکودری صاحب اس دنیا میں ہیں اور نہ ہی شاد نکودری۔درد نکودری صحافی تھے اور جالندھر ہی میں ایک روزنامے کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ایک دن تنخواہ لے کر دفتر سے نکلے اور اس کے بعد آج تک واپس نہیں آئے۔اس واقعہ کو کوئی بیس سال ہو گئے ہیں اور آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔نریش کمار شاد جمنا کے کنارے گھوم رہے تھے کسی کو پتہ نہیں۔کچھ راہگیروں نے دیکھا کہ ایک آدمی کا آدھا دھڑ پانی میں ہے اور آدھا باہر کنارے پر۔جب انہوں نے قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ آدمی مرا پڑا ہے۔شناخت ہوئی تو وہ نریش کمار شاد تھے۔

نریش کمار شاد بے حد ذہین آدمی تھے۔اس نے اپنی زندگی خود ضائع کی اور اگر وہ زندہ رہتا تو اس کا ادب میں بہت بلند مقام ہوتا۔اتنی چھوٹی عمر میں بھی اس نے جو کچھ لکھا وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔اس نے غزل، نظم، قطعات، خاکے اور لطائف تک مرتب کئے اور ان تمام چیزوں میں اس کا اپنا ایک انداز تھا۔وہ چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا اور زیادہ تر مشاعروں پر انحصار تھا۔ دہلی میں کنور مہندر سنگھ بیدی، نریش کی بہت سرپرستی کرتے تھے۔انہیں اس کی شکایتیں بھی آتی تھیں لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کے کچھ COMPLEXES ہیں۔ اس کی بناء پر وہ شراب بھی پیتا تھا اور بے احتیاطیاں بھی کرتا تھا۔اس لیے وہ اسے بچا لیتے تھے۔آخر دم تک یہی رہا اور جب وہ مر گیا تو اس کی بیوی اور بچوں کی کفالت کا بھی کنور مہندر سنگھ بیدی نے مناسب انتظام کیا۔

نریش کمار شاد ایک اچھا شاعر ہی نہیں تھا بلکہ وہ حاضر جواب بھی تھا۔ایسا جملہ کہتا تھا کہ اس کی کاٹ دیر تک محسوس ہوتی تھی۔اگر کوئی اس پر جملہ کستا تھا تو وہ اس کا بہت ٹھاٹھ کا جواب دیتا تھا۔یہ 1955

ءمیں لاہور میں آئے اور بہت دنوں تک میرے پاس ٹھہرے۔ پھر ہم ایک ساتھ راولپنڈی بھی گئے۔ اس زمانے میں شراب کا چلن تو تھا ہی اور پھر انڈیا کا شاعر آجائے تو خصوصی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اب ان کی حاضر دماغی کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔

ہمارے ایک بہت عزیز دوست راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ بہت آزاد خیال، لبرل اور غیر متعصب ہیں۔ اس دن خدا جانے انہیں کیا ہوا کہ نریش کمار شاد بیٹھا ہوا کچھ دوستوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھا رہا تھا کہ میرے اس دوست کو جانے کیا سوجھی اور کہنے لگا کہ نریش کمار جی! معلوم ہے آپ کیا کھا رہے ہیں۔ سب لوگ پیئے ہوئے تھے۔ نریش نے جواب دیا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ نہیں تمہاری پلیٹ میں کیا ہے۔ نریش نے کہا کہ تم ہی بتا دو۔ کہنے لگا کہ یہ گائے کا گوشت ہے جو تم کھا رہے ہو۔ نریش نے کہا اچھا۔ یار میں تو اسے سوّر کا گوشت سمجھ کر کھا رہا تھا۔ چلو کوئی حرج نہیں۔ اگر تم میرے ساتھ مل کر سوّر کا گوشت کھا سکتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ مل کر گائے کا گوشت کھا سکتا ہوں۔ آخر ہم دوست ہیں۔ اس کے بعد ہمارا وہ دوست اتنا چپ ہوا کہ اس سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ سب لوگ ہی سناٹے میں آگئے تھے۔ یہ اتنا حساس معاملہ تھا کہ اس پر ہندو مسلم فسادات ہو جاتے ہیں ۔لیکن وہاں امن رہا۔ ویسے بھی نریش کمار شاد نے یہ جواب ایک ہندو کے طور پر نہیں دیا تھا بلکہ ایک جواب کے طور پر دیا تھا۔ جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب تھا۔ متعصب دونوں ہی نہیں تھے۔ جب کبھی شراب اس طرح بولتی ہے تو لوگوں کا اعتراض بجا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس روز بھی شراب کا CLIMAX لوگوں نے دیکھا۔

جس طرح میں نے بتایا ہے کہ محمود اختر کیانی علامہ اقبال کے خلاف رائے زنی سے چڑتے تھے۔ اسی

طرح ہمارے ایک میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ان کی پینے کے بعد یہ عادت تھی کہ وہ ہیر پھیر کر اپنے والد کا نام بات میں لے آتے تھے اور یونہی ان کے ساتھ کسی واقعہ کو منسلک کر کے بات کرنے والے سے لڑنے لگتے تھے۔ایک دن مال روڈ پر "ونڈر لینڈ" نامی کھلونوں کی دوکان کے پیچھے منٹو صاحب کے کمرے میں میں،رشید عطرے، منٹو صاحب اور ایک دو اور آدمی موجود تھے۔ شاعروں اور مصوروں کی باتیں چل نکلیں تو بات گویوں تک جا پہنچی۔مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر آیا کہ وہ جس فن پر نظر ڈالتے تھے تو اسے پی جاتے تھے اور اس کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر لیتے تھے کہ پوری گفتگو کر سکتے تھے۔

روایت یہ ہے کہ کسی بڑے گویے کے پاس بیٹھے ہوئے انہوں نے کسی فنی نقطہ پر گفتگو کرنا چاہی۔ جیسے کہ صاحب فن لوگ غیر صاحب فن لوگ کی بات کو وقعت نہیں دیتے اور یہ بات خاص طور پر اہل موسیقی میں ہے۔وہ دوسرے کو عطائی سمجھ کر اس کی تحقیر کرتے ہیں۔اور سمجھتے ہیں کہ فن موسیقی صرف انہی کی میراث ہے۔وہاں ہم سب میں مولانا آزاد کے حوالے سے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا نے جب کوئی فنی نقطہ بیان کیا تو اس گویے نے کہا کہ مولانا آپ اس معاملے کو چھوڑ یئے ۔آپ عالم دین ہیں آپ کو موسیقی سے کیا تعلق۔آپ اس میں کیوں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔مولانا کو یہ بات چبھی۔اس کے بعد انہوں نے علم موسیقی کو پڑھا اور اس کے بارے میں بہت حد تک پریکٹیکل بھی کیا۔اس کے بعد وہ پھر اس شخص کے پاس گئے اور اس سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ثابت کیا کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔یہ بات ہو رہی تھی کہ رشید عطرے اچانک بھڑک اٹھے اور کہنے

لگے کہ منٹو صاحب! آپ کو میرے باپ کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ہم ابوالکلام آزاد اور ایک گویے کی بات کر رہے ہیں تمہارا باپ کہاں سے آگیا۔ کہنے لگے کہ براہ راست تو کوئی تعلق نہیں لیکن جب آپ ابوالکلام آزاد کی تعریف کریں گے تو ظاہر ہے کہ میرے باپ کی بے عزتی ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ ان کی بے عزتی کیسے ہو گی۔ کہنے لگے ایسے ہو گی کہ میرا باپ بھی موسیقی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر رشید عطرے کہنے لگے کہ میرا باپ فن میں ابوالکلام آزاد سے بڑا تھا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ وہ بڑا ہو گا لیکن اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو۔ کہو تو لکھ کر دے دیں۔ عطرے صاحب اب پیچھا چھوڑنے میں نہ آئیں۔ منٹو صاحب پہلے تو ٹالتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان کے والد صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی جملہ ایسا بیان کیا کہ رشید عطرے چپ ہو گئے۔ لیکن اس چپ ہونے کے بعد عطرے صاحب نے کتنے دنوں تک منٹو صاحب سے بات نہیں کی۔ حالانکہ دونوں دوست تھے۔ پھر ایک بار عطرے صاحب کو دیکھا۔ پارٹیشن کے بعد دلیپ کے بھائی ناصر یہاں آئے ہوئے تھے وہ یہاں کچھ دیر رہے اور فلموں میں کام بھی کیا۔ پھر یہاں اپنی ایک فلم بھی بنانے لگے۔ اس کے میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ اور میں اس فلم کا نغمہ نگار مقرر ہوا۔ کچھ کام ہوا۔ لیکن بعد میں انہوں نے فلم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن یہاں ایک ڈیڑھ ماہ خوب محفلیں رہیں۔

یہاں بھی عطرے صاحب کے ساتھ ایک شام اسی طرح کی گزری جس طرح منٹو صاحب کے ساتھ گزری تھی۔ اس شام ناصر خان نے کہیں میوزک ڈائریکٹر سجاد کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہا کہ وہ بہت باکمال آدمی ہے اور غزل بناتا ہے تو کمال کر دیتا ہے۔ پھر کہا کہ وہ ایک ساز ''سرود'' اتنا اچھا بجاتا ہے

کہ ہندوستان میں اس کے مقابلے کا کوئی آدمی نہیں۔اس پر رشید عطرے بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ ناصر خان! ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔آپ میرے باپ کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ناصر خان نے کہا کہ وہ کیسے۔کہنے لگے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ میرا باپ جو ہارمونیم بھی بجاتا تھا اس جیسا ہارمونیم کوئی ساری دنیا میں نہیں بجا سکتا تھا۔ناصر نے کہا کہ وہ بجاتے ہوں گے۔آپ کے باپ ہمارے باپ ہیں لیکن میں سرود کی بات کر رہا ہوں۔اگر میں کہوں کہ وہ آپ کے والد سے اچھا سرود بجاتے تھے تو آپ کے والد کی بے عزتی ہو۔رشید عطرے کہنے لگے کہ نہیں آخر ساز کی بات ہے۔میرے والد سے اچھا ساز کوئی نہیں بجاتا تھا۔وہ اگر سرود بھی بجاتا تو بہت اچھا بجاتا۔انہوں نے کہا بھئی اتفاق سے وہ سرود نہیں بجاتے تھے۔چنانچہ وقتی طور پر ان میں ناراضگی ہو گئی لیکن ممبئی سے جو لوگ آئے تھے ان کے ساتھ ناراضگی بھی جلد ہی صلح میں تبدیل ہو جاتی تھی۔چنانچہ رشید عطرے کی یہ عادت تھی کہ جب وہ پی کر آؤٹ ہو جاتے تھے تو انہیں اپنے والد یاد آجاتے تھے۔والد کا احترام اچھی بات بھی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ احترام بھی کبھی کبھی بدمزگی کا باعث بن جاتا ہے۔

میرے دوست احمد راہی کا ذکر تفصیل سے الگ کروں گا۔لیکن یہاں ان کی پینے کے بعد کی عادت کا ذکر کروں گا۔وہ جب پی لیتے تھے تو انہیں امرتسر اور اپنی ماں کی قبر یاد آجاتی تھی۔ان کے تحت الشعور میں یہ دونوں چیزیں رچی بسی ہوئی تھیں اور جب زیادہ پی لیتے تھے تو یہی موضوع لے بیٹھتے تھے۔یہ احساس ان کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔جب یہ امرتسر گئے تھے تو انہوں نے ایک نظم کہی

تھی جس نے امر تسر والوں کو رلا دیا تھا۔اس نظم میں انہوں نے امر تسر میں اپنے بچپن اور ماں کی قبر کا ذکر کیا تھا۔یہ پی کر ماں کی قبر کا ضرور ذکر کرتے تھے۔ یہ ان کی عادت میں شامل تھا۔

میرے یہ بھائی اس زمانے میں مسرت نذیر پر عاشق تھے۔اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ مسرت نذیر پر ان کے عشق کا کیا اثر تھا۔ایک دن ہم ملکہ سٹوڈیو مسلم ٹاؤن میں شوٹنگ کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔احمد راہی اسی موڈ میں آ گئے۔چونکہ مسرت نذیر کی شوٹنگ تھی۔اس لیے وہ کسی چھوٹے سے واقعہ پر دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلے گئے۔خیال تھا کہ باہر گئے ہوں گے۔باہر دیکھا تو وہاں نہیں تھے۔بہت تلاش کیا لیکن نہیں ملے۔آخر ان کے ایک دوست ماڈل ٹاؤن کی طرف سے آرہے تھے انہوں نے بتایا کہ یہ ماڈل ٹاؤن سے آگے کہیں پیدل جا رہے تھے۔انہوں نے پوچھا کہ راہی صاحب کدھر جا رہے ہو۔کہنے لگے کہ اس مسرت نذیر نے مجھے دل شکستہ کر دیا ہے اور اب اس ملک میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے امر تسر جا رہا ہوں۔وہاں ماں کی قبر سے لپٹ کر کہوں گا کہ میرے ساتھ یہ ہوا ہے۔چنانچہ ان کی یہ عادت یہاں تک پہنچ گئی کہ معاشقے میں بھی ان کا ماں کی قبر سے لپٹ کر رونے کو جی چاہا۔

منیر نیازی اپنے ترک وطن کے بعد منٹگمری میں آکر آباد ہوئے۔ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔ ان کا ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں حصہ تھا لیکن ان کا جی کاروبار میں نہیں لگتا تھا۔یہ اکثر لاہور آجایا کرتے تھے۔انہوں نے منٹگمری سے ایک پرچہ بھی نکالا تھا۔لاہور میں یہ پتھروں والی کوٹھی میں رہتے تھے جسے اس کے مالکان ہوٹل کے طور پر چلاتے تھے۔خوبصورت کوٹھی تھی اور کرایہ بھی کم ہی

تھا۔ منیر نیازی کا اس زمانے میں پرابلم پبلک ریلیشنگ تھا۔ الگ الگ لوگ وہاں آ کر رہتے تھے۔ یہ آتے تھے اور بہت سی بیئر خرید کر رکھ دیتے تھے۔ اور کار آمد لوگوں کو بلا کر بیئر پلاتے تھے۔ یہ ان کا تعلقات بڑھانے کا ذریعہ تھا۔

اسی پتھروں والی کوٹھی کے اوپر ایک فلم پروڈکشن کا دفتر تھا میں اس میں بیٹھا فلم ''امانت'' کے گانے لکھ رہا تھا تو آتے جاتے منیر نیازی سے ملاقات ہوتی تھی۔ کئی بار انہوں نے کہا کہ آؤ بیٹھ کر بیئر پیتے ہیں۔ میں شروع سے ہی مفت خوری کا عادی نہیں تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ منیر کا ایک مقصد تو پبلک ریلیشنگ ہے۔ دوسرا کچھ مفت خورے جو اس کے کام ابھی نہیں آسکتے وہ بھی یہاں آ کر اس سے کھاتے پیتے ہیں۔ اس لیے میں کیوں ان مفت خوروں میں شامل ہو جاؤں۔ نہ تو میں اس طرح منیر نیازی کے کام آسکتا ہوں جس طرح یہ چاہتے ہیں اور نہ میں مفت خورا ہوں۔ چنانچہ میں نے ان کے ساتھ یہ سلسلہ روا نہیں رکھا۔ جب یہ ذرا آگے بڑھے اور عام شاعر کی حیثیت سے آگے آئے تو مجھے فخر ہے کہ ان کے ایک میزبان کی حیثیت سے میرا نام بھی آتا ہے۔ یہ کافی دنوں تک میرے گھر پر رہے اور مجھے انہوں نے عزت بخشی۔

انہیں میں نے دیکھا کہ ویسے تو ان پر وارفتگی طاری رہتی ہے لیکن حساب کتاب میں پینے کے بعد یہ بہت ہوشیار ہو جاتے ہیں اور میں نے کسی کو پینے کے بعد ان سے زیادہ ہوشیار نہیں دیکھا۔ ایک بار ہم کوئٹہ میں ایک مشاعرے میں گئے ہوئے تھے۔ یہ رات سے ہی بہت پی رہے تھے اور جب صبح ہوئی تو بھی پی رہے تھے۔ جب چیک دیئے گئے تو سب نے چپ چاپ جیب میں ڈال لیے۔ جب چلنے لگے تو

منیر نیازی کہنے لگے کہ سب لوگ ٹھہرو۔ان چیکوں پر تو دستخط ہی نہیں ہوئے۔اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ چونکہ یہ NEAT ہی پی رہے تھے اس لیے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں انہیں اٹھا کر ہی نہ لے جانا پڑے لیکن چیک دیکھنے کے بعد ان کے سارے حواس مجتمع ہو گئے۔سب نے چیک نکال کر دیکھے تو واقعی ان پر دستخط نہیں تھے۔چنانچہ شراب پی کر ان کے شعور اور تحت الشعور دونوں بیدار ہو جاتے ہیں اور یہ اسی بیداری کا نتیجہ ہے کہ ہم اس روز پریشانی سے بچ گئے۔

دبئی میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ یہ اسی طرح پی رہے تھے۔پیتے پیتے کچھ اراضی کی الاٹمنٹ کا ذکر چلا۔بھٹو صاحب کے زمانے میں منیر نیازی کو بھی حنیف رامے صاحب نے ایک مربع زرعی اراضی الاٹ کی تھی۔اس کا ذکر آیا تو نجانے انہیں کیا سوجھی اور شاید یہ بتانا چاہا کہ انہوں نے بھٹو کا کاسہ لیس بن کر مربع نہیں لیا۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب کو ماں کی گالی دی۔ہم وہاں جس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھٹو صاحب کا حامی تھا۔وہ کچھ کہہ بھی نہیں پایا۔اس نے ان کی طرف گھور کر قہر آلود نظروں سے دیکھا۔میں نے کہا یار منیر نیازی کسی کا خیال کرو اور اس طرح کی بات مت کرو۔ بھٹو کو اب تم گالی دو یا اس نے ایک ایسی ہستی کو گالی دی جس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا کہ دیکھو اب میرا بھی پارہ چڑھ سکتا ہے اس لیے اس بات کو چھوڑو۔دراصل منیر نیازی صاحب نے پہلی بات کو بیلنس کیا اور یہ تاثر دیا کہ جیسے وہ یہ سب کچھ وارفتگی میں کہہ رہے ہیں۔حالانکہ منیر نیازی صاحب نشے میں ہو کر جتنے ہوشیار ہو جاتے ہیں اتنا ہوشیار میں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اول تو خدا کسی کو شراب پینے کی عادت نہ ڈالے لیکن اگر یہ عادت پڑ ہی جائے تو میری دعا ہے کہ خدا اسے نشے کے بعد منیر نیازی جیسی کیفیت دے کیونکہ اس سے نقصان کوئی نہیں ہوتا۔یہ نشہ کر کے بھی

چوکس رہتے ہیں۔ان کی نشے کی ایک اور عادت بھی دیکھی، کہ اگر کسی جگہ انہیں بلالیا جائے اور میز بان ان کے سامنے بوتل رکھ دے تو یہ جتنی پی سکیں پی لیتے ہیں اور باقی لوگ تو نشے کی حالت میں وہاں اپنی چیزیں بھول آتے ہیں مگر یہ آتے ہوئے بے خودی وہشیاری کی کیفیت میں باقی بچی ہوئی بوتل کو اپنے ساتھ گھر لے جانا کبھی نہیں بھولے۔

جب فلم ''قاتل'' بن رہی تھی اور میں انور کمال پاشا صاحب کی ٹیم میں مستقل طور پر کام کر رہا تھا۔ پاشا صاحب نے اپنے ادارے میں اچھے لکھنے والوں کو یکجا کیا ہوا تھا۔ چنانچہ سیف الدین سیف، تنویر نقوی مرحوم اور میں ان کے ہاں شاعر کے طور پر کام کرتے تھے۔ ہم یہ کام مل کر بھی کرتے تھے اور الگ الگ بھی کرتے تھے۔ ہم تینوں اس زمانے میں تھوڑی سی پیتے تھے۔ تنویر نقوی صاحب کا کچھ اور معاملہ تھا اور ان میں شراب سے ہٹ کر بھی کچھ عادتیں تھیں۔ سیف صاحب اور میں بہت کم مقدار میں استعمال کرتے تھے۔

پاشا صاحب بالخصوص مجھے کہتے تھے کہ آپ قوم کا سرمایہ ہیں اور یہ شراب واقعی خانہ خراب ہے اس لیے اس سے بچ کر رہیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ واقعی لت پڑ گئی تو آپ زیادہ پینے لگیں گے اور پھر شاعری دھری رہ جائے گی۔ میں کہتا تھا کہ پاشا صاحب میں کوئی عادی نہیں ہوں۔ ویسے ہی کبھی کبھی تھوڑی لے لیتا ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ تھوڑی سے ہی زیادہ بنتی ہے۔ خیر یہ معاملہ چلتا رہا۔ اس کے کچھ عرصے بعد پاشا صاحب کو کھانسی کی شکایت رہنے لگی۔ وہ بہت شدید کھانستے تھے۔ پنجاب میں جسے کتا کھانسی کہتے ہیں وہ کھانسی انہیں ہو گئی تھی۔ کسی نے انہیں یہ علاج بتایا کہ سوتے وقت تھوڑی سی برانڈی پی لیا کریں۔

چنانچہ انہوں نے برانڈی پینی شروع کی۔اس سے قدرے افاقہ ہوا۔آہستہ آہستہ انہوں نے سرور محسوس کرکے برانڈی بڑھانی شروع کی۔اس کے بعدان کی زندگی میں جنسی بے راہروی آئی توان کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ان کی زندگی میں جو قابل رشک کامیابیاں آئی تھیں وہ اب ناکامیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔کیونکہ پہلے تو یہ سرتاپا تخلیق میں ڈوبے رہتے تھے۔ہرچند کہ انہوں نے ایک ٹیم رکھی ہوئی تھی لیکن مرکزی کردار انہی کا ہوتا تھا۔جب زندگی میں بے راہروی شروع ہوئی تو یہ شراب بھی کثرت سے پینے لگے۔تب انہوں نے اپنا کام بھی نائبین کے سپرد کیا جس کے بعد پے در پے ان کی فلمیں ناکام ہونے لگیں۔جبکہ پہلے صورت یہ تھی کہ جب ان کی فلم اناؤنس ہوتی تھی تو ڈسٹری بیوٹر اپنی تجوریوں کے دہانے کھول دیتے تھے۔اور پیسوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔یہ بھی اپنے کارکنوں کو بہت خوش کرتے تھے۔مگر ناکامیوں کے بعد یہ حال ہوا کہ یہ بھی کارکنوں سے حیلے بہانے کرنے لگے اور انہیں بھی کچھ غلط بیانی کی عادت ہوگئی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس معاملے میں ان کی نیک نامی تھی۔غرضیکہ شراب میں اتنا ڈوبے کہ نیک نامی بھی نہ رہی۔اگر یہ آؤٹ بھی ہو چکے تھے اور صرف کہانی یا مکالمے لکھتے تو بھی ان کے پاس جو فن تھا اس کے ذریعے کافی کما سکتے تھے۔

میں ایک طرح سے ان کا ممنون احسان تھا۔وہ یوں کہ اس زمانے میں اچھے شاعروں کا معاوضہ پانچ سو روپے فی گیت ہوتا تھا جو آج پانچ ہزار روپے سے زائد ہے۔یہ مجھے اس زمانے میں پانچ سو کی بجائے چھ سو روپیہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ پانچ سو روپے تو گیت کے ہیں اور ایک سو روپیہ شاعر قتیل شفائی کے لیے میرا نذرانہ ہے۔پھر جب کبھی میری ضرورت آجاتی تو ناز برداری کرتے تھے۔جب ان کی شراب سے یہ کیفیت ہوگئی تو مالی حالت خراب ہوگئی۔لوگ ان سے دور دور رہنے لگے۔

انہی دنوں میں نے ایک فلم شروع کی جس کا نام تھا ”اک لڑکی میرے گاؤں کی“۔ ہر چند کہ میرے استاد احمد ندیم قاسمی اعلیٰ درجے کے سٹوری رائٹر تھے لیکن میں پاشا صاحب کا احسان چکانا چاہتا تھا۔ کہانی میں نے پاشا صاحب سے لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ یہ فلم کی تکنیک کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے پہلے تو یہ بات کی کہ آپ مجھے شراب کے خلاف سمجھایا کرتے تھے تو میں تو آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اصل میں کوئی چیز بھی حواس کو اعتدال میں رکھ کر نہ کریں تو خرابی کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔

ان کے ایک منیجر حسین شاہ ہوتے تھے۔ وہ کھاتے بہت تھے اور پیٹ کافی بڑھ گیا تھا۔ اور دل کی تکلیف بھی ہو گئی تھی۔ ان سے میری بے تکلفی تھی۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دیکھئے کھانا زیادہ کھانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا پیٹ اتنا بڑھا ہوا ہے۔ اگر یہ حساب سے کھانا کھاتے تو ان کا پیٹ بڑھا ہوا نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر آپ میری طرح پیتے تو آپ کا یہ حال نہ ہوتا۔ دیکھئے میں اب بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں گیت نگار سے پروڈیوسر بن گیا ہوں اور آپ پروڈیوسر سے صرف سٹوری رائٹر بن گئے ہیں۔ خیر وہ میری باتیں سن لیتے تھے۔

پوچھنے لگے کہ کیسے آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں اتفاق سے پروڈیوسر بن گیا ہوں اور آپ سے اپنی فلم کی کہانی لکھوانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیا نذرانہ پیش کروں۔ کہنے لگے کہ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔ میں نے کہا کیوں آپ مجھے پیسے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ آپ تو مجھے پانچ سو کی بجائے چھ سو روپے دیتے تھے۔ میں نے پوچھا کیا پیش کروں۔ وہ چونکہ اس وقت

آؤٹ آف مارکیٹ تھے اور جب آدمی کی مانگ نہ ہو تو وہ پیسے بتاتا ہوا ہچکچاتا ہے کہ کہیں دوسرا فریق بھاگ نہ جائے یا بوجھ محسوس کرکے انکار نہ کردے حالانکہ میں ان کا معتقد اور احسان مند بھی تھا۔ انہوں نے ڈر کے کہا کہ سات کا ہندسہ بڑا برکت والا ہوتا ہے۔ اس لیے سات ہزار روپے ٹھیک ہیں۔ میں نے کہا پاشا صاحب یہ طاق ہندسے والا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ راؤنڈ فگر ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑیئے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو دس ہزار روپے دوں گا اور یہ پانچ ہزار روپے آپ ایڈوانس رکھ لیجئے۔ اب آپ مجھے کہانی کا آئیڈیا سنادیں اور جب کہانی مکمل کریں گے تو باقی پیسے بھی لے لیں۔ لوگ تو عام طور پر صرف ایک ڈیڑھ ہزار روپے ایڈوانس دیتے ہیں اور پھر چکر لگواتے رہتے ہیں لیکن میں تو ان کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک آئیڈیا سنایا جو مجھے پسند آیا کیونکہ وہ بہرحال ایک اعلیٰ درجے کے لکھنے والے تھے۔

اب میں اس بات کو ان کی عادت پر لا کر ختم کرتا ہوں۔ ان کی یہ عادت تھی کہ یوں تو تھوڑا سا مبالغہ کرتے تھے لیکن پینے کے بعد انتہائی طور پر گپ ہانکتے تھے۔ جب میں انہیں اس وقت ملا ہوں جب یہ پیئے ہوتے تو کہتے کہ اچھا آپ کو میرا پیغام نہیں ملا۔ حالانکہ انہوں نے کوئی پیغام نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ میں کہتا کہ کیا پیغام بھیجا تھا۔ کہتے کہ میں چار فلمیں شروع کرنے والا ہوں اور ایک ہفتے کے بعد ایک ساتھ ہی چاروں کا افتتاح کرنا ہے اور آپ ان چاروں کا ایک ایک گانا لکھ کردیں گے۔ پھر کہتے لکھ لیں گے نا۔ میں کہتا کہ میوزک ڈائریکٹر کون ہے۔ کہتے کہ آپ جسے کہیں گے اسے ہی رکھ لیں گے۔ جھوٹ اس بات سے ہی کھل جاتا تھا کہ فلموں کا افتتاح کرنا ہے لیکن ابھی تک میوزک ڈائریکٹر رکھا ہی نہیں۔ لیکن میں چپ ہو جاتا تھا۔

ان کی یہ عادت تھی کہ وہ پی کر ایک ایسی گپ ہانک دیتے تھے جس سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن بہر حال گپ ان کی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ چونکہ پڑھے لکھے بھی تھے اور اس وقت ایم ایس سی پاس تھے۔ پھر پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق تھا اور حکیم احمد شجاع کے بیٹے تھے۔ وراثت میں انہیں گفتگو کا سلیقہ اور علمیت کا پس منظر ملا ہوا تھا۔ اس لیے اگر کبھی محسوس کرتے کہ سننے والے کو اس گپ کا یقین نہیں آ رہا تو دلائل سے اسے منانے کی کوشش کرتے۔

ان کے فوت ہونے سے ایک ماہ پہلے میں ان سے ملا تھا۔ ان کا ایک بیٹا امریکہ گیا ہوا ہے۔ حکیم صاحب جو اثاثہ چھوڑ گئے تھے اس میں مکان وغیرہ شامل تھا۔ اسی مکان میں اب بھی رہتے تھے لیکن اپنے مالی حالات درست نہ تھے۔ میں آخری بار جب ان سے ملا تو کہتے تھے کہ میرا بیٹا امریکہ سے سٹوڈیو کا پورا سامان لے کر آ رہا ہے۔ لیبارٹری کلر ہو گی اور پھر اپنے سٹوڈیو میں اپنی فلمیں بنایا کریں گے۔ مجھے کہنے لگے کہ آپ کا تو میں نے یہ کیا ہے کہ آپ میوزک کے شعبے کے مکمل انچارج ہوں گے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ وہ خواہشیں ہوتی ہیں کہ جب آدمی بڑے اونچے مقام سے نیچے آ کر گرتا ہے۔ تو اس کی ناتمام حسرتیں اور آرزوئیں سامنے آ جاتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ یہ مکمل ہو جائیں۔ چنانچہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے۔ اور اپنے آپ کو فریب دینے کیلئے ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہی حال کچھ پاشا صاحب کا تھا۔

محبوب اختر میرے ان دوستوں میں سے ہیں جنہیں میں بہت ہی عزیز سمجھتا تھا اور جو میرے بہت ہی قریب تھے۔ فلم لائن میں بھی مجھے وہی لے کر گئے جبکہ میرا فلم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر بھی انہیں مجھ پر اعتماد تھا کہ یہ اچھا کام کرے گا۔ میں نے پارٹیشن سے پہلے ان کی فلم کیلئے دو گانے لکھے اور ان کی

مجھ سے جو توقعات تھیں وہ پوری بھی ہوئیں۔لوگ پوچھتے تھے کہ یہ گانے لکھے ہوئے کس کے ہیں۔ شاعر کو داد اسی وقت ملتی ہے جب گانا ریکارڈ ہو رہا ہو اور کوئی خاص طور پر پوچھے کہ گانا لکھا ہوا کس کا ہے۔

محبوب اختر کے بڑے بھائی فضل الرحمان اشک اپنے زمانے میں ایک مختصر عرصے تک شاعری بھی کرتے رہے۔اور ان کا ایک شعر تھا:

وہ لوگ رہ زیست میں یاد آئے ہیں اکثر
جن لوگوں نے دو چار قدم ساتھ دیا ہے

یہ راولپنڈی میں رہتے تھے اور ایشیاٹک آپٹیکل کمپنی کے نام سے ان کا ادارہ تھا۔ باہر سے جو شاعر آتے تھے یہ گھر پر ان کی دعوتیں وغیرہ کرتے تھے۔یہ محبوب اختر کی بات بہت مانتے تھے بلکہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب پورا خاندان ان کی بات بہت مانتا تھا۔ محبوب اختر کو فلم میں لکھنے کا شوق تھا۔یہ پارٹیشن سے بہت پہلے ممبئی گئے اور وہاں کاردار سٹوڈیو میں ملازم ہوئے۔جب فلم مغل اعظم کا پہلا ورشن شروع ہوا جو تھوڑا سا فلما کر ضائع ہو گیا تھا۔ اس میں پرتھوی راج ہیرو تھے اور اس فلم کے سینئر رائٹر محبوب اختر تھے۔ پھر جب بعد میں ''شاہجہاں'' فلم بنی تو اس میں بھی یہ سٹوری ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور بالآخر پارٹیشن سے پہلے انہوں نے اپنی فلم پروڈکشن کی بنیاد ڈالی اور اس پروڈکشن میں امان اللہ نیازی بھی ان کے پارٹنر تھے جو آخر میں سیکرٹری ڈیفنس تھے اور ہارٹ اٹیک ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔

شاعروں کی قدر و منزلت تو محبوب اختر صاحب کے گھر میں تھی ہی۔ انہیں پینے کی کچھ عادت تھی یہ پنڈی کلب کے ممبر تھے اور جب بھی کوئی دوست پنڈی جاتا تھا تو یہ اسے اپنے ساتھ کلب میں لے جاتے تھے۔ پینے کے بعد ان کی عادت تھی کہ یہ حاتم طائی بن جاتے تھے۔ اور جو نہ مانگو وہ بھی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیتے تھے۔ اگر کسی نے کہا کہ مجھے کل دو سو روپے کی ضرورت ہے اور مجھے یہ پیسے ٹیکسلا سے جا کر ہی لانے پڑیں گے تو یہ جیب میں ہاتھ ڈال کر تین سو روپے نکال کر دے دیتے۔

کلب کے ممبر ہونے کی وجہ سے وہاں ان کے دستخط چلتے تھے اور نقد ادائیگی نہیں کرنی پڑتی تھی اس لیے یہ حاتم طائی بن سکتے تھے۔ احمد فراز ان کی بہت اچھی نقل کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ایک بار انہوں نے بیرے کو بلایا اور کہنے لگے کہ دیکھو بھئی یہ احمد فراز ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہیں یاد رکھنا یہ میرے دوست ہیں۔ اس لیے جاؤ اور پہلے تو ہمارے لیے ایک ایک بڑا گلاس لے کر آؤ باقی تمہیں پھر بتاؤں گا۔ جب بیرا وہ لے آیا تو اس کے منیجر کو بلا لیا۔ ان کا نام راجہ احسان تھا اور وہ ان کے دوست ہی تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ راجہ صاحب احمد فراز کو پہچان رکھئے یہ جب بھی اس کلب میں آئیں میرے اکاؤنٹ میں پی سکتے ہیں اس کے بعد ایک بڑا پیگ اور منگوایا۔ اس طرح باتیں کرتے رہتے اور پیتے رہتے۔ قریب والے میز پر کوئی فارغ بیٹھا ہوتا تو اسے بھی بلوا لیتے اور اپنے اکاؤنٹ میں سے پلاتے اور دستخط کرتے رہتے۔

روزانہ صبح کے وقت دوکان پر بل منگوایا کرتے تھے۔ جب بل آتا تو کہتے کہ اتنا بل کیوں ہے۔ چنانچہ پہلے تو جا کر راجہ صاحب سے لڑتے تھے اور پھر اگلی شام کو دوبارہ وہی سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔

چنانچہ ان کی عادت تھی کہ پینے کے بعد یہ شاہ خرچ بن جاتے تھے اور جو جیب میں ہوتا تھا وہ بھی لٹا دیتے تھے اور جو ویسے مل جاتا تھا تو اسے بھی اپنے اکاؤنٹ سے پلا دیتے تھے۔

خورشید انور ہند و پاک میں ایک ایسا نام ہے جس سے پرانے اور نئے سبھی لوگ واقف ہیں۔ وہ لاہور کے ایک بہت بڑے وکیل خواجہ فیروز دین کے صاحبزادے تھے اور اپنے خاندان کے سب سے زیادہ ہونہار فرد تھے۔ ان کے دادا ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے تھے اور باقی خاندان بھی اچھے عہدوں پر تھا۔ ان کے بھائیوں میں سے بھی جو جہاں ہے نامور رہے۔ آگے اولاد بھی ماشاء اللہ لائق نکلی ہے۔ جس وقت مسلمان پرائمری پاس نہیں ہوتے تھے خورشید انور نے اس زمانے میں ایم اے کیا تھا۔ اور گولڈ میڈلسٹ کہلوائے۔ جس دن گولڈ میڈل ملنے والا تھا یہ اپنے استاد سے میوزک کی تعلیم لے رہے تھے۔ اور گولڈ میڈل لینے نہیں گئے۔ اس سے ان کی موسیقی کے جنون کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کب سے نمازیں ادا کر رہے تھے لیکن میرا جب ان سے واسطہ ہوا تو یہ نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ یہ پارٹیشن کے بعد کی بات ہے۔ انہوں نے "انتظار فلم کے لیے مجھے بلایا اور میں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ پانچ وقت کی نماز، ایک وقت کی شراب اور صبح کی تلاوت ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ڈائریکشن میں انہیں بہت زیادہ ملکہ حاصل تھا لیکن میوزک میں نئے نئے تجربے کرنے کے شائق تھے۔ یہ خود بھی کسی زمانے میں شاعر رہے تھے اور فیض صاحب کے کلاس فیلو رہے تھے۔ اس وقت فیض صاحب کو موسیقی کا شوق ہوتا تھا اور انہیں شاعری کا۔ پتہ چلا کہ فیض صاحب کا جب شروع میں کسی لڑکی پر دل آیا ہوا تھا تو اسے جو خط لکھا کرتے تھے ان میں سے ایک خط انہوں نے خورشید انور کو کہا ہوا شعر لکھ کر

بھیجا تھا۔ یہ بات مجھے خورشید صاحب نے بتائی تھی اور جب میں نے فیض صاحب سے اس کی تصدیق کی تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت میں شاعر نہیں تھا۔ یہ شاعر تھے۔ میں نے دو آدمیوں کو ایک جیسی شراب پیتے دیکھا۔ ان میں سے ایک جوش ملیح آبادی تھے اور دوسرے خورشید انور۔ جوش صاحب کو تو پینے کا بڑا اہتمام ہوتا تھا اور وہ عین سورج غروب ہونے کے وقت شراب پینی شروع کرتے تھے اور چاندنی وغیرہ سجا کر بیٹھتے تھے۔ پھر گھڑی سامنے رکھی ہوتی تھی اور نہ ایک منٹ ادھر ہونے دیتے تھے نہ ادھر۔ ان کا اپنا شعر ہے۔

جب مہرِ مبیں غروب ہوتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

جوش صاحب دن میں نہیں پیتے تھے اور شام کے وقت گھڑی رکھ کر تین پیگ سوا دو گھنٹے میں ختم کرتے تھے۔ خورشید صاحب بھی تین ہی پیگ پیتے تھے اور ایک کوارٹر منگواتے تھے کیونکہ اگر زیادہ شراب پڑی ہوتی تو ادھر ادھر سے لوگ آکر جھپٹ پڑتے تھے۔ یہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ ایک کوارٹر میں ساڑھے تین پیگ ہوتے ہیں۔ یہ اس میں سے تین پیگ پی کر آدھا پیگ چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کام کرنے والا لڑکا اپنا شوق پورا کر لیتا تھا۔

پینے کے بعد ان کی عادت تھی یہ مذہب پر بات کرتے تھے۔ ان کے دوست مسعود پرویز بلانوش تھے۔ دونوں قرآن کے بہت اچھے قاری تھے اور انہوں نے بڑی گہرائی سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ جب یہ پی لیتے تو دونوں مذہب کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو کرتے اگر مسعود پرویز نہ ہوتے اور کوئی اور بیٹھا ہوتا تو یہ فن پر ایسی ایسی باتیں بتاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی کہ ایک وہ شخص

جسے اہل موسیقی عطائی کہتے ہیں۔ وہ موسیقی کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت بھی دے گے اور انہوں نے ''آہنگ خسروی'' کے نام سے ای ایم آئی کے لیے ریکارڈنگ کی۔ ان کے تقریباً بیس ایل پی ہیں جن میں انہوں نے تقریباً سو راگنیاں تحقیق کر کے اچھے گویوں سے گوائیں اور اصلاح بھی کی۔ جہاں جہاں کوئی غلط گا رہا تھا اس کی اصلاح کی اور انہوں نے مانا کہ یہ اصلاح واقعی ٹھیک ہے۔ انہوں نے ان راگنیوں کے ساتھ ساتھ NARRATION بھی دی۔

فلم ''انتظار'' ہی کی بات ہے کہ ہم لوگ آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے مانسہرہ اور اس سے آگے جنگلات تک گئے۔ ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ پر بھی ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ کیونکہ مل کر کام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کہانی لکھنے والا بھی ساتھ چلے جاتا تھا۔ اس طرح نہیں جیسے آج کے کہانی نگار کرتے ہیں کہ وی سی آر پر دو چار فلمیں دیکھیں اور ایک فلم نکال کر پروڈیوسر کو دیدی۔ ہم سوچ کر اور بڑی محنت کر کے کام کرتے تھے اس لیے باہر بھی ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ فلم ''انتظار'' میں ہیرو کے بچپن کا رول میرے بیٹے پرویز نے کیا تھا جو آج کل گلاسگو میں ہے اور بچوں کا باپ ہے۔ اس وقت وہ بچہ تھا۔

ہم نے دو جگہ پڑاؤ رکھے ہوئے تھے۔ ایک مانسہرہ کے ڈاک بنگلہ میں اور دوسرا گڑھی حبیب اللہ کے ڈاک بنگلہ میں۔ گڑھی میں میں سنتوش کمار، مسعود پرویز، خورشید احمد اور پروڈیوسر جیلانی ٹھہرے تھے۔ باقی تمام سٹاف مانسہرہ میں رہتا تھا۔ اس سفر میں مسعود پرویز کو سٹڈی کرنے کا بہت موقع ملا۔ یہ

بڑے پڑھے لکھے ہوئے آدمی تھے۔ انہیں بھی موسیقی اور ادب سے گہرا شغف تھا۔ تھیوری کے علاوہ عملی طور پر بھی موسیقی کو سمجھتے تھے۔

پینے کے سلسلے میں جتنا بلانوش میں نے مسعود پرویز کو دیکھا کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ پیتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور اپنی جگہ پر قائم رہتے تھے۔ آؤٹ ہونے کی ان کی ایک ہی علامت تھی اور کہتے تھے کہ غالب کا شعر آپ نے سنا ہے:

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

پھر غالب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ واہ واہ غالب انسان کی کیا نفسیات جانتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے درمیان میں غالب کے اشعار کا ذکر شروع کر دیتے تھے اور بار بار اسی شعر کا حوالہ دیتے رہتے تھے۔ بات کوئی بھی ہوتی وہ تھوڑی دیر کے بعد کہتے کہ آپ نے شاید غالب کا وہ شعر نہیں سنا۔ پھر یہ شعر سناتے اور کہتے کہ واہ واہ غالب نے کیا نفسیات بیان کی ہے۔ یہ بھول جاتے تھے کہ پہلے بھی یہ شعر سنا چکا ہوں۔ یہ چار چار پانچ پانچ بار ایک ہی شعر سناتے رہتے تھے۔ ان کے آؤٹ ہونے کا یہی ثبوت تھا۔ وہ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے تھے بلکہ جب آؤٹ ہوتے تو یا تو کوئی کو ٹیشن لے لیتے اور یا پھر کوئی شعر اور بار بار وہی سناتے رہتے اور اس کی تعریف کرتے رہتے۔ اب تو کئی اور لوگوں کی طرح وہ بھی وہسکی سے دور ہٹ گئے ہیں اور سنا ہے کہ اب وہ علمی کام کر رہے ہیں۔ وہ آج کل امریکہ میں اپنی بیٹی کے پاس ہوتے ہیں۔

جن میوزک ڈائریکٹر وں کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ میرے

پہلے میوزک ڈائریکٹر شام سندر تھے۔ جو پارٹیشن سے پہلے شروع ہونے والی ایک فلم میں میرے ساتھی تھے۔ یہ فلم مکمل نہیں ہو پائی تھی۔ شام سندر بھی خوب پینے والے تھے اور دن میں بھی پیتے تھے لیکن ان کے فن کے عروج کا یہ معاملہ تھا کہ جہاں کسی کی سوچ دنوں میں پہنچتی تھی وہ وہاں گھنٹوں میں پہنچ جاتے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ فلم انڈسٹری میں شاعر کی اچھی خاصی گت بنتی ہے اور میوزک ڈائریکٹر اسے اچھی طرح ستاتا ہے۔ اور جو شاعر لکھ کر دے میوزک ڈائریکٹر کہتا ہے کہ اسے یہاں سے تبدیل کر دو یا وہاں سے تبدیل کر دو۔ اس لیے میں سہا ہوا تھا۔

ہر چند کہ فلم کے ڈائریکٹر ایک پڑھے لکھے نوجوان محبوب اختر تھے اور میرا واسطہ انہی سے تھا لیکن میوزک ڈائریکٹر کا خوف میرے ذہن میں تھا۔ یہاں لاہور میں ہال روڈ، میکلوڈ روڈ لنک پر کونے والی سرخ بلڈنگ میں جہاں کبھی راشننگ کا دفتر بھی رہا ہے۔ وہاں فلم کا دفتر تھا اور وہیں میرا شام سندر سے تعارف کروایا گیا۔ محبوب اختر نے میرا لکھا ہوا پہلا گیت پسند کیا تھا۔ ڈائریکٹر کو اوکے کر دے تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی کچھ ایسے میوزک ڈائریکٹر ہوتے تھے کہ اگر ان سے ٹیون نہ بن پاتی تو شاعر سے کہتے کہ ایک گیت اور لکھ دیجئے۔

ملاقات ہو چکی تھی۔ بیسمنٹ میں میوزک روم تھا۔ میں وہاں گیا اور شام سندر کو جا کر گیت دیتے ہوئے کہا کہ ڈائریکٹر صاحب نے یہ گیت اوکے کر دیا ہے۔ اب اگر آپ کو اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے بتائیے میں حاضر ہوں۔ پہلے تو وہ میرے منہ کو دیکھتے رہے۔ کیونکہ بہت پئے ہوئے تھے۔ اور پھر کہنے لگے " دیکھو شاعر صاحب! میں وہ نہیں ہوں (خود کو گالی دی) بلکہ میں تو میوزک ڈائریکٹر ہوں۔ آپ نے تو یہ گیت کسی قاعدے میں لکھا ہو گا آپ مجھے اخبار کی

کٹنگ لادیجئے اور ایک ایک کٹنگ کی پندرہ پندرہ ٹیونین بنوالیجئے۔ وہ کوئی میوزک ڈائریکٹر ہوتا ہے جو شاعر سے کہے کہ ذرا تبدیل کر دو۔ آپ نے جو بھی لکھا ہے اس کی ٹیون بنے گی۔ اب آپ یہیں بیٹھے رہئے اور سنئے“

انہوں نے گیت پڑھا۔ اس گیت کے پس منظر میں قحط بنگال کا واقعہ تھا۔ میں نے اسی پس منظر میں لکھا تھا کہ

ماتا دیکھ اپنی سنتان

تیری بیٹی لاج لٹائے تجھ کو لاج نہ آئے

ان جل دے کر جیون چھینے دھن والوں کے دان

ماتا دیکھ اپنی سنتا

اس قحط کے دوران عورتوں کی عزتیں بکی تھیں اس لیے میں نے اس گیت میں سرمایہ داری اور غربت کا ذکر کیا تھا۔ کہنے لگے کہ ”شاعر صاحب! گیت تو بڑا زور دار لکھا ہے مجھے اس پر ذرا سوچنا پڑے گا۔“ میں نے کہا کہ آپ سوچئے میں پھر آجاتا ہوں۔ کہنے لگے نہیں آپ یہیں بیٹھئے میں ابھی سوچتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی ٹیون بنائی میں نے کہا کہ بہت اچھی ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے خوش کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں یا واقعی اچھی ہے میں نے کہا اچھی ہے۔ کہنے لگے کہ شاعر صاحب! پہلی بار آپ نے کہا کہ بہت اچھی ہے اب کہہ رہے ہیں اچھی ہے۔ مجھے شروع میں وہ شاعر صاحب ہی کہتے تھے کیونکہ پہلی دو تین ملاقاتوں میں ان کی زبان پر میرا نام قتیل شفائی نہیں چڑھ رہا تھا۔

انہوں نے اس ٹیون کو رہنے دیا۔ اور ایک اور ٹیون بنائی۔ اس کے بعد ایک اور ٹیون بنائی۔ یوں انہوں

نے آدھے گھنٹے میں تین ٹیونیں بنادیں۔اور سب ایک دوسرے سے بہتر تھیں۔زندگی میں کسی بھی شعبے میں جو پہلا شخص آتا ہے وہ یاد رہتا ہے۔ ان سے میری دوستی ہو گئی۔

شام سندر کو پینے کے بعد کی عادتیں بہت بری تھیں۔جب وہ زیادہ پی لیتا تھاتو اسے عورت کی تلاش ہوتی تھی۔اور وہ اسے ڈھونڈنے نکل جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھاجب عورتوں کو زیادہ ڈھونڈنا نہیں پڑتا تھا اور کچھ آوارہ عورتیں ہوٹلوں میں مل جاتی تھیں۔سڑکوں پر بھی مل جاتی تھیں۔شام سندر کہیں نہ کہیں سے کوئی اپ ٹوڈیٹ سی عورت لے آئے تھے۔کبھی مال روڈ سے، کبھی رائل پارک سے۔مجھے اس بات کا شروع میں علم نہیں تھا۔اصل میں میں رتن سینما کے بالکل سامنے یونیورسل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس کا نام بعد میں بیت القیام ہو گیا تھا اور یہ سرائے سی بن گئی تھی۔اس میں فلم کے درمیانے درجے کے لوگ رہتے تھے۔

میرے کمرے کی دو چابیاں تھیں۔شام سندر نے ایک چابی مجھ سے اس بہانے سے لے لی ہوئی تھی کہ میں یہاں کبھی سوچنے یا آرام کرنے کیلئے بیٹھ جاؤں گا۔میرا اسلسلہ ایک خاتون چندر کانتا سے تھا میں اس کے پاس چلا جاتا تھا۔یہ میرے بعد کسی عورت کو لے کر وہاں پہنچے ہوتے تھے۔ایک دن ہوٹل والوں نے مجھے بتایا کہ شام سندر صاحب کو آپ نے کمرہ منتقل کر دیا ہے اور وہ تو روز یہاں عورت لے کر آتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن پڑوس کے کمرے والوں کو اعتراض ہے۔تب مجھے پتہ چلا کہ شام سندر وہاں کیا کرتے ہیں۔
میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ شکایت ملی ہے تو کہنے لگے کہ کیا آپ کمرے کے پیسے نہیں دیتے۔ میں

نے کہا کہ پیسے تو دیتا ہوں لیکن اس کام کیلئے نہیں دیتا۔ خیر انہوں نے چابی تو واپس دیدی لیکن برا مانا۔ بعد میں انہیں احساس ہوا کہ میری بات درست تھی، تب کہیں جا کر وہ بات بھولے۔ مگران کی یہ عادت تھی کہ جب ذرا زیادہ پی لیتے تو عورت کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔

کچھ اور بادہ نوش

ماسٹر غلام حیدر ایک بہت پرانا اور جانا مانا نام ہے۔ وہ ربانی خاندان سے تھے اور ان کا تعلق امرتسر سے تھا۔ شروع میں جیسا کہ تھیٹریکل کمپنی میں دستور تھا کہ اچھے سازندوں کو لیا جاتا تھا، یہ بھی تھیٹریکل سے وابستہ رہے تھے۔ یہ ہارمونیم کے بہت اچھے بجانے والے تھے۔ سیٹھ حبیب اس زمانے میں مشہور تھیٹر کے مالک تھے جن کی ماسٹر غلام حیدر خود بھی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی کمپنی کے ساتھ وہ ہندوستان بھر میں گھومے اور ہارمونیم بجانے میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہاں سے وہ ایک ریکارڈنگ کمپنی میں لاہور آئے جس کا نام چائنا فون تھا۔ انہوں نے یہاں کچھ ایسی دھنیں دیں جن سے ان کا نام پیدا ہوا۔

اس زمانے میں شمشاد بیگم اور امراؤ ضیاء بیگم کے نام ریڈیو پر اور ریکارڈوں میں بہت نمایاں تھے۔ یہ دونوں ہی ماسٹر غلام حیدر کی دریافتیں تھیں۔

میرا سلام لے جا

امراؤ بیگم کا یہ گانا بہت مشہور ہوا۔ پھر امتیاز علی تاج نے ایک فلم شروع کی جس کا نام تھا ”سورگ کی سیڑھی“ ۔اس میں ماسٹر غلام حیدر کو میوزک ڈائریکٹر لیا گیا اور غالباً یہ ماسٹر غلام حیدر کی پہلی فلم

تھی۔اس کے بعد انہوں نے کچھ اور فلموں میں میوزک کا جادو جگایا۔ایک وقت ایسا آیا کہ پنچولی اور دیگر پروڈکشنز کی فلموں میں لوگ ان کا نام تلاش کرتے تھے اور جس فلم پر ان کا نام ہوتا تھا اسے کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ان کی فلم ''خزانچی'' کے گانے بہت مشہور ہوئے۔ بہر حال پنچولی کی فلموں میں ان کا نام بہت گونجا۔اس زمانے میں ایک گانا تھا:

ساون کے نظارے ہیں،لاللا،لا

ساتھ مہمل لفظ لگا کر گانے کو سنوارنے کا اولین سہرا ابھی انہی کے سر تھا۔اس کے بعد ہر گانے کے ساتھ مہمل لفظ لگا کر لوگ گانوں کو سنوارنے لگے تھے۔یہ بھی ان کی ذہنی کوشش تھی۔ یہاں سے ان کا نام بڑھا اور پھر ممبئی میں ان کی مانگ ہوئی۔یہ وہاں چلے گئے اور وہاں کے بڑے بڑے ڈائریکٹر وں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے جن میں سہراب مودی، محبوب اور دیگر شامل تھے۔ان کی آخری فلم وہاں پر فلمستان والوں کی طرف سے تھی جس میں انہوں نے لتا منگیشکر جیسی آرٹسٹ کو چانس دیا۔اور آج تک لتا کی آواز گونج رہی ہے۔یہ بھی ماسٹر غلام حیدر کی دریافت تھی۔

پارٹیشن کے ساتھ ہی یہ لاہور میں آگئے اور یہاں انہوں نے سندھ کے ایک وڈیرے خاندان کے چشم وچراغ کو اپنے ساتھ ملایا۔ان کا نام فضل علی شاہ تھا لیکن انہوں نے ایس گل کے نام سے فلم میں کام کیا۔سرمایہ ایس گل کا تھا جبکہ ماسٹر غلام حیدر ایک طرح کے مینجنگ پارٹنر تھے۔انہوں نے پہلی فلم 'بے قرار '' بنائی۔یہ فلم تو نہ چل سکی لیکن اس کے گانے برسوں چلے۔حالانکہ آواز منور سلطانہ کی تھی۔لیکن ماسٹر غلام حیدر نے منور سلطانہ کی آواز کو اس سلیقے سے استعمال کیا تھا کہ منور سلطانہ بھی بہت عرصے تک پاکستانی فلم انڈسٹری کی ضرورت رہیں۔

میرا ان سے واسطہ فلم ''اکیلی'' سے شروع ہوا۔ یہ سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی فلم تھی جو ''اداکار'' کے مالک تھے جبکہ میں ان دنوں اس پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ میرا مزاج تھوڑا سا معیار کی طرف تھا۔ میں فلمی گانوں میں بھی ایک معیار رکھنا چاہتا تھا۔ جبکہ ماسٹر غلام حیدر جس ماحول سے آئے تھے وہاں صرف کمرشل ازم چلتا تھا۔ وہ اس میں کامیاب بھی تھے اور اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ صرف کامیابی نہ ہو بلکہ معیار بھی ہو اور لوگ شعر سن کر کہیں کہ گیت لکھا ہوا بھی اچھا ہے اس وجہ سے میری ان کے ساتھ کچھ ٹسل بھی ہوئی۔ اس ان بن کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میری ان کے ساتھ قربتیں نہیں تھیں اور دوسرے یہ کہ ان کی ٹیم میں شاعر طفیل ہوشیار پوری پہلے سے موجود تھے اور طے تھا کہ یہ گانے ان سے ہی لکھوائیں گے۔ لیکن مجھے فلمساز عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی طرف سے آگے کر دیا گیا تھا۔ اس لیے میں انہیں ذہنی طور پر قبول نہیں تھا اور وہ میرے راستے میں روڑے اٹکانے لگے۔

یہ پارٹیشن کے بعد کی بات ہے۔ عطاءاللہ شاہ ہاشمی کے ساتھی کرشن کمار ایم ایس سی تھے۔ وہ پہلے تو ہندوستان چلے گئے تھے لیکن بعد میں ویزا لے کر یہاں آئے تھے۔ انہیں ایک فلم بنانی تھی جس کی ڈائریکشن ان کی تھی۔ اس دوران وہ دوبارہ ہندوستان گئے تو عطاءاللہ شاہ ہاشمی بھی ان کے ساتھ انڈیا چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ماسٹر غلام حیدر کے کولہو کے آگے میں جتا رہا۔ میں نے انہیں ایک سیچوئیشن پر گیت لکھ کر دیا۔ انہوں نے دو دن سے اسے اپنے پاس رکھے رکھا اور پھر کہا کہ کچھ لکھئے۔ میں نے اسی ایک سیچوئیشن پر اس طرح ان کے کہنے پر چھ گیت لکھے۔ اسی اثناء میں کرشن کمار انڈیا سے واپس آ گئے اور مجھ سے پوچھا کہ گانا کوئی بنا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں تو چھ گیت لکھ کر دے چکا

ہوں۔ یہ گیت ماسٹر جی کی نظر میں نہیں جچے۔ وہ مسکرائے اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر پوچھا کہ ماسٹر جی کا کوئی دوست شاعر ہے میں نے کہا جی ہاں طفیل ہوشیار پوری ہیں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے۔ کل میٹنگ رکھیں گے اور پھر اس معاملے کو دیکھیں گے۔

اگلے روز میٹنگ ہوئی۔ اس میں انہوں نے انجان بن کر مجھ سے پوچھا کہ قتیل صاحب کچھ لکھا ہے آپ نے؟ میں نے کہا جی ہاں میں نے ایک سیچوئیشن پر چھ گانے لکھے ہیں۔ حیران ہو کر کہنے لگے کہ چھ گانے کیوں لکھے ہیں۔ میں نے کہا کہ ماسٹر جی کا خیال تھا کہ زیادہ گانے لکھنے چاہئیں۔ کہنے لگے کہ سنائیے۔ ہم نے پہلے سے جو پلاننگ کر رکھی تھی اس کے مطابق میں نے انہیں ایک گانا سنایا۔ انہوں نے گانا سن کر کہا کہ یہ گانا بس ٹھیک ہے لیکن آپ نے کوئی اور گانا بھی لکھا ہے۔ میں نے دوسرا گانا سنایا تو وہ کہنے لگے کہ واہ واہ یہ بہت اچھا گانا ہے۔ آپ ماسٹر جی کو یہ گانا دیتے۔ انہوں نے یہ بات انجان بن کر کہی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی یہی دے دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ آپ باقی کے گانے چھوڑیئے۔ مجھے اور کوئی گانا نہیں سننا۔ یہ گانا ٹھیک ہے اور مجھے بالکل سوٹ کرتا ہے۔

چنانچہ میں نے وہ گانا ماسٹر جی کو پکڑا دیا اور انہوں نے کچھ کہے بغیر وہ گانا رکھ لیا۔ اس طرح ماسٹر جی کے ساتھ کام کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اندرونی طور پر کچھ کشمکش چلتی رہی۔ انہوں نے اس فلم میں ایک آدھ گانا طفیل ہوشیار پوری کا بھی رکھا اور اپنی ضد پوری کی۔

آگے چل کر فلم ''گلنار'' بننے لگی تو اس کی ٹیم میرے مطلب کی تھی۔ سید امتیاز علی تاج اس فلم کے ڈائریکٹر تھے۔ شوکت تھانوی اس کے مکالمہ نگار تھے جبکہ وہ اس فلم میں ایک کیریکٹر بھی کر رہے تھے۔ اس فلم کے پروڈیوسر شوکت رضوی تھے۔ یہ سب، خاص طور پر تاج صاحب میرے قدردان

تھے اور مجھ پر کرم بھی کرتے تھے۔اس فلم میں میوزک ڈائریکٹر ماسٹر غلام حیدر تھے اور گیت نگار مجھے لیا گیا۔ وہاں ماسٹر جی سے جب پہلی بار ٹکراؤ ہوا تو انہوں نے مجھے دیکھا اور میں نے انہیں دیکھا۔ انہوں نے تھوڑا سا محسوس کیا پھر خود ہی مجھے کہا کہ قتیل صاحب! ہم اگر مل کر کچھ کام کر لیں تو فلم کے مفاد میں بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جیسے آپ کہتے ہیں کر لیں گے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن آپ ڈائریکٹر صاحب سے بھی یہ بات کہہ لیں کیونکہ سارا پلان تو ان کے ذہن میں ہے۔

میں نے پہلا گیت لکھا تو ماسٹر جی نے کہا کہ آپ اسے چھوڑیئے۔ میں آپ کو ٹیون دیتا ہوں آپ اس پر گیت لکھئے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ ٹیون دیجئے۔ اگر ٹیون اچھی ہوئی تو میں گیت لکھوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ٹیون دی اور میں نے پانچ منٹ میں گیت لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ ماسٹر صاحب ہکے بکے رہ گئے۔ عام طور پر ادب سے گیا ہوا شاعر ٹیون پر لکھنے سے گھبراتا ہے۔ اور گھبرانا بھی ٹھیک ہے کیونکہ عام طور پر میوزک ڈائریکٹر اوٹ پٹانگ سی ٹیون دے دیتا ہے جس کا کوئی وزن وغیرہ بھی نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ماسٹر غلام حیدر نے جو وزن دیا وہ قاعدے میں تھا۔ وہ ایک پرانی ٹھمری یاد درا تھا۔ میرے لئے آسان تھا اس لیے میں نے کر دیا۔ یہ گیت لکھنے سے پہلے یہ بھی ہوا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ ٹیون پہلی سیچوئیشن پر ٹھیک نہیں ہے بلکہ دوسری سیچوئیشن پر ٹھیک ہے اس لیے اگر آپ کہیں تو میں اس سیچوئیشن پر اس ٹیون میں گانا لکھ دوں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے چنانچہ میں نے وہ گانا لکھ کر دے دیا اور وہ گانا ہو گیا۔

اب میں نے پہلی سیچوئیشن کے لیے جو گانا لکھا تھا وہ میں نے امتیاز علی تاج صاحب کو دکھایا اور کہا کہ میری نظر میں یہ گانا بہت اچھا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میری نظر میں یہ بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ یہ گانا ماسٹر صاحب سے Approve کروائیں۔ اور اس طرح کروائیں کہ وہ ناراض نہ ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ انہیں سامنے بٹھا کر مجھ سے یہ گانا سنیں اور اپروو کر دیں۔ وہ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ۔ چنانچہ ہم ایک ساتھ بیٹھے اور انہوں نے ماسٹر صاحب کے سامنے مجھ سے پوچھا کہ قتیل صاحب! سنایئے کیا لکھا ہے۔ میں نے گانا سنایا تو وہ کہنے لگے واہ واہ۔۔۔ واہ واہ۔۔۔ کیا خوبصورت گانا لکھا ہے۔ اور انہوں نے اس طرح کہا جیسے ان پر وجد طاری ہو گیا ہو۔ پھر کہنے لگے کہ یہ گانا ماسٹر صاحب کو دیجئے۔ ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ تاج صاحب! یہ گانا تھوڑا سا مشکل نہیں ہے۔ تاج صاحب کہنے لگے کہ مشکل ہے؟ وہ غزل تھی۔

لو چل دیئے وہ ہم کو تسلی دیئے بغیر
اک چاند چھپ گیا ہے اُجالا کئے بغیر
اے ضبط عشق اور نہ لے امتحانِ غم
ہم رو رہے ہیں نام کسی کا لیے بغیر

اب ماسٹر صاحب لفظ امتحان غم پر انگلی رکھ کر کہنے لگے کہ یہ ذرا مشکل ہے۔ تاج صاحب کہنے لگے کہ ماسٹر جی آپ ان معاملات پر کیوں کڑھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ آپ بس ٹیون بنایئے ان معاملات کے لیے میں جو بیٹھا ہوں۔ اور آپ لفظوں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اس طرح تاج صاحب نے ایک طرح

سے ان کی فہمائش کر دی۔ پھر ماسٹر جی نہیں بولے۔اس واقعہ کے بعد بھی میں ماسٹر صاحب سے مل کر کام کرتا رہا اور بالآخر ہم دونوں میں اتنی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی کہ آئندہ کیلئے لمبے چوڑے پروگرام بننے لگے۔ایک دن وہ مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب ویسے تو یہاں بھی ٹھیک ہے کیونکہ یہ اپنا وطن ہے لیکن میں کاروباری طور پر یہاں آکر پچھتایا ہوں۔کیونکہ یہاں فن کی قدر نہیں ہے۔پھر کہنے لگے کہ میں وہاں پر ایک لاکھ روپے لیتا تھا لیکن یہاں پر صرف دس ہزار روپے لیتا ہوں۔پھر مجھے کہنے لگے کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیئے۔ہم ادھر جا کر ایک دو سال لگا کر واپس آئیں گے اور یہاں آکر بزازی کی دوکان کھول لیں گے لیکن یہ کام یہاں نہیں کریں گے۔غرضیکہ پھر ہمارے درمیان انڈرسٹینڈنگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس طرح کے پروگرام بھی بننے لگے اور کھانا پینا بھی اکثر ایک ساتھ ہوتا۔

وہ پیتے بھی تھے اور ان کی عادت تھی کہ پینے کے بعد انہیں وہ لوگ یاد آتے تھے جن سے کبھی انہوں نے پیار کیا تھا۔ان کا نام میں یہاں نہیں لیتا کیونکہ مجھے کسی کی رسوائی مقصود نہیں۔یہ ان کا نام لیتے تھے اور روتے تھے اور یا پھر یہ کہتے تھے کہ اس ملک میں فن کی کوئی قدر نہیں ہے آپ میرا ساتھ دیں۔انڈیا جائیں گے دو سال لگا کر واپس آئیں گے۔میرے پاس کوئی دس لاکھ روپے ہوں گے۔اور آپ کے پاس بھی دو لاکھ روپیہ تو ہو ہی جائے گا۔ دونوں مل کر بزازی کی دوکان کھولیں گے اور آپ میرے پارٹنر ہوں گے۔پینے کے بعد پھر اور پیگ لیتے تھے اور پھر انہی چیزوں کو دہراتے تھے۔پھر کہتے تھے کہ آہ اس کی کیا آواز تھی اور کیا حسن تھا۔افسوس کہ اس کا ساتھ نہ ہو سکا۔

اس دوران میں انہیں گلے کا کینسر ہو گیا۔انہوں نے دو شادیاں کی ہوئی تھیں۔ ایک تو فیملی ہی میں کی ہوئی شادی تھی۔جس وقت ان کی یہ شادی ہوئی تھی اس وقت وہ اتنے بڑے میوزک ڈائریکٹر نہیں

بنے تھے۔اس لیے وہ شادی اسی برادری سے اسی معیار کے مطابق ہوئی تھی۔ویسے وہ ذہنی طور پر بہت بڑے آدمی تھے۔ان کا گھریلو ماحول تو اسی سطح پر رہا لیکن وہ خود بہت اوپر پہنچ گئے۔ان کے اندر ایک بڑا آدمی بھی تھا۔ان سے بات کرتے ہوئے پتہ چلتا تھا کہ ہم کسی معزز آدمی سے بات کر رہے ہیں۔
ان کی دوسری شادی امراؤ ضیاء بیگم سے ہوئی تھی۔ان کی ان کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ چائنا فون سے وابستگی کے زمانے میں ہو گئی تھی کیونکہ یہ گھر سے اکتائے ہوئے تھے۔جس وقت یہ گلے کے کینسر کی بیماری میں میو ہسپتال میں پڑے ہوئے تھے "گلنار" فلم کا میوزک مکمل کر چکے تھے لیکن ابھی بیگ گراؤنڈ میوزک باقی تھا۔جو انہی کے رشتہ دار رشید عطرے نے کیا۔جب یہ ہسپتال میں پڑے تھے تو دونوں بیویوں کی طرف سے سازشیں جاری تھیں۔ایک طرف کی فیملی جاتی اور کہتی کہ ماسٹر جی ہمارا کیا بنے گا۔دوسری طرف کی فیملی جاتی تو کہتی کہ یہ مکان ہمارے نام کر دیں۔یہ ان سازشوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔میرے اس زمانے میں ان کے ساتھ تعلقات عروج پر پہنچ گئے ہوئے تھے اور شروع میں جتنی ناچاقی تھی اب اتنی قربت تھی۔
میں ایک دن ہسپتال گیا تو کہنے لگے کہ قتیل صاحب! آپ زندگی میں دوسری شادی کبھی نہ کریں مر جائیں لیکن دوسری شادی نہ کریں۔ان سے بولا نہیں جاتا تھا اور انہوں نے بڑی مشکل سے اور بڑی آہستہ آواز میں یہ بات کہی تھی۔وہ اپنی دو بیویوں سے کم اور ان کے رشتہ داروں سے زیادہ تنگ آئے ہوئے تھے جو یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ مر رہے ہیں بلکہ یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح جائیداد میں سے حصہ مل جائے۔
پہلے بھی دو شادیوں کے بارے میں میرا تصور ایسا ہی تھا کیونکہ کچھ گھریلو معاملات بھی میرے سامنے

تھے۔ لیکن اس دن سے میں نے یہ بات پلے باندھ لی اور ماسٹر غلام حیدر کے ان الفاظ سے دو شادیوں کے خلاف میرے دل میں ایک جذبہ مرتسم ہو کر رہ گیا۔اس کے بعد زندگی میں ہزار انقلاب آئے لیکن میں دو شادیوں والے پل صراط سے آسانی سے گزر گیا۔

کامیابی کی صورت میں لوگ جتنی داد دیتے ہیں، ناکامی کی صورت میں لوگ اس سے بڑھ کر تضحیک کرتے ہیں اور بعض اوقات تو لطیفے بھی گھڑ لیتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری صاحب ہمارے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جن کا قلم ہمہ گیر تحریروں کے لیے مشہور ہے۔وہ باشعور آدمی ہیں اور ایک نظریہ رکھنے والے اور ادب وسیاست دونوں پر یکساں نظر رکھنے والے ادیبوں میں سے ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ بھی فلم میں آئے تھے۔ اب فلم میں آنے والوں کی خوش قسمتی اور بدقسمتی آتی ہے۔اگر پہلی فلم ہٹ ہو گئی تو اس آدمی کے وارے نیارے ہو گئے اور اسے لکی قرار دیا دے کر دس فلمیں اور عطا کر دیں گئیں لیکن اگر پہلی فلم ناکام ہو گئی تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری صاحب کو چھوٹے چھوٹے چانس تو پہلے بھی ملے تھے لیکن فلم "کہاں گئے" میں ان کو بڑا چانس ملا۔اس کے ڈائریکٹر نرنجن تھے جو کانوں سے بہرے تھے اور چاند بائی اس کی ہیروئن تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے نرجن سے مراسم ہیں۔ یہ فلم جس زمانے میں بن رہی تھی اس زمانے میں اس ٹیم کا ہر آدمی پر آمید تھا کہ یہ فلم ہٹ ہو گی۔ خاص طور پر ظہیر صاحب جب ادبی محفلوں میں ہوتے تھے تو اس فلم کا ذکر کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ انہوں نے اس میں کیا کیا لکھا ہے ۔کہتے تھے کہ یہ ایک قیامت خیز فلم ہے اور جب آئیگی تو میرا نام سب سے اوپر ہو گا۔ ہمیں ان کی

باتوں کا یقین بھی تھا کیونکہ وہ جو دعوے کر رہے تھے ان کے مستحق تھے۔ لیکن فلم کا معاملہ تو لاٹری کا ہوتا ہے۔ اگر نکل آئے تو پانچ لاکھ روپے مل جاتے ہیں۔ نہ نکلے تو پانچ روپے بھی گئے۔

چنانچہ ہم بھی انتظار کرنے لگے۔ یہ فلم 1947ء کے فروری میں رٹز سینما میں لگی پہلا شو چلا تو فلم کی پوری ٹیم بھی گیلری میں موجود ہے۔ یہ روایت اس زمانے میں بھی تھی اور اب بھی ہے اور فلم کی ٹیم لوگوں کا ردعمل دیکھنے کیلئے وہاں جاتی ہے۔ ظہیر کاشمیری صاحب سے میرے مراسم تھے مگر ہم اس ٹیم میں نہیں تھے۔ میں اور میری پروڈکشن والے دوسری کلاس میں بیٹھے ہوئے یہ فلم دیکھ رہے تھے۔ پکچر شروع ہوئی تو چار ریلیں تو لوگوں نے برداشت کیں اور پانچویں ریل پر ہوٹنگ شروع ہو گئی۔ پھر کچھ پکچر جمی اور اس کے بعد انٹرول ہو گیا۔ جب اگلا ہاف شروع ہوا تو پھر وہی بوریت کی کیفیت آ گئی۔ جب فلم ختم ہوئی تو لوگوں نے کرسیاں توڑنی شروع کر دیں اور کرسیوں کے ٹکڑے گیلری میں پھینکنے شروع کر دیتے کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ ٹیم اوپر بیٹھی ہوئی ہے۔ لوگوں کو چوٹیں آئیں۔ چاند بائی کے ماتھے پر کرسی لگی اور وہ لہولہان ہوئی۔ یہ سب بیچارے وہاں سے بھاگے اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔

لطیفہ یہ ہوا کہ ظہیر صاحب یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ پکچر معیاری نہیں ہے۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پکچر کچھ ایسے بن گئی ہے جس کے خیالات وقت سے پہلے آ گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس ان دنوں اپنی فلم "آج اور کل" بنانے کیلئے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی پروگریسو آدمی تھے اور ظہیر کاشمیری بھی پروگریسو آدمی تھے۔ دونوں ہم مشرب اور ہم مسلک بھی تھے۔ تو لوگوں نے ان کے بارے میں لطیفہ بنا لیا کیونکہ جب آدمی ناکام ہو جائے تو لطیفے بھی بن جاتے

ہیں۔

چنانچہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ظہیر کاشمیری صاحب خواجہ احمد عباس کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ نے میری فلم دیکھی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں دیکھی ہے۔ پوچھنے لگے کیسی ہے۔ خواجہ صاحب کہنے لگے کہ سبحان اللہ بہت اچھی پکچر ہے مجھے اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی صرف دو باتوں کی تھوڑی سی کمی ضرور نظر آئی اور وہ یہ کہ ایک تو پکچر سنائی نہیں دیتی اور دوسرے دکھائی نہیں دیتی۔

یہ لطیفہ بہت عرصہ چلتا رہا اور یوں ظہیر کاشمیری بہت عرصہ فلم میں پیچھے رہے۔ پھر انہیں فلم ''تین پھول'' میں چانس ملا۔ یہ فلم انہوں نے ڈائریکٹ کی اور یہ بھی ناکام ہو گئی۔ یہ ان کی بد قسمتی تھی۔ یہ نہیں کہ یہ نااہل تھے بلکہ فلم کا معاملہ لاٹری والا ہے۔ جب یہ فلم نہ چلی تو لوگوں نے یہاں بھی لطیفے بنائے۔ ایک مشہور لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ ''تین پھول'' فلم دیکھنے کیلئے گئے ہوتے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک آدمی جو پہلی قطار میں بیٹھا تھا سو گیا۔ پچھلے آدمی نے اسے تھوڑا سا ہلا کر کہا کہ جناب آپ فلم دیکھتے سو گئے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر میں سو گیا ہوں تو آپ کو کیا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ آپ کے خراٹے مجھے سونے نہیں دے رہے۔ آپ میری نیند میں کیوں خلل ڈال رہے ہیں۔ چنانچہ اس فلم پر یہ لطیفہ مشہور ہوا۔

ظہیر کاشمیری اس کے بعد فلم سے الگ ہو گئے اور اس کے بعد ان کا اپنا جو میدان تھا یعنی ادب اور سیاست اس میں بہت آگے بڑھے۔ کئی کتابیں لکھیں اور ان کی تصانیف سے لوگوں نے رہنمائی حاصل کی۔

پینے کے بعد میں نے ان کی جو کیفیت دیکھی وہ یہ تھی کہ وہ پینے کے بعد مخاطب کو سٹوڈنٹ سمجھ کر سوشلزم پر تقریر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے انہیں فالج ہو گیا تھا اور ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس وقت سے انہوں نے پینی چھوڑ دی اور اب اتنے تندرست ہو گئے ہیں کہ ستر سال کے ہونے کے باوجود وہ پچاس سال کے نظر آتے ہیں۔ میں ان کی عادت کا ذکر کر رہا تھا۔ پینے کے بعد وہ سوشلزم پر تقریر کرتے تھے۔ یہ تقریر بو گھس نہیں ہوتی تھی بلکہ جینوئن ہوتی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا کہ پوری کی پوری تقریر ان پر نازل ہو رہی ہے۔ دوسرا انہیں چونکہ گانے سے مس رہا ہے اور وہ گانے کی باریکیوں کو بھی جانتے ہیں اس لیے وہ کوئی ٹھمری دادرا یا کوئی پکا راگ ضرور سناتے تھے۔ تیسرا یہ ہے کہ وہ اپنا تازہ کلام ضرور سناتے تھے۔ یہ سب کچھ سنا کر ہی انہیں چین آتا تھا۔

یہ سب ان کے پینے کے بعد کی عادتیں ہیں اور یہ ساری چیزیں صحت مند ہیں۔ میں نے ان کی اس عادت سے کافی سیکھا۔ اگرچہ میں ان کے ساتھ اس طرح کی محفلوں میں زیادہ نہیں بیٹھا لیکن ان کے جو خیالات مجھ تک پہنچتے تھے میں انہیں توجہ سے سنتا تھا۔ ظہیر صاحب کی آواز بھی اچھی تھی اور اگر وہ راگنی سناتے تو واقعی مزہ آتا۔ اس طرح اگر ایک اچھے شاعر کا تازہ کلام سن لیا جائے تو اس سے بھی خود کہنے کی تحریک ہوتی ہے۔

چنانچہ پینے کے بعد میرے تجربے میں جو بہتر آدمی آیا ہے وہ ظہیر کاشمیری ہیں۔

رفیق غزنوی کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ہم لوگ زندگی کے سفر میں چند قدم ساتھ چلے اور مجھے رفیق غزنوی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رفیق غزنوی کا آبائی طور پر تعلق غزنی سے تھا۔ ان کا محمود غزنوی سے کوئی تعلق نہیں تھا صرف یہ کہ ان کے والد غزنی سے آئے تھے اور یہ لوگ آکر پنڈی میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی ماں بھی پٹھان تھی اور والد بھی۔ اس زمانے میں ان کی بڑی متمول فیملی تھی۔ اصل میں ان کا کباڑ کا کام تھا اور راجہ بازار راولپنڈی میں یہ 1906ء سے یہ کام کر رہے تھے۔ رفیق اکلوتی اولاد تھے اور بڑے ناز و نعم سے پلے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں عام طور پر بچے ان پڑھ رہتے تھے اور اگر سو میں سے کوئی ایک بچہ میٹرک کر لیتا تھا تو وہ پڑھا لکھا کہلاتا تھا اور بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتا تھا۔ باپ نے اس زمانے میں رفیق غزنوی کو گریجویشن کروائی۔ لیکن رفیق شاید پیدائشی طور پر فنکار تھے۔

وہ ایک تو خوبصورت تھا اور دوسرا اس کا گلا بہت اچھا تھا۔ چنانچہ جب گاتا تھا تو ایک سماں باندھ دیتا تھا۔ چونکہ گھر سے بھی ٹھیک ٹھاک اور کوئی مالی پریشانیاں نہیں تھیں۔ اس لیے اس زمانے کے استاد زماں عاشق علی خان کی شاگردی اختیار کی۔ اور باقاعدہ گانا سیکھا اور اس حد تک سیکھا کہ لوگوں کو خود اصلاحیں دینے لگے۔ ظاہر ہے کہ راولپنڈی میں رہ کر اس شوق کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ فلم انڈسٹری اس وقت خاموش فلموں سے ٹاکی کی فلموں کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اور پہلی متکلم فلم انڈین سکرین پر ''عالم آرا'' کے نام سے آچکی تھی چنانچہ اس زمانے میں ان لوگوں کی مانگ بڑھی جو گا بھی سکتے تھے۔ رفیق غزنوی تو چونکہ خوبصورت تھے۔ اس زمانے میں اشرف خان، بھائی دیسا، اور

ماسٹر نثار وغیرہ ہیرو ہوا کرتے تھے۔ماسٹر نثار کو تو وہ شہرت ملی جو آج کے زمانے میں دلیپ کمار کو بھی حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گاتے بھی تھے کیونکہ وہ پلے بیک کا زمانہ نہیں تھا۔اور فلموں میں گانوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ہر فلم میں بیس پچیس گانے ہوتے تھے۔ فلم ''اندر سبھا '' تو پوری کی پوری منظوم تھی۔اس کے ڈائیلاگ بھی گا کر ادا کئے جاتے تھے۔لیکن عام فلموں میں بھی دس بیس گانے زیادہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ ہیرو لیے جاتے تھے جو گا بھی سکتے تھے اور کچھ شکل وصورت بھی ہوتی تھی۔ لیکن رفیق غزنوی کا معاملہ دوسرا تھا۔وہ انتہائی خوبصورت تھے اور اللہ تعالٰی نے انہیں حسن اور خوبصورتی سے پوری طرح نوازا ہوا تھا اور ''ہیر وارث شاہ'' میں جو رانجھے کا سراپا ہے یہ بالکل اسی کی تصویر تھے۔

یہ لاہور پہنچے تو کاردار نے جو پہلی فلم ''ہیر رانجھا'' بنائی اس میں انہوں نے رانجھے کا کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی ہز ماسٹر وائس کمپنی میں ان کے ریکارڈ بنے۔پھر چونکہ پڑھے لکھے تھے اور شعر وادب سے بھی دلچسپی تھی اس لیے اس زمانے میں جبکہ علامہ اقبال شہرت کی معراج پر پہنچے ہوئے تھے اور ان کی نظم '' شکوہ'' پڑھے لکھے مسلمانوں میں ازبر تھی۔رفیق غزنوی نے یہ نظم اپنی آواز میں ریکارڈ کروائی تھی۔چنانچہ انہوں نے لاہور سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا اور اس کے بعد وہ ممبئی چلے گئے۔

شروع میں انہیں لاہور میں ایک فلم '' پرواز'' ملی اور لاہور میں مال روڈ کے ایک ہوٹل میں ان کا قیام ہوا اور وہاں ان سے محفلیں جمیں۔دوستی کا پس منظر یہ بھی تھا کہ یہ بھی راولپنڈی کے مکین رہے تھے اور میرے ایک کزن ان کے بچپن کے دوست تھے۔محلہ بھی تقریباً ایک ہی تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ پھر انہیں شعر وادب سے بھی شوق تھا اور میری شاعری کو پسند کرتے تھے اس لیے ان سے ملاقاتیں

بڑھیں۔ان کی بڑائیوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ان کے قریب بیٹھ کر فخر محسوس ہوتا تھا۔اس لیے ان سے مراسم ہو گئے۔اس کے بعد جب یہ کراچی منتقل ہو گئے تو جب کبھی میرا وہاں آنا جانا ہوتا تو ان سے ملاقات ہوتی تھی اور کراچی میں قیام کے دوران ایک شام میری ان کے گھر میں بھی ہوتی تھی۔ان کی باقی کی شامیں تو ہم لے لیتے تھے لیکن چونکہ خود بھی بہت اچھا کھانا پکاتے تھے اور کھانے کا بھی اعلیٰ ذوق تھا اس لیے وہاں جا کر خوشی ہوتی تھی۔

رفیق غزنوی کے بارے میں مشہور تھا کہ جب یہ گانا سننے کسی کوٹھے پر جاتے تھے تو گانے والیوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود کسی پائے کے گانے والے ہیں۔اس لیے وہ الٹا ان سے گانے کی فرمائش کرتی تھیں۔اور جہاں ان کی طبیعت جم جاتی تھی اس کوٹھے کے دروازے اور لوگوں کے لیے بند ہو جاتے تھے۔اور رفیق غزنوی وہاں سے اتنے دنوں بعد نکلتے تھے جب کہ نائیکہ کو یہ پتہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی بیٹی رفیق غزنوی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔مذاق سے دوست کہا کرتے تھے کہ رفیق غزنوی سے کوٹھوں کو بچاؤ یہ تو پوری پوری فیملی کو ساتھ لے جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی عورتیں ان کی زندگی میں آئیں اور ان سے اولادیں بھی ہوئیں لیکن زیادہ تر لڑکیاں ہی ہوئیں اور جیسے خود خوبصورت تھے اسی طرح وہ بھی بہت خوبصورت تھیں۔لیکن وہ ان عورتوں سے ہونیوالی بچیوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔چونکہ ان عورتوں کا تعلق زیادہ تر کوٹھوں سے ہوتا تھا۔ اور وہاں پر اولاد ہی کو دولت تصور ہوتی ہے اور ماں ہی اولاد کو اپنے پاس رکھتی ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان چیزوں کے کچھ اثرات ہوتے ہیں وہ ان باتوں کا برا نہیں مانتے تھے۔

کراچی میں ان کی آخری بیوی کا نام شاید انور ادھا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ بیوی کے بغیر رہے اس کے بعد ایک کرنل کی بیٹی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس سے زائد تھی اور وہ لڑکی سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کی نئی شادی اس سے ہو گئی ہے۔ ہم گئے تو دیکھا کہ وہ نہایت خوش گفتار، باذوق، زندہ دل اور خوش پوش تھی۔ وہ رفیق صاحب کا ساتھ دینے والی لڑکی تھی اور اتنی خوش تھی کہ عمروں کا فرق بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ مطمئن بھی نظر آتی تھی۔ کھانا وہ بھی پکاتی ہو گی لیکن جس دن میں وہاں گیا تو اس دن رفیق صاحب نے کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا۔ ان کے ہاتھ کی میں نے ایک بار جو نہاری کھائی وہ بہت لذیذ تھی۔ عام طور پر نہاری میں لوگ مرچ مصالحہ زیادہ ڈالتے ہیں لیکن ان کے ہاں مرچ مصالحہ کم ہوتا تھا اس لیے یہ نہاری زیادہ لذت والی تھی اور چیزیں بھی میں نے ان کے ہاں کھائیں لیکن بکرے کے پائے کا پلاؤ میں نے پہلی اور آخری بار ان کے ہاں ہی کھایا۔ سب جانتے ہیں کہ پائے پکنے کے بعد اس کا شوربہ انتہائی چپکنے والا ہو جاتا ہے اور اگر شوربہ زیادہ گاڑھا ہو تو انگلیاں آپس میں چپک جاتی ہیں لیکن اس پلاؤ کی خاصیت یہ تھی کہ دانہ دانہ الگ الگ تھا اور کچھ جڑا ہوا نہیں تھا۔ یہ رفیق غزنوی کی ایسی صناعی تھی کہ جیسے وہ بعض راگوں میں ایسے سر استعمال کرتے تھے کہ دو راگ ایک ساتھ ہونے کے باوجود الگ الگ نظر آتے تھے مگر سماں بھی ایک ہوتا تھا اسی طرح یہ پلاؤ تھا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں سے سنا کہ وہ بھی ایسا پلاؤ پکا سکتے ہیں لیکن یہ زبانی دعوے ہی ثابت ہوئے۔ میں نے ان کے بعد ایسا پلاؤ کبھی نہیں کھایا۔

رفیق غزنوی کو ایک شوق ریس کا تھا۔ ریس میں جو بھی جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس فن پر عبور رکھتا ہے۔ اور اس زعم میں مارا جاتا ہے۔ رفیق نے اپنی زندگی کی بہت سی کمائی ریس میں ضائع کی۔ اور

دعویٰ یہ تھا کہ وہ اسے بہت سمجھتے ہیں۔ ریس کھیلنے والے اپنی ہار کو کبھی لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے کیونکہ اس میں تضحیک بھی ہوتا ہے اور لوگوں کی باتیں بھی سننی پڑتی ہیں۔ اور کوئی جوئے والا بھی نصیحت سننا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ انہوں نے بہت کچھ ریس میں ہارا۔ آخری وقت میں جب یہ ریڈیو سے ریٹائر ہوئے تو انہیں جو پراویڈنٹ فنڈ ملا وہ یہ پورے کا پورا ریس میں ہار گئے۔ اس سے بیوی کو بھی صدمہ ہوا۔ اور خود بھی ملول ہوئے۔ اور جو رقم ان کا آخری وقت کا سہارا بن سکتی تھی وہ نہ بن سکی۔ اور انہیں دوبارہ کنٹریکٹ پر کام کرنا پڑا۔ پہلے وہ اپنے آرٹ کے بارے میں اور اپنے آرٹسٹ ہونے کے بارے میں فخر سے جو بات کیا کرتے تھے وہ اب ذہن سے نکل گئی۔ میں نے ایک بار فون کیا تو کہنے لگے کہ شام کو آپ میری طرف ذرا لیٹ آیئے۔ پہلے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں ریکارڈنگ کے لیے جا رہا ہوں یا کسی کو ریہرسل کروانی ہے لیکن اس دن کہا کہ کام پر جا رہا ہوں اور ان کا لہجہ بہت بجھا ہوا تھا۔ اب رفیق غزنوی کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بجھ چکے تھے۔

ان کی زندگی میں ایک صدمہ اور تھا اور وہ یہ کہ ان کی ایک چہیتی بیٹی تھی جو بہت خوبصورت تھی اور اس کی شادی ضیا سرحدی سے ہوئی تھی۔ جب یہ ممبئی میں تھے تو ضیا سرحدی بھی وہیں تھے۔ دونوں پٹھان تھے اور دونوں کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ ضیا سرحدی intellectuals میں شمار ہوتے تھے اور ان کا کافی نام بھی تھا۔ اس سطح پر رفیق غزنوی کی بیٹی کی شادی ضیا سرحدی سے ہوئی لیکن بعد میں خدا جانے کیا ہوا کہ دونوں کی علیحدگی ہو گئی۔

پارٹیشن کے بعد رفیق صاحب اور ان کی بیٹی یہاں آ گئے۔ بعد میں یہاں ضیا صاحب بھی آ گئے اور انہوں نے ایک کرسچن خاتون سے شادی کر لی مگر بعد میں ان سے بھی علیحدگی ہو گئی۔ خیر ایک دن

میں کراچی میں رفیق غزنوی صاحب کے گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک خاتون وہاں بیٹھی ہیں جن کی آنکھوں پر عینک تھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے۔رفیق صاحب مجھے اپنے ساتھ وہاں سے گزار کر اپنے کمرے میں لے گئے۔میں نے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں تو وہ بڑے دکھ سے کہنے لگے کہ اب تو یہ میری ماں ہیں۔ کبھی یہ میری بیٹی ہوا کرتی تھی اور وہ جو یہاں کے بہت بڑے دانشور ہیں حضرت ضیا سرحدی یہ ان کی بیوی ہیں۔ان کے یہ جملے دکھ میں ڈوبے ہوئے تھے۔چنانچہ رفیق صاحب کی زندگی میں جو دکھ آئے انہوں نے انہیں توڑ کے رکھ دیا اور وہ اپنے جسم کو گھسیٹتے رہے۔بظاہر مرتے دم تک تنومند تھے اور چہرے پر بشاشت تھی اور اپنی عمر سے پندرہ سال کم نظر آتے تھے لیکن اندر سے ٹوٹ چکے تھے اور بالآخر ایک دن ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

فیض احمد فیض بڑے سادہ انسان تھے لیکن پراسرار بھی اتنے تھے کہ زندگی بھر کوئی ان کی یہ ادا سمجھ نہیں سکا کہ بعض اداروں نے اور بعض اشخاص نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے ساری ساری عمر گزار دی لیکن انہوں نے اس کے رد عمل میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ پیغمبروں کے بارے میں تو سنا تھا کہ وہ گالیاں سن کر دعائیں دیتے تھے لیکن شاعروں کے بارے میں ایسا نہیں سنا تھا۔فیض احمد فیض پیغمبر نہیں تھے صرف شاعر تھے۔یہ کسی کو دعا بھی نہیں دیتے تھے لیکن بد دعا بھی نہیں دیتے تھے۔ اکثر چپ ہی رہتے تھے اور اگر کوئی اس بارے میں پوچھتا تو زیادہ سے زیادہ ہنس دیتے تھے۔

اب ہم سب جانتے ہیں کہ ''نوائے وقت'' میں ایک مدت تک ان کے خلاف کہا جاتا رہا۔دوست کہتے بھی تھے کہ یہ سراسر زیادتی ہو رہی ہے۔آپ اس کی تردید کریں لیکن وہ صرف مسکرا دیا کرتے

تھے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیتے تھے کہ یہ ان کا نقطہ نظر ہے اس لیے انہیں کہنے دیں۔انہیں حق پہنچتا ہے۔جنگ والوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ فیض صاحب کا انٹرویو چاہئے اور وہ آپ کے گھر میں ہی ہونا چاہیے۔کیونکہ ہم ان کے ساتھیوں کی فہرست ٹھیک سے نہیں بنا سکتے۔آپ بنایئے اور باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔اس کے علاوہ وہ باقی جو لوگ بھی آئیں گے وہ بھی آپ ہی کے قبیلے سے ہوں گے۔مجھے تو فیض صاحب کو بلانے کا بہانہ چاہیے تھا۔وہ پہلے بھی میرے ہاں آتے رہتے تھے۔ لیکن اس شکل میں انہیں بلانے کی مجھے خوشی ہوئی۔

مین نے اس موقع پر ان کے لیفٹ کے دوستوں کے علاوہ رائٹ کے کچھ لوگوں کو بھی بلا لیا۔تاکہ دونوں طرف سے سوالات آئیں اور فیض صاحب ان کا جواب دیں۔چنانچہ یہ انٹرویو ہوا اور بڑے ٹھاٹھ کا ہوا۔اس میں عبداللہ ملک، صفدر میر، حمید اختر،اور دوسرے لوگ موجود تھے۔اس زمانے میں ایران عراق کی جنگ ہو رہی تھی۔شہنشاہ ایران کو وہاں سے نکالنا تو ان لوگوں کا کارنامہ تھا ہی مگر اب ایران چونکہ عراق کے خلاف بھی اپنے موقف پر جما ہوا تھا اور امریکہ کو بھی اپنے یرغمالی چھڑانے کے سلسلے میں ایران کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑ چکی تھی۔اب فیض صاحب مذہبی آدمی قطعاً نہیں تھے ان کا تعلق تو سیاست سے تھا یا ادب سے تھا۔جنگ کے حسن رضوی بھی وہاں موجود تھے۔وہ صحافی تھے اور اس کے علاوہ ان کا تعلق اہل تشیع سے ہے اور وہ اس زاویے سے بھی فیض صاحب سے بات کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے کہا کہ فیض صاحب ! انقلاب ایران کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔لوگوں نے سوچا کہ چونکہ ایران میں مذہبی حکومت قائم ہو چکی ہے اس لیے فیض صاحب دوسری طرح بات کریں گے۔لیکن فیض صاحب نے کہا کہ انقلاب فرانس کے بعد سب

سے بڑا انقلاب یہی ہے۔اور اگر اس کا رخ غلط طرف نہ موڑ دیا گیا تو یہ بہت بڑا انقلاب ثابت ہو گا۔اس جواب نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

یہ انٹرویو چھپا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا،لوگ یہ شمارہ ایک دوسرے سے مانگ کر پڑھتے رہے۔جنگ اور نوائے وقت میں مسابقت تو تھی۔اس لیے ایک اور محفل میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ فیض صاحب سے کہئے کہ وہ نوائے وقت کے لیے انٹرویو دیں۔ان کا خیال تھا کہ چونکہ نوائے وقت ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا رہا ہے اس لیے فیض صاحب کو انٹرویو کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بہت محنت اور منت کرنی پڑے گی۔لیکن میرا خیال اس کے برعکس تھا کیونکہ فیض صاحب کے منہ سے نہ تو ہوتی ہی نہیں ہے۔اس لیے میں نے عطاء صاحب سے کہا کہ فیض صاحب اس محفل میں وہ سامنے بیٹھے ہیں آپ جا کر خود ان سے بات کریں وہ مان جائیں گے۔اگر وہ نہ مانے تو آپ مجھے بتائیں۔ میں دونوں کو دیکھتا رہا اور میں نے اندازہ کر لیا کہ فیض صاحب نے ہاں کر دی ہے۔یہ واپس آئے اور کہنے لگے کہ فیض صاحب مان گئے ہیں۔میں نے کہا کہ آپ فیض صاحب کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ان میں بہت بڑے لوگوں والی خصلت ہے۔

خیر وہاں انٹرویو ہوا اور فیض صاحب کو بہت گھیرے میں لیا گیا۔لیکن فیض آخر فیض ہے۔وہاں پر فیض صاحب کو پچھاڑنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بہت متوازن اور معتدل جواب دیئے اور وہ جوابات دیئے جو ان کے مسلک سے ہٹ کر نہیں تھے۔ان کا مسلک کبھی بھی متشدد نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو ایک شکل میں فلسطین مسلمانوں کی تحریک ہے مگر وہ اس کی بہت حمایت کرتے تھے۔ اب فیض صاحب پر الزام آتا ہے کہ وہ کمیونسٹ ہیں مگر اس سے قطع نظر انہوں نے ہمیشہ حق و

انصاف کی بات کی۔ انہوں نے جتنی خدمت فلسطین کی کی، پاکستان کا کوئی بڑے سے بڑا مولوی بھی اتنی خدمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

فیض صاحب باقاعدہ بیروت میں رہے۔ وہاں یہ ''لوٹس'' پرچے کے ایڈیٹر بنے اور یاسر عرفات کے دوست اور دست راست کے طور پر انہوں نے سالہا سال کام کیا۔ انہوں نے اپنے پرچہ کے ذریعے اسرائیل کی دھجیاں بکھیریں اور مختلف کانفرنسوں میں فلسطین کی نمائندگی کی۔ ایک ایسا آدمی ظاہر ہے کہ انصاف پسند ہی کہلا سکتا ہے۔ اور ''دل بدست آور کہ حجِ اکبر است'' والی بات دیکھیں تو وہ کبھی دل آزاری کسی کی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے دل میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ وفات سے پہلے اپنے گاؤں گئے اور ان کے والد نے وہاں پر جو مسجد بنائی تھی اسے دیکھا اور جب نماز کا وقت ہوا تو لوگوں نے کہا کہ فیض صاحب ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کی امامت کریں چنانچہ انہوں نے جماعت کی امامت کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور تبصرے ہونے لگے کہ یہ منافقت ہے۔ کچھ اور لوگ کہنے لگے کہ وہ صوفی ہیں۔ حالانکہ وہ طبقاتی معاملہ ہے۔ وہ ایک پسے ہوئے طبقے کے حامی اور ظالم طبقے کے مخالف تھے۔ انہیں کسی مذہب سے کوئی بیر نہیں تھا ۔وہ مسلمان تھے اور قدم قدم پر مسلمان تھے۔ بلکہ ایک بار تو اشفاق احمد صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ جتنا فیض مجھے مسلمان نظر آتا ہے اتنا کوئی اور مجھے یہاں مسلمان نظر نہیں آتا ۔کہنے لگے کہ میں نے اندر جھانک کر اور قریب سے اسے دیکھا ہے اور کمیونسٹ تو ہو گا لیکن مجھے تو وہ مسلمان ہی نظر آیا۔ میں نے کہا کہ آپ انہیں ان معنوں میں مسلمان نہ لیں جن معنوں میں مولوی

سمجھتے ہیں کہ جب کوئی شخص تعصب میں ڈوب کر بات کرے تو ہی وہ سچا مسلمان ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میرا ابھی یہ مطلب نہیں ہے۔ میرے نزدیک تو مسلمان ایک سونا اور پارس ہوتا ہے اور وہ سب کا احترام کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔

بین الاقوامی اہمیت کے حامل لوگوں کا ذکر تو میں نے کر دیا جو سیاست اور بین الاقوامیت میں اپنا نام رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات کے اندر ایک انجمن ہوتے ہیں۔ اور ان کی کچھ غیر معمولی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے صفحہ قرطاس پر ان کا نام تادیر باقی رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً شہروں شہروں اور محفل محفل ان کا ذکر ماحول کو خوشگوار بنانے کا موجب بنتا ہے۔ ایسے ناموں میں پنجاب کی ایک شخصیت استاد امام دین کا نام سر فہرست ہے۔ وہ جس محفل میں جاتے وہاں میلہ لوٹ لیتے اس لئے بڑے شعرا ایسی محفل میں جانے سے کتراتے تھے۔
استاد امام دین ایک ایسے شاعر تھے کہ جنہیں اگر آپ فن کے پیمانوں سے ناپیں تو شاید آپ کو مایوسی ہو لیکن جس بے ہنگم انداز سے وہ شعر کہتے تھے وہ سن کے کوئی ہی ایسا شخص ہو گا جو اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ اسی طرح ان کی زندگی کے واقعات کچھ ایسے تھے کہ وہ بس انہی کی زندگی میں رونما ہو سکتے تھے۔ استاد امام دین کا تعلق سرزمین گجرات پنجاب سے تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شکل وصورت بہت عمدہ تھی۔ سرخو سفید رنگ تھا اور اونچا قد۔ شرفائے پنجاب کی طرح ان کا لباس ہوتا تھا اور جب تک وہ خاموش بیٹھے رہیں یا شاعری پر بات نہ کریں تو یوں نظر آتا تھا کہ بہت

سمجھدار اور زیرک آدمی ہیں لیکن جس وقت وہ شاعری کی طرف رخ کرتے تھے تو پھر نام بتائے بغیر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ استاد امام دین ہیں۔

ان سے میری بڑی ملاقاتیں دو ہوئیں۔ایک تو راولپنڈی میں ہوئی۔ایک بار یہ وہاں آئے اور ہمیں ان کی آمد کا پتہ چلا تو ہم نے سوچا کہ ہم کتنے ہی بڑے بڑے شاعروں کا سواگت کر چکے ہیں کیوں نہ انہیں بھی مدعو کیا جائے۔کیونکہ یہ بھی ایک شہرت یافتہ شاعر ہیں اور پورے ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا ہے ۔چنانچہ ہم سب دوستوں نے مل کر جامع مسجد کے قریب ایک مکان کی چھت پر گیس کی روشنی میں ایک مجلس شعر و سخن کا اہتمام کیا جس کے چیف گیسٹ استاد امام دین تھے۔

ہم نے کہا کہ شعر تو سنیں گے لیکن پہلے ان سے شاعری پر ایک لیکچر کیوں نہ کروا دیا جائے اور دیکھیں کہ شاعری کے سلسلے میں یہ کیسے خیالات رکھتے ہیں۔اس محفل میں انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں جن خیالات کا اظہار کیا ان میں کام کی باتیں دو تھیں۔ویسے تو وہ ان کے علاوہ بھی جو جی میں آیا کہتے گئے۔ان دو باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ شاعری ایک ٹارچ ہے اور جہاں اندھیرا ہو وہاں کوئی چیز تلاش کرنی ہو تو ٹارچ اس پر روشنی ڈالتی ہے۔چنانچہ شعر بھی زندگی کے مختلف مسئلوں پر روشنی ڈالتا ہے،اس لیے میری نظر میں شعر ایک ٹارچ ہے۔ان کا یہ مقولہ اس کے بعد مدتوں گونجتا اور کالم نگار مقامی اخبارات میں یہ مقولہ استعمال کرتے رہے۔ہمارے دوستوں میں بھی جب کوئی ایسا شعر کہتا تھا جس سے مسائل حاضر پر روشنی پڑتی ہو تو ہم مذاق سے اسے کہتے تھے کہ واقعی آپ کا شعر ٹارچ شعر ہے۔ٹارچ شعر کا یہ سلسلہ بہت دیر تک چلا۔

پھر انہوں نے ہمیں ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا "استاد امام دین دنیا کے ہر رنگ میں" یہ نظم کچھ یوں تھی:

موٹر نہیں رہا کہ میں سائیکل نہیں رہا
پیڈل نہیں رہا کہ میں ہینڈل نہیں رہا
مجنوں نہیں رہا کہ میں لیلیل نہیں رہا

میں نے سوال کیا کہ آپ نے اس مصرع میں لیلیٰ کو لیلیل کیسے بنا دیا۔ تو کہنے لگے کہ برخوردار آپ شاعر کو ایک معمار یا ایک بڑھئی سمجھ لیں۔ جس طرح معمار جب دیوار بنا رہا ہوتا ہے اور کوئی اینٹ اٹھا کر دیوار میں لگاتا ہے اور وہ پوری نہیں آتی تو وہ تیشی لے کے ایک چوتھائی اینٹ کو کاٹ دیتا ہے اور پوری اینٹ کی بجائے تین چوتھائی اینٹ کو لگا کے دیوار کو ٹھیک کر لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام یہ ہے کہ جہاں لفظ فٹ نہ آئے اس لفظ میں سے کوئی حرف نکال دے اور باقی جو لفظ بچے اس سے قافیے کو پورا کرے۔ چنانچہ اس شعر میں لیلیٰ نہیں آتا تھا تو میں نے اسے حسب ضرورت لیلیل کر لیا ہے اس طرح شعر کا وزن بھی پورا ہو گیا ہے اور قافیہ بھی ٹھیک آ گیا ہے۔

یہ بات مدتوں ہمارے ذہن میں رہی کہ شاعر معمار یا بڑھئی ہوتا ہے اور اسے بڑھئی کی طرح کے اختیارات بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بہت بعد جب بھائی ظفر اقبال کا مجموعہ "گل آفتاب" آیا تو انہوں نے لسانی تشکیلات کے نام سے وہی کام کیا جو استاد امام دین نے کیا تھا۔ اس لیے ہمیں یقین آیا کہ استاد امام دین ٹھیک کہتے تھے۔ وہ کم پڑھے لکھے تھے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو بڑھئی کہہ لیا لیکن ظفر اقبال زیادہ پڑھے لکھے تھے انہوں نے امام دین کے کام کو آگے بڑھا کے پوری ایک کتاب چھاپی

اور دیباچے میں بحث کی کہ نئی لسانی تشکیلات آنی چاہئیں۔ پھر انہوں نے اپنی کتاب میں جو جو کمال دکھائے وہ بھی دیدنی تھے۔ لیکن کہاں استاد امام دین اور کہاں ظفر اقبال۔ استاد امام دین میں بے ساختگی تھی جبکہ ظفر اقبال میں ساری تقلید تھی اور ''گل آفتاب'' گل ہو کے رہ گیا۔ اور یہ تجربہ آگے نہ بڑھ سکا اور وہ ظفر اقبال جو ''گل آفتاب'' سے پہلے ''آبِ رواں'' جیسی خوبصورت کتاب دے چکا تھا ایک بار پھر ''آب رواں '' کی طرف مڑا لیکن وہ آج تک پھر ''آب رواں'' کو پا نہیں سکا۔ ہاں استاد امام دین کے مزاج کا کہیں کہیں اس میں ہلکا ہلکا اثر نظر آتا ہے۔

استاد امام دین سے میری دوسری ملاقات مظفر گڑھ کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ مشاعرہ آل پاکستان مشاعرہ تھا۔ اس میں اور بھی مزاحیہ شاعر شریک تھے جن میں مجید لاہوری، سید محمد جعفری، ظریف جبل پوری اور ضمیر جعفری نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ تمام سنجیدہ شعرا، بشمول جناب احمد ندیم قاسمی موجود تھے۔

جب اس مشاعرے میں میں نے استاد امام دین کو دیکھا تو وہ مجھے بہت ہی سنجیدہ نظر آئے۔ حیرت اس بات سے ہوئی کہ انہوں نے قاسمی صاحب کے ایک دو اشعار انہیں سنائے اور کہا کہ مجھے آپ کے یہ اشعار پسند ہیں۔ قریب بیٹھے ہوئے سب شاعروں کو استاد صاحب کی یہ بات سن کر حیرانی ہوئی کہ کیا واقعی وہ مطالعہ کے خوگر ہیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اوپر سے جو کچھ بنے ہوئے ہیں یہ اندر سے اس کے برعکس ہوں اور ہم انہیں بیوقوف سمجھ رہے ہیں اور یہ ہمیں بیوقوف بنا رہے ہوں۔ چنانچہ اس معاملہ پر استاد صاحب کا کافی دیر ٹیسٹ ہوا اور یہ پتہ چلا کہ وہ باقاعدہ پڑھتے ہیں لیکن عالم یہ تھا کہ جب

شعر سناتے تھے تو اس سے یہ تاثر نہیں ملتا تھا۔ مثال کے طور پر انہوں نے مولانا ظفر علی خان کے ایک مصرع پر تضمین کی۔ ظفر علی خان نے کسی زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اخبارات کے باہمی جھگڑے کے دنوں میں کہا تھا۔

تو گاندھی جی کی بکری کے لیے بکرا مہیا کر

استاد صاحب نے اس کے ساتھ تین مصرع لگائے:

کچھ تو تو ظاہر کر اور کچھ چھپ چھپا کر
جو بھی تیرے دل میں آئے تو بھیا کر
وہ کلے پر کھڑی ممیاتی اور چلاتی ہے
تو گاندھی جی کی بکری کیلئے بکرا مہیا کر

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ان کے یہ شعر سن کر نہ ہنسے۔ وہ جس وثوق اور خود اعتمادی سے اپنا کلام سناتے تھے اس کی وجہ سے انہیں خوب داد ملتی تھی اور اس مشاعرے میں بھی سب سے زیادہ داد انہوں نے ہی لی۔ ان سے پہلے جتنے بھی مزاحیہ شاعر پڑھ چکے تھے وہ ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر حاضرین کی طرف سے جو فرمائشیں آئیں وہ استاد امام دین کے کلام کے بارے میں ہی تھیں۔ چنانچہ بار بار ان سے کلام سنا گیا۔ وہاں کسی نے کوئی فرمائش کی تو استاد نے کہا کہ یہ میرے اشعار نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ اظہر امرتسری کبھی کبھی اپنے مزاحیہ کالم میں لکھا کرتے تھے کہ استاد امام دین ایم اے پی ایچ ڈی کی طرف سے کچھ تازہ کلام آیا ہے جس میں یہ اشعار مجھے یاد ہیں۔

تو جنگل کو چھوڑ اور گھر کو چلا آ

تیری ماں نے پکائے مٹر امام دینا
نہ چھیڑو میری پنڈلیوں کو نہ چھیڑو
ان میں ہے درد جگر امام دینا

اس طرح یہ سب ایک طرح سے الحاق اشعار تھے جو کہ در حقیقت ان کے مجموعہ کلام "بانگ دہل" میں نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو جو شعر وزن میں نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی اور نے وہ شعر کہہ کے استاد صاحب کے نام میں ڈال دیا ہے۔ ویسے کبھی کبھی استاد امام دین سے بھی شعر وزن میں سرزد ہو جایا کرتے تھے۔

امام دین کے مجموعہ کلام کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ انہیں بیوقوف بناتے تھے۔ استاد امام دین ایک چونگی محرر تھے اور گجرات ہی میں کام کرتے تھے۔ اس مجموعے میں انہوں نے زیادہ تر تضمین کی ہے۔ جس طرح استاد صاحب نے مولانا ظفر علی خان کی تضمین کی اسی طرح غالب کی غزل

کوئی صورت نظر نہیں آتی

کی انہوں نے تضمین کی۔ اور لکھا

ہوسکے استاد انسپکٹر چونگی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

گجرات میں ایک وکیل تھے جن کے نام میں خادم آتا تھا۔ اس زمانے میں گجرات میں راجہ اختر مجسٹریٹ تھے۔ استاد امام دین ان کی دل بستگی کا سامان ہوا کرتے تھے چنانچہ انہوں نے استاد کو مجموعہ

شائع کرنے کا مشورہ دیا اور امام دین کی تصویر علامہ اقبال جیسی چھپوائی گئی۔ پھر کتاب کا سائز بھی بانگ درا جیسا رکھا گیا اور اس میں باقاعدہ دیباچہ لکھا گیا۔ پھر اس میں ایک قطعہ بھی لکھا گیا جس سے تاریخ اشاعت نکلتی تھی۔ اس کے دو مصرعے یوں تھے۔

طبع دیوان خاص و عام ہوا

کام استاد کا تمام ہوا

اس سے مجموعے کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ استاد صاحب کو یہ سمجھ نہ آسکی کہ اس کے آخری مصرعے کا مطلب کیا نکلتا ہے اور انہوں نے اسے بڑے اہتمام سے چھاپا اور پھر اس کتاب کا افتتاح ہوا اور استاد صاحب کو گرمیوں کے موسم میں ایک ٹرک کی چھت پر بٹھایا گیا جبکہ باقی سب افراد ٹرک کے اندر بیٹھے۔ ان کے گلے میں گنڈیریوں اور پھلوں کے ہار پہنائے گئے اور اہتمام یہ کیا گیا کہ ان کے سر میں کچھ رنگ ڈال دیئے گئے اور جب انہیں پسینہ آتا تھا تو وہ رنگ میں مل کر ان کے چہرے پر گرتا تھا اور ان کا چہرہ رنگین ہوتا جاتا تھا۔ لوگ ادھر اُدھر کھڑے استاد امام دین کو اس حالت میں دیکھ کر تالیاں بجاتے تھے اور استاد داد لیتے تھے۔

وہاں پر کوئی صاحب محمد حسین تھے۔ سنا ہے کہ وہ کافی نام والے آدمی تھے اور بعد تک گجرات میں رہے۔ ان سے استاد امام دین کی چپقلش ہو گئی اور استاد نے ان پر ایک نظم لکھ ڈالی۔ جس میں کچھ اس طرح کے مصرعے تھے:

تیرا نک اے یا پکوڑا محمد حسین

مار کے مکہ میں اسے کردوں گا چوڑا محمد حسین

پھرے گا پھر تو دوڑا دوڑا محمد حسین

اس قسم کی نظم تھی۔ان صاحب محمد حسین نے راجہ حسن اختر مجسٹریٹ کی عدالت میں استاد امام دین کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔استاد تو ایسے تھے ہی۔ اس لیے اب یہ کم احمق نظر آئے اور مقدمہ دائر کرنے والا آدمی زیادہ احمق نظر آیا۔انہوں نے ایک مجذوب آدمی کے پیچھے پڑ کے کیس کر دیا۔وہاں ان کی دل لگی کا سامان ہوا۔انگریز کا زمانہ تھا۔یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ راجہ حسن اختر نے استاد سے کہا کہ اب محمد حسین نام کا کوئی اور شخص پیدا کرو جس کا ناک بھی پکوڑے جیسا ہو پھر ہم مان جائیں گے کہ آپ نے نظم مدعی کے بارے میں نہیں کہی بلکہ اس محمد حسین کے بارے میں کہی۔راجہ حسن اختر اس مقدمے کو طول دیتے گئے۔ہر تاریخ پر پورا گجرات ان کی عدالت میں امڈ چلا آتا تھا اور وہاں راجہ صاحب ان سے شعر سنتے تھے اور بہت مدت کے بعد کہیں جا کر انہوں نے اس مقدمے کو خارج کیا۔

استاد امام دین سے ملاقاتوں کے واقعات میں نے بیان کئے ہیں۔اس قسم کے ایک اور صاحب لاہور میں بھی موجود تھے۔یہ دہلی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔اچھی فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا نام نواب ناطق دہلوی تھا۔بہت پڑھے لکھے تھے لیکن تھوڑے سے امام دین بھی تھے۔کسی انگلش اخبار میں کام بھی کرتے تھے اور سنا ہے کہ وہاں اچھے ورکر تھے۔غالباً سب ایڈیٹر تھے اور کافی ہاؤس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔

یہ یہاں پر دل لگی کا سامان تھے۔ان کا ایک شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا جو یہ تھا:

ناطق ترا یہ شعر ہے تریاق تری ہا

زنباق تری ہالا کا زنباق تری ہا

لوگ اس کا مطلب جب ان سے پوچھتے تھے تو وہ سب کہتے تھے کہ میرا کام شعر کہنا ہے مطلب بتانا نہیں، مطلب آپ خود ڈھونڈیں۔

ان صاحب کی بیچ میں نوکری چلی گئی۔ ہمارے ایک مشفق دوست سبطین فضلی مرحوم کے کچھ راہ رسم ہوتے تھے۔ ان کے کچھ تعلقات ادیبوں، آرٹسٹوں وغیرہ سے بھی تھے۔ فلم ڈائریکٹر تھے اور ان کا فنون لطیفہ سے تعلق بھی تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے ساتھ لے کر کافی ہاؤس میں چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے نواب ناطق دہلوی کا تذکرہ سنا تو ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ان سے ملے اور لطف لیا۔ بعد میں انہوں نے جب سنا کہ ناطق دہلوی سروس سے نکل چکے ہیں اور آج کل ضرورت مند ہیں تو وہ کہنے لگے کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ ایک کریک آدمی ہیں۔ اگر آپ نے مدد کا لفظ استعمال کیا تو وہ آپ سے لڑ پڑیں گے۔ اور پیسے بھی نہیں لیں گے۔ اگر ان کی امداد کرنی ہے تو ہم دوسرے طریقے سے کر دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا اور اس کے بعد ناطق صاحب سے بات کی۔

میں نے ان سے کہا کہ نواب ناطق ! فضلی صاحب ایک بہت بڑے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ ایک فلم بنا رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے گانے مجھ سے لکھوائے ہیں۔ باقی گانے تو میں نے لکھ لیے ہیں لیکن ایک جگہ آکر میں رک گیا ہوں۔ مجھ سے آگے بڑھا نہیں جا رہا۔ سب دوستوں کا خیال ہے کہ اس طرح کی سیچوئیشن پر آپ بہتر لکھ سکتے ہیں۔ اب فضلی صاحب خود اس معاملے پر آپ سے بات نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ یہ بہت چھوٹا کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم جیسے فلمی شاعروں کا کام ہے جبکہ

آپ کا تو ادب میں بڑا مقام ہے۔ اور وہ آپ کی سطح پر نہیں آتے۔ لیکن میں نے فضلی صاحب سے کہا ہے کہ جب ایک بڑا شاعر فلم کے لیے لکھے گا تو وہ یہاں بھی بڑی شاعری کرے گا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ فضلی صاحب تو میری باتوں سے قائل ہو گئے ہیں۔ اور اگر آپ کہیں تو میں ان سے آپ کی بات کروا دوں۔

ناطق دہلوی کہنے لگے کہ صاحب وہ ہم سے کیا لکھوائیں گے۔ وہ ہمارا معاوضہ دے سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ کیا ہے آپ کا معاوضہ؟ تو کہنے لگے کہ ایک لاکھ روپے فی گانا۔ میں نے کہا کہ ایک لاکھ روپے میں تو پوری فلم بنتی ہے جس میں اداکاروں کے پیسے اور سٹوڈیو وغیرہ کے اخراجات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے۔ کہنے لگے کہ اچھا وہ پچاس ہزار روپے دے دیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ کہنے لگے کہ اچھا وہ پچاس ہزار روپے دے دیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ آپ کم سے کم کتنا لے سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دس ہزار روپے فی گانا سے کم نہیں لیں گے۔ میں نے کہا کہ ہم دس ہزار روپے دو گانوں کے دیتے ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ میں جا کر فضلی صاحب کو خوشخبری سناتا ہوں کہ آپ مان گئے ہیں۔

فضلی صاحب اس وقت دوسرے ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ فضلی صاحب! آجائیے۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ کا کام ہو گیا ہے اور نواب صاحب مان گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ دس ہزار روپے میں دو گانے لکھ کر دیں گے آپ فی الفور پانچ سو روپے نکال کر انہیں ٹوکن منی کے طور پر دے دیجئے ورنہ شاعروں کا تو موڈ ہوتا ہے۔ نجانے بعد میں ان کا موڈ کیا ہو جائے۔ چنانچہ فضلی صاحب نے پانچ سو روپے نکال کر نواب صاحب کو دیئے اور اس طرح ان کی مدد کی۔

نواب ناطق دہلوی کو کبھی کبھی کسی مشاعرے میں بھی دل لگی کے لیے بلایا جاتا تھا ایک بار ہم گوجرانوالہ گئے تو نواب صاحب ساتھ تھے۔ احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، صوفی تبسم، علامہ لطیف انور اور بہت سے دوسرے شعراء بھی ہمارے ساتھ گئے۔ ہم لاہور ریلوے سٹیشن سے گوجرانوالہ کیلئے ٹرین میں بیٹھے تو گاڑی کے چلتے ہی ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے ۔ وہ بڑے تن کر اشعار سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے اس طرح بڑے تن کر غزل سنانی شروع کی جو یہ تھی:

طعنہ اغیار کا نہ طعنئیے کہ

یہ غزل کا پہلا مصرع تھا۔ جب وہ غزل سنا چکے تو میں نے بڑے ادب سے کہا کہ نواب صاحب باقی تو شاید لفظ ''طعنئیے بھی'' ہوگا لیکن یہ آخر میں ''کہ'' کیا مطلب ہے۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ خاموش رہیں۔ ہم اہل زبان ہیں اور یہ زبان کا مسئلہ۔ آپ اسے چھوڑ دیجئے اور اس کا مزا لیجئے۔ ہم نے سوچا کہ چلو اس بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ میں نے ٹرین ہی میں سب شاعروں کو کہہ دیا کہ چند اڈالو اور ایک ایک شعر کہو۔ باقی میں بندوبست کرلوں گا۔

چنانچہ ہم وہاں مشاعرے میں گئے تو وہاں ان سے پہلے یہ غزل سنی گئی جو انہوں نے خوب تن کر سنائی۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق مجھے بلالیا گیا۔ میں نے سٹیج پر جاکر کہا کہ صاحب! میں نواب صاحب کی غزل سن کر بہت متاثر ہوا ہوں اور انہوں نے کیا زمین نکالی ہے۔ ایسی زمین تو غالب اور میر بھی نہیں دے سکے۔ اس لیے ارتجالاً یہ اشعار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہی کی زمین میں غزل سنائی جس میں سے ایک مصرع تھا:

پان حاضر ہے پانئے کہ

غزل کے آخر میں کہ آتا تھا۔ میں نے ان پر خوب طنز کیا اور جس جس طرح میں شعر پڑھتا جارہا تھا ان کا رنگ سرخ ہوتا جارہا تھا اور ان کے کان اور بال کھڑے ہوتے جارہے تھے مگر وہ غصہ پی گئے اور اس وقت مجھے کچھ نہیں کہا۔

جب ہم اگلی صبح واپس آئے تو کسی نے ان سے پوچھا کہ قتیل شفائی نے آپ کی زمین میں غزل کہی تھی اور آپ نے اسے بہت متاثر کیا۔ تو کہنے لگے کہ تم قتیل شفائی کی بات کرتے ہو یا تو وہ پاگل ہے یا دشمن کا جاسوس ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ شعر کہنے کے سلسلے میں میں دشمن کا جاسوس کیسے ہو گیا۔

بہر حال خدا بخشے وہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ اب تو کافی ہاؤس کی نہ وہ بہار رہی اور نہ ہی نواب ناطق دہلوی یا فضلی صاحب رہے۔ اب صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ خدا ان سب کو بخشے جن کے دم سے یہ محفلیں تھیں۔

ملک ٹنڈا

لاہور کے ایک ملک صاحب تھے جن سے میرا تعارف فارغ بخاری نے کروایا تھا اور فارغ بخاری سے ان کا تعارف ان حالات نے کروایا تھا جو انہیں بیکاری کی وجہ سے درپیش تھے۔ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی ایک جان و دو قالب کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اب تک یہی سلسلہ ہے۔ خدا ان دونوں کو لمبی عمر دے اور اس جسم اور سائے کو ایک ساتھ ہی چلتا رکھے۔ یہ روزگار کے سلسلے میں جب پشاور سے نکلے تو لاہور میں بھی ان کا قیام ہوا۔ اس بارے میں ان کی ایک الگ داستان ہے۔ اس عرصے میں ان کی ملاقات ملک صاحب سے بھی ہوئی۔ اور یہاں انہوں نے ان سے ایک پرچہ بھی نکلوایا جسے بعد کے تلخ تجربات کی بنا پر چھوڑ کر فارغ اور رضا میں کراچی کی جانب بڑھ گئے۔ اور ملک صاحب نے یہیں قیام

ضروری سمجھا اور پھر یہاں سے ایک پرچہ ''جذبات'' نکالنا شروع کیا۔لوگ انہیں ملک ٹنڈا پکارتے تھے۔ یہ ایک ہفت روزہ تھا اور ہفتہ وار نہیں چھپتا تھا بلکہ منشاور چھپتا تھا۔ وہ جب اس کی ضرورت سمجھتے تھے تو اسے چھاپ لیتے تھے اور تازہ پرچہ اور پچھلی فائل لے کر دوسرے شہروں میں ٹور پر نکل جاتے تھے۔

یہ عجیب وغریب شخص لاہور کے ککے زئی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے باقی عزیز بہت معزز اور دیانتدار لوگ تھے۔ لیکن یہ ملک صاحب عجیب وغریب شہرتوں کے مالک بنے گھوما پھرا کرتے تھے جہاں بھی انہیں اپنے مطلب کا آدمی نظر آتا تھا یہ اسے گھیر لیتے تھے۔اشخاص کے علاوہ بھی اداروں پر بھی ان کی نظر کرم خاصی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ اس زمانے میں سرحد کے دورے پر نکلے۔یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی اور ہر طرف قائداعظم کے نام کا غلغلہ تھا۔جب یہ ہری پور پہنچے تو وہاں یہ قاضی عزیزالرحمان صاحب سے ملے۔

قاضی عزیزالرحمان ہمارے بزرگ تھے اور خبار نویس تھے۔وہ ہری پور سے ایک مقامی پرچہ ''پیغام سرحد'' کے نام سے نکالتے تھے۔وہ سادہ آدمی تھے۔ ملک صاحب نے جاکر قاضی صاحب کو آئینے میں اتارا اور ان سے کہا کہ میں '' جذبات'' کا مشاہیر نمبر نکال رہا ہوں۔آپ بھی اس کے ساتھ ہی ''پیغام سرحد '' کا پاکستان نمبر نکال لیں۔اور میں آپ کے ایک نمائندے کو ساتھ لے لیتا ہوں اور صوبہ سرحد کا دورہ کرتا ہوں۔اس زمانے میں اشتہارات نہیں تھے اور جیسے آج کل قیمتی اشتہارات ہوتے ہیں اس طرح کا سلسلہ نہیں تھا البتہ وہ لوگ جو اپنی تشہیر چاہتے تھے یا جو اپنے مسائل پریس میں لانا چاہتے تھے ان کی سرپرستی حاصل کی جاتی تھی۔

''پیغام سرحد'' شرافت کے اندر رہ کر نکلتا تھا اور اس کے ذرائع آمدن جائز تھے لیکن ''جذبات'' کے مالک و مدیر کا میدان کچھ اور تھا۔اس میں خوشامد بھی شامل ہوتی تھی اور حد سے بڑھی ہوئی خوشامد ایک طرح کی بلیک میلنگ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی ابتداء ''پیغام سرحد'' ہی سے کی تھی اور میں شروع میں اس سے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور غزلیں لکھا کرتا تھا۔ جیسے کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میری زندگی کا رویہ یہ رہا ہے کہ اپنے سے زیادہ قابل آدمیوں کے ساتھ بیٹھو۔ان کی باتیں سنوں اور ان سے کچھ سیکھوں۔ چنانچہ جن لوگوں کی محفل میں میں بیٹھتا تھا ان میں سے ایک قاضی عزیزالرحمان بھی تھے۔ وہ بہت شفیق اور سیدھے سادے آدمی تھے۔اور اپنے علاقائی صحافیوں میں معزز سمجھے جاتے تھے۔

جب ملک صاحب نے قاضی صاحب سے اپنا نمائندہ ساتھ کرنے کیلئے کہا تو قاضی صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اس زمانے میں بیروزگار تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے کہا کہ تم ان کے ساتھ چلے چلو۔

صحافت کی یہ ڈیوٹی میرے مزاج کے مطابق لگتی تھی پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کچھ پیسے بھی مل جائیں گے چنانچہ میں نے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ ملک صاحب نے قاضی صاحب سے میرے اخراجات بھی خود وصول کئے اور میں اور ملک صاحب پشاور اور کوہاٹ کی طرف نکل پڑے۔ ہمارے قیام کے دو بڑے مقامات یہی تھے۔

پہلے ہم پشاور گئے جہاں ہم شاہی مہمان خانے میں ٹھہرے۔ یہاں لوگ تھوڑے سے پیسے دے کر ٹھہرا کرتے تھے اور یہ ایک طرح کا V.I.P ہاؤس تھا۔ملک صاحب نے پشاور میں مسلم لیگ والوں سے کہہ کر وہاں ایک کمرہ لیا۔اس کے بعد میں ان کے پیچھے تھا اور یہ میرے آگے آگے۔ ہم

جہاں بھی جاتے گفتگو یہی کرتے تھے اور ان کی تمام گفتگو جذباتی ہوتی تھی۔ یہ لوگوں کو مشاہیر نمبر کے ایسے ایسے سبز باغ دکھاتے تھے کہ ہر کوئی انہیں سو دو سو روپے دے دیتا تھا۔ اس زمانے میں سو دو سو روپیہ آج کے دس پندرہ ہزار روپے کے برابر شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ پیسے لینے کے بعد لوگوں کی تصویریں لیتے تھے اور صرف تصویروں پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کے راز بھی لیتے تھے۔ فرنٹیئر میں یہ خواتین سے بہت ملے۔ وہاں نسل در نسل مخالفانہ ماحول چلتا ہے۔ جو خان ان سے ملتا تھا وہ ملک صاحب کی نیت جانے بغیر اپنے مخالف کی تمام برائیاں اور خامیاں غلیظ باتوں سمیت نوٹ کروا دیتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے مخالف کے تمام ثبوت بھی انہیں مہیا کر دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ یہ توقع کرتا تھا کہ یہ سب کچھ پرچے میں چھپ جائے گا اور اس کا مخالف اب جہنم رسید ہو جائے گا۔ وہ کچھ پیسے دے کر ملک صاحب کو رخصت کرتا تھا۔ ملک صاحب نے اس قسم کے کئی راز وہاں اکٹھے کئے۔ اس کے بعد ملک صاحب اپنے طریقہ واردات کے عین مطابق اس مخالف کے پاس جاتے تھے اور اسے کہتے تھے کہ ہمارے پاس آپ کے سلسلے میں بہت سی چیزیں آئی ہوئی ہیں اور ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ چھاپنے سے پہلے آپ سے دریافت کر لیا جائے کیونکہ ہم بہت دیانتدار آدمی ہیں اور کبھی بھی یکطرفہ کارروائی نہیں کرتے۔ پھر ان کے پاس جتنی بھی ڈراؤنی معلومات ہوتی تھیں وہ اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اور اگر معلومات فراہم کرنے والے نے ایک سو روپیہ دیا ہوتا تو یہ انہیں دو سو روپے فراہم کرتا اور کہتا کہ یہ سب غلط بات ہے اور اسے کسی طرح روکئے۔ ملک صاحب اس طرح دو طرفہ پیسے وصول کر رہے تھے۔

ایک واقعہ یوں ہوا کہ ضلع ہزارہ میں ایک ریاست امب کے نام سے تھی۔ نواب فرید خان اس ریاست

کے والی تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں جنہوں نے مجھ سے کبھی شاعری بھی کروائی تھی اور مجھے انعامات بھی دیئے تھے۔ نواب فرید خان قانونی طور پر اس ریاست کے حقدار بھی تھے لیکن ان کے ایک قریبی رشتہ دار کو اعتراض تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ ناجائز طور پر گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتہ دار مسلسل نواب صاحب کے خلاف مہم چلائے ہوئے تھا۔ اس کا ایک اور ساتھی اور عزیز پشاور میں رہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک صاحب نے ان سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے شام کی چائے پر بلایا۔ میں نے پہلی بار ان نوابزادہ صاحب کے گھر اچھی چائے پی۔ میں نے اس چائے کے ساتھ کئی ایسی چیزیں دیکھیں جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی چائے کے ساتھ بھی ایسا اہتمام ہو سکتا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ کھانے کے ساتھ بھی اتنی اشیاء کا اہتمام نہیں ہو سکتا۔

بہر حال نوابزادہ صاحب نے ہمارے لیے بہت پر تکلف چائے کا اہتمام کیا۔

ملک صاحب کا اتفاق سے بایاں بازو کٹا ہوا تھا اور ان کا صرف ایک ہی ہاتھ تھا۔ لیکن کھانے پینے اور ہاتھ کی صفائی کے معاملات میں ان کا ایک ہاتھ بھی دو ہاتھ والوں سے زیادہ صفائی کرتا تھا۔ وہ کھاتے بھی جاتے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اس موقع پر ان نوابزادہ صاحب نے نواب امب کے سلسلے میں جو باتیں کہیں ان میں ایسے بھیانک الزامات تھے کہ میں سن کر کانپ گیا۔ اس زمانے میں فوٹو سٹیٹ نہیں تھی لیکن انہوں نے ہاتھ سے کی ہوئی نقلوں کی شکل میں ملک صاحب کو کچھ ثبوت بھی فراہم کئے۔

ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو وہاں کے بڑے بڑے مسلم لیگی افراد سے ملے اور انہیں بتایا کہ ہم مشاہیر نکال رہے ہیں۔ انہیں بھی آرزو تھی کہ پاکستان کے قیام کے بعد ان کا نام آنا چاہیئے اور وہ بھی

اپنے نام کی تشہیر چاہتے تھے۔اس لیے ملک صاحب نے ان سے پیسے بٹورے۔ملک صاحب ان لوگوں کے ساتھ مل کر جلسے میں تقریر بھی کرتے تھے اور تقریر اچھی ہوتی تھی۔ایک تقریر میں انہوں نے انڈیا کے ہندوؤں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے اپنا کٹا ہوا بازو بلند کر کے کہا کہ ہندوؤں کے مظالم کا یہ جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انہوں نے میرا بازو کاٹ دیا۔حالانکہ ان کا بازو کسی آپریشن میں کٹا تھا کسی فرقہ ورانہ فساد میں نہیں کٹا تھا۔چنانچہ انہوں نے اپنے بازو سے بہت فائدہ اٹھایا اور کہتے تھے کہ مسلمانو! کیا تم بھی اپنا یہ حال دیکھنا چاہتے ہو۔کیا تم بھی اپنے بازو کٹوانا چاہتے ہو؟ بہتر ہے کہ تم لوگ مسلم لیگ میں شامل رہو اور پاکستان کی جدوجہد کرو۔

ویسے تو پاکستان کی جدوجہد میں اس وقت سبھی مسلمان شریک تھے جو مسلم لیگ میں بھی شامل تھے۔لیکن عام مسلمان تو اپنے خلوص نیت کی وجہ سے مسلم لیگ میں شامل تھے جبکہ ملک صاحب اپنے کٹے ہوئے بازو سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے چنانچہ جب وہ اپنا کٹا ہوا بازو لہرا کر کہتے تھے کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے تو ان کے الفاظ میں کوئی خلوص نہیں ہوتا تھا۔لیکن بہر حال اس کاروبار میں وہ خاصے کامیاب رہے۔

یہاں سے انہوں نے درمیانے درجے کے مسلمان لیڈروں سے بھی بہت سارو پیہ بٹورا جو بڑے درجے کے لیڈر بننا چاہتے تھے۔پھر انہوں نے کوہاٹ کے مسلم لیگی لوگوں کی ایک فہرست بنائی اور ہم لوگ وہاں چلے گئے۔اب صورت یہ تھی کہ ہم جہاں جاتے تھے ہمیں کھانا مفت مل جاتا تھا جبکہ کرایہ ملک صاحب لگاتے تھے۔میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں تھی اور اس تمام عرصے میں "پیغام سرحد" کے لیے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ملک صاحب صرف اپنے پرچے کا ذکر کرتے تھے اور

ساتھ صرف اتنا کہہ دیتے تھے کہ ایک اور پرچہ بھی ہے جس کا نام ''پیغام سرحد'' ہے،اس میں بھی آپ کی مدد کی جائے گی۔دوسرے لفظوں میں وہ اپنے کھاتے میں ہی دو پرچے ڈال کر پیسے بٹورتے رہے۔

اس کے بعد کوہاٹ والوں کی فہرست بنا کر وہاں چلے گئے۔وہاں کے دو تین بڑے آدمیوں سے ان کی ملاقات بھی ہوئیں۔جب ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے تیسرا دن تھا تو یہ مجھے کہنے لگے کہ تم یہاں بازار میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔اس کے بعد یہ شام تک نہیں آئے میں ان کی راہ تکتا رہا۔اس شہر میں میرا کوئی واقف نہیں تھا اور میرے پاس کھانے کیلئے بھی کوئی پیسہ نہیں تھا۔

دو عظیم سربراہانِ شعبہ

ادبی صحافت میں میرا آغاز ''ادب لطیف'' سے ہوا لیکن اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ میں فلمی صحافت سے منسلک ہوا اور اس وقت کے سب سے بڑے پرچے ہفتے وار ''اداکار'' میں میں ایڈیٹر مقرر ہوا جو سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی ملکیت میں چل رہا تھا۔یہ پرچہ قیام پاکستان سے پہلے دو مقامات سے نکلتا تھا۔ایک لاہور سے اور دوسرا ممبئی سے۔قیام پاکستان سے پہلے سب سے بڑا فلمی پرچہ ''چترا ویکلی'' تھا۔اس کے ایڈیٹر دھرم ویر تھے۔یہ پرچہ بڑی تعداد میں بکتا تھا۔اس میں لیٹر بکس کے عنوان سے ایک کالم ہوتا تھا۔جس میں لوگ سوالات بھیجتے تھے اور اس کالم میں ان سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔یہ سلسلہ انگریزی صحافت میں ''فلم انڈیا ممبئی'' میں بھی بہت مقبول تھا۔اس کا معیار ''چترا'' سے بہت اونچا تھا اور اس کے جوابات بہت با معنی ہوا کرتے تھے لیکن ''چترا''

کی سطح نیچی ہونے کے باوجود یہاں بھی یہ سلسلہ بہت پاپولر تھا۔ چنانچہ ''چترا'' اس زمانے میں فلمی پرچوں میں اول نمبر پر شمار ہوتا تھا جبکہ دوسرے نمبر پر ''اداکار'' آتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد چترا ممبئی میں منتقل ہو گیا تو ''اداکار'' پاکستان میں فلمی پرچوں میں سرفہرست آگیا۔ کسی زمانے میں میں اِس پرچے میں افسانے لکھا کرتا تھا اور حالات اور اتفاقات دیکھئے کہ میں اسی پرچے میں ایڈیٹر بھی مقرر ہوا۔ اتفاقات کا سلسلہ عجیب ہوتا ہے۔ جب میں فلمی نغمہ نگاری کے سلسلے میں لاہور بلایا گیا تو جس فلم کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا تھا وہ قیام پاکستان کے بعد رک گئی اور مکمل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد پاکستان بننے کے بعد کی پہلی فلم ''تیری یاد'' مجھے ملی جس کے پروڈیوسر دیوان سرداری لال تھے۔ یہ پکچر بھی درمیان میں رہ گئی۔
اس کے بعد مجھے جو باقاعدہ فلم ملی وہ بھی سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی تھی جس کا نام ''اکیلی'' تھا۔ گویا ''اداکار'' میں میں نے لکھنا شروع کیا ''اداکار'' ہی میں ایڈیٹر مقرر ہوا اور ''اداکار'' میں رہتے ہوئے ہی نغمہ نگاری کی باقاعدہ ابتداء ''اداکار'' کے مالک عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی فلم سے ہوئی۔ ''اکیلی'' کی نغمہ نگاری کے سلسلے میں میں اِلگ بات کر چکا ہوں یہاں میں آپ کو فلمی صحافت کے کچھ تجربات بتانا چاہتا ہوں۔
فلم ''اکیلی'' بنی شروع ہوئی تو اس کا یونٹ الگ تھا اور اخبار ''اداکار'' کا عملہ الگ تھا۔ دونوں کا آپس میں انتظامی طور پر کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہر چند کہ دونوں کے مالک شاہ صاحب ہی تھے اور شاہ صاحب نے ''اداکار'' کا باقی کام کلیتہ میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میں جو لکھتا تھا اس کی مجھے آزادی تھی۔ شاہ

صاحب کی طرف سے کچھ عمومی ہدایات ہوتی تھیں جن کے تحت ہم کام کرتے تھے۔ان کی پکچر کی کاسٹ میں راگنی ہیروئن تھیں۔بے بی اختری پارٹیشن سے پہلے اس نام سے بہت مشہور ہوئی تھیں۔ اس فلم میں وہ سائیڈ ہیروئن تھیں۔ان کا تعلق ہیرامنڈی سے تھا لیکن شادی ایک بڑے ادارے کے منیجر سے ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنے رکھ رکھاؤ میں اضافہ کر لیا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر Touchy ہو جاتی تھیں۔"فلم انڈیا" اور "چترا" کی طرز پر ہم نے "اداکار" میں بھی سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کرر کھا تھا۔اس میں کسی نے سوال کیا کہ بے بی اختری کا ایڈریس کیا ہے تو جو اس کا آبائی ایڈریس تھا وہ میں نے لکھ دیا یعنی ہیرامنڈی لاہور۔

یہ سوال و جواب کہیں اختری کے خاوند نے پڑھ لیا اور اسے محسوس کیا حالانکہ اس میں کوئی بد دیانتی نہیں تھی۔اس وقت تک بے بی اختری کا وہی ایڈریس تھا۔اسی رات ایک دعوت میں عطاء اللہ شاہ ہاشمی، ان کے ساتھی کرشن کمار، جواب کے خورشید ہیں اور جو اس فلم کے ڈائریکٹر تھے اور فلم کا دوسرا سٹاف بھی موجود تھا۔اس دعوت میں بے بی اختری اور ان کے خاوند نے شاہ صاحب سے بہت احتجاج کیا اور کہا کہ آپ کے پرچے میں ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے اور آپ اس کے ایڈیٹر کو نکال دیں۔شاہ صاحب بڑے بہادر اور با اصول آدمی تھے۔انہوں نے کہا کہ پرچے کا معاملہ الگ ہے اور پرچے کے ایڈیٹر کو ہم نے کلی اختیارات دے رکھے ہیں اور اگر آپ کو ایڈریس پر اعتراض ہے تو آپ نیا ایڈریس دے دیں ہم وہ چھاپ دیں گے۔وہ کہنے لگے کہ نہیں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایڈیٹر ساتھ معافی بھی مانگے۔شاہ صاحب نے کہا کہ اس میں معافی کا کیا سوال ہے۔جو کچھ ہوا ہے غلط فہمی سے ہوا ہے اور بدنیتی پر مبنی نہیں ہے۔اس لئے معافی کی ضرورت نہیں ہے۔بے بی اختری اور ان کے

خاوند مصر ہوگئے کہ پرچے کے ایڈیٹر ہم سے معافی مانگیں ورنہ ہم فلم میں کام نہیں کریں گے۔ فلم کی دو ریلیں بن چکی تھیں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ پرچے اور فلم کے معاملات الگ الگ ہیں اس لئے آپ فلم میں کام کو پرچے کے ساتھ منسوب نہ کریں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا ہے۔ وہ عطاء اللہ شاہ ہاشمی ہیں۔ شاہ صاحب ان دنوں آگ تھے اور بڑی بڑی اصولی لڑائیاں لڑ چکے تھے اور ساری فلم انڈسٹری ان سے گھبراتی تھی اور اب بھی جو باقیات و صالحات تھے یہی کچھ تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے کہا کہ آپ اچھی طرح سوچ لیں کیونکہ "اداکار" اور "اکیلی" دونوں الگ الگ ادارے ہیں۔ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ آپ پرچے پر کیس کر دیں۔ میں مداخلت نہیں کروں گا اور اگر آپ کی واقعی توہین ہوئی ہے تو ایڈیٹر کو عدالت سے سزا مل جائے گی۔ وہ کہنے لگے کہ میں فلم کا آپ کو معاوضہ دے رہا ہوں جس میں آپ کام کر رہی ہیں۔ اگر آپ فلم میں کام نہیں کریں گے تو یہ آپ کی مرضی ہے اور پھر ہمیں یہ حق ہوگا کہ آپ ہمیں بلاوجہ جو نقصان دیں گی اس کے ازالے کے لئے ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ غرض بات بڑھ گئی اور بے بی اختری نے کہہ دیا کہ ہم فلم میں کام نہیں کریں گے۔

ہوا یوں کہ اگلے دن شاہ صاحب نے یہ کہا کہ فلم میں بے بی اختری کا جتنا کام ہو چکا تھا۔ قینچی رکھوا کر اسے کاٹا اور اس کام کا ایک رول بنا کر شاہ صاحب نے بے بی اختری اور ان کے شوہر کو بھیج دیا اور انشاء اللہ یہ آپ کی آخری فلم کی شوٹنگ ثابت ہوگی۔ اس رول کو اچھے وقتوں کی یادگار سمجھ کر دونوں میاں بیوی دیکھتے رہیے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے بے بی اختری کو اپنی فلم سے الگ کرنے کی نیوز چار کالمی چھاپی اور عطاء اللہ شاہ ہاشمی صاحب کی زبان ایسی سچی ثابت ہوئی کہ وہ فلم واقعی بے بی اختری کی

آخری فلم ثابت ہوئی اوراس کے بعد کسی نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ نہیں کیااوراچھاہی ہواکہ اس طرح وہ اپنی گھریلوزندگی میں آباد ہوگئی۔ پھر کسی نے اسکوسٹوڈیو میں نہیں دیکھا،

اصول کی بات ہے۔کوئی اور ہوتاتواپنانقصان نہ کرتاکیونکہ اس جھگڑے میں شاہ صاحب کابھی نقصان ہوااورانہیں بے بی اختری کی جگہ دوسری اداکارہ ڈال کرازسرنوجن مناظر کی شوٹنگ کرنی پڑی ان سے خرچ بڑھا۔لیکن شاہ صاحب یہ خرچ برداشت کرگئے۔ مگرانہوں نے اپنے پرچے کے ایڈیٹر کی توہین برداشت نہیں کی۔

میں اب بھی اس واقعہ پر فخر کرتاہوں کہ مجھے پرچے کامالک ایساملاجس نے مجھے کسی کے سامنے LEAD DOWNنہیں کیا۔

اس طرح صبیحہ خانم فلم انڈسٹری میں نئی نئی آئی تھیں۔ان کے سرپرست ہمارے ایک دوست اداکار تھے۔انہوں نے پہلے سٹیج اور تھیٹر سے کام شروع کیاتھا۔ یہ درست ہے کہ شروع میں ہرآدمی اسی طرح آغاز کرتاہےاور شروع میں کچھ بھی نہیں ہوتااوراس وجہ سے پبلسٹی کے ذرائع بھی تلاش کرتا ہے لیکن ان کے سرپرست نے یوں کیاکہ صبیحہ کے نام کے بعدایم اے لگاناشروع کیا۔میں نے ""اداکار"" میں اپنے طنزیہ کالم میں اس بات پر تبصرہ کیا۔یہ انہیں برالگا اوروہ صاحب ناراض ہوئے۔ انہوں نے پہلے تومجھے پیغام بھیجاکہ آپ نے جوکچھ کیاہےاس سے صبیحہ کی بےعزتی ہوئی ہےاورہم آپ کی ٹانگیں توڑدیں گے۔اخبارنویسی میں یہی کچھ ہوتاہےاورسب سے پہلے ٹانگیں توڑنے کی ہی دھمکی آتی ہے۔ پھراگرایڈیٹراپنے قدموں پرمضبوط ہے تودوسراپیغام یہ آیاکرتاہے کہ ہم آپ پرکیس کردیں گے۔اس پربھی اگرایڈیٹرثابت قدم رہے توپھردرمیان میں صلح کے لئے آدمی پڑجاتے ہیں اور

اگر پارٹی تھوڑی سی مالدار ہے اور اخبار والا تھوڑا سا بلیک میلر ہے تو معاملہ پیسوں پر طے ہوتا ہے۔ یہ بات میں اپنی فلمی اخبار نویسی کے حوالے سے کر رہا ہوں۔

چنانچہ جب مجھے دھمکی ملی کہ ٹانگیں توڑ دیں گے تو میں نے اور لکھا۔ اس کے بعد مجھے کیس کی دھمکی آئی تو میں نے پھر اور لکھا۔ اس کے بعد ہمارے ایک دوست آغا سلیم رضا مرحوم کو بیچ میں ڈالا گیا۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب ان کا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ میں نے کہا میں تو ان کا پیچھا چھوڑتا ہوں لیکن یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی دھمکی آ جاتی ہے۔ کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی عقلمند آدمی نہیں ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میں اس کو کسی دن یہاں لے آؤں۔ میں نے کہا لے آیئے میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ آغا سلیم رضا جب ان صاحب کو لے کر آئے تو انہوں نے آ کر ہاتھ ملایا اور جب دیکھا کہ میں پیار سے بات کر رہا ہوں تو انہوں نے وہی سرالاپنا شروع کیا اور کہا کہ جناب آپ نے عورت سمجھ کر صبیحہ کے ساتھ کیا ہے۔ کسی مرد کے بارے میں لکھتے تو اور بات ہوتی۔ میں نے ان کے منہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ بھائی میں نے آغا سلیم رضا کی وجہ سے آپ کو یہاں آنے دیا اور بات ختم کرنے لگا ہوں لیکن آپ بات بڑھا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ میں نے یہ سب عورت کے بارے میں نہیں لکھا بلکہ آپ کے بارے میں لکھا ہے۔ اب آپ بتایئے۔ چنانچہ میں گرم ہو گیا تو آغا سلیم رضا نے مجھے ٹھنڈا کیا۔

بات آخر مالک تک بھی جاتی ہے اور یہ دعویٰ بھی ہوتا ہے کہ یہ ایڈیٹر کیا چیز ہے۔ یہ بات ہے بھی درست کیونکہ مالک جسے چاہے نکال دے اور جسے چاہے رکھ لے لیکن انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ اس پرچہ

کے مالک عطاءاللہ شاہ ہاشمی ہیں۔ وہ صاحب میرے پاس سے تو ٹھیک ٹھاک اٹھے لیکن بعد میں شاہ صاحب کے پاس چلے گئے اور ان سے کہا کہ آپ کے پرچے کے ایڈیٹر نے بہت زیادتی کی ہے اس کی تلافی ہونی چاہیے کیونکہ انہوں نے اخبار کے دفتر میں بھی ہماری بڑی بے عزتی کی ہے۔ یہ صاحب ابھی زندہ ہیں اور میں عمداً ان کا نام نہیں لینا چاہتا۔ اس زمانے میں بڑے تلخ لہجے کے ہوتے تھے اب کچھ مختلف ہیں۔ خیر شاہ صاحب نے ان سے تفصیل پوچھی تو آغا سلیم رضا نے کہا کہ یار آپ نے بھی تو کچھ زیادتی کی تھی اور آپ نے بھی تو کہا تھا کہ میرے بارے میں لکھتے تو میں یہ کر دیتا۔ شاہ صاحب فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے قتیل صاحب سے کہا تھا کہ اگر آپ میرے بارے میں لکھ دیتے تو میں یہ کر دیتا۔ آغا صاحب کہنے لگے کہ ہاں اتنا کہا تھا۔ شاہ صاحب کہنے لگے کہ اگر میں قتیل صاحب کی جگہ ہوتا تو آپ کو دھکے دے کر سیڑھی سے نیچے گرا دیتا۔ شکر کریں میں نہیں تھا اور آپ بچ گئے اور انہیں کہنے لگے کہ آپ آئندہ ایسی بات مت کریں اور اب آپ کے بارے میں بھی سب کچھ لکھا جائے گا۔ وہ صاحب بالکل گھبرا گئے اور اس کے بعد ان صاحب نے شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔

یہ عطاءاللہ شاہ ہاشمی اور ایک مالک اخبار کا کردار تھا جو کہ کبھی اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا اور میں نے ان کی وجہ سے اتنے ٹھاٹھ سے فلمی اخبار نویسی بھی کی۔ اب کسی کا درد محسوس کر کے حق و انصاف کی بنیاد پر ساتھ دینے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ نغمہ نگاری میں بھی یہ مشکل پیش ہوتی ہے

فلم میں پروڈیوسر کی طرف سب کی نظریں ہوتی ہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ کسی فنکار سے آنکھیں بدل لے تو سارے آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور فنکار کی کوئی سائیڈ نہیں لیتا۔ فلم میں ایکٹر کا تو کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ خواہ وہ کتنی بھی زیادتیاں کرے نہ تو پروڈیوسر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہی ڈائریکٹر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے لیکن جو لوگ پس پردہ کام کرتے ہیں ان کی سروسز ہمیشہ خطرے میں پڑی رہتی ہیں اور ڈائریکٹر یا پروڈیوسر چاہے تو ان کو نکال کر ان کی جگہ کسی اور آدمی کو کھڑا کر سکتا ہے۔

1949ء کا واقعہ ہے کہ ایک فلم بن رہی تھی جس کے ڈائریکٹر سبطین فضلی تھے۔ جو بڑے مشفق دوست بھی تھے اور اپنے وقت کے نامور آدمی بھی تھے۔ اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر ماسٹر غلام حیدر تھے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ بڑے پائے کے میوزک ڈائریکٹر تھے اور اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ اس فلم میں میں اور طفیل ہوشیارپوری شاعری کر رہے تھے۔ فلم کمپنی کے پروڈیوسر، انچارج یا پروڈیوسر کے منیجر ایک وکیل صاحب تھے اور اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا ان پر رحمت کرے۔ اس فلم کے پروڈیوسر فرید سنز والے تھے۔ جنہوں نے فضلی صاحب کو پکچر کے لئے فنانس کیا تھا۔ انہیں یہ فلم بنوانے کی ضرورت شاید اس لئے محسوس ہوئی کہ انہیں فضلی صاحب کے بڑے بھائی جو غالباً سیکرٹری صنعت تھے سے کوئی کام آپڑا تھا۔ چنانچہ فرید سنز والے اس فلم کے پروڈیوسر تھے اور وہ ایڈووکیٹ ان کے منیجر تھے کیونکہ وہ ویسے بھی ان کے ادارے کی طرف سے وکالت کرتے تھے۔ یہ صاحب ویسے بھی کچھ گڑبڑ تھے۔ وہ ادائیگی کے سلسلے میں اکثر وعدہ خلافیاں کرتے تھے۔

ایک بار میں اپنے دو گانوں کی ادائیگی کے لئے ان کے پاس گیا۔ یہ دونوں گانے مکمل ہو چکے تھے۔

انہوں نے کہا کہ کل پیسے دیں گے۔ زمانہ ایسا تھا کہ تلی میں آیا گلی میں کھایا والی بات تھی۔ ادھر سے پیسے ملتے تھے اور ادھر پہلے سے کچھ بل سر پر ہوتے تھے۔ ورنہ تو کوئی بات نہیں ہوتی اگر پیسے ایک دو دن لیٹ بھی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن اس زمانے میں ہاتھ بہت تنگ ہوتا تھا۔ میں نے ان کے پاس اگلے دن گیا تو پیسے نہ ملے۔ میں نے کہا کہ آج تو کوئی بات نہیں ہے لیکن آپ اگلا وعدہ ٹھیک ٹھاک کریں۔ کہنے لگے کہ میں پرسوں ادائیگی کر دوں گا۔ پرسوں آئی تو انہوں نے پھر عذر کیا تو میں نے کہا کہ ادائیگی کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ ہمیں بس آپ ہی کے پیسے نہیں دینے ہیں۔ دنیا میں اور بھی کئی مجبوریاں ہیں۔

اس زمانے میں میں بہت تیز ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کی مجبوریوں کی ایسی تیسی، میں آپ کی مجبوریوں کا پابند نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ لایئے میرے کاغذ۔ بھاڑ میں جائیں آپ کے پیسے۔ میں آپ کے گانے لکھتا ہی نہیں۔ انہوں نے سوچا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ گانے کسی دوسرے شاعر سے لکھوا لیں گے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ آپ اپنے گانے واپس لے لیں اور انہیں پھاڑ دیں ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر H.M.V کے دفتر میں آ گیا۔ ماسٹر غلام حیدر ابھی نہیں آئے ہوئے تھے البتہ ان کے ایک اسسٹنٹ موجود تھے میں انہیں سارا واقعہ بتا کر کام چھوڑ کر واپس گھر چلا آیا۔

بعد میں ماسٹر غلام حیدر آئے تو انہوں نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ آج قتیل صاحب نہیں آئے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے اور پروڈکشن منیجر نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی تھی

جس سے تلخی پیدا ہوئی اور وہ چلے گئے ہیں اور جاتے ہوئے یہ کہہ کر گئے ہیں کہ میں کام نہیں کروں گا۔ماسٹر صاحب نے فضلی صاحب کو بلایا۔ماسٹر غلام حیدر ایک عظیم انسان تھے۔انہوں نے میرے لئے جو قدم اٹھایا میں ان سے بڑا کسی اور میوزک ڈائریکٹر کو قدم اٹھاتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے فضلی صاحب کو سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ فضلی صاحب نے کہا کہ پروڈکشن منیجر کا قصور ہے۔کہنے لگے کہ کیا آپ گوارا کریں گے کہ قتیل صاحب یوں ناراض ہو کر چلے جائیں۔کہنے لگے کہ وہ ہمارے دوست بھی ہیں لیکن آپ یہ بتائیں کہ اصلی طور پر کیا ہونا چاہیے۔

فضلی صاحب نے کہا کہ پروڈکشن منیجر کی ایسی تیسی۔اسے قتیل صاحب سے وہاں جاکر معافی مانگنا چاہیے اور پیسے بھی وہاں جاکرادا کرنے چاہئیں۔چنانچہ فرید سنز میں ایک مسئلہ بن گیا۔فضلی صاحب نے ان سے کہا کہ گیت قتیل صاحب ہی کے ہوں گے اور آپ کا آدمی انہیں پیسے بھی پہنچائے گا اور جاکران سے معافی بھی مانگے گا۔پروڈکشن منیجر کہیں دوسرے شہر میں جاچکا تھا۔فرید سنز والوں نے فضلی صاحب سے کہا کہ آپ ہم سے پیسے لے لیں اور قتیل صاحب کو پہنچادیں۔چنانچہ ماسٹر غلام حیدر اور فضلی صاحب پیسے لے کر خود میرے گھر پر پہنچے۔مجھے پیسے دیئے اور کہا کہ آپ نے جو کیا ایسے ہی کرنا چاہیے تھا اور وہ آکر آپ سے معافی بھی مانگے گا۔چنانچہ بعد میں پروڈکشن منیجر نے خود آکر مجھ سے معافی بھی مانگی اور میں عزت سے وہاں جانے لگا۔

ایسے سربراہان شعبہ بہت کم ملتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی عزت رکھیں اور ان کی خاطر لڑیں میں نے اس طرح کے لوگوں میں عطاء اللہ شاہ ہاشمی،ماسٹر غلام حیدر اور سبطین فضلی کو دیکھا ہے۔یہ لوگ آج بھی میرے ذہن میں دیوتا کی طرح کھڑے ہیں۔جنہوں نے یہ پروا کئے بغیر کہ جھگڑا بڑھ کے ان

کی علیحدگی کا باعث بن سکتا ہے میری پاسداری کی۔

کچھ احسان فراموش دوست

بعض لوگ اصول کی خاطر اپنے مفادات سے بھی کھیل جاتے ہیں اور اپنے اصولوں پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ مگر بیشتر لوگ ہیں جو اپنے مفاد پر تھوڑی سی زد پڑنے کے ڈر سے بھی پرانی دوستی کو بھول جاتے ہیں اور احسانات کو نظر انداز کر کے وہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ بڑی سطح پر سیاسیات میں آپ کو اس طرح کی کئی مثالیں مل جائیں گی کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ مروت کا سلوک کیا اور دوسروں کو نظر انداز کر کے آپ کو ترقی کی اعلیٰ سیڑھی پر پہنچا دیا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آپ اتنے بددل ہو گئے کہ اپنے محسن کو ڈس لیا اور یہ بھی پرواہ نہیں کی کہ دنیا آپ کو کیا کہے گی۔ سیاست میں اس کی زندہ مثال ہمارے اپنے ہی زمانے میں موجود ہے لیکن چھوٹے پیمانے پر دیکھیں تو کئی معاملات ایسے ہیں کہ آپ کو اپنے ہی دوستوں میں اس کی مثالیں مل جائیں گی۔

ایوب خان کے مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ جب پہلی بار اخبارات کی آزادی پر زد پڑی تو پروگریسو پیپرز کے اخبارات پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار قومیا لئے گئے اور ردعمل میں بعض اصول پرست لوگوں نے وہاں سے مستعفی ہونا مناسب سمجھا۔ ان مستعفی ہونے والوں میں سے ایک حضرت احمد ندیم قاسمی تھے جو اس وقت "امروز" کے ایڈیٹر تھے۔ جب ان کا استعفیٰ گیا تو قدرت اللہ شہاب بار باران کے پاس آئے انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے اور لمبی چوڑی محفلوں میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں کیونکہ آپ کا امروز کا ایڈیٹر رہنا آپ کی اصول پرستی کے

خلاف نہیں ہے۔اگر آپ سرکار کی ملازمت میں بھی ہوتے تو بھی ڈیوٹی کرتے۔یہ شہاب صاحب کی نیک دلی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قاسمی صاحب بیروزگار ہو جائیں لیکن قاسمی صاحب نہیں مانے اور انہوں نے بیروزگار ہونا مناسب سمجھا۔

قاسمی صاحب اس زمانے میں نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری کے پیچھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کے پاس قرب وجوار میں ان کے وہ دوست بھی رہتے تھے جن پر قاسمی صاحب کے احسانات بھی تھے اور ان کے ساتھ دوستی کے رشتے بھی بڑے استوار تھے۔ قاسمی صاحب کو بیروزگار ہوئے چار مہینے گزر گئے لیکن ان کا کوئی دوست ان سے یہ پوچھنے بھی نہیں آیا کہ آپ کس حال میں ہیں اور یوں بھی ہوا کہ اگر قاسمی صاحب کے راستے سے کوئی اور آشنا آرہا ہوتا تو وہ راستہ بدل کر گزر جاتا۔

ایک صاحب قاسمی صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ایک دن مجھ سے ملے اور قاسمی صاحب کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ قاسمی صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

کہنے لگے " نہیں قتیل میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میں انہیں اس حال میں دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہو گا"

میں نے کہا' ان کا کیا حال ہے۔انہوں نے بڑے ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اصول پرستی کی ہے۔یہ حال دیکھ کر تمہیں غش پڑ جائے گا"

کہنے لگے " دراصل وہ چار مہینے سے بیکار ہیں"

میں نے کہا" شاید اس واسطے ہی آپ کو غش پڑ جائے گا کہ کہیں وہ آپ سے کچھ مانگ نہ بیٹھیں"

میں نے کہا" قاسمی صاحب کے چاہنے والے بے انتہا ہیں اور پھر وہ گھر سے بھی اتنے گئے گزرے

نہیں ہیں کہ ان پر فاقوں کی نوبت آجائے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ تمہیں یہ دیکھ کر خوشی ہو گی کہ وہ آج کل بھی پہلے سے زیادہ گھر بیٹھے کما رہے ہیں اور اگر نہ بھی کماتے ہوتے تو وہ پہلے بھی تم سے مروت کرتے تھے اور اب بھی مروت کرتے اور پوچھتے کہ بھائی تمہیں کوئی ضرورت ہے تو لے جاؤ'' ان صاحب کی طرف سے نہ ملنے کا دراصل یہ ایک عذر لنگ تھا۔ درحقیقت لوگ ڈرتے تھے کہ مارشل لاء کو قاسمی صاحب نے آنکھیں دکھائی ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے ملنے جلنے سے سی آئی ڈی والے ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔ چنانچہ ایسے افراد کے دلوں میں بزدلی بھی تھی اور مصلحت اندیشی بھی تھی۔

ایسے حالات میں کچھ لوگ کس طرح کام آتے ہیں؟ یہ بھی دیکھئے۔ میں نے قاسمی صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ فلموں کے لیے مکالمے لکھئے اور میرا خیال ہے کہ آپ اس کام کیلئے بہت ہی مناسب ہیں۔ ان سے یہ بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں فلم لائن میں سانگ رائیٹر کے طور پر موجود تھا اور میں اس زمانے میں فلم لائن میں سب سے زیادہ مصروف آدمی تھا اور میری اس زمانے میں سنی بھی جاتی تھی۔ اور قاسمی صاحب کا اپنا بھی بہت زیادہ نام تھا۔ میں اگر ان کا نام پیش کرتا تو کسی کو اس پر اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی بلکہ لوگ خوش ہوتے۔ چنانچہ میں نے قاسمی صاحب کو راغب کیا کہ فلم کے لیے لکھیں۔ میں نے جس شخص سے بھی بات کی اس نے یہی کہا کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ قاسمی صاحب ہمارے لیے لکھیں۔

اس موقع پر فضلی صاحب ایک بار پھر کام آئے۔ میں نے جب ان سے بات کی تو کہنے لگے کہ صاحب ہماری ایسی قسمت کہاں کہ وہ ہمارے لیے ڈائیلاگ لکھیں۔ فضلی صاحب نستعلیق آدمی تھے۔ اور ان کا بات کہنے کا یہ ایک انداز تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ قاسمی صاحب آپ کیلئے لکھیں گے۔ میں نے فضلی

صاحب کو بتایا کہ تین چار اور پروڈیوسر بھی قاسمی صاحب سے لکھوانے کی ہامی بھر چکے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ قاسمی صاحب کے سٹینڈرڈ کا پروڈیوسر ہو جس کی بات قاسمی صاحب سمجھ سکیں اور جو خود بھی قاسمی صاحب کی بات سمجھ سکے جس سے قاسمی صاحب آغاز کریں۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں بات نہیں ہے۔ آپ معاملہ طے کروا دیجئے اور قاسمی صاحب جو کہیں میں اس کیلئے حاضر ہوں۔ چنانچہ قاسمی صاحب کا سلسلہ بڑے معقول پیسوں سے طے ہو گیا۔ اس زمانے میں ڈائیلاگ رائٹر جتنے پیسے لیتا تھا اس سے کم و بیش ڈیڑھ گناہ معاوضہ پر قاسمی صاحب سے معاملہ طے کیا گیا۔ اور فلم کا آغاز کر دیا گیا۔ لیکن فضلی صاحب کا مزاج دھیما سا تھا۔ وہ کام جلدی نمٹانے کی یا تو اہمیت نہیں رکھتے تھے اور یا پھر سوچتے بہت تھے۔ کچھ وہمی تھے اور بعض چیزیں بنا بنا کر توڑتے رہتے تھے۔ اس طرح معاملہ آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ تاہم قاسمی صاحب نے اس زمانے میں اپنے ڈائیلاگ مکمل کر لیے تھے اور انہیں معاوضہ بھی پورا مل چکا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور پروڈیوسروں سے بھی ہماری وساطت سے قاسمی صاحب کا معاملہ طے ہوا اور بیروزگاری کے زمانہ میں عزت آبرو سے قاسمی صاحب کا کام چلتا رہا۔

میں موازنہ کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بیشتر لوگ ایسے ہیں جو مشکل وقت میں کام نہیں آتے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی مل جاتے ہیں جو مشکل وقت میں کام بھی آتے ہیں اور اس میں خوشی بھی محسوس کرتے ہیں۔ میرا معاملہ تو یہ تھا کہ میں تو قاسمی صاحب کا شاگرد تھا اور میرا تو فرض تھا کہ میں ان کے کام آؤں۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ اور لوگوں نے بھی میرے ساتھ شمولیت کی جنہیں میں آج بھی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے جوہر شناسی کا ثبوت دینے کے علاوہ ایک ایسے بڑے ادیب کا ہاتھ بٹایا جو بظاہر فلم

کے لیے کام نہیں کرتا تھا لیکن فضلی صاحب کے اس زمانے کے ریمارکس میں آپ کو بتاتا ہوں۔ انہوں نے جب قاسمی صاحب کا سکرپٹ دیکھا تو کہا کہ قاسمی صاحب نے میرا تو مسئلہ ہی حل کر دیا ہے کیونکہ مجھے یہاں سکرین پلے لکھنے والا کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے جو ڈائیلاگ لکھے ہیں ان کے ساتھ سکرین پلے اتنا مکمل ہے کہ مجھے آدھی ڈائریکشن تو اس میں سے ہی ملتی نظر آتی ہے۔ فضلی صاحب نے مجھے کہا کہ قاسمی صاحب سے کہیے کہ وہ اس کام کو جاری رکھیں کیونکہ ان سے زیادہ مناسب آدمی مجھے نظر نہیں آتا۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ خدا جانے کیوں قاسمی صاحب اپنی نسبت فلمی ڈائیلاگ سے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ فلمی کام کو برا سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر جیسے ان کے پیشرو بھی موجود تھے جو فلم میں کام کر چکے تھے اور اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے۔ چنانچہ قاسمی صاحب اس بات کے قائل بھی تھے لیکن کہتے تھے کہ میرا دل اندر سے اس کام کیلئے مائل نہیں ہو پاتا۔ بہر حال ان کا وہ زمانہ خیریت سے گزر گیا اور آگے حالات بدلے تو انہوں نے فلم سے کبھی اپنی رغبت کا اظہار نہیں کیا۔

ختم شد